روزانہ درسِ قرآن کریم

تفسیر

① سُورۃ الفرقان (مکمّل)

② سُورۃ الشّعراء (مکمّل)

③ سُورۃ النّمل (مکمّل)

④ سُورۃ القصص (مکمّل)

⑤ سُورۃ العنکبوت (مکمّل)

⑥ سُورۃ الرُّوم (مکمل)

جلد : ۱۴

إفادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دام مجدہم

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ . پاکستان

طبع یازدہم

جملہ حقوق بحق مکتبہ محفوظ ہیں

نام کتاب ________ معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ الفرقان تا الروم) جلد

افادات ________ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب ________ الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ لاہور

مطبع ________ لعل شار پریس لاہور

تعداد طباعت ________ پانچ سو روپے (۵۰۰)

سرورق ________ سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت ________ محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر ________ مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت ________ دوسو ستر روپے (270)

تاریخ طباعت ________ جون ۲۰۰۸ بمطابق جمادی الاول ۱۴۲۹ھ

ملنے کے پتے ________

1- مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

2- مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

3- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

4- مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور

5- کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

6- مکتبہ علمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی ۱۶

7- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

8- اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد

9- مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

10- مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

معالم العرفان فی دروس القرآن جلد ۱۴

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

نزولِ قرآن کے بعد اس کی تشریح و توضیح کا کام اہل اللہ ہر زمانے میں کرتے چلے آئے ہیں اور ہر سعی کنندہ نے اس بحرِ ذخار سے نئے نئے موتی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم قرآن پاک کا علم و فہم بھی خداوند قدوس کی اعانت سے ہی ممکن ہے کیونکہ انسان کو قرآن کا علم و بیان سکھانے والی ذات بھی وہ خود ہی ہے۔

گذشتہ جلد ۱۳ پانچ سورتوں اور تقریباً اڑھائی پاروں پر مشتمل تھی۔ زیرِ نظر چودھویں جلد میں اگلی چھ سورتیں فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت اور روم آگئی ہیں جن کی کل ضخامت بھی تقریباً اڑھائی پارے ہی بنتی ہے۔ یہ تمام سورتیں مکی زندگی کے درمیانی یا آخری حصے میں نازل ہوئیں جن کے مضامین کی ایک مختصر جھلک قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

(۱) سورۃ الفرقان

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ کے مرکزی مضامین بھی توحید، رسالت، معاد اور قرآن کی حقانیت ہیں، تاہم اس سورۃ مبارکہ میں عقائد اور اخلاق کی درستگی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اس سورۃ میں مسئلہ رسالت و بشریت کی خاص طور پر وضاحت کی گئی ہے۔ کفار کو اعتراض تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہماری طرح چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہیں، بھلا یہ رسول کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان کے پاس تو مال و دولت اور باغات ہونے چاہئیں تھے اور ان کے ساتھ فرشتے اترنے چاہئیں تھے جو ان کی رسالت کی تصدیق کرتے۔ اللہ نے بیان واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے تمام رسول انسان ہی ہوتے ہیں اور بشریت نبوت و رسالت کے ہرگز منافی نہیں ہے۔

کفار کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ پہلی آسمانی کتب کی طرح قرآن حکیم یکبارگی کیوں نہیں اترا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب بھی دے دیا ہے۔

اس سورۃ میں دلائل قدرت و توحید کے طور پر سایہ، چاند، سورج اور رات دن کا ذکر آیا ہے۔ دو مختلف نوعیت کے پانیوں کی یکجائی کا تذکرہ ہے اور ساتھ ساتھ سابقہ اقوام نوح، عاد اور ثمود کی ہلاکت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے تاکہ عبرت حاصل ہو۔ معبودان باطلہ کی بے بسی اور ان کی بے بسی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سورۃ کے آخر میں عباد الرحمان کے چودہ اوصاف بیان کر کے ہر انسان کو ان کی روشنی میں اپنی اصلاح کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

سورۃ الشعراء

اس سورۃ مبارکہ کے آخر میں شعراء کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام سورۃ الشعراء ہے۔ تاہم امام مالک اس کو سورۃ الجامعہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ سورۃ نصیحت کی بہت سی باتوں کو جمع کرنے والی ہے۔

اس سورۃ کا مرکزی مضمون تسلی کا مضمون ہے۔ حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ ہارون، ہود، صالح، شعیب علیہم السلام کے واقعات اور ان کی اقوام کی تباہی کا حال بیان کر کے حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ دل برداشتہ نہ ہوں کیونکہ اللہ کے راستے میں مشکلات کا آنا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہلاکت و تباہی ہمیشہ نافرمان اقوام کے حصے میں ہی آئی ہے اور اہل اللہ ہمیشہ سرخرو ہوئے۔ اس ضمن میں سابقہ اقوام کے حالات، انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تبلیغ، توحید کی دعوت اور معاد کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں نزول قرآن کے طریقہ کار کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ کہ رب العزت نے جبرئیل امین کی وساطت سے حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل فرمایا ہے جو کہ عربی زبان میں ہے اور جس سے علمائے بنی اسرائیل بخوبی واقف ہیں۔ آخرت کے سلسلہ میں منکرین کی سزا کا ذکر ہے۔ وہ مہلت طلب کریں گے مگر

اللہ نے فرمایا ہے کہ انہیں اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ یہ لوگ اپنی قبیح حرکات سے باز آنے والے نہیں۔ سورۃ کے آخر میں شعرا کی تین خرابیوں کا ذکر ہے کہ ان کے پیروکار عموماً گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ شاعر لوگ تخیلات کی ہر وادی میں گھوم جاتے ہیں۔ اور ان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے (الا ماشاء اللہ)۔ اللہ نے اپنے نبی کو شعر و شاعری کی تعلیم نہیں دی کیونکہ یہ کوئی پسندیدہ امر نہیں ہے۔ البتہ ایمان لانے کے بعد اعمال صالحہ انجام دینے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اور مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لینے والے شعراء مذکورہ عیوب سے پاک اور قابل قبول ہوتے ہیں۔

سورۃ النمل

مکی سورتوں کے چار بنیادی عقائد توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت و صداقت اور معاد میں سے اس سورۃ مبارکہ میں معاد کو خاص طور پر موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ وقوعِ قیامت کا تذکرہ ہے کہ صور پھونکے جانے کے بعد ہر چیز درہم برہم ہو جائیگی۔ لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائیگی۔ سوائے اُن کے جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھنا چاہے گا۔ پھر نیکی اور برائی کی جزا اور سزا کا ذکر بھی آگیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں بہت سے عقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی بعض صفات مختصہ کا ذکر کر کے مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ بتاؤ یہ کس کا کام ہے۔ جب جواب ایک ہی ہے یعنی "اللہ" تو پھر اُس کے ساتھ شریک بنانے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ قرآنِ پاک کی حقانیت و صداقت کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی بہت سی مختلف فیہ باتوں میں رہنمائی کرتا ہے اور اہل کتاب کی طرف سے آسمانی کتابوں میں کی گئی تحریفات کی نشاندہی کرتا ہے۔

رسالت کے ضمن میں حضرت موسیٰ، صالح اور لوط علیہم السلام اور اُن کی قوموں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنے انبیاء کی نافرمانی کی اور ہلاک ہوئے۔ داؤدؑ و سلیمان علیہ السلام کا خصوصی تذکرہ ہے۔ اُن کو اللہ نے بے مثال بادشاہی عطا فرمائی اور وہ اللہ کے شکر گزار بندے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں ملکہ سبا کا

واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ مشرکہ تھی مگر اللہ نے بادشاہت بھی کمال درجے کی دی تھی۔ سلیمان علیہ السلام نے اُسے دعوتِ توحید دی۔ اُس نے تحائف بھیج کر آپ کا امتحان لینا چاہا مگر بالآخر ایمان لے آئی۔

سورۃ القصص

حضرت موسیٰ علیہ السلام، قارون اور بعض دیگر شخصیات کے واقعات بیان ہونے کی بنا پر اس سورۃ کا نام سورۃ القصص ہے۔ تاہم اس کا بیشتر حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہم قوم قارون کا حال اور اس کی تباہی کا منظر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو نہایت ناسازگار حالات سے گزرنا پڑا اسی طرح حضور علیہ السلام پر بھی نہایت مشکل ادوار آئے اس طرح دونوں جلیل القدر انبیاء کے حالات میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے اہلِ ایمان کو تسلی دلانا بھی مقصود ہے کہ جس طرح بالآخر موسیٰ علیہ السلام کو کامیابی حاصل ہوئی، اسی طرح اہلِ ایمان بھی کفر و شرک کے مقابلے میں کامیاب ہوں گے۔

اس سورۃ مبارکہ میں شب و روز کے نظام کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور چیلنج کیا گیا ہے کہ کون ہے جو اس نظام کو بدل کر ہمیشہ کے لیے دن یا ہمیشہ کے لیے رات بنا دے، اور کون ہے جو اس کو معمول کے مطابق بنائے اور آپ دن کو کام اور رات کو آرام کر سکیں۔

اللہ نے اہلِ کتاب کی بعض صفات کا ذکر بھی کیا ہے اور خوشخبری دی ہے کہ ان میں سے جنہوں نے دینِ حق کو قبول کر لیا ہے وہ دوہرے اجر کے مستحق ہیں۔ ایک پہلے دین پر استقامت کا اور دوسرا دینِ حنیف کی قبولیت کا۔ مشرکینِ مکہ نے اعتراض پیش کیا تھا کہ اگر ہم اللہ کے آخری نبی پر ایمان لے آئے تو باقی عرب ہمیں اچک لے جائیں گے۔ اللہ نے جواب دیا کہ جس اللہ نے حرم کو امن بنایا اور تمہیں عزت بخشی، ایمان لانے کے بعد بھی وہ تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

اس سورۃ میں اللہ نے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دائمی زندگی کا ذکر کر کے

آخرت کا گھر حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اپنی حاجات میں غیر اللہ کو پکارنے والے مشرکین کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا قیامت والے دن ان کو ان کے معبودوں سمیت حاضر کر کے ان کا کیا چٹھا ظاہر کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ عطائے نبوت اور نزول کتاب کو رحمتِ خداوندی کا مرہونِ منت قرار دیا گیا ہے کوئی شخص اپنی محنت، عبادت اور ریاضت کی وجہ سے درجہ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مشن جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ آخر میں دنیا کے فنا اور ذاتِ خداوندی کی بقا کا ذکر ہے۔

سورۃ العنکبوت

اس سورۃ مبارکہ میں خدا کے سوا دوسروں کو کارساز بنانے کی مثال عنکبوت یعنی مکڑی کے جالے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جس طرح مکڑی کا گھر کمزور ترین گھر ہوتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کو معبود بنانے کا عقیدہ بھی کمزور ترین عقیدہ ہے۔ گویا شرک ایک ایسی شے ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

اس سورۃ کا مرکزی مضمون ایمان اور ابتلاء ہے۔ چنانچہ آغاز سورۃ میں ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان محض اس لیے نہیں چھوڑ دیے جائیں گے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، بلکہ پہلے لوگوں کی طرح انہیں بھی مختلف آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔ اس ضمن میں حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ، لوط اور شعیب علیہم السلام کی آزمائشوں کا تذکرہ ہوا ہے

اس سورۃ میں قرآن پاک کی تلاوت اور اقامتِ صلوٰۃ کی تلقین کی گئی ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے بچاتی ہے۔ ذکرِ الٰہی کی فضیلت، اہلِ کتاب کے ساتھ بہتر تبادلہ اور مشرکوں کے ساتھ سخت لہجہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ہجرت کی ترغیب، روزی بدستِ خدا ہونے کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اگر جانوروں کی طرح انسان بھی توکل کریں تو ان کو بھی اللہ تعالیٰ ان جانی جگہ سے رزق عطا کرے۔ دنیا کی زندگی تو محض لہو ولعب ہے اور آخرت کا گھر ہی بہتر ہے جس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ توحید کے ضمن میں فرمایا کہ جب کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے تو مشرک خالص اللہ کو پکارتے

ہیں، مگر جب خشکی پر پہنچ جاتے ہیں، تو پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے والوں کو اللہ نے اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کا مژدہ سنایا ہے۔

سورۃ الرّوم

یہ سورۃ مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی جب کہ ایرانی مجوسیوں نے رومی عیسائیوں کے بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی۔

سورۃ کی ابتدا میں رومیوں کے مغلوب ہونے کی خبر دے کر چند سالوں میں دوبارہ غالب آنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو کہ نو سال کے عرصہ میں پوری ہوئی۔ اہل کتاب ہونے کے ناطے مسلمانوں کو رومیوں کے ساتھ ہمدردی تھی جب کہ مشرک ہونے کی وجہ سے مشرکین مکہ ایرانیوں کے ہمدرد تھے۔ وہ مسلمانوں کو طعنہ دیتے تھے کہ جس طرح رومی مغلوب ہو گئے ہیں اسی طرح تم بھی مغلوب ہی رہو گے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں رومی دوبارہ غالب آ گئے اور ادھر اہل ایمان نے مکہ فتح کر لیا، اور اس طرح مشرکین کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی چار بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور قرآن کی حقانیت کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں توحید کو خاص طور موضوع سخن بنایا گیا ہے اور اس ضمن میں عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ فرمایا جب تم اپنے مجازی غلاموں کو اپنے مال میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں تو مالک حقیقی کے ساتھ دوسروں کو کیسے شریک کرتے ہو۔ انسان کو دین خالص کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرقہ بندی کی حوصلہ شکنی اور عبرت کے لیے نافرمانوں کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور سود اور زکوٰۃ کا فرق سمجھایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کے تین ادوار کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یوم البعث کا کچھ حال بھی بیان ہوا ہے۔

احقر العباد (الحاج) لعل دین ایم اے (علوم اسلامیہ)
شالامار ٹاؤن، لاہور

سخنہائے گفتنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد فقال اللہ تبارک وتعالیٰ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

قرآن کریم اللہ رب العزت کا بابرکت اور پاکیزہ کلام ہے۔ نسل انسانی کے لیے رشد و ہدایت کا گراں قدر اور قیمتی پیغام ہے بنی نوع انسان کے لیے ضابطہ حیات اور اقوام عالم کے لیے نصب العین دستور اور حقیقی پروگرام ہے جس کی حفاظت کا بیڑہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے۔ جس کی صداقت و حقانیت کا تذکرہ خود خالق کائنات نے کیا ہے۔ آقائے نامدار خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ نے جس کی اشاعت و حفاظت کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں جس پر عمل پیرا ہونا ہی ابدی اور سرمدی فوز و فلاح کا ذریعہ ہے آج دنیا میں قرآن کریم کے ایک کروڑ سے متجاوز حفاظ ہیں جو اس کے الفاظ کو اپنے سینوں کے نہاں خانوں میں نقش کیے ہوئے ہیں لیکن اسلام دشمن طاقتیں اس کو مٹانے کے درپے ہیں۔ دشمن اپنی عیارانہ اور ناپاک چالوں سے اس کی روشنی کو مٹا دینے اور اس کی چمکدار شعاعوں کو تیرہ و تاریک کر دینے میں کوشاں اور بزعم خود کامیاب ہے ہر طرح کی کشمکش جاری ہے ہر طرف سے تند و تیز آندھیاں اس کی فضا کو غبار آلود اور کشت زار کو خس و خاشاک بنانا چاہتی ہیں۔ اس کے الفاظ کو بدلنے کے لیے بے حد و بے شمار مذموم جسارتیں کی گئی ہیں اور اس کو ختم کرنے کے لیے مکروہ اور لامتناہی منصوبے تیار کیے گئے ہیں اور اس کو صفحہ ہستی سے ناپید کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا ہے۔

لیکن جس کی حفاظت کا ذمہ خود قادرِ مطلق نے اٹھایا ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی
اگرچہ آج مسلمان خود اسلام اور قرآن کے انقلابی پروگرام سے غافل ہیں۔ ہر طرف جہالت،
بے راہ روی اور اخلاقی کمزوریوں کا طوفان بپا ہے۔ ہوا و ہوس، زر پرستی اور روحانی امراض کا تیرہ و
تاریک جال بچھا ہوا ہے۔ حق و باطل، طیب و خبیث کی تمیز ختم ہو رہی ہے۔ مصائب و آلام
کی مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ خود پسندی کی بادِ صرصر نے اسلام کے سبزہ زاروں کو مرجھا دیا ہے
فتنۂ عیاری ہر سو دور دورہ ہے کہ حبِ دنیا اور کراہیتِ موت کے دیمک نے حرمِ اسلام
کے جڑوں کو کھوکھلا اور اس کے گلستانوں کو برباد کر ڈالا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ نفسانی
خواہشات کی خوابِ غفلت میں مست ہیں دوست نما دشمن اور گندم نما جو فروش عیار زندگی
دل کی طرح ہر طرف منڈلا رہے ہیں دشمن اپنی قوت و توانائی میں مست ہو کر شدید اسلام اور
قرآن کی بیخ کنی میں لمحہ بہ لمحہ کوشاں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں
کوشش ہی نہیں کرتا کہ اس کے انقلابی پروگرام پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کا دستور العمل
بنائے جس سے ان کی عظمت و سطوت اوجِ ثریا تک پہنچ سکتی ہے یہ قعرِ ذلت سے نکل
کر عزت کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ یہ شرک و بدعت سے نکل کر توحید و سنت میں داخل
ہو سکتا ہے۔ یہ بدعات و خرافات سے ہٹ کر حسنات و نیکیوں کے قریب ہو سکتا ہے۔
یہ قرآن کے الفاظ و معانی اور مطالب کو سمجھ کر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو لوٹا سکتا ہے
اس سے روحانی فیض حاصل کر کے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنیان مرصوص
کی طرح متحد ہو کر جرأت مندانہ مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلمان صراطِ مستقیم پر گامزن
ہونے کی بجائے ضلالت و گمراہی کی بھیانک اور عمیق وادی میں سرگرداں ہے لہو و لعب
اور تعیش نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ رسوماتِ باطلہ کے دلدل میں پھنسا
ہوا ہے۔ اجتماعی غلامی کی لعنت کا طوق گلے میں سجا رکھا ہے۔ بے عمل درباری حکومتیں
غیر مسلموں کی دستِ نگر بنی ہوئی ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا محبوب ترین مشغلہ
ہے۔ کاش کہ مسلمان اسلام اور قرآن کا مطالعہ کریں اس کے رموز و اسرار سے واقفیت
حاصل کریں اس کے انقلابی پروگرام کو اپنی زندگیوں کا جزو بنا لیں تو آج بھی یہ قوت ایمانی

سے سرشار ہو سکتے ہیں۔ ان کا وقار اقوامِ عالم میں بن سکتا ہے۔ یہ باطل کو مرعوب و مغلوب کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے اسوۂ رسول اور قرآن کے انقلابی پروگرام کو سمجھنا اور پھر اس پر عمل کرنا شرطِ اول ہے۔ اس پروگرام کو سمجھانے کے لیے بزرگانِ دین نے بہت سی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ قرآن مجید کی تفاسیر لکھی ہیں اور اپنے اپنے انداز میں قرآن کے پروگرام کو عوام الناس کے اذہان کے قریب کرنے کے لیے طویل اور مختصر انداز میں تفسیریں لکھی ہیں زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن کی چودھویں جلد ناظرین کے ہاتھوں میں ہے اس جلد میں سورۃ الفرقان، سورۃ الشعراء، سورۃ النمل، سورۃ القصص، سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم، چھ سورتوں کی تفسیر ہے۔ جو اپنے اندر علمی و تحقیقی جواہر پارے سموئے ہوئے ہے۔ اسلوبِ بیان انتہائی سہل سادہ اور پیچیدگیوں سے خالی ہے۔ قاری کے لیے سحر انگیز اور سرور افزا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ متقدمین و متاخرین کی تفاسیر کا نچوڑ اور خلاصہ ہے ——————— جس کے مطالعہ سے انسان دیگر تفاسیر سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اس جلد پر بھی سابقہ جلدوں کی طرح امام ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ اور حکمت کی چھاپ غالب ہے۔ اس جلد کی اشاعت کے ساتھ ساتھ "دروس الحدیث" کی پہلی جلد بھی منظرِ عام پر آچکی ہے جو کہ مسند احمد کی منتخب احادیث کی تشریح ہے۔ تفسیر معالم العرفان کی طرح دروس الحدیث کی جلدوں کا سلسلہ بھی چلے گا[1]۔ انجمن محبانِ اشاعتِ قرآن کے علم دوست اور باذوق احباب نے حضرت صوفی صاحب مدظلہ کے خطبات جمعہ کو بھی شائع کرنے کا ایک اہم پروگرام بنایا ہے جو کہ خطباتِ سواتی کے نام سے شائع ہو گا[2]۔ جملہ احباب سے درخواست ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت اس پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور اس کے لیے اپنے غیبی خزانے سے مدد فرمائے۔ صاحب دروس اور دیگر اراکین انجمن فاضل مرتب الحاج لعل دین صاحب، حاجی غلام حیدر صاحب، حاجی محمود انور بٹ صاحب، حافظ شیخ محمد یعقوب صاحب، حاجی محمد اسلم صاحب، بلال احمد ناگی صاحب، مسترق منیر احمد صاحب، الحاج لطیف صاحب وغیرہ کے لیے اور انجمن کے ساتھ تعاون کرنے والے جملہ

---

[1] دروس الحدیث چار جلدوں میں مکمل ہو چکی ہے۔ [2] خطبات کی چار جلدیں چھپ چکی ہیں۔

احباب کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی پریشانیوں کو ختم فرمائے اور اُن کو اس نیک راہ پر ثابت قدم رکھے اور اُن کی اس کوشش کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنائے آمین اس جلد کی پروف ریڈنگ میں احقر کے ساتھ حافظ محمد اشرف گجراتی متعلم مدرسہ نصرۃ العلوم نے حصہ لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وّاٰلہ واصحابہٖ اجمعین

احقر محمد فیاض خان سواتی

مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲۹ رجب ۱۴۱۴ھ - ۱۲ جنوری ۱۹۹۴ء

سُورۃ

الفرقان

(مکمل)

سُورَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعٌ وَّسَبْعُونَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوعَاتٍ

سورۃ فرقان مکی ہے۔ اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝۱ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝۲ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

ترجمہ:۔ بڑی برکت دینے والی ہے وہ ذات جس نے اتارا ہے فرقان اپنے بندے پر تاکہ ہو جائے وہ تمام جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ① وہ اللہ جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی۔ اور نہیں بنایا اس نے بیٹا اور نہیں اس کے لیے کوئی شریک بادشاہی میں۔ اور پیدا کیا اس نے

ہر چیز کو۔ پس اندازہ ٹھہرایا ہے اس کا ٹھیک طریقے پر اندازہ ٹھہرانا (۲) اور بنا لیے ہیں ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود۔ نہیں پیدا کرتے وہ کسی چیز کو بلکہ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور نہیں مالک وہ اپنی جانوں کے نقصان اور نفع کے۔ اور نہیں مالک وہ موت اور حیات کے اور نہ دوبارہ زندہ کرنے کے (۳)

نام و نزول

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الفرقان ہے جو کہ اس کی پہلی آیت میں آمدہ لفظ سے ماخوذ ہے۔ فرقان قرآن کریم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ قرآن کا معنی پڑھی جانے والی کتاب جب کہ فرقان کا معنی حق و باطل میں فیصلہ کن کتاب ہے۔ اس سورۃ میں چونکہ قرآن پاک کی عظمت و بزرگی اور اس کے منزل من اللہ ہونے کا بیان بھی ہے۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ الفرقان رکھا گیا ہے۔ اس سورۃ کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۲۹۲ الفاظ اور ۳۷۶۳ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط سورت

یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ جب کہ اس سے پہلی سورۃ نور مدنی تھی۔ ان دونوں سورتوں میں مکی اور مدنی بُعد ہونے کے باوجود ان کے بعض مضامین مشترک ہیں۔ مثلاً توحید کے دلائل، نبوت و رسالت کی صداقت اور اس پر معترضین کے اعتراضات کا رد اور وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال جیسے مضامین دونوں سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس سورۃ کے بعد سات مزید سورتیں مکی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان کے بعد سورۃ الاحزاب کا تعلق مدنی زندگی سے ہے۔ گویا یہ مسلسل آٹھ سورتیں مکی ہیں۔ ان مکی سورتوں کے مضامین بھی آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

یہ سورۃ مبارکہ ہجرت سے دو یا تین سال پہلے نازل ہوئی۔ بعض مفسرین اس کا زمانہ نزول سورۃ النساء سے آٹھ سال پہلے متعین کرتے ہیں۔ سورۃ نساء پانچ یا چھ ہجری میں نازل ہوئی تو اس لحاظ سے بھی اس سورۃ کا نزول ہجرت سے تقریباً تین سال پہلے بنتا ہے

واللہ اعلم۔

مضامین سورۃ

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ کے مضامین بھی زیادہ تر عقائد سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں توحید، رسالت، معاد اور قرآن پاک کی حقانیت و صداقت شامل ہیں۔ یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے عقائد اور اخلاق کی درستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ اگر عقیدہ ہی درست نہ ہو تو اللہ کی بارگاہ میں کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اگرچہ تمام مکی سورتوں میں یہی بنیادی مضامین بیان ہوئے ہیں تاہم بعض سورتوں میں کسی ایک مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری سورۃ میں دوسرے مضمون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر روئے سخن کفار کی طرف سے رسالت پر اعتراضات کی طرف ہے جن کا اللہ نے جواب دیا ہے اس سورۃ کا ایک خاص مضمون اللہ کے بندوں کے اوصاف ہیں جو اس کے آخری رکوع میں بیان ہوئے۔

بابرکت ذات خداوندی

ارشاد ہوتا ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْ بڑی برکت والی ہے وہ ذات یہ الفاظ بعض سورتوں کی ابتداء میں اور بعض کے آخر میں ذکر کیے گئے ہیں اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ و ارفع ذات کا ذکر کر کے اُس کی بعض صفات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ برکت کا عام فہم معنی زیادتی ہوتا ہے، تاہم امام رازیؒ اور تمام شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قسم کی زیادتی کا نام برکت نہیں بلکہ برکت ایسی زیادتی ہے جس میں تقدس کا مفہوم پایا جائے۔ گویا جس چیز میں معجزے یا کرامت کے طور پر اضافہ ہو جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ چیز برکت والی ہے۔ مسیح علیہ السلام نے اپنی والدہ کی گود میں کہا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دے کر بھیجا ہے، مجھے نبی بنایا ہے وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا (مریم - ۳۰) اور مجھے بابرکت بنایا ہے۔ دورانِ سفر پانی ختم ہو گیا۔ تمام صحابہؓ اور جانور مشقت میں پڑ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے پاس پانی کا ایک پیالہ

نہ تفسیر کبیر ص ۲۴۵، ۲۴۶ (فیاض)

ہوتو لے آئے۔ ایک پیالہ پانی آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اُس پیالے میں رکھا تو انگلیوں کے نیچے سے پانی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ پانی جوش مار کر اُوپر آ رہا تھا جسے تمام صحابہؓ نے پیا اونٹوں نے پیا حتیٰ کہ مشکیزے بھر لیے گئے۔ پھر آپ نے پیالے سے ہاتھ نکالا تو وہ اسی طرح پانی سے لبالب تھا۔ مطلب یہ کہ معجزے یا کرامت کے طور پر کسی چیز میں جو زیادتی آجاتی ہے اُسے برکت کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

تو فرمایا برکت دینے والی ذات خداوندی ہے۔ اگر ہم دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کی عمر میں برکت عطا کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص تھوڑی عمر میں بھی زیادہ کام انجام دے لے۔ بعض آدمیوں کی کارکردگی پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مختصر زندگی میں اتنے بڑے بڑے کام کیسے انجام دے لیے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ جب کسی کام میں برکت عطا کرتا ہے تو تمام مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور انسان بڑے سے بڑا کام بھی انجام دے جاتا ہے۔

کمالِ عبدیت

فرمایا برکت دینے والی ذات فقط ذاتِ خداوندی ہے اور یہ وہی ذات ہے نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ جس نے فیصلہ کن کتاب یعنی قرآن پاک نازل فرمایا۔ یہ کتاب اس لیے فرقان ہے کہ یہ حق و باطل جائز اور ناجائز، حلال اور حرام، صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کرتی ہے۔ یہ ہر چیز کو اس طرح کھول کر بیان کرتی ہے کہ کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اور یہ اُتاری ہے اُس نے اپنے بندے پر۔ اس بندہ سے مراد کامل اور اکمل بندہ حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ ہے کہ کمالِ عبدیت کی بنا پر جن کا لقب عبد ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِنَّمَا عَبْدُ اللّٰہِ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ لوگو! میں اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کے بندے اور اُس کے رسول کے نام سے ہی پکارا کرو۔ فرمایا عیسائیوں کی طرح میری ذات میں مبالغہ نہ کرنا کہ مجھے الوہیت کے درجے پر پہنچا دو اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ الغرض! عبدیت تمام کمالات میں سے بلند ترین

لے ترمذی مع شمائل ص۵۹۴ (فیاض)

کمال سے جس کے ساتھ اللہ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو موصوف فرمایا ہے۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فیصلہ کن کتاب کو اپنے کامل بندے پر نازل فرمایا۔

نزولِ قرآن کی غایت

فرمایا، اللہ نے اس فرقان کا نزول اس لیے فرمایا ہے لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا تاکہ وہ بندہ تمام اقوام عالم کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔ لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے خوفزدہ کرتے۔ انذار و تبشیر ہر نبی کے مشن میں شامل ہے۔ اللہ کا ہر پیغمبر اپنی امت کے اچھے کاموں پر انہیں خوشخبری دیتا ہے اور بُرے کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے۔ سورۃ یونس کی ابتدا میں ہے کہ کیا لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی کی طرف وحی کی ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرائے اور اہل ایمان کو خوشخبری سنائے أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (آیت-۲) کہ اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں سچائی کا پایہ ہوگا۔ اور جو کفر، شرک، نفاق اور معاصی کا ارتکاب کریں گے اُس کا نتیجہ خدا تعالیٰ کی گرفت کی صورت میں نکلے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ نزولِ کتاب کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا نبی لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے خبردار کرتے۔

توحیدِ خداوندی

آگے فرمایا، وہ ذاتِ خداوندی وہ ہے الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ ایسا پروردگار ہے وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا۔ نہ حقیقی اور نہ مجازی۔ حقیقی بیٹا باپ سے جنسیت میں مشابہ ہوتا ہے مگر خدا تعالیٰ جنسیت سے پاک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا حقیقی بیٹا ہونا محال ہے۔ ویسے بھی خدا تعالیٰ کا فرمان ہے لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (الاخلاص-۳) نہ اُس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے یعنی نہ اُس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی باپ۔ بعض لوگ مجازی بیٹے

کا تعلق ہے۔ قرآن نے عیسائیوں کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ (الانبیاء: ۲۶) وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے بیٹا بنایا ہے۔ حالانکہ وہ تو پاک ہے۔ کہتے ہیں اللہ نے مسیح علیہ السلام کو اختیارات تفویض کر دیے ہیں کہ وہ لوگوں کی حاجات پوری کریں۔ اللہ نے ان پر الوہیت کی چادر ڈال دی (استغفر اللہ) یہ سب شرکیہ عقائد ہیں، جن کی اللہ نے تردید فرمائی ہے

بہرحال فرمایا کہ اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ اور نہ ہی اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا اور اُسے ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کیا ہے لہذا کسی چیز میں کوئی نقص یا عیب نہیں ہے۔ بلاشبہ جو چیز اللہ کی تقدیر سے کائنات میں ظاہر ہوگی۔ اس میں کوئی نقص نہیں ہوگا بلکہ وہ بہترین شے ہوگی۔ بزرگوں کا مقولہ ہے جیسا کہ امام غزالی نے کہا ہے لَيْسَ اَبْدَعُ مِمَّا كَانَ کائنات میں جو چیزیں واقع ہوئی ہیں ان سے عمدہ کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی تقدیر سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اس نے ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک اندازہ کر رکھا ہے اور ہر چیز کی تقدیر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اس کے باوجود انسان کتنے ظالم ہیں وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں یہ غیروں کو بھی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں، دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔ اُن کو نافع و ضار سمجھ کر ان کی نذریں دیتے ہیں۔ کوئی فرشتوں اور جنات کی پوجا کرتے ہیں اور کوئی قبروں والے اولیاء اللہ سے مرادیں پوری کرواتے ہیں۔ گویا لوگوں نے شرک کے مختلف راستے بنا رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ دوسروں کو خدا کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے معبود جبری سفارش

کر کے اُن کے کام کروا دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کی سفارش کو رد نہیں کرتا۔ بعض لوگوں نے یہ باطل عقیدہ بنا رکھا ہے کہ ہم اِن کو راضی کریں گے تو اللہ ہم سے راضی ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کی نذر و نیاز کرنا ضروری ہے۔ بعض اپنے اور خدا تعالیٰ کے درمیان واسطہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ہماری تو وہاں تک رسائی نہیں، درمیان میں کوئی ایسی ہستی ضروری ہے جو ہمیں وہاں تک پہنچا دے۔ یہ سب کفریہ اور شرکیہ عقائد ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔

صفتِ تخلیق

اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں حالانکہ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وہ کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہیں وَهُمْ يُخْلَقُونَ اور وہ تو خود خدا تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ (آیت ۱۷) بھلا پیدا کرنے والی ہستی اور نہ پیدا کرنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں کائنات کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے۔ انسان، روح، جبرائیل، شیاطین سب مخلوق ہیں اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر - ۶۲) ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ جو پیدا نہیں کر سکتے وہ الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں، لہٰذا غیر اللہ کو معبود سمجھ کر اُن سے حاجت براری کرانا کتنی حماقت کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ صفتِ تخلیق بھی اللہ کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتی۔

نفع نقصان کا اختیار

فرمایا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی حالت تو یہ ہے وَلَا يَمْلِكُونَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وہ تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں مگر لوگ پھر بھی اُن کو حاجت روا اور مشکل کشا تسلیم کرتے ہیں وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وہ تو موت و حیات کے مالک بھی نہیں ہیں نہ کسی کو زندگی بخش سکتے ہیں اور نہ کسی کو موت دے سکتے ہیں یہ اختیارات بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کے پاس ہیں۔ وَلَا نُشُوْرًا اور یہ

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ قیامت والے دن اللہ تعالےٰ ہی سب کو فنا کرے گا اور پھر وہی سب کو دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب کے لیے اپنے سامنے لا کر کھڑا کرے گا۔ اس کے سوا اور کون سی ذات ہے جو یہ کام کر سکے۔ اور ظاہر ہے کہ جو ذات مذکورہ امور میں سے کوئی کام بھی کرنے پر قدرت نہیں رکھتی، وہ الٰہ کیسے ہو سکتی ہے؟ معبودِ برحق تو وہی ہے جو خالق مالک مختار، نافع، ضار ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے نفع پہنچاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نقصان پہنچاتا ہے، وہی مشکلیں حل کرتا ہے، اُس کے علاوہ کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ لہٰذا اُس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہو سکتا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ
عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ﴿۴﴾ وَ
قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ
بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿۵﴾ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۶﴾
وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي
فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ
نَذِيرًا ﴿۷﴾ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ
يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا
رَجُلًا مَسْحُورًا ﴿۸﴾ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ
فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿۹﴾

ترجمہ :۔ اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے
یہ (قرآن) مگر جھوٹ جس کو اس شخص نے گھڑ لیا ہے اور
مدد کی ہے اس کی اس پر دوسرے لوگوں نے ۔پس تحقیق
لائے ہیں یہ لوگ ظلم اور جھوٹ ﴿۴﴾ اور کہا ان لوگوں نے کہ
یہ قصے کہانیاں ہیں پہلے لوگوں کی جن کو اس نے لکھ لیا ہے
پس یہ پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے صبح اور پچھلے پہر ﴿۵﴾

آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر) اتارا ہے اس کو اُس ذات نے جو جانتا ہے پوشیدہ چیزوں کو آسمانوں میں اور زمین میں۔ بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے (۶) اور کہا ان لوگوں نے کہ کیا ہے اس رسول کو یہ کھانا کھاتا ہے اور چلتا ہے بازاروں میں کیوں نہیں نازل کیا گیا اس کی طرف کوئی فرشتہ۔ پس ہوتا وہ اس کے ساتھ ساتھ ڈرانے والا (۷) یا کیوں نہیں اتارا گیا اس کی طرف خزانہ یا کیوں نہیں اس کا باغ کہ یہ کھاتے اس میں سے۔ اور کہا ظلم کرنے والوں نے کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے (۸) آپ دیکھیں کہ کس طرح انہوں نے مثالیں بیان کی ہیں آپ کے لیے۔ پس یہ گمراہ ہو گئے۔ پس یہ نہیں طاقت رکھتے سیدھے راستے کی طرف آنے کی (۹)

دو آیات

برکات دینے والی ذات اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نازل فرمایا ہے جو کہ ایک فیصلہ کن کتاب ہے۔ اس کے نزول کی غایت یہ ہے کہ اللہ کا کامل ترین بندہ اور اُس کا آخری رسول اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ڈرانے والا بن جائے۔ گزشتہ درس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی آسمان و زمین پر محیط سلطنت کا ذکر بھی ہو۔ اللہ نے مشرکین کا شکوہ بیان کیا کہ وہ اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے اختیار ہیں۔ نہ تو وہ کوئی چیز تخلیق کر سکتے ہیں اور نہ نفع نقصان کے مالک ہیں۔ یہ کس قدر ظلم و زیادتی کی بات ہے۔

قرآن پاک پر حملہ

سورۃ کے اس ابتدائی تمہیدی بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی طرف سے قرآنِ پاک پر کیے جانے والے اعتراضات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا یہ کافر لوگ کہتے ہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ یہ تو

محض ایک جھوٹ ہے۔ جسے اس رسول نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے کفار و مشرکین کی طرف سے ایسے بیہودہ اعتراضات کا ذکر سورۃ یونس اور بعض دیگر سورتوں میں بھی موجود ہے۔ وہ لوگ قرآن پاک کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں مثلاً ایک مقام پر فرمایا قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ (ہود۔ ۳۵) اے پیغمبر! آپ ان کو بتا دیں کہ اگر تمہارے بقول اس قرآن پاک کو میں نے گھڑ لیا ہے تو پھر اس کا گناہ بھی مجھ پر ہی ہوگا۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ البتہ تم اپنی فکر کرو کہ تم کیا کرتے ہو۔ دوسری جگہ فرمایا کہ تم اس قرآن کو من گھڑت کہتے ہو فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (یونس۔ ۳۹) تم اس جیسی ایک سورۃ تو بنا کر لاؤ۔ پھر پتہ چل جائے گا کہ کیا واقعی یہ انسان کا کام ہے یا حقیقت میں خدا تعالیٰ کا کلام ہے جس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جسے اس نے اپنے علم اور مشیت کے ساتھ نازل فرمایا ہے اِفک گھڑی ہوئی بناوٹی بات کو کہتے ہیں کسی پر جھوٹ کا طومار باندھ دیا گیا ہو۔ پچھلی سورۃ نور میں واقعہ افک گزر چکا ہے جس میں منافقوں نے حضرت عائشہ پر افترا باندھا تھا اور پھر اس کی خوب تشہیر بھی کی تھی۔ اسی طرح قرآن پاک کے متعلق بھی یہ لوگ کہتے تھے کہ محض جھوٹ ہے، من گھڑت ہے۔ اس کو جمع کرنے میں وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ بعض دوسرے لوگوں نے اللہ کے نبی کی مدد کی ہے۔ اس کو بعض اوقات یہود و نصاریٰ کی طرف منسوب کرتے تھے کہ حضور علیہ السلام ان سے مل کر یہ باتیں سیکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس پرانی کتابوں کا کچھ علم موجود تھا بعض اس کو ایرانی، رومی، اور بعض قدیم عراقی زبان بولنے والے غلاموں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ کہ یہ لوگ اللہ کے نبی کو کچھ باتیں بتاتے ہیں جنہیں آپ قرآن بنا کر پیش کر

معالم التنزیل ص۹۹ ج ۳ (فیاض)

دیتے ہیں۔ جبر، یسار، عداس وغیرہ بعض غلام تھے مگر وہ تو بیچارے عربی زبان سے ہی ناواقف تھے ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ فصیح و بلیغ عربی میں ایسا کلام پیش کریں جس کی نظیر عربی زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب بھی نہ پیش کر سکیں۔ فرمایا ان لوگوں کا اعتراض بالکل لغو ہے حقیقت میں فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا یہ مشرک لوگ بہت بڑا ظلم اور جھوٹ لائے ہیں جو قرآن کو خود ساختہ کلام کہتے ہیں یہ بڑے بے انصاف لوگ ہیں جو صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔

پھر فرمایا، وہ یہ بھی کہتے ہیں وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ اِكْتَتَبَهَا جنہیں اس شخص نے لکھ لیا ہے اور پھر ہمیں سناتا رہتا ہے۔ ظالم مشرک حضور علیہ السلام سے کہتے کہ تم ہمیں اقوام عاد اور ثمود کے قصے سناتے ہو، آؤ ہم تمہیں ایران کے رستم اور اسفندیار کے افسانے سناتے ہیں، وہ تمہارے افسانوں سے بھی دلچسپ ہیں (العیاذ باللہ) بہر حال انہوں نے کہا کہ یہ پہلے لوگوں کے واقعات ہیں فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا جو اس شخص پر صبح و شام پڑھے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ انہیں وحی الٰہی کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اللہ کی طرف سے جواب

اس بیہودہ اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ یہ قرآن پاک نہ عربوں کا بنایا ہوا ہے اور نہ عجمیوں کا وضع کردہ ہے بلکہ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ تو اس ذات پاک کا نازل کردہ ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز کو جانتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ذہنیت کو بھی جانتا ہے اور ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کی تہذیب و تربیت کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا نَزَّلَ الْكِتٰبَ

لہ معالم التنزیل صہ۱۹ و تفسیر طبری صہ ۱۸۶ (فیاض)

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (الاعراف ۔ ۱۹۶) یہ کلام خدا تعالیٰ نے ہی نازل
کیا ہے اور نیکوکاروں کی سرپرستی اور کارسازی بھی وہی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خالقِ
فطرت ہے، وہ علیم کل ہے، لہذا انسان کی ضروریات اور قوتوں کی احتیاج
بھی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ اپنی کمال قدرت سے ایسے احکام اور
قانون نازل فرماتا ہے جو انسانوں کی فطرت و ضرورت کے عین مطابق ہوتے
ہیں۔ سورۃ النساء میں فرمایا ہے اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (آیت ۱۶۶) اللہ نے
اس کلام کو اپنے علم کی روشنی میں نازل فرمایا ہے۔ یہ من گھڑت نہیں ہے
بلکہ یہ تو تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الواقعہ ۸۰) تمام جہانوں
کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا بے شک وہ ذات بڑی بخشش دینے والی اور نہایت مہربان ہے
وہ ایک طرف تو ظالم اور جھوٹے لوگوں کو بسا اوقات مہلت دیتا رہتا ہے اور
دوسری طرف اس کی بخشش و مغفرت بھی ایک نعمت ہے۔ وہ ایسی باتیں کرنے
والوں کی فوراً گرفت نہیں کر لیتا ہے مگر یہ اس کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ اس
نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب نازل فرمائی ہے
جس میں اسرار و رموز اور علوم و معارف کے خزانے ہیں۔

پیغمبر خدا پر ایراد

کفار کا پہلا اعتراض تو قرآن حکیم پر تھا کہ یہ نعوذ باللہ من گھڑت ہے
اب دوسرا اعتراض پیغمبر علیہ السلام کی ذات پر کیا۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا
الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ کہنے لگے
یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ان کا زعم
یہ تھا کہ جس نبی میں لوازماتِ بشریہ پائے جائیں، وہ رسول نہیں ہو سکتا۔ وہ
لوگ بشریت اور رسالت کو دو متضاد چیزیں سمجھتے تھے، کہتے تھے۔ ہماری
طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے، مگر رسالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ لوگوں کی
پرانی بیماری ہے۔ قومِ ثمود نے بھی یہی کہہ کر صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔

بَشَرٌ مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (القمر ۲۴) کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی اتباع کریں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی کافر و مشرک یہی کہتے تھے کہ یہ تو ہمارا جانا پہچانا انسان ہے ہم اس کو کیسے رسول تسلیم کریں۔ اگر اللہ کسی کو رسول بنا کر بھیجتا تو وہ کوئی فرشتہ ہوتا جو نہ کھاتا پیتا، نہ اس کے بیوی بچے ہوتے اور نہ دیگر انسانی لوازمات اس میں پائے جاتے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انبیاء میں پائے جانے والے لوازماتِ بشری ہی ان کی اقوام کے لیے پردہ بن گئے۔ انہوں نے اسے خلافِ نبوت سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں چونکہ انسانوں کی اصلاح مطلوب تھی، اس لیے اللہ نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہ مضمون اللہ نے قرآن پاک میں مختلف عنوانات سے وسیع پیمانے پر بیان فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو رسول بنا کر زمین پر بھیج دیتا تو عام انسان اس سے کیسے مستفید ہو سکتے تھے؟ انسان کسی غیر جنس سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے انسانوں کی ہدایت کے لیے جن شخصیات کو منتخب فرماتا ہے، ان کو امتیاز بخشتا ہے۔ وہ معصوم عن الخطا اور اخلاقی لحاظ سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ لوگ امت کے لیے بطور نمونہ ہوتے ہیں، مگر ہوتے انسان ہی ہیں۔ ان میں تمام لوازماتِ بشری پائے جاتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح انہیں بھی بھوک پیاس لگتی ہے، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔ ان پر بیماری اور تندرستی بھی آتی ہے۔ ان کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں اور یہ چیزیں منصبِ نبوت کے خلاف نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کے جسم مبارک کو ہاتھ سے چھو کر کہا کہ حضور! آپ کو تو شدید بخار ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری نسبت مجھے دگنا بخار آتا ہے۔ ابن مسعودؓ نے

لہ [illegible] (فیاض)

عرض کیا حضور! پھر آپ کو اجر بھی تھوڑا ملتا ہے فرمایا، یہ بھی درست ہے۔
غرضیکہ پیغمبر دوسرے لوگوں کی طرح زخمی بھی ہوتا ہے، وہ ہنستا اور روتا بھی ہے
اس کی بیوی بھی ہوتی ہے کسی کی صرف بچیاں اور کسی کے صرف بچے اور کسی
کے بچے اور بچیاں دونوں ہوتے ہیں۔ اور وہ نوعِ انسانی سے خارج نہیں ہوتے
علمِ کلام کی کتابوں میں نبی کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے هُوَ اِنْسَانٌ
بَعَثَهُ اللّٰهُ لِتَبْلِيْغِ مَآ اَوْحَاهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ نبی ایک انسان
ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اس چیز کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے جو اس
کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ نوعِ انسانی کو ایک انسان ہی ہدایت
دے سکتا ہے۔ انسان کسی غیر جنس سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے۔

نبی کی امتیازی حیثیت

تمام انبیاء و رسل بھی انسانی لوازمات ہونے کے باوجود عام انسانوں پر انہیں
دینی اور اخلاقی اعتبار سے امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ نبی عام انسانوں کی نسبت معصوم
ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے اُسے گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اُس سے کوئی
گناہ سرزد نہیں ہونے دیا جاتا۔ البتہ صحابہ کرامؓ اولیاء اور علماء گناہ سے محفوظ
ہوتے ہیں معصوم نہیں ہوتے۔ پھر وحی الٰہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جو انبیاء کو
حاصل ہوتا ہے۔ کسی غیر نبی پر وحی نہیں آتی۔ انبیاء میں کامل درجے کی عبودیت
ہوتی ہے۔ وہ کمال درجے کے عبادت گزار اور کمال اخلاص کے مالک ہوتے
ہیں۔ اُن کے اعمال میں بڑا وزن ہوتا ہے، البتہ ہوتے انسان ہی ہیں۔ اُن
پر بھی زندگی اور موت اسی طرح وارد ہوتی ہے۔ جیسے دوسرے انسانوں پر ہوتی ہے
عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو اس لیے خدا کا بیٹا کہہ دیا کہ آپ کا باپ
نہیں ہے۔ اگر عقیدۂ ابنیت کا یہی معیار ہے تو پھر وہ آدم علیہ السلام کے
متعلق ایسا عقیدہ کیوں نہیں رکھتے جن کا نہ باپ ہے اور نہ ماں ہے ابراہیم
علیہ السلام اور دیگر انبیاء کو عیسائی بھی انسان مانتے ہیں مگر مسیح علیہ السلام کو الوہیت
کا درجہ دینے کے لیے انہیں خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ یہ کتنی زیادتی کی بات ہے، وہ اللہ

کے بندے اور انسان تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق جس طریقے سے چاہا اُن کو پیدا فرما دیا۔

بازاروں میں جانا

مشرکوں کا عقیدہ یہ تھا کہ بازاروں میں چلنا پھرنا عیب ہے اسی لیے تو وہ بازاروں میں جانے والے رسول کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودا سلف لانے یا کسی اور اچھے کام کے لیے بازار میں جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ مساجد کی فضیلت بازاروں کے مقابلے میں تو اپنی جگہ مسلم ہے۔ مسجدوں میں اللہ کی عبادت ہوتی ہے انہیں صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ جب کہ بازاروں میں بعض اوقات دھوکہ، فریب وعدہ خلافی، ماپ تول میں کمی بیشی کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم جائز کام کے لیے بازار جانا ممنوع نہیں ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے شاگرد سے فرمایا، چلو بازار چلیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے کوئی سودا سلف تو خریدنا نہیں، پھر وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ آپ نے فرمایا، بیوقوف! ہم بازار جا کر لوگوں کو سلام کرتے ہیں تو ہمیں نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنے سے تیس نیکیاں تو حاصل ہو گئیں۔ چلو چلتے ہیں۔ واپس آکر پھر درس و تدریس میں مصروف ہو جائیں گے۔ غرضیکہ نیک کام کے لیے بازار جانا کوئی عیب کی بات نہیں۔ البتہ بلا ضرورت یا کسی غلط مقصد کے لیے بازار جانا یقیناً گناہ کا باعث ہوگا۔ اور غلط کام اگر مسجد میں بھی کرے گا تو وہ غلط ہی ہوگا۔ بلکہ بازار کی نسبت دگنا گناہ لازم آئے گا۔

معترضین کا تصورِ رسالت

کفار و مشرکین نبی کی نبوت و رسالت پر یہ اعتراض بھی کرتے تھے لَوْ لَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا اللہ کے نبی کے ساتھ ایک فرشتہ کیوں نہیں اترا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہے اور لوگوں کو بتلائے کہ یہ اللہ کا رسول ہے۔ نیز وہ لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرائے اس اعتراض کا جواب اللہ نے سورۃ الانعام میں دیا ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ

حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام - ۱۲۴) وہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کو کہاں رکھ رہا ہے۔ وہ انسانوں کی استعداد و صلاحیت کے مطابق ہی منصب رسالت کے لیے انتخاب کرتا ہے۔ نبوت و رسالت کسی کو خواہش اور کوشش سے نہیں ملتی بلکہ یہ تو اللہ کی مہربانی ہوتی ہے۔ فرمایا اگر ان کی خواہش کے مطابق ہم کسی فرشتے کو نبی بنا کر بھیجتے تو اس کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو فرشتہ انسانی شکل میں آتا یا اپنی اصلی شکل میں۔ اگر وہ انسانی شکل میں آتا تو پھر بھی وہی اعتراض ہوتا کہ یہ انسان ہے ہم اس کی پیروی کیوں کریں؟ اور اگر فرشتہ اپنی اصلی شکل میں نازل ہوتا تو انسان اس کی تاب نہ لا سکتے اور فوراً ہلاک ہو جاتے۔ لہٰذا انسانوں کا فرشتوں سے مستفید ہونا کسی طور پر ممکن نہیں۔ انسانوں کی راہنمائی کے لیے انسان کا رسول ہونا ہی قابلِ عمل ہے۔

کفار و مشرکین کہنے لگے کہ اگر نبی کے ساتھ فرشتہ نازل نہیں ہوا تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ یا اس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا۔ اللہ کا رسول مالدار آدمی ہوتا۔ اس کے نوکر چاکر ہوتے، عالیشان مکان ہوتا تو پھر بھی ہم سمجھتے کہ یہ اللہ کا رسول ہے۔ مکے والوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم اس یتیم کو کیسے نبی تسلیم کر لیں۔ اگر وحی کا نزول مکے یا طائف کے کسی بڑے سردار پر ہوتا تو ہم مان بھی لیتے۔ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا پیتا۔ پھر بھی ہم کہتے کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہے، وحی کا نزول اس پر ممکن ہے۔ مگر نبوت کے اس دعویدار کے پاس تو کچھ بھی نہیں، لہٰذا ہم اس کی رسالت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے برعکس وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ان ظالم لوگوں نے کہا کہ تم تو ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کر رہے ہو۔ اس پر تو جادو کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے (نعوذ باللہ) اس کے حواس درست نہیں ہیں۔ تم اس کے پیچھے کیسے لگ رہے ہو؟ اس قسم

کی بیہودہ باتوں کے ذریعے منصب رسالت پر اعتراض کرتے تھے۔

معترضین کی گمراہی

اللہ نے فرمایا اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ اے پیغمبر! آپ دیکھیں کہ ان بدبختوں نے آپ کے لیے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں۔ یہ لوگ اپنے باطل عقائد کی وجہ سے فَضَلُّوْا گمراہ ہو چکے ہیں۔ اور گمراہی میں اس قدر دور جا پڑے ہیں فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا کہ راہ راست پر چلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یہ اسی زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ انسان رسول نہیں ہو سکتا گویا بشریت منصب نبوت کے منافی ہے۔ یہ بدنصیب لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اپنے نبی کو کتنا کمال اور شرف بخشا ہے۔ اس کا اخلاق کتنا پاکیزہ ہے اور اس کا کردار کتنا بلند ہے۔ نبی کے اخلاق و کردار پر مخالف ترین آدمی کبھی بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ لوگ دنیا کے مال و دولت کو لازمہ نبوت سمجھتے ہیں جو کہ بالکل غلط اور گمراہی کا باعث ہے۔

آج بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہدایت کو مال و دولت کے پیمانے سے ماپتے ہیں۔ یہی دولت مندی ہے جو انسانوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ دین اسلام کی ابتداء غریبوں سے ہوئی اور آخر میں بھی یہ غریب طبقے میں سمٹ کر رہ جائے گا۔ اکثر نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگ ہی ہدایت قبول کرتے ہیں اور دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے لوگ کم ہی اس طرف آتے ہیں۔ البتہ جب مجبور ہو جائیں تو پھر ان کا دین کی طرف آنا ممکن ہو جاتا ہے ابوسفیانؓ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ بیس سال تک مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رہے مگر فتح مکہ پر جب کوئی صورت باقی نہ رہی تو اسلام قبول کر لیا۔ تاہم بعد میں ان کی حالت بہت اچھی ہو گئی اور نبی کے ساتھ کمال درجے کی محبت کا ثبوت دیا۔

ے مسلم صفحہ ۸۴ ج ۱ (فیاض)

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَيَجْعَلْ لَّكَ
قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ
بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ
سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا
مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا
الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ
اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ
كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ
خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ:- بڑی برکت دینے والی ہے وہ ذات اگر چاہے
تو بنا دے آپ کے لیے بہتر اس سے باغات جن کے
سامنے نہریں بہتی ہوں، اور بنا دے آپ کے لیے محلات ﴿۱۰﴾
بلکہ جھٹلایا ہے ان لوگوں نے قیامت کو اور تیار کی ہے
ہم نے اس شخص کے لیے جس نے جھٹلایا قیامت کو
بھڑکتی ہوئی آگ ﴿۱۱﴾ جب وہ (دوزخ) دیکھے گی ان کو دور
جگہ سے تو سنیں گے اس کے لیے جوش اور آواز ﴿۱۲﴾

جب وہ ڈالے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں جکڑے ہوئے تو پکاریں گے وہاں پر ہلاکت کو (۱۳) (کہا جائے گا) مت پکارو آج کے دن ایک ہلاکت کو، بلکہ پکارو بہت سی ہلاکتوں کو (۱۴) (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے، کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشہ رہنے کا باغ جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے یہ اُن کا بدلہ ہوگا اور لوٹ کر جانے کی جگہ (۱۵) اُن کے لیے اُن باغات میں ہوگا جو چاہیں گے، اور ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ ہے یہ تیرے پروردگار پر وعدہ طلب کیا ہوا (۱۶)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں کفار ومشرکین کی طرف سے قرآن پاک کی حقانیت کے متعلق اعتراض تھا کہ یہ خود ساختہ ہے اور پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں بلکہ خدائے علیم وخبیر کا نازل کردہ ہے۔ اُن کا دوسرا اعتراض رسالت پر تھا کہ یہ کیسے نبی ہوسکتا ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا ہے۔ کہتے تھے کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیئے تھا جو اس کی تصدیق کرتا اور لوگوں کو اس کے برے انجام سے ڈراتا۔ نیز یہ ہے کہ پیغمبر کے خزانے اور باغات ہونے چاہئیں۔ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ لوازمات بشریت رسالت ونبوت کے مانع نہیں ہیں۔ رسول بھی انسان ہی ہوتا ہے جو کھاتا پیتا اور تمام بشری تقاضے پورے کرتا ہے۔ البتہ وہ معصوم عن الخطا اور تمام امت سے افضل ہوتا ہے۔ نبی کی مالی کمزوری بھی نبوت کے منافی نہیں ہوتی کیونکہ مال و دولت رسالت کا لازمی جزو نہیں ہے۔ اب آج کے درس میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو دنیا کا مال ومتاع اور باغات ومحلات بھی عطا کرسکتا ہے۔ مگر متقیوں کو آخرت میں ملنے والے انعامات دنیا کے لوازمات سے بہت بہتر اور دائمی ہوں گے۔

نبی کے لیے دنیوی لوازمات

ارشاد ہوتا ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ بڑی برکت دینے والی ہے ذات تعالیٰ وہ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ کہ اگر وہ چاہے تو بنا دے آپ کے لیے اس سے بہتر مطالب یہ کہ کفار و مشرک لوگ تو آپ کے لیے باغات، کوٹھی، خزانہ اور نوکر چاکر کا مطالبہ کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ تو ان چیزوں سے کہیں زیادہ آپ کو عطا کرنے پر قادر ہے۔ فرمایا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وہ ایسے باغات عطا کر سکتا ہے جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں۔ صرف باغات ہی نہیں بلکہ وَیَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا وہ آپ کو من پسند محلات بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔ وہ نہ صرف جنت میں عالیشان محل دے گا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی عطا کرنے پر قادر ہے۔ معترضین کا اعتراض بیہودہ ہے کہ نبی کے پاس مال و دولت، زر و جواہر، باغات اور مکانات ہونے چاہئیں۔ نبوت و رسالت کے لیے یہ چیزیں ضروری نہیں ہیں یہ تو انعامی چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی حکمت کے مطابق عطا کرتا ہے۔ نبی کے لیے تو علم و عصمت، پاکیزگی اور اعلیٰ اخلاق و اطوار کی ضرورت ہے جو اسے اس دنیا میں میسر آتے ہیں۔ تاہم اللہ کے نبی دنیا میں مصائب و تکالیف برداشت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور آخرت میں بہتر اجر کے امیدوار ہوتے ہیں۔ صحیح حدیث میں امام احمد اور امام ترمذی نے ابوامامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پیشکش کی ان یجعل لی بطحاء مکۃ ذھبا کہ اگر میں چاہوں تو میرے لیے مکہ کی پتھریلی زمین سونے کی بنا دی جائے۔ میں نے اس پیشکش کے جواب میں عرض کیا، پروردگار! مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں اَشْبَعُ یَوْمًا وَّاَجُوْعُ یَوْمًا میں ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دوسرے دن بھوکا رہوں۔ اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی

---

[1] معالم التنزیل ص ۱۹ • تفسیر خازن ص ۹۴

کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جنہیں امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ جب میں بھوکا ہوں گا تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ تو تیرے سامنے گڑگڑاؤں گا اور جب پیٹ بھرا ہوا ہوگا حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ تو تیری تعریف بیان کروں گا اور تیرا شکر ادا کروں گا۔ بہرحال مجھے دنیا کے اِن خزانوں اور مال متاع کی ضرورت نہیں۔

حضور علیہ السلام کی انکساری

حضرت عائشہؓ سے روایتؓ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک موقع پر ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور کہا کہ پروردگار آپ کو سلام کہتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں اِنْ شِئْتَ نَبِيًّا عَبْدًا اَوْ شِئْتَ نَبِيًّا مَلِكًا یعنی اگر آپ چاہیں تو نبی اور اللہ کے عبادت گزار بن جائیں یا چاہیں تو نبی اور بادشاہ ہوں۔ فرماتے ہیں کہ پاس ہی جبریل علیہ السلام بھی کھڑے تھے، انہوں نے مجھے اشارے سے کہا کہ آپ تواضع والی بات پسند کریں چنانچہ میں نے اُس فرشتے سے کہا کہ میں نبوت اور عبدیت کا طلبگار ہوں مجھے بادشاہت کی ضرورت نہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کھانا تناول فرماتے تھے تو نہایت عاجزی کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ آپ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔ آج کل کے طریقے کے مطابق نہ کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور نہ کھڑے ہو کر بلکہ انکساری کے ساتھ بیٹھ کر۔ آپ نے فرمایا اٰكُلُ كَمَا يَاْكُلُ الْعَبْدُ میں تو اس طرح کھانا کھاتا ہوں جس طرح اللہ کا کوئی بندہ کھانا کھاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آپ نے حضور علیہ السلام کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشان دیکھے تو آبدیدہ ہو کر عرض کیا حضور! قیصر و کسریٰ کے بڑے بڑے نافرمان تو عیش و عشرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں جب کہ آپ اللہ کے برگزیدہ رسول ہو کر عسرت کا وقت گزار رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے پُرجوش انداز میں فرمایا اَفِيْ هٰذَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اے ابن خطاب (عمرؓ) آپ

له معالم التنزیل ص ۳/۹ وخازن ص ۴/۵۲ (فیاض)

اسی قسم کے تصورات میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان آرام پسند لوگوں کی حالت تو یہ ہے عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي حَيَاتِهِ الدُّنْيَا ان کو ساری بھلائیاں اور عیش و آرام دنیا میں ہی دے دیا گیا ہے جبکہ آخرت میں یہ لوگ تہی دامن ہوں گے۔ تو کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں کہ ہم اہل ایمان کو بہتری کی ساری چیزیں آخرت میں نصیب ہوں اور یہ لوگ وہاں محروم رہیں؟ آخرت میں ان لوگوں کے پاس کفر و شرک اور معاصی کے پلندوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ کو بعد میں اللہ نے بڑا مال و دولت بھی دیا مگر وہ ہمیشہ اس خیال میں متفکر رہتے تھے کہ کہیں آخرت کے ہمارے اجر بیں کمی نہ آجائے۔ حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کثیر المال صحابی تھے اور بڑے فیاض بھی تھے۔ ایک موقع پر آپ کے سامنے بہترین گوشت کے ساتھ کھانا آیا تو دیکھ کر رونے لگے حتیٰ کہ آپ سے کھانا ہی نہ کھایا گیا۔ کہنے لگے کہ اتنی اچھی نعمتیں کھالوں تو قیامت والے دن خدا تعالیٰ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ میں نے تمہیں ساری نعمتیں دنیا میں ہی دے دی تھیں اور اس طرح ہم آخرت کے اجر سے محروم نہ رہ جائیں۔

وقوعِ قیامت کی تکذیب

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر علیہ السلام! یہ کفار و مشرکین آپ کی کسی کمزوری یا خامی کی وجہ سے تکذیب رسالت نہیں کرتے بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ بلکہ درحقیقت انہوں نے وقوعِ قیامت کو جھٹلایا ہے جو شخص قیامت کا انکار کرتا ہے وہ احساسِ ذمہ داری سے قطعاً محروم ہوتا ہے، کفر و شرک کی بنیاد عام طور پر احساسِ ذمہ داری سے محرومی ہوتی ہے۔ جب کسی شخص کو یہ وہم ہو جائے کہ اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، کوئی قیامت نہیں آئے گی، نہ کوئی حساب کتاب کی منزل ہوگی۔ اور نہ جنت دوزخ کا کوئی تصور ہے تو پھر انسان چھوٹ بھاگتا ہے۔ وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ جو چاہے آزادی کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ نہ اُسے اپنے کسی قول کا خیال

آتا ہے اور نہ کسی عمل کی ذمہ داری کی طرف دھیان جاتا ہے۔ فرمایا ایسے مادر پدر آزاد لوگوں کے لیے وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا جنہوں نے قیامت کا انکار کیا۔ بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے قیامت والے دن اُن کا یہی ٹھکانا ہوگا۔ جس قیامت کی تکذیب کرتے تھے وہ ان کے لیے ابدی سزا کا موجب بن جائے گی۔

فرمایا اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ جب وہ دوزخ ان کو دُور سے دیکھے گی سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا تو یہ لوگ اُس کے جوش اور چلانے کی آواز کو سنیں گے۔ یہ اتنی سخت اور غضبناک آواز ہوگی کہ دور سے ہی ناقابل برداشت ہوگی۔ دوزخ کے جوش اور غیظ و غضب کے متعلق ابو وائلؓ کہتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ایک بزرگ صحابی ربیعؓ بھی ہمراہ تھے۔ راستے میں لوہار کی دکان آئی۔ جہاں لوہا آگ میں تپایا جا رہا تھا۔ اُس بھٹی کو دیکھ کر حضرت ربیعؓ کا حال تو خراب ہو گیا۔ عذاب الٰہی کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ اور قریب تھا کہ آپ بیہوش ہو کر گر پڑیں۔ پھر آگے نہر کے کنارے پر ایک آتشیں بھٹی کو جوش مارتے ہوئے دیکھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی زبان سے یہ آیت نکلی اِذَا رَاَتْهُمْ ... تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا پھر آپ نے پلٹ کر دیکھا تو حضرت ربیعؓ پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ وہ اس خیال میں مستغرق ہو گئے کہ جب دنیا کی اس بھٹی کا یہ جوش و خروش ہے تو جہنم کا جوش و خروش کس قدر تند و تیز ہوگا۔ حضرت ابن مسعودؓ دوپہر تک حضرت ربیعؓ کے پاس بیٹھے اُن کو ہوش میں لانے کا چارہ کرتے رہے مگر وہ ہوش میں نہ آئے اور اسی حالت میں ختم ہو گئے۔

فرمایا وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ جب دوزخی دوزخ میں کسی تنگ جگہ میں جکڑے ہوئے ڈالے جائیں گے

لے تفسیر مواہب الرحمن ص ۲۲ (بیان)

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا تو اُس وقت ہلاکت کو پکاریں گے اور کہیں گے ہائے! ہماری ہلاکت وتباہی۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ ابلیس کو دوزخ کی آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ وہ اس لباس کو اپنے سر پر رکھ کر چیخ و پکار کرے گا۔ اور ہائے ہلاکت، ہائے ہلاکت کرتا ہوا دوڑے گا۔ اس کے ساتھ اس کے ماننے والے بھی ہلاکت وتباہی کو پکاریں گے۔ پھر اُدھر سے جواب آئے گا لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا آج صرف ایک ہلاکت کو نہ پکارو بلکہ وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔ آج تمہیں ہر بدعملی کی علیحدہ علیحدہ سزا ملے گی، لہٰذا تم پر بہت سی بلائیں آئیں گی، اُن سب کو پکارو اور کسی ایک پر اکتفا نہ کرو۔

دوزخ میں تنگ جگہ میں ڈالنے کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ دوزخیوں کو کسی تنگ وتاریک مقام پر اس طرح ٹھونس دیا جائے گا جس طرح کسی پتھر میں کیل ٹھونک دیا جائے۔ اس کے علاوہ حشر کے دن کی تنگی بھی ہو گی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے دُعا میں سکھایا ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ دنیا اور قیامت کے دن کی تنگی سے پناہ چاہتا ہوں۔ حشر کی تنگی کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ لوگوں کو پاؤں ٹکانے کی جگہ بھی میسر نہیں آئے گی۔ اُوپر سے گرمی اور پسینہ ہوگا۔ اور پھر دوزخ کی تنگی کا تو کیا کہنا۔

متقیوں کے لیے انعامات

فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اَذٰلِكَ خَيْرٌ کیا یہ بات بہتر ہے کہ انسان جہنم کی تنگ و تاریک جگہوں میں جکڑ دیا جائے؟ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ یا ہمیشہ کا باغ بہتر ہے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننے والے اور کفر و شرک اور معاصی سے بچنے والے لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اپنی

ل مسند احمد ... در منثور ... ج ... ص ۳۶ و معالم التنزیل ص ۹ و قرطبی ... ۱۳ ابن ... ص ۲ (فیاض)

رحمت کے مقام جنت میں پہنچائے گا۔ اور پھر اُن کا بدلہ بھی یہ بتلایا کَانَتۡ لَهُمۡ جَزَآءً وَّمَصِيۡرًا اور یہی اُن کا بدلہ اور لوٹ کر جانے کی جگہ ہوگی۔ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ وہاں اُن کے لیے ہر وہ شے ہوگی جسے وہ چاہیں گے۔ وہاں اپنی من مانی مرادیں پائیں گے۔ اور یہ نعمتیں عارضی نہیں ہوں گی اور نہ ختم ہو جانے والی ہوں گی خٰلِدِيۡنَ جنتی لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ان کے انعامات بھی لازوال ہوں گے۔ وہاں سے نکلنے یا کسی نعمت کے ختم ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا پھر فرمایا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ یہ وعدہ اپنے ذمے لے رکھا ہے جو کہ پورا ہو کر رہے گا اور اللہ تعالےٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی رحمت کے مقام جنت میں ضرور پہنچائے گا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں دونوں مقامات کا ذکر کر دیا ہے۔ قیامت کے منکرین کے لیے دوزخ کی تنگ ترین وادیاں ہوں گی اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب ہوگا۔ اس کے برخلاف متقین کے لیے ہمیشہ رہنے کے باغات ہوں گے جہاں انہیں خواہش کے مطابق ہر چیز میسر ہوگی۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ نہ وہاں سے نکالے جائیں گے اور نہ کسی نعمت میں کمی آئے گی۔ اللہ نے انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ دیکھ لو اِن دونوں مقامات میں سے کون سا مقام بہتر ہے اور تم کس کو پسند کرتے ہو؟ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اپنے عقیدے اور عمل کی بنا پر جونسا مقام چاہو منتخب کر لو۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا ۢ بُوْرًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾

ترجمہ :- اور جس دن وہ (اللہ تعالیٰ) اکٹھا کرے گا اِن کو اور ان کو جن کی یہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے، پس فرمائے گا، کیا تم نے گمراہ کیا میرے اِن بندوں کو یا یہ خود رستے سے گمراہ ہو گئے ﴿١٧﴾ وہ کہیں گے، پاک ہے تیری ذات نہیں لائق ہمارے کہ ہم بنائیں تیرے سوا کسی کو کارساز. لیکن تو نے اِن کو فائدہ پہنچایا اور ان کے آباؤاجداد کو یہاں تک کہ

یہ تیری یاد کو بھول گئے ، اور تھے یہ لوگ ہلاک ہونے والے (۱۸)
پس بیشک انہوں نے جھٹلا دیا تم کو جو کچھ تم کہتے تھے ۔
پس نہیں طاقت رکھتے تم اپنے آپ سے تکلیف کو ہٹانے
کی اور نہ مدد کی ، اور جو ظلم کرے گا تم میں سے ، ہم چکھائیں
گے اُس کو بڑا عذاب (۱۹) اور نہیں بھیجے ہم نے تجھ سے
پہلے رسول مگر یہ کہ وہ البتہ کھانا کھاتے تھے ، اور چلتے تھے
بازاروں میں ۔ اور بنایا ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے
لیے آزمائش ۔ کیا تم صبر کرتے ہو ؟ اور تیرا پروردگار سب
کچھ دیکھتا ہے (۲۰)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے بطور وحی منزل من اللہ ہونے کا ذکر کیا ۔ اُس سے پہلے توحید کا بیان ہوا ۔ رسالت کے باب میں اُن معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا جو کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترا جو اُس کی تصدیق کرے ، اس رسول کے پاس خزانے اور باغات کیوں نہیں ۔ بعض بدبخت آدمی رسول کو سحر زدہ کہنے سے بھی نہ چوکتے ۔ اللہ نے ان تمام اعتراضات کو رد کر دیا اور فرمایا کہ اگر اللہ چاہے تو اپنے نبی کو معترضین کی فرمائش سے بڑھ کر بھی عطا کر دے ۔ مگر ان لوگوں کا اعتراض محض اس وجہ سے ہے کہ یہ قیامت کے منکر ہیں اور جو شخص قیامت کا انکار کرتا ہے وہ ایمان کے باقی اجزاء کا بھی منکر ہوتا ہے ۔ پھر اللہ نے قیامت والے دن کی سختی اور تلخی کا ذکر فرمایا اور یہ بھی کہ منکرین توحید ، رسالت اور وحی الٰہی کا اس دن بہت برا حال ہوگا ۔

اب آج کی ابتدائی آیات میں قیامت والے دن خود ساختہ معبودان اور ان کے متبعین سے سوال و جواب کا تذکرہ ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور جس دن اللہ تعالیٰ ان کو اور اللہ کے

اور ان کے خود ساختہ معبود سب میدانِ محشر میں جمع کیے جائیں گے۔ اللہ کے سوا معبودوں میں انبیاء، اولیاء، فرشتے اور جنات بھی ہوں گے۔ تو اُس وقت اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہوگا فَيَقُولُ اور کہے گا ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِىْ هٰٓؤُلَآءِ کیا دنیا میں تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا۔ یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے، کیا تم نے اپنی پوجا کا حکم دیا تھا۔ اور انہیں شرک میں مبتلا کیا تھا؟ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ یا یہ لوگ از خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے۔ سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست اس قسم کے سوال کا ذکر بھی آتا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آیت - ۱۱۶) اللہ تعالیٰ حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کریں گے کہ کیا تو نے ان لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود بنالو۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیں گے کہ پروردگار! تیری ذات پاک ہے، بھلا میں وہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں جس کے کرنے کا مجھے حق نہیں ہے۔ تو یہاں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عابدوں اور معبودوں کو جمع کر کے جب معبودوں سے سوال کریں گے قَالُوْا تو وہ جواب میں کہیں گے سُبْحٰنَكَ پروردگار! تیری ذات پاک ہے مَا كَانَ يَنْۢبَغِىْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ یہ بات ہمارے لائق نہیں ہے کہ ہم تیرے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں۔ ہم تو خود تجھے ہی اپنا کارساز مانتے رہے ہیں پھر بھلا ہم ان سے کیسے کہہ سکتے تھے کہ وہ ہمیں اپنا کارساز تسلیم کرلیں۔ مطلب یہ کہ مشرک لوگ دنیا میں جن مقربینِ الٰہی کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے رہے، وہ قیامت والے دن اپنی معبودیت کا صاف انکار کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے تو ان کو نہیں کہا تھا کہ ہمیں اپنا معبود بنالو۔ انہوں نے تو شیطان کے بہکاوے میں آکر اور اپنی

نفسانی خواہش کی بنا پر ہمیں اپنا کارساز بنالیا۔ اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے۔

پھر وہ مقربین بارگاہِ الٰہی میں یہ عرض کریں گے کہ مولا کریم! اصل بات یہ ہے وَلٰكِن مَّتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ کہ تو نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو دنیا میں طرح طرح کا فائدہ پہنچایا۔ ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا، اسبابِ معیشت مہیا کیے، مال و متاع کی فراوانی دی اور دنیا کی زندگی میں ان کو خوشحال بنایا حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ یہاں تک کہ یہ تیری یاد کو ہی بھول گئے۔ یہ لوگ دنیا کی آسودگی اور عیش و عشرت میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ اپنے پروردگار کو ہی بھلا بیٹھے وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا اور یہ تباہ و برباد ہونے والے لوگ بن گئے۔ انہوں نے انبیاء کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، کسی کی نصیحت پر کان نہ دھرا، تیری نعمتوں اور مہربانیوں کا غلط فائدہ اٹھاتے رہے، لہٰذا ان کے حصے میں ہلاکت کے سوا کچھ نہ آیا۔

بور کا معنی

اس آیت میں آمدہ الفاظ قَوْمًا بُورًا کا ترجمہ ہلاک ہونے والے لوگ کیا ہے۔ ان معانی کی تصدیق بعض دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے مثلاً حضور علیہ السلام کی سکھلائی ہوئی دعا میں یہ الفاظ آتے ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ بَوَارِ الْاَیِّمِ اے اللہ میں رانڈ ہونے کی تباہی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ عبداللہ ابن زبعری عرب کا شاعر تھا۔ پہلے سخت مخالفین میں سے تھا مگر بعد میں اللہ نے ایمان کی دولت نصیب فرمائی۔ اس کے بعض اشعار میں بھی بور کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کہتا ہے [1]

یَا رَسُوْلَ الْمَلِیْكِ اِنَّ لِسَانِیْ
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ اِذْ اَنَا بُوْرٌ

اے اللہ کے پیغمبر اور برحق رسول! میری زبان اب اُن چیزوں کو جوڑنے والی ہے، جن کو میں توڑتا رہا ہوں جب کہ میں ہلاکت میں مبتلا تھا۔ گویا جاہلیت میں نبی کی شان میں جو گستاخی کرتا تھا، توحید کے خلاف بات کرتا تھا، اب

میں اپنے سابقہ گناہوں کی معافی طلب کرتا ہوں۔ اب میری زبان سے حق و صداقت کی بات نکلے گی جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والی بات ہوگی کہتا ہے کہ میں یہ اُس وقت کی بات کر رہا ہوں۔

اِذْ اُجَارِی الشَّیْطٰنَ فِیْ سَنَنِ الْغَیِّ
وَمَنْ مَالَ مَیْلَهٗ مَثْبُوْرٌ

جب میں شیطان کے ساتھ گمراہی کے راستے پر چل رہا تھا۔ اور اُن اُلٹے راستے پر چل رہا تھا۔ جن کا میلان ہلاکت میں ڈالا ہوا تھا۔ یعنی جو لوگ حق کو چھوڑ کر باطل کی طرف چلے گئے تھے میں بھی ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ بہر حال بُور کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے۔

معبودان کا اعلان بیزاری

جب مشرکین کے خود ساختہ معبودان اپنے متبعین سے اظہار بیزاری کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن متبعین سے فرمائے گا فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ تمہارے اِن معبودان نے تمہاری بات کو جھٹلا دیا ہے تم کہا کرتے تھے کہ یہ تمہاری مدد کریں گے یا سفارش کر کے تمہیں بچا لیں گے۔ اللہ نے اُن کو اختیار دے رکھا ہے اور یہ لوگوں کی مشکلات حل کرتے ہیں۔ انہوں نے تو آج تمہیں جھٹلا دیا ہے اور صاف کر دیا ہے کہ ہم تو خود اللہ کے سوا کسی کو کارساز نہیں مانتے، بھلا ہم دوسروں کو کیسے کہہ سکتے تھے کہ تم ہمیں کارساز تسلیم کر لو۔ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا آج حالت یہ ہے کہ تم اتنی بھی طاقت نہیں رکھتے کہ اپنے آپ سے کسی تکلیف کو ہٹا سکو۔ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی گرفت کو دوسری طرف نہیں پھیر سکتے۔ وَلَا نَصْرًا اور نہ ہی تم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہو، اور نہ کوئی دوسرا تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ تمہارے معبودان نے بھی تم سے بیزاری کا اعلان کر دیا ہے۔

خود ساختہ معبودان کا اپنے متبعین سے بیزاری کا مضمون قرآن پاک

کے مختلف مقامات پہ بیان ہوا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا (آیت ۱۶۶) جب کہ متبوع اپنے متبعین سے برأت کا اظہار کر دیں گے اور وہ عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ متبوع صاف کر دیں گے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اِلٰہ تسلیم کر لو۔ تم نے تو از خود یہ کام کیا، لہٰذا اُس کے نتائج کے ذمہ دار بھی تم خود ہو۔ اُس دن شیطان کا اتباع کرنے والے بھی مایوس ہو جائیں گے۔ وہ بھی کہہ دے گا فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (ابراہیم۔ ۲۲) آج مجھے ملامت نہ کرو بلکہ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میرا تم پر کوئی تسلط تو نہیں تھا، میں تو تمہیں برائی کی طرف ترغیب دیتا تھا۔ دوسری طرف اللہ کے نبی تمہیں نیکی کی ترغیب دیتے تھے اور عذابِ الٰہی سے ڈراتے تھے مگر تم نے اُن کی بات نہ مانی اور میرے جھانسے میں آگئے۔ اب اپنی کارگزاری کا مزا چکھو۔ فرمایا وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا تم میں سے جو کوئی ظلم کا ارتکاب کریگا، ہم اُس کو بڑا عذاب چکھائیں گے۔ ظلم میں ہر قسم کی تعدی شامل ہے مگر یہاں پر خاص طور پر عقیدے کا ظلم یعنی کفر اور شرک مراد ہے۔ دوسرے مقام پہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ۔ ۲۵۴) کفر کرنے والے ہی دراصل ظالم ہیں۔ نیز فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان۔ ۱۳) شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ مقصد یہ کہ اگرچہ حق تلفی، قتل ناحق جیسے بڑے بڑے ظلم ہیں مگر عقیدے کا ظلم ایسا ہے جسکی کوئی معافی نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم ظالم کو بڑا عذاب چکھائیں گے۔

بشریت رسل

اب اگلی آیت اُس سابقہ آیت کے جواب میں ہے جس میں معترضین نے اعتراض کیا تھا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا، پیتا اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ
آپ سے پہلے ہم نے کوئی ایسے رسول نہیں بھیجے مگر وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں
میں چلتے پھرتے تھے۔ مشرک اور کافر لوازماتِ بشریہ کو رسالت کے منافی
سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری طرح کھانے پینے اور چلنے پھرنے والا
رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ نے ان کے اس باطل خیال کی تردید فرمائی
اور فرمایا کہ تمام انبیا اور رسل انسان تھے اور ان میں تمام انسانی لوازمات منجملہ
کھانا پینا، سونا جاگنا، صحت بیماری، بیوی بچے، رونا ہنسنا وغیرہ پائے جاتے
تھے۔ اللہ نے سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر
کر کے فرمایا ہے کَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (آیت - ۷۵) دونوں
کھانا کھاتے تھے جو کھانا کھاتا ہے اس کو قضائے حاجت کی ضرورت
بھی پیش آتی ہے۔ تو یہ سب چیزیں لوازماتِ بشریت میں سے ہیں
جو تمام رسولوں میں پائی جاتی تھیں۔ انبیاء ان چیزوں سے مستثنیٰ نہیں ہیں
سورۃ الکہف میں صاف موجود ہے۔ اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
کو مخاطب کر کے فرمایا ہے قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
(آیت - ۱۱۰) آپ ان لوگوں پر واضح کر دیں کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک
انسان ہوں۔ میں اپنے والدین کے گھر پیدا ہوا۔ میرے بیوی بچے ہیں۔
میں کام کاج کرتا ہوں، بازار سے سودا سلف خریدتا ہوں۔ اس میں کون
سی عیب والی بات ہے۔ ہاں میری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ نے
مجھے تمام امت پر شرف عطا فرمایا ہے۔ مجھے معصوم عن الخطا اور پاکیزہ کردار
کا مالک بنایا ہے۔ اللہ نے سارے نبیوں کو خطاب فرمایا ہے يَا أَيُّهَا
الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا
(المومنون - ۵۱) کہ اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال انجام

(د) یہی صفت اللہ نے ایمان والوں کی بھی بتلائی ہے کُلُوا مِنَ الطَّیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ (البقرہ - ۱۷۲) لوگو! ہماری عطا کردہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

بازار میں جانا

بازار میں جانا بذاتہٖ کوئی عیب والی بات نہیں۔ ضرورت کے مطابق دکانداری کے لیے سودا سلف خریدنے کے لیے بازار میں جانا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بازار کے مقابلے میں اللہ نے مسجد کو بہت زیادہ فضیلت عطا فرمائی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ نے یوں فرمایا ہے شَرُّ الْبِقَاعِ اَسْوَاقُهَا وَخَيْرُ الْبِقَاعِ مَسَاجِدُهَا (مسند احمد) یعنی بدترین خطے بازار ہیں اور بہترین خطے مساجد ہیں۔ بازاروں کی قباحت اس وجہ سے ہے کہ وہاں تجارت کے دوران دھوکا فریب اور غلط بیانی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ وگرنہ ضرورت کے تحت بازار میں جانا معیوب نہیں ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت عمرؓ سے یہ روایت بیان کی ہے جسے ابوداؤد طیالسی نے بھی روایت کیا ہے۔ کہ جس شخص نے بازار میں داخل ہو کر یہ دعا پڑھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک لاکھ نیکی لکھ دیگا۔ اس کے ایک لاکھ چھوٹے گناہ معاف کر دے گا اور ایک لاکھ درجات بلند فرمائے گا گویا بازار میں داخل ہو کر انسان اتنی نیکیاں بھی کما سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے ایک شاگرد کے ہمراہ بازار جانے کے لیے تیار ہوئے تو شاگرد نے عرض کیا حضرت! آپ نے کوئی خریداری تو کرنی نہیں، پھر یہیں بیٹھ کر درس و تدریس کا کام کریں۔ فرمانے لگے

لہ قرطبی صفحہ ۱۳۶ (ایاض)

تمھیں مچھ نہیں، ہم بازار میں سودا خریدنے کے لیے نہیں جاتے بلکہ وہاں ہمیں بہت سے لوگ ملتے ہیں جن کو ہم سلام کرتے ہیں ایک دفعہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہنے سے تیس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں، لہٰذا یہ کوئی برا سودا نہیں ہے اگر کوئی شخص بازار میں غلط کام کے لیے جاتا ہے تو وہ اس کے لیے یقیناً باعث وبال ہوگا۔

ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ

آگے ارشاد ہے

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے ذریعہ آزمائش بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے مثلاً اللہ کے نبی منکرین کے لیے آزمائش کا ذریعہ ہیں اور وہ نبی کے لیے ذریعہ آزمائش ہیں۔ جب کافر اور مشرک طعن و تشنیع اور بیہودہ اعتراض کرتے ہیں۔ توہین آمیز باتیں کرتے ہیں تو یہ چیزیں اللہ کے نبی اور اہلِ ایمان کے لیے آزمائش ہوتی ہیں کہ وہ کس حد تک صبر سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے نبی اور اہلِ ایمان نافرمانوں کے لیے ذریعہ آزمائش ہیں کہ وہ ان کی اطاعت کر کے اپنے لیے آخرت کا سامان پیدا کرتے ہیں یا نافرمانی کر کے ہمیشہ کی ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح فقیر دولت مند کے لیے آزمائش کا ذریعہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اور فقیر اس لحاظ سے مبتلائے آزمائش ہوتا ہے کہ وہ اس حالت میں صبر کا دامن تھامتا ہے یا جزع فزع کرتا ہے۔ چنانچہ بیمار تندرست کے لیے اور صحت مند مریض کے لیے ذریعہ آزمائش ہے۔ بادشاہ رعیت کے لیے اور رعیت حاکم کے لیے آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اب یہ تم پر موقوف ہے کہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اترتے ہو۔

فرمایا، اس آزمائش کا مقصد یہ دیکھنا ہے اَتَصْبِرُوْنَ کہ کیا تم صبر کرتے ہو؟ ہر شخص کسی نہ کسی طرح امتحان سے گزر رہا ہے۔ کیا اہل ایمان کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا کمزور، بیمار اور نادار اپنی حالت پر صابر رہتا ہے یا نہیں؟ اور کیا عام لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت پر اس کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ غرضیکہ کوئی بھی شخص آزمائش سے مستثنیٰ نہیں۔ فرمایا وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا تیرا پروردگار تجھے ہر آن دیکھ رہا ہے۔ تمہارا ہر عمل اور کائنات کی ہر چیز اس کی نگاہ میں ہے وہ انسانوں کی نیت اور ارادے کو بھی جانتا ہے اور پھر وہ ہر ایک کے ساتھ اس کے عقیدے اور عمل کے مطابق ہی سلوک کریگا۔

نظریہ مساوات

اس آیت سے موجودہ زمانے کا نظریہ مساوات بھی باطل ثابت ہوتا ہے۔ اللہ نے انسانوں کی صلاحیت اور استعداد یکساں نہیں رکھی، اسی لیے ان کے اشغال بھی یکساں نہیں۔ جب ان کی ذہانت بھی یکساں نہیں تو پھر ان میں مساوات کیسے قائم کی جا سکتی ہے؟ اصل مسئلہ معیشت کا ہے جیسے قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے بیان کیا ہے کہ ہر انسان بلکہ ہر جاندار کو حق معیشت حاصل ہونا چاہیئے اور کوئی بھی اس حق سے محروم نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ کوئی انسان بھوکا ننگا نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر ایک کو مکان، صحت اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات ملنی چاہئیں۔ تاہم جہاں تک درجات کا تعلق ہے برابر نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے مطابق ہی مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بنی نوع انسان کی تمام ارواح کو آدم علیہ السلام کے سامنے حاضر کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا، پروردگار! لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ تو نے اپنے بندوں کے درمیان مساوات کیوں نہیں قائم کی۔ کوئی بھاری پھر کم ہے۔ کوئی کمزور، کوئی صحت مند اور کوئی بیمار، کوئی امیر ہے اور کوئی غریب، کوئی گورا ہے اور کوئی کالا، تو

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اگر میں ان سب کو برابر کر دیتا تو مجھے پہلانے والا کوئی نہ ہوتا بلکہ سب کے سب نافرمان ہو جاتے۔ حضور علیہ السلام کا فرمانِ مبارک ہے اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْہِ فِی الْمَالِ وَالْجِسْمِ جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو تم میں مال اور جسم میں فضیلت رکھتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کو مال بھی زیادہ دیا ہے اور صحت بھی اچھی عطا کی ہے، تو فرمایا فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَسْفَلُ مِنْہُ تو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے سے کمتر آدمی کی طرف دیکھے۔[1] ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو اَلَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ اللہ کی نعمت کو حقیر نہیں سمجھو گے۔ بلاشبہ تم سے اعلیٰ حیثیت کے لوگ بھی ہیں مگر تم سے کمزور، نادار اور مفلس لوگ بھی تو ہیں۔ اُن کی طرف دیکھو گے تو اپنی حالت پر اللہ کا شکر ادا کرو گے۔ اور اگر اوپر والوں کی طرف ہی دیکھتے رہے تو کفرانِ ناشکرگزاری میں مبتلا ہو کر اللہ کی نعمتوں سے محروم ہو سکتے ہو۔

---

[1] معالم التنزیل ص۹۱ ج۳ و خازن ص۹۲ ج۲ (فیاض)

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى
يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾
وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً
مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ
مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ
بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ
اِلْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى
اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ
اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ
اِذْ جَآءَنِىْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

ترجمہ:- اور کہا اُن لوگوں نے جو نہیں اُمید رکھتے تھے ہماری
ملاقات کی کہ کیوں نہیں اتارے جاتے ہم پر فرشتے - یا
(کیوں نہیں) دیکھتے ہم اپنے پروردگار کو - (فرمایا) البتہ تحقیق انہوں

نے تکبر کیا ہے اپنے نفسوں میں اور سرکشی کی ہے ۔ انہوں
نے حد سے زیادہ بڑی سرکشی (۲۱) جس دن دیکھیں گے
فرشتوں کو ، نہیں خوشخبری ہو گی اس دن مجرموں کے لیے اور
کہیں گے کاش کہ ہمارے درمیان کوئی آڑ کھڑی ہوتی (۲۲) اور
ہم متوجہ ہوں گے اُن کاموں کی طرف جو انہوں نے کیے
ہیں ۔ پھر ہم کر دیں گے اُس کو ذرات بکھیرے ہوئے (۲۳)
جنت والے لوگ اُس دن بہتر ہوں گے ٹھکانے کے اعتبار
سے اور بہتر ہوں گے آرام کی جگہ کے اعتبار سے (۲۴)
اور جس دن پھٹ جائے گا آسمان بادل کے ساتھ ۔ اور
اتارے جائیں گے فرشتے لگا تار (۲۵) بادشاہی اُس دن سچی خدائے
رحمان کے لیے ہو گی ۔ اور وہ دن کافروں پر بہت دشوار
ہو گا (۲۶) اور جس دن کاٹیں گے ظالم لوگ اپنے ہاتھوں
کو (افسوس کی وجہ سے) اور کہیں گے کاش کہ میں نے پکڑ
لیا ہوتا رسول کے ساتھ راستہ (۲۷) اے خرابی ! کاش کہ میں
نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا (۲۸) البتہ تحقیق اُس
نے گمراہ کیا مجھے نصیحت سے جب کہ میرے پاس وہ
نصیحت آئی ۔ اور شیطان ہے انسان کے لیے دغا دینے
والا (۲۹)

ربطِ آیات اس سورۃ مبارکہ میں تمام بنیادی عقائد بیان کیے گئے ہیں ، جن میں خدا تعالے
کی وحدانیت اور اُس کے عقلی و نقلی دلائل ہیں ۔ قیامت اور جزائے عمل کا سلسلہ ہے ۔
نبوت و رسالت کا بیان اور اُس پر اعتراض کرنے والوں کے باطل شکوک کا ازالہ ہے
اس کے علاوہ دیگر بہت سی اخلاقی تعلیمات ہیں مگر زیادہ تر نبوت و رسالت کا بیان ہے

کافر اور مشرک لوگ نبی آخر الزمان پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اُن کے نزدیک بشریت نبوت و رسالت کے منافی تھی۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام سے پہلے جتنے بھی نبی اور رسول دنیا میں آئے وہ سب کے سب انسان تھے۔ وہ سارے کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے۔ یہ چیز نبوت کے منافی نہیں ہے فرمایا اِن لوگوں کے انکارِ نبوت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کر کے بیباک ہو گئے ہیں اور اس قسم کے بیہودہ اعتراضات کرتے ہیں۔

اب آج کی آیات میں اللہ نے پہلے مشرکین کا شکوہ بیان کیا ہے، اور پھر قیامت کو پیش آنے والے بعض واقعات کا اجمالی ذکر پیش کیا ہے۔

فرشتوں اور خدا سے ملاقات کی خواہش

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا اور کہا اُن لوگوں نے جو نہیں اُمید رکھتے ہماری ملاقات کی، یعنی جن کو بعث بعد الموت پر یقین نہیں ہے اور مرنے کے بعد انہیں بارگاہِ ربّ العزت میں پہنچنے کی کوئی توقع نہیں۔ رجیٰ کا معنیٰ اُمید بھی ہوتا ہے اور خوف بھی۔ گویا نہ انہیں خدا تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے کی اُمید ہے اور نہ خوف، وہ گستاخی کے یہ کلمے کہتے تھے لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ اگر نبی پر فرشتے وحی لاتے ہیں تو وہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتے تاکہ ہمیں بھی یقین ہو جائے کہ وہ واقعی خدا کا پیغام لاتے ہیں اَوْ نَرٰى رَبَّنَا یا ہم خود اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اُس سے ہم کلام ہوں۔ گویا کفار و مشرکین نے ایمان لانے کے لیے فرشتوں اور خدا تعالیٰ کو اپنے سامنے لا کھڑا کرنے کی شرط عاید کر دی۔ فرمایا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ انہوں نے یہ بات کر کے اپنے جی میں کس قدر تکبر کیا کہ وہ فرشتوں اور خدا کو اپنی پیشی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرمایا یہ مطالبہ کر کے وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا انہوں نے حد

سے بڑھ کر سرکشی کا ارتکاب کیا۔ کام تو ان کے کفر اور شرک والے ہیں مگر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ سے براہ راست ہمکلام ہونے کا اہل سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے۔

بوقت موت فرشتوں سے ملاقات

اللہ نے فرمایا کہ ان کو فرشتوں سے ملاقات کا شوق ہے تو ہم ان کا یہ شوق بھی پورا کر دیں گے جب ان کی موت کا وقت قریب آئے گا۔ اور پھر ایسا ہوگا يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ اُس دن مجرموں کے لیے خوشخبری کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔ فرشتے موت کے وقت بھی نظر آتے ہیں اور برزخ میں بھی۔ قرآن پاک میں ہے کہ جب کفار و مشرکین کی موت کا وقت قریب آتا ہے يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (محمد - ۲۷) تو فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں۔ ان پر دہشت طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں اُن کی روحوں کو نکالتے ہیں پھر ان کو اگلا خطرہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کہتے ہیں۔ کاش ہمارے اور اس خوفناک منظر کے درمیان کوئی آڑ ہوتی اور ہمیں یہ خوفناک منظر دیکھنا نہ ہوتا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ يَقُوْلُوْنَ کا فاعل فرشتے بھی ہو سکتے ہیں اگر ایسا ہو تو پھر معنی یہ ہوگا کہ اس دن فرشتے ان منکرین سے کہیں گے کہ آج تمہارے اور بہتری کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے۔ آڑ کھڑی کر دی گئی ہے۔ اب تم بہتری کی بات تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے تم نے اس کا موقع دنیا میں ضائع کر دیا، اب تمہیں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی

اعمال کا ضیاع

فرمایا وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ اور ہم توجہ ہوں گے ان کے کردہ اعمال کی طرف۔ دنیا میں رہ کر اگر انہوں نے کوئی نیک عمل بھی کیا ہوگا تو ان کے کفر اور شرک کی وجہ سے فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً

لہ ابن کثیر ص۳۱۶ ج۳ (فیاض)

مَّنْثُوْرًا ہم انہیں بکھرے ہوئے ذرات کی مانند نابود کر دیں گے۔ اور ایسے اعمال کا انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (الکہف۔ ۱۰۵) اُن کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور وہاں میزان قائم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ چونکہ ان لوگوں کے پاس ایمان اور توحید نہیں ہوگی، لہٰذا ہم ان کے اچھے اعمال بھی ذرات کی طرح پراگندہ کر دیں گے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ قیامت والے دن بعض لوگوں کے اعمال پہاڑوں جیسے بڑے بڑے ہوں گے مگر انہیں ان کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کون لوگ ہوں گے؟ تو فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہوں گے جو دنیا میں نماز، روزے کے پابند تھے مگر حلت و حرمت میں امتیاز نہیں کرتے تھے، جونہی اُن کے سامنے کوئی حرام چیز آتی تھی تو اسے بے دریغ استعمال کر لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُن کے سارے اعمال ہی غارت کر دیئے۔

فرمایا، اس کے برخلاف اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا اُس دن اہل جنت ٹھکانے کے اعتبار سے بھی بہتر ہوں گے وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا اور آرام کے اعتبار سے بھی اچھے ہوں گے۔ مستقر مستقل ٹھکانے کو کہتے ہیں اور مقیل آرام کرنے کی جگہ کو جیسے کوئی دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منکرین کے مقابلے میں اطاعت گزاروں کو ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل ہوگا اور انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

نزولِ ملائکہ

کفار و مشرکین کے نزولِ ملائکہ کے مطالبہ کے پیش نظر فرمایا وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ اور جس دن بادل کے ساتھ آسمان پھٹ جائے گا، یعنی قیامت کی گھڑی آن پہنچے گی تو آسمان درتچے ہو جائیگا۔

غمام بادل کو کہتے ہیں اور اس کی حقیقت کے متعلق بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی خصوصی تجلی یا نورانیت ہوگی جس کی شکل لطیف بادلوں جیسی ہوگی۔ پھر اس وقت وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ان بادلوں جیسی تجلی سے فرشتے رگا تار اتریں گے۔ میدانِ محشر برپا ہوگا اور فرشتے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پہ حاضر ہو جائیں گے۔

سلطنت خداوندی

فرمایا اُس دن کی کیفیت یہ ہوگی اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ اُس دن سچی بادشاہی خدائے رحمان کے لیے ہوگی۔ بادشاہی تو آج بھی پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، مگر اس دنیا میں اللہ نے مجازی طور پر بعض بادشاہوں کو محدود علاقے میں محدود اختیار بھی دے رکھے ہیں۔ دنیا میں بے شمار چھوٹی موٹی سلطنتیں اور جاگیریں ہیں جہاں لوگوں کا سکہ چلتا ہے مگر جب قیامت برپا ہوگی تو پھر اللہ کے سوا نہ کوئی حقیقی بادشاہی باقی رہے گی اور نہ کوئی مجازی سلطنت ہوگی نہ کوئی سپر طاقت ہوگی اور نہ زیر دست حکومت، ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کا کوئی تصور باقی نہیں رہے گا اور نہ کسی داخلی اور خارجی خود مختاری کی بات ہوگی۔ بلکہ ظاہری باطنی، حقیقی، مجازی غرضیکہ ہر طرح کی سلطنت صرف خدا تعالیٰ کی ہو گی۔ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا اور کافروں کے لیے یہ دن بڑا ہی دشوار ہوگا۔ اُن کے اعمال اُن کے سامنے کر دیے جائیں گے اور پھر اُن سے ذرے ذرے کا حساب لیا جائے گا۔

اُس دن حالت یہ ہوگی وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ کہ ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹیں گے۔ يَقُوْلُ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہیں گے يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا کاش کہ میں نے دنیا میں رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ وہاں تو میں اللہ کے نبیوں کی تکذیب کرتا رہا، رسالت پر بیہودہ اعتراض کرتا رہا، اُن کو تکلیفیں پہنچاتا رہا۔ کاش کہ میں اُن کے راستے پر چلتا تو آج ذلیل و خوار نہ ہوتا۔ ایک تو انبیاء سے دور رہنے

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۱۶ ج ۳ (فیاض)

کی وجہ سے حسرت کرے گا اور دوسری بات یہ کرے گا یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ہائے میری خرابی! افسوس، میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ دنیا میں نبی کو چھوڑ کر دوسروں کو پیشوا بنایا۔ اُن کی راہنمائی میں زندگی میں غلط راستے پر چلتا رہا۔ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کی لیڈری چمکاتا رہا، مگر اب پتہ چلا کہ وہ سب دھوکہ تھا۔ کاش کہ اِن کی بجائے نبی کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرتا تو آج کامیاب و کامران ہوتا۔ پھر ظالم شخص حسرت کے ساتھ یہ بھی کہے گا۔ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ جب میرے پاس نصیحت آئی، خدا کا کلام آیا، نبی کا فرمان آیا تو اِن بدبخت نام نہاد راہنماؤں نے مجھے گمراہ کر دیا۔ میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو چھوڑ کر اِن کے پیچھے چل پڑا تو آج یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا۔ کاش کہ میں اِن جھوٹے خداؤں کے بہکاوے میں نہ آتا۔ یہ سارا شیطان ہی کا بہکاوا تھا۔ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا اور شیطان تو انسان کے حق میں سراسر دھوکہ دینے والا ہے، وہ تو دغاباز ہے جس نے مجھے بہلا کر غلط راستے پر ڈال دیا۔ مجھے نصیحت سے بیگانہ رکھا اور برائیوں کی طرف مائل کر دیا۔[1]

اچھی اور بری ہم نشینی

حدیث شریف[2] میں آتا ہے کہ صالح ہم نشین کستوری والے کی مانند ہے اس کے پاس بیٹھو گے تو کستوری خریدو گے جو کہ اچھی چیز ہے۔ اور اگر نہ بھی خریدو تو کم از کم اُس کی خوشبو تو پاؤ گے۔ اور برے ہم نشین کی مثال بھٹی والے کی ہے اس کے پاس بیٹھنے سے اوّل تو چنگاریوں سے کپڑے جلا بیٹھو گے ورنہ دھواں اور بدبو تو بہرحال تمہارے حصے میں آئے گی۔ ترمذی شریف اور مسند احمد کی روایت میں آتا ہے لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا صرف مومن کی رفاقت اختیار کرو کسی غلط آدمی کے قریب نہ جاؤ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک اور بدعتی کے ساتھ دوستی اور ہم نشینی پر فخر کیا جاتا ہے

---

[1] السراج المنیر صفحہ ... [2] السراج المنیر صفحہ ... وخازن صفحہ ... (فیاض)

کہتے ہیں کہ ہمارے اور ان کے خیالات یکساں ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کجا ایک مردِ مومن کے پاکیزہ خیالات اور کجا ایک کافر کے باطل خیالات۔ اسی لئے فرمایا کہ مومن کے سوا کسی دوسرے کی رفاقت اختیار نہ کرو۔ حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں لَا یَأْکُلُ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ تمہارا کھانا صرف متقی آدمی کو کھانا چاہیئے۔ کسی نیک آدمی کی محبت کے ساتھ دعوت کرو گے تو اس کی وجہ سے اس میں توانائی آئے گی۔ وہ خدا کی عبادت کرے گا تو اس میں سے تمہیں بھی حصہ ملے گا۔ وہ دعا کرے گا تو تمہاری دعا بھی مستجاب ہوگی۔ حضور علیہ السلام کسی شخص کے ہاں کھانا کھاتے تو اس کے حق میں دعا فرماتے کہ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے۔ اس کے برخلاف اگر فاسق فاجر لوگوں کو کھلاؤ گے تو وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں گے، نافرمانی کے کام کریں گے اور اُن کی برائی میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔

صحبتِ کفار

حضور علیہ السلام نے بُری رفاقت سے بھی منع فرمایا ہے۔ ایک حدیث[1] میں آپ کا فرمان ہے اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ آدمی اپنے دوست کے مذہب پر ہوا کرتا ہے۔ فرمایا تم میں سے ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی دوستی کس کے ساتھ ہے۔ اگر بدعقیدہ، بدعتی اور مشرک کے ساتھ دوستی کرو گے تو تمہارا عقیدہ بھی خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ مرزائی، عیسائی، یہودی اور دہریے کی صحبت اختیار کرو گے تو تم پر بھی ویسا ہی اثر ہوگا اور اگر پاکیزہ اور دین دار لوگوں کے پاس بیٹھو گے تو تمہارا عقیدہ بھی پاکیزہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی[2] فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ انجام کے اعتبار سے آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی بزرگانِ دین کا بھی مقولہ ہے صُحْبَۃُ الْاَشْرَارِ تُوْرِثُ بُغْضَ الْاَخْیَارِ یعنی اگر تم بُرے لوگوں کی صحبت اختیار کرو گے تو نیک لوگوں کے لیے تمہارے دل میں نفرت پیدا ہوگی۔ حضرت مالک ابن دینارؒ فرماتے

---

[1] خازن صہ ۱۵، السراج المنیر ص ۱۶۹ و خازن ص ۱۵، ترمذی ص ۳۶۲ (فیاض)

ہیں[1] نقل الاحجار مع الابرار خیر من اکل الخبیص مع الفجار یعنی نیک لوگوں کے ساتھ پتھر اٹھانے جیسی سخت محنت کرنا اس بات سے بہتر ہے کہ کوئی شخص بُرے لوگوں میں بیٹھ کر حلوہ کھائے، مطلب یہ کہ نیک لوگوں کی رفاقت بہرحال انجام کے لحاظ سے بہتر ہے اگرچہ بری مجلس میں بظاہر کوئی فائدہ بھی نظر آتا ہو۔

---

[1] تفسیر روح البیان ص ۲۰۶ ج ۲ (فیاض)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾ ع

ترجمہ:- اور کہا اللہ کے رسول نے، اے میرے پروردگار! بیشک میری قوم نے بنا لیا ہے اس قرآن کو ترک کیا ہوا ﴿٣٠﴾ اور اسی طرح ہم نے بنائے ہیں ہر ایک نبی کے لیے دشمن مجرموں میں سے۔ اور کافی ہے تیرا پروردگار، ہدایت دینے والا اور مدد کرنے والا ﴿٣١﴾ اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ کیوں نہیں اتارا گیا اس پر قرآن ایک ہی دفعہ؟ اسی طرح (اُتارا ہے ہم نے اس کو) تاکہ ثابت رکھیں ہم اس کے ساتھ آپ کے دل کو۔ اور ہم نے اس کو اتارا ہے آہستہ آہستہ ﴿٣٢﴾ اور نہیں لاتے یہ لوگ تیرے پاس کوئی مثال مگر لاتے ہیں ہم تیرے پاس حق اور بہتر تفسیر ﴿٣٣﴾ وہ لوگ

جو اٹھائے جائیں گے اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف یہ لوگ ہیں بدترین ٹھکانے کے اعتبار سے ، اور زیادہ گمراہ ہیں راستے کے اعتبار سے (۳۴)

ربط آیات

یہ آیات بھی گذشتہ آیات کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔ گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا شکوہ کیا تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے ، نیز اللہ تعالیٰ خود ان کے سامنے کیوں نہیں آتا؟ اللہ نے جواباً فرمایا کہ یہ لوگ بڑی گستاخی کی بات کہتے ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب فرشتوں کے ظاہر ہونے کا وقت آئے گا تو اس دن ان مجرموں کا بہت برا حال ہوگا۔ وہ افسوس کے ساتھ اپنے ہاتھ کاٹیں گے اور کہیں گے کاش کہ ہم نے رسول کے ساتھ راستہ پکڑا ہوتا۔ اس کی اتباع کی ہوتی اور اس کے بجائے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ یہ سب شیطان کا بہکاوا ہے وہ انسان کو دھوکہ دیکر ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ بہرحال اس دن مجرم لوگ اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے اور افسوس کا اظہار کریں گے مگر اس وقت ان کا پچھتانا کسی کام نہیں آئے گا۔

ترک قرآن پر گواہی

کفار و مشرکین ایک طرف تو رسالت کا انکار کرتے تھے اور دوسری طرف قرآن کو خود ساختہ بنا کر اس پر اعتراض کرتے تھے۔ تو اللہ نے اس سلسلے میں حضور علیہ السلام کی اس شکایت کا ذکر کیا ہے جو وہ قیامت کے روز بارگاہ رب العزت میں پیش کریں گے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ الرَّسُوْلُ اور اللہ کا رسول کہے گا یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا۔ اے مولا کریم! میں ان کو تیرا قرآن سناتا تھا یہ اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ - ۲۶)

اس قرآن کو مت سنو بلکہ شور شرابہ کر دو تاکہ تم غالب آسکو۔ قرآن کو شاعری کہتے کبھی کہانت اور کبھی پہلے لوگوں کے قصے کہانیوں سے تعبیر کرتے۔ تو اس طرح خود صاحب قرآن اس سے اعراض کرنے والوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ مہجور کا عام معنی تو متروک ہی ہے کہ منکرین نے اس کو ترک کر دیا نہ اس کو سنا، نہ سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا۔ اور اگر یہ ھُجر کے مادے سے ہو تو اس کا معنی بیہودہ کلام بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ کافر لوگ اس کو کلام الٰہی تسلیم کرنے کی بجائے اسے بیہودہ کلام سمجھتے تھے (العیاذ باللہ) بہر حال جس دن منکرین قرآن کے خلاف اللہ کے رسول کی شہادت ہوگی۔ اُس دن ان کا بُرا حال ہوگا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کفار کی طرف سے ترکِ قرآن تو سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے سرے سے اس کو تسلیم ہی نہ کیا۔ لیکن اس کو برحق تسلیم کر کے اس کے پروگرام پر عمل نہ کرنا بھی قرآن پاک کے عملی ترک پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں اہلِ ایمان بھی آجائیں گے جو اس کے احکام پر عمل پیرا نہ ہوتے یا جنہوں نے عملی طور پر اس کے پروگرام کی مخالفت کی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے خلاف بھی اللہ کے رسُول اور خود قرآن کی گواہی ہوگی۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف گواہی دے گا۔ اگر دنیا میں اس کو مان کر اس کے پروگرام کو عملی شکل دی ہے تو پھر تو یہ آدمی کے حق میں طور گواہ پیش ہوگا اور اگر اس سے روگردانی کی ہے یا اس کی مخالفت کی ہے تو پھر یہ اُس شخص کے خلاف گواہی دے گا اور بارگاہِ ایزدی میں شکایت کرے گا کہ اس شخص نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ حضور علیہ السلام نے اس سلسلہ میں یہ دُعا بھی سکھائی ہے اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الْقُرْاٰنَ حُجَّةً عَلَیْنَا وَاجْعَلْہُ حُجَّةً لَنَا اے مولا کریم! اس قرآن کو ہمارے برخلاف

۱؎ مسلم ص۱۱۸ (فیاض)

دلیل نہ بنائیں بلکہ اسے ہمارے حق میں دلیل بنائے۔

خود قرآن بھی آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا جس نے اس کو تسلیم کیا اور پھر اس کے احکامات پر عمل کیا، قرآن اس کے حق میں گواہی دیگا بلکہ ہر ہر سورۃ اور ہر ہر آیت اپنے قاری کے حق میں سفارش کرے گی۔ اور جس شخص نے ایمان لانے کے باوجود اس پر عمل نہیں کیا، قرآن اس کے خلاف گواہی دے گا۔ اس زمانے میں تو کوئی شاذ لوگ ہی ہیں جو قرآن پر عمل پیرا ہیں ورگرنہ تسلیم کرنے کے باوجود لوگوں کی اکثریت اس کے کسی شعبے پر بھی عمل نہیں کرتی بلکہ اس کے خلاف چلتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم حاصل نہ کرنا، اس کی تلاوت اور اس میں غور و فکر سے گریز اور اس کی عدم تصدیق وغیرہ اس کو ترک کرنے کے مترادف ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن اور صاحب قرآن ایسے لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ یہود و نصاریٰ تو قرآن کو کلام الٰہی تسلیم ہی نہیں کرتے لہٰذا ان کی طرف سے اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر افسوس تو ان اہل ایمان پر ہے جو اس کو خدا کا آخری کلام مانتے ہوئے بھی اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اسی اعراض کی وجہ سے تو ذلت آتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[1] اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ اس قرآن پاک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بعض اقوام کو بلندی عطا کرتا ہے اور بعض کو پست کر دیتا ہے۔ جس نے اس پر عمل کیا وہ ترقی کی منازل طے کر گیا اور جس نے روگردانی کی وہ رسوائی کے گڑھے میں جا پڑا۔

حضور علیہ السلام کے لیے تسلی

قرآن پاک سے روگردانی کا شکوہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو کفار کی ایذا رسانیوں پر تسلی دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے ہیں مطلب

[1] مسلم ص۲۷۲ ج۱ (فیاض)

یہ کہ حق کی مخالفت کرنیوالی صرف آپ ہی کی قوم نہیں بلکہ آپ کی طرح ہر نبی
کی قوم نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی، اسے ساحر اور مجنون کہا، اس کو تکلیف
پہنچائی، بعض کو ہجرت پہ مجبور کیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لہٰذا آپ دل
شکستہ نہ ہوں بلکہ تسلی رکھیں بالآخر کامیابی آپ ہی کے حصے میں آئے گی۔ وَکَفٰی
بِرَبِّکَ ھَادِیًا وَّنَصِیْرًا آپ کا پروردگار ہدایت دینے اور مدد کرنے کے
لیے کافی ہے۔ وہ آپ کو یونہی نہیں چھوڑ دے گا بلکہ آپ کی پوری پوری مدد کریگا۔
اور آپ کی بات کو لوگوں کے دلوں میں پیوست کر دے گا۔ کفار و مشرکین کے
بیہودہ اعتراضات سے قطع نظر آپ اپنا کام جاری رکھیں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ
دیں وہ آپ کا حامی و ناصر ہوگا۔

تدریجی نزول قرآن پر اعتراض

کفار و مشرکین قرآنِ پاک پر طرح طرح کے اعتراض کرتے تھے۔ کبھی کہتے
کہ یہ خود ساختہ ہے، کبھی کہتے کہ نبی یہ باتیں دوسروں سے سیکھتا ہے اور
پھر قرآن بنا کر پیش کرتا ہے، اور کبھی اسے پرانے لوگوں کی قصے کہانیاں
بتاتے۔ اب آگے اللہ نے اُن کا ایک نیا اعتراض نقل کیا ہے وَقَالَ
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً
کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا کہ یہ قرآن اس شخص پر بیک وقت
کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اس سے پہلے انجیل، تورات اور دیگر صحائف یک مشت
نازل ہوتے رہے ہیں مگر قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تیئس سال کے طویل عرصہ
پر کیوں پھیلا دیا گیا ہے۔ کہتے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص تھوڑا تھوڑا سوچ
سوچ کر بناتا رہتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ نے اتارا ہے۔
اس قسم کا اعتراض پہلے رکوع میں بھی گزر چکا ہے۔ کافر لوگ کہتے تھے۔
اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اِفْکُ نِ افْتَرٰىہُ وَاَعَانَہٗ عَلَیْہِ قَوْمٌ
اٰخَرُوْنَ (آیت۔ ۴) یہ تو اس شخص کا گھڑا ہوا ہے اور اس معاملے
میں بعض دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ بہرحال اُن کا اعتراض

یہ تھا کہ یہ قرآن یکمشت کیوں نہیں نازل ہوا۔

جواب ۱
دل کی پختگی

اللہ نے جواب میں فرمایا کَذٰلِکَ ہم نے قرآن کو اسی طرح یعنی تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے۔ اور اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے ۔ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ تاکہ اس کتاب کے ساتھ ہم آپ کے دل کو پختہ کریں ۔ ظاہر ہے کہ وحی کے بار بار نزول سے ہر بار دل میں یقین اور پختگی پیدا ہوگی ۔ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔ ترتیل کا لغوی معنی آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا ہوتا ہے جیسے سورۃ المزمل میں ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (آیت - ۴) قرآن پاک ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کریں ۔ تاہم یہاں پر یہ لفظ نزول کے معنی میں آیا ہے کہ ہم نے اس کو بتدریج نازل فرمایا۔ اس میں بڑی حکمت ہے ۔ جو چیز آہستہ آہستہ آئے گی وہ اچھے طریقے سے ضبط ہوتی جائے گی اور دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرے گی ۔ برخلاف اس کے جو چیز جلدی جلدی سامنے آئے گی ، وہ نہ تو اچھی طرح ضبط ہو سکے گی اور نہ ہی اس پر پختگی حاصل ہوگی ۔ تو فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو اس لیے بتدریج نازل فرمایا ہے کہ یہ آپ کے قلب میں پختہ ہو جائے ۔

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام سے قرآن پاک کی جو آیات سیکھتے تھے ، ان پر فوراً عمل شروع کر دیتے تھے ، اس لیے ہر حکم دل میں اچھی طرح پیوست ہو جاتا تھا ۔ اور ہم اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھ جاتے تھے جب علم کے ساتھ عمل بھی شامل ہو جاتا تو پھر ایمان میں مزید پختگی آجاتی ۔ ویسے اصولی طور پر بھی جو چیز آہستہ آہستہ سبقاً سبقاً پڑھی جائے وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پوری کتاب ایک ہی دن یا رات میں ختم کر دی جائے تو اس کے اثرات بھی دیرپا نہیں ہوں گے کسی حصے کی سمجھ آئے گی اور کسی کی نہیں آئے گی ۔ ذہین لوگ تو پھر بھی بہت

کچھ پاتے ہیں مگر عام آدمی اس طریقہ تعلیم سے کما حقہ مستفید نہیں ہو پاتے۔ اسی لیے امام بخاری فرماتے ہیں اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ یعنی علم سیکھنے سے ہی آتا ہے جو لوگ اخبار کی طرح کسی چیز کا یک وقت مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو علم میں پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے جو سبق استاد سے سمجھ کر پڑھا ہو۔ اس میں وقت لگایا ہو، غور و فکر کیا ہو۔ وہ علم یقینی اور دیرپا ہوگا۔

جہاں تک قرآن پاک کے عرصہ نزول کا تعلق ہے تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو لیلۃ القدر میں حظیرۃ القدس یا لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف نازل فرمایا۔ اور پھر تیئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور علیہ السلام پر نازل ہوتا رہا۔ اس عرصہ میں تین سال کا فترتِ وحی کا عرصہ بھی شامل ہے جس میں سلسلہ وحی منقطع رہا۔ امام ابن کثیرؒ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس کو ملاءِ اعلیٰ کے مقام سے آسمانِ دنیا میں بیت العزت کے مقام پر یک وقت لیلۃ القدر میں نازل فرمایا اور پھر ضرورت کے حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال میں اس کا نزول پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

جواب۲
ازالہ شبہات

فرمایا، قرآن پاک کے بتدریج نزول کی دوسری حکمت یہ ہے وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ نہیں لاتے یہ لوگ آپ کے پاس کوئی مثال مگر ہم آپ کے پاس حق لاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری کسی آیت پر جب معترضین کوئی اشکال لاتے ہیں تو ہم فوراً دوسری آیت نازل کر کے اُن کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک کی بہت سی آیات يَسْئَلُونَكَ کے جواب میں نازل ہوئیں۔ اپنوں یا غیروں نے کوئی چیز دریافت کی تو اللہ نے اس کے جواب میں آیت نازل کر کے مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ تو گویا بتدریج نزولِ قرآن کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر اعتراض اور اشکال کا جواب ساتھ کے ساتھ مل گیا۔ فرمایا، ہم ہر اشکال

ا بخاری ص۲۶ ۲ تفسیر ابن کثیر ص۳۲۱ (فیاض)
ج ۱ ج ۳ [illegible]

کے جواب میں حق لاتے ہیں وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا اور حسب ضرورت
بہتر تفسیر بھی لاتے ہیں۔ جب کوئی مسئلہ وضاحت طلب ہوتا ہے تو اسکی
وضاحت کر دیتے ہیں۔ اس بتدریج نزول کے ذریعے تمام مسائل حل ہوتے
جاتے ہیں۔ اگر پورا قرآن یک مشت نازل کر دیا جاتا تو اس کی تفہیم، ازالہ شبہات
اور عملدرآمد کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہذا اس کا آہستہ آہستہ نزول ہی بہترین صورت
نزول ہے۔

چہروں کے بل بعث

آگے منکرین کتاب و رسالت کا انجام بھی بیان کیا گیا ہے اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ وہ لوگ
جو اٹھائے جائیں گے اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف۔ یہ لوگ میدان محشر میں پاؤں
کی بجائے سر کے بل چلیں گے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ پوچھنے والے نے
پوچھا کَیْفَ یُحْشَرُ الْکَافِرُ عَلٰی وَجْهِهٖ یعنی کافر آدمی اپنے
چہرے کے بل کیسے اٹھایا جائے گا۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا
اَلَیْسَ الَّذِیْ اَمْشَاهُ عَلٰی رِجْلَیْهِ فِی الدُّنْیَا
قَادِرًا عَلٰی اَنْ یُّمْشِیَهٗ عَلٰی وَجْهِهٖ جس مالک الملک
نے اسے دنیا میں پاؤں پر چلایا، کیا وہ چہرے کے بل چلانے پر قادر نہیں ہے؟
وہ سروں کے بل چلتے ہوئے جہنم کی طرف جائیں گے۔ ترمذی شریف کی روایت[۲]
میں تین گروہوں کا ذکر ہے اِنَّکُمْ تُحْشَرُوْنَ رِجَالًا وَّرُکْبَانًا
وَّتُجَرُّوْنَ عَلٰی وُجُوْهِکُمْ بعض پیدل چلیں گے بعض سواریوں
پر اور بعض سر کے بل دوڑتے ہوئے جائیں گے۔ ایک حدیث[۳] میں اس
طرح آتا ہے کہ حشر کے دن تین قسم کے لوگ ہوں گے۔ بعض کو زیادہ فخر
نہیں ہوگی اور وہ سواری پر سوار ہو کر جائیں گے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے
جو پاؤں پر دوڑتے ہوئے جائیں گے۔ اور تیسرا گروہ ایسا ہوگا جسے فرشتے
چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔

۱ے تفسیر مدارک ص ۱۶۳ [illegible] مظہری ص ۹ ۲ے تفسیر [illegible] ص ۹ ۳ے تفسیر ابو السعود ص ۹ (فیاض)

فرمایا جن کو چہروں کے بل اٹھایا جائے گا اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وہ ٹھکانے کے اعتبار سے بدترین قسم کے لوگ ہونگے۔ اِن کو بہت ہی بُرا ٹھکانا میسر آئیگا۔ وَّاَضَلُّ سَبِیْلًا اور راستے کے اعتبار سے بھی یہ لوگ سخت گمراہ ہوں گے۔ دنیا میں بھی انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا اور گمراہی میں مبتلا رہے آگے حشر میں بھی یہ گمراہ کن راستے کے مسافر ہوں گے۔ دنیا میں انہوں نے قرآن و رسالت کا انکار کیا، توحید باری تعالیٰ سے بیگانہ رہے۔ کسی اچھے راستے کی طرف جانا نہ ہوا۔ لہٰذا آخرت میں بھی یہ بھٹکتے ہی پھریں گے۔ اور انہیں جنت والا راستہ میسر نہیں آئیگا۔ دوسرے مقام پر ہے وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (بنی اسرائیل - ۷۲) جو اس دنیا میں اندھا یعنی ہدایت سے محروم رہا اُس کو جنت کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔ وہ اس لحاظ سے وہاں پر اندھا ہی ہو گا اور بالآخر جہنم کی تاریکی میں داخل ہو جائے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ
هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝۳۵ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۝۳۶ وَقَوْمَ نُوْحٍ
لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ
وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۷ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَ
اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝۳۸ وَكُلًّا
ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝۳۹ وَلَقَدْ
اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ
يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝۴۰

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ۔ اور بنایا ہم نے اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو معاون ۝۳۵ پس ہم نے کہا کہ تم دونوں جاؤ اُس قوم کی طرف جنہوں نے جھٹلایا ہے ہماری آیتوں کو ۔ پھر (بالانتہاء) ہم نے ہلاک کر دیا اُن کو ہلاک کرنا ۝۳۶ اور قومِ نوح ، جب کہ جھٹلایا انہوں نے اللہ کے رسولوں کو ، تو ہم نے اُن کو پانی میں غرق کر دیا ۔ اور بنا دیا ہم نے اُن کو لوگوں کے لیے ایک نشانی ۔ اور تیار کیا ہے ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب ۝۳۷

اور عاد اور ثمود کو، اور کنوئیں والوں کو، اور بہت سی جماعتیں اس کے درمیان (۳۸) اور ہر ایک کے لیے ہم نے مثالیں بیان کیں، اور سب کو ہم نے ہلاک کیا ہلاک کرنا (۳۹) اور البتہ تحقیق یہ (مشرک) لوگ گزرتے ہیں اُس بستی پر جس پر بری بارش برسائی گئی تھی۔ کیا یہ اس کو نہیں دیکھتے؟ بلکہ یہ لوگ نہیں امید رکھتے مگر دوبارہ جی اٹھنے کی (۴۰)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے رسالت کے بارے میں اعتراضات کے جوابات دیے اور اُن کے بُرے انجام کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے نبی اور اُس کے پیروکاروں کو تسلی بھی دی۔ فرمایا منکرین توحید و رسالت کی طرف سے صرف آپ کو ہی اذیتیں نہیں پہنچائی گئیں بلکہ اللہ کے ہر نبی کے ساتھ دشمنوں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ آپ گھبرائیں نہیں بلکہ اپنا کام کرتے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والا اور آپ کا مددگار ہے۔

کفار و مشرکین نے یہ اعتراض بھی کیا کہ قرآن پاک کو اللہ کے نبی پر یکمشت کیوں نہیں نازل کیا گیا، حالانکہ سابقہ کتب کا دیہ تورات، انجیل اور دیگر صحیفے انبیاء علیہم السلام پر یکبارگی نازل ہوئے۔ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ قرآن کے بتدریج نزول کا مقصد نبی کے دل کی پختگی اور آیات کا انضباط ہے۔ نیز اس ضمن میں معترضین جو سوال وقتاً فوقتاً پیش کرتے ہیں اُن کا جواب بھی ملتا رہتا ہے اور قرآن پاک کی بہتر تفسیر پیش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ نے نافرمانوں کے بُرے انجام کا کچھ تذکرہ بھی بیان فرمایا۔

اب آج کی آیات بھی پیغمبر علیہ السلام اور اہل ایمان کے لیے بطور تسلی کے ہیں۔ اللہ نے بعض انبیاء اور اُن کی قوموں کا حال ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نافرمانوں کی ایک سی روش رہی ہے لہٰذا اس بات سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ اہل مکہ اللہ کے آخری نبی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے کچھ حالات

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن کا واسطہ بھی ایک جابر شخص فرعون کے ساتھ تھا مگر اللہ کے اس عظیم نبی نے خدا کا پیغام نہایت ناساز گار حالات میں لوگوں تک پہنچایا۔ اُن کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا۔ اور بالآخر اللہ نے فرعون اور اس کے حواریوں کو تباہ و برباد کیا۔ پھر بعض دوسری اقوام کی تباہی کا حال بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح حضور علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ صبر کا دامن نہ چھوڑیں۔ بالآخر کامیابی و کامرانی انہیں کے حصے میں آئے گی۔ اور وہ دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر سرخرو ہوں گے۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا کی۔ اللہ نے بڑا احسان کیا کہ بنی اسرائیل کے لیے تورات جیسی عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ اللہ نے تورات کی تعریف قرآن میں بھی بیان کی ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (المائدہ - ۴۴) ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اللہ کے بہت سے نبی اور نیک لوگ اس کتاب کی تعلیم دیتے رہے۔ موجودہ بائبل میں پہلے پانچ بڑے باب تورات کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ چار انجیلیں، زبور اور ۳۹ صحائف ہیں۔

فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا اور ہم نے اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اُن کا معاون بنایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود اللہ کی بارگاہ میں دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (۲۹) هٰرُوْنَ اَخِي (۳۰) (سورہ طٰہٰ) کہ میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو میرا معاون بنا دے کیونکہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا (القصص - ۳۴) وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ تو اللہ نے ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا اور پھر فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

بِاٰیٰتِنَا ہم نے کہا کہ تم دونوں اُس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے۔ اللہ کے نبیوں کو حکم ہوا کہ فرعون اور اس کے حواریوں کے پاس جا کر پیغام اُن تک پہنچاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام دو قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ایک تو ان کی اپنی قوم بنی اسرائیل تھے اور دوسرے قبطی لوگ تھے جن کا بادشاہ فرعون تھا۔ بنی اسرائیل تو اس وقت فرعونیوں کے غلام تھے۔ اس لیے اللہ نے سب سے پہلے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس تبلیغِ حق کے لیے بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام نے چالیس سال تک اللہ کا پیغام قومِ فرعون کو پہنچایا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ بنی اسرائیل کو زیادہ تکلیفیں دینے لگے۔ کبھی موسیٰ علیہ السلام بات کرتے اور ہارون علیہ السلام اُن کی تائید کرتے اور کبھی ہارون علیہ السلام حسبِ موقع بات کرتے۔ مگر فرعون بڑا جابر اور مستبد تھا، اُس پر اس وعظ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر جیسا کہ دوسری سورتوں میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحرِ قلزم پر پہنچ گئے۔ جب فرعون کو پتہ چلا تو اُس نے مع لشکر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے تو اللہ نے سمندر میں راستہ بنا دیا اور وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ مگر فرعون مع لاؤ لشکر اسی راستے پر سمندر کے عین وسط میں پہنچا تو اللہ نے فرمایا فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ہم نے اُن کو جڑ بنیاد سے ہی اکھاڑ دیا۔ اللہ نے پانی کو حکم دیا، وہ آپس میں مل گیا اور ساری قوم وہیں غرق ہو گئی۔ اُن میں سے ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔ البتہ جو لوگ پیچھے مصر میں رہ گئے تھے، وہ بچ گئے۔ اللہ نے اپنے نبی آخر الزمان کی توجہ اِن حالات کی طرف دلائی ہے کہ دیکھو ہم نے مجرموں کو کس طرح صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ مجرموں کو مہلت دیتا رہتا ہے۔ پھر آخر کار ان کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ آپ حوصلہ رکھیں آپ کے دشمن بھی ناکام ہوں گے اور کلمۂ حق ہی بلند ہو گا۔

قوم نوح کی ہلاکت

فرمایا۔ ذرا قوم نوح کا حال بھی دیکھو وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ
جب قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی اَغْرَقْنٰهُمْ اُن کو بھی ہم نے پانی
میں ڈبو دیا۔ یہاں پر رُسل جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ اُس وقت
اللہ کے واحد نبی نوح علیہ السلام ہی اُن کو اللہ کا پیغام سناتے تھے۔ مفسرین کرام[1]
فرماتے ہیں کہ اُمت تو ہر شخص کسی ایک نبی کی ہوتا ہے۔ مگر ایمان تمام انبیاء
اور رُسُل پر لانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی ایک نبی کا انکار سارے انبیاء
کے انکار کے مترادف ہوتا ہے۔ قوم نوح نے اگرچہ نوح علیہ السلام کا
انکار کیا تھا۔ اُن کا جھٹلانا سارے رسولوں کا جھٹلانا ٹھہرا۔ اس لیے یہاں پر جمع
کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کا دین
تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ جیسے مشہور حدیث[2] میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے:
نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ اَوْلَادُ عَلَّاتٍ دِيْنُنَا وَاحِدٌ
یعنی ہم انبیاء کا گروہ علاتی بھائی ہیں جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف
ہوں۔ ہمارا باپ یعنی دین تو سب کا ایک ہی ہے۔ البتہ ہماری مائیں یعنی
شرائع مختلف ہیں۔ جو دین آدم علیہ السلام کا تھا۔ وہی عیسیٰ علیہ السلام کا تھا اور
وہی نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

بہرحال جیسا کہ سورۃ ہود اور دیگر سورتوں میں موجود ہے کہ نوح علیہ السلام
کی ساڑھے نو سو سال تبلیغ کے باوجود چند گنتی کے آدمی ایمان لائے اور باقی
ساری قوم نے آپ کو جھٹلایا جس کے نتیجے میں اُن پر ہلاکت و تباہی آئی
چالیس شب و روز[3] تک آسمان سے موسلادھار بارش برستی رہی اور نیچے سے
زمین کے سوتے بھی پھوٹ پڑے اور اس طرح پانی کی اس قدر فراوانی ہو
گئی کہ اونچی سے اونچی پہاڑی کے اوپر بھی بیس بیس فٹ تک پانی چلا
گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نہ کوئی جانور بچ سکتا تھا اور نہ کوئی انسان
سوائے اُن کم و بیش اسی آدمیوں کے جو نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو گئے

۱ قرطبی صفحہ ۳۱ ج ۱۳ ۲ ابن کثیر صفحہ ۱۹۶ ج ۱ ۳ تفسیر کبیر صفحہ ۱ ج ۲۴ ۴ السراج المنیر صفحہ ۹۵ ج ۲ ۵ فیاض

تو فرمایا اس طرح ہم نے ان کو پانی میں ڈبو دیا وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً اور ان نافرمانوں کو ہم نے باقی لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا اور ظلم کرنے والوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے جو انہیں قیامت کو ملے گا۔ ظلم میں ہر قسم کا ظلم و تعدی، صغائر، کبائر، حق تلفی، چوری، ڈاکہ، زنا، دھوکہ فریب آ جاتے ہیں۔ تاہم سب سے بڑا ظلم عقیدے کا ظلم کفر اور شرک ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ-۲۵۴) کفر کرنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ نیز فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان-۱۳) شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

عاد ثمود اور کنوئیں والوں کی تباہی

پھر فرمایا وَعَادًا وَّثَمُوْدَا عاد اور ثمود اقوام کی ہلاکت کا حال بھی دیکھیں کہ ان کو ہم نے کس طرح تباہ و برباد کیا۔ ان قوموں کا حال سورۃ اعراف، سورۃ ہود اور دیگر سورتوں میں مذکور ہے۔ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ اور کنوئیں والوں کو بھی اللہ نے ہلاک کیا۔ یہ کنوئیں والے کون لوگ تھے، کسی صحیح حدیث میں ان کے کوائف نہیں ملتے۔ البتہ امام ابن جریر طبری[1] نے کعب احبار کی ایک ضعیف روایت نقل کی ہے جو قابل اعتماد نہیں۔ بہر حال بعض کہتے ہیں کہ یہ قوم یمامہ کے مقام پر آباد تھی اور بعض[2] اسے یمن یا یمامہ کے باشندے بتلاتے ہیں۔ بعض[3] نے ان کا وطن شام کا مقام انطاکیہ بتایا ہے۔ مفسرین نے اس قوم کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے کہ اللہ نے ان کی طرف بنا ایک نبی مبعوث فرمایا۔ بعض[4] کہتے ہیں ان کا نام حنظلہ ابن صفوان تھا جو کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی نبی نہیں ہوا۔ سوائے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ص ۱۳ / ۹۲ [2] مظہری ص ۱/۲ و معالم التنزیل ص ۹۳/۳ و خازن ص ۱/۳

[3] معالم التنزیل ص ۹۳/۳ و خازن ص ۱۱/۳ [4] معالم التنزیل ص ۹۳/۳ و خازن ص ۱/۳ (فیاض)

علیہ وسلم کے۔ بہر حال کوئی بستی تھی جہاں اللہ نے اپنا نبی مبعوث فرمایا۔ اس بستی میں ایک سیاہ رنگ کے حبشی غلام کے سوا کوئی شخص ایمان نہ لایا۔ ایک دن اُن کافروں نے منصوبہ بنایا کہ اللہ کا نبی ہمیں ہر روز تنگ کرتا ہے۔ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ اسے فلاں کنوئیں میں پھینک کر اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کے نبی کو کنوئیں میں پھینکا اور اس کے منہ پر ایک بڑی چٹان رکھ دی تاکہ اللہ کا نبی باہر نہ نکل سکے۔ وہ ایماندار حبشی غلام دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو کھانا لاکر کسی طرح اللہ کے نبی کو کنوئیں میں پہنچا دیتا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ ایک دن اس حبشی نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی آپ کے پاس کنوئیں میں آجاؤں مگر اللہ کے نبی نے منع کر دیا۔ ایک دن بستی والے کنوئیں پہ آئے تاکہ دیکھیں کہ اللہ کا نبی زندہ بھی ہے یا نہیں۔ جونہی انہوں نے چٹان کو ذرا سا سرکا کر آواز دی تو نیچے سے آواز آئی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود - ۶۱) لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ جب اُس قوم نے نبی کو زندہ پایا تو انہوں نے مٹی اور پتھر ڈال کر کنوئیں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ پھر اللہ کا عذاب آیا اور وہ سارے کے سارے ہلاک ہوئے[1]۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اُن لوگوں نے پتھر کو ہٹا دیا تھا۔ اللہ کے نبی باہر نکل آئے اور وہ لوگ تائب ہو گئے مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے نبی کو ہلاک ہی کر دیا کیونکہ یہاں قوموں کی ہلاکت کا حال ہی بیان ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہلاکت والی بات راجح ہے[2]۔

دیگر اقوام کا حال

فرمایا وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا اس کے درمیان ہم نے اور بھی بہت سی قوموں اور جماعتوں کو ہلاک کیا۔ جب انہوں نے اللہ کے نبیوں کی نافرمانی کی، اُن کو اذیتیں پہنچائیں، اللہ کی توحید کا انکار کیا تو اُن

---

[1] تفسیر کبیر صفحہ ۹۳ ج ۲۴ وطبری صفحہ ۱۴ ج ۱۹ وقرطبی صفحہ ۳۲ ج ۱۳ وابن کثیر صفحہ ۳۱۹ ج ۳

[2] ابن کثیر صفحہ ۳۱۹ ج ۳ وتفسیر البحر المحیط صفحہ ۴۹۹ ج ۶ ودر منثور صفحہ ۶۸ ج ۵ (فیاض)

پر بھی تباہی آئی۔ ایسی بعض قوموں اور ان کے انبیاء کا ذکر توراۃ میں ملتا ہے اور بعض کے حالات قرآن پاک نے بیان کیے ہیں۔ تاہم بہت سے ایسے انبیاء اور اُن کی قوموں کا حال بالکل بیان نہیں کیا۔ جیسے سورۃ المؤمن میں ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (آیت ۔ ۷۸) ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے آپ کے آیا ہے اور بعض کا نہیں۔ بہرحال فرمایا کہ ہم نے بعض دیگر قوموں کو بھی تباہ و برباد کیا جنہوں نے اللہ کے نبیوں کی تکذیب کی تاہم وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ اور سب کے لیے ہم نے مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ جب اللہ کا نبی آتا ہے تو وہ اپنی زبان میں خدا کا پیغام لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا ہے اور پورے طریقے سے بات سمجھاتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر یہی ہوا کہ لوگوں نے اللہ کے نبی کو جھٹلایا، توحید اور قیامت کا انکار کیا۔ اور کفر وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ایسے تمام افراد کو ہم نے ملیا میٹ کر دیا۔ اُن میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔

فرمایا، لَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ اور یہ مکے والے اُس بستی پر سے گزرتے ہیں جس پر بری بارش برسائی گئی۔ مکے سے شام و فلسطین کے راستے پر وہ بستیاں آباد تھیں جن کو اللہ نے بری بارش برسا کر تباہ کیا۔ ان پر پتھروں کی بارش ہوئی اور انہیں زمین سے اُوپر اٹھا کر نیچے پٹخ دیا گیا۔ فرمایا، مکے والے تجارتی سفر پر جاتے ہیں تو ان اجڑی ہوئی بستیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا کیا یہ اُن کو دیکھتے نہیں؟ یعنی ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ امام ابن کثیرؒ اور دیگر مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں پر بڑے بڑے چھ شہر آباد تھے جن کی آبادی چار لاکھ نفوس سے زیادہ تھی وہاں ان بستیوں

کے کھنڈرات اور بحرِ میت بھی نظر آتا ہے۔ وہاں کوئی انسان زندہ نہ بچا۔ آج بھی بحرِ میت کے بعض حصوں میں کوئی آبی جانور بھی زندہ نہیں رہتا۔ یہ ساری نشانیاں ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ مکے والے ان کو دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے

فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا کہ یہ لوگ مر کر دوبارہ جی اُٹھنے پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ اگر ان کو بعث بعد الموت اور جزائے عمل کی فکر ہوتی تو نافرمانی کی اتنی بڑی جرأت نہ کرتے۔ دراصل عقیدہ قیامت کا انکار لوگوں کو آخرت کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے لہٰذا وہ غافل ہو جاتے ہیں اور بالآخر اللہ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ﴿٤١﴾ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٢﴾ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ﴿٤٣﴾ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾

ترجمہ:- اور جب دیکھتے ہیں یہ لوگ آپ کو، تو نہیں بناتے آپ کو مگر ٹھٹھا کیا ہوا۔ اور کہتے ہیں کیا یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿۴۱﴾ البتہ تحقیق یہ قریب تھا کہ یہ ہم کو گمراہ کر دیتا ہمارے معبودوں سے اگر ہم صبر نہ کرتے اُن پر۔ اور عنقریب جان لیں گے جس وقت دیکھیں گے یہ عذاب کو کہ کون سب سے زیادہ بہکا ہوا راستے کے اعتبار سے ﴿۴۲﴾ اے پیغمبر! کیا آپ نے دیکھا ہے اس شخص کو کہ جس نے بنا لیا ہے معبود اپنی خواہش کو کیا آپ اُس کے ذمہ دار ہیں ﴿۴۳﴾ کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ اُن میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا عقل رکھتے ہیں؟ نہیں، یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ

بھٹکے ہوئے راستے کے اعتبار سے (۲۴)

ربطِ آیات

اس رکوع کی پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دی۔ ان انبیائے کرام کو بڑے سرکش اور مغرور لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اللہ نے ان کے غرور کو توڑا اور ان کو تباہ و برباد کیا۔ اللہ نے نوح علیہ السلام کا تذکرہ بھی فرمایا کہ آپ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، پھر قوم عاد، ثمود اور کنوئیں والوں نے اللہ کے نبیوں کے ساتھ زیادتی کی تو ان کو بھی ہلاک کیا گیا۔ درمیان میں بہت سی دیگر قومیں بھی گزری ہیں جن کا تذکرہ نہ تو کتب سماویہ نے کیا ہے اور نہ ہی تاریخ نے انہیں محفوظ رکھا ہے ہر قوم کے لیے اللہ نے رسول بھیجے، مثالیں بیان کیں، ان کو ہر طریقے سے سمجھایا مگر اکثر لوگوں نے تسلیم نہ کیا اور ہلاک ہوئے۔ پھر ان بستیوں کا تذکرہ جن پر سے اہل مکہ تجارتی سفر کے دوران گزرتے ہیں۔ اللہ نے ان پر بُری یعنی پتھروں کی بارش برسا کر انہیں نہس نہس کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ قیامت اور جزائے عمل کا انکار کر دیتے ہیں۔ وہ آخرت سے غافل اور لاپرواہ ہو جاتے ہیں اور یہی چیز ان کی ہمیشہ کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

باطل پر ڈٹے رہنے کی خواہش

اس سورۃ میں زیادہ تر انکارِ رسالت کا مسئلہ بیان ہوا ہے لوگ اللہ کے نبیوں پہ طرح طرح کے اعتراض کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے اور اہل ایمان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ آج کی پہلی آیت میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا رَاَوْكَ جب کفار و مشرکین آپ کو دیکھتے ہیں اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا تو بناتے ہیں آپ کو ٹھٹا کیا ہوا یعنی آپ کا تمسخر اڑاتے ہیں ______ کہتے ہیں کہ اللہ کو نبوت و رسالت کے لیے ابوطالب کا یتیم بھتیجا ہی ملا تھا۔ نہ اس کے پاس مال نہ جانور، نہ باغات نہ محلات اور نہ نوکر چاکر، بھلا یہ کیسے نبی جو

ہو سکتا ہے ؟ کہتے تھے اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا کیا یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے ؟ پھر یہ بھی کہتے اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا قریب تھا کہ یہ شخص ہمیں ہمارے معبودوں سے گمراہ کر دیتا ہے لَوْ لَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا اگر ہم ان پر صبر نہ کرتے یعنی ان پر مستحکم نہ رہتے۔ اس شخص کی تقریر بڑی پر اثر ہے اگر ہمارے معبودوں کے متعلق ہمارا عقیدہ ذرا بھی کمزور ہوتا تو یہ شخص ہمیں بدظن کر کے گمراہ کر دیتا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کو اپنے معبودان باطلہ پر پختگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (نوح - ۲۳) کہتے تھے اس شخص کے کہنے میں آکر اپنے معبودوں وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑ بیٹھنا، بلکہ ان پر اپنا عقیدہ مضبوط رکھنا۔ ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ہود - ۵۰) لوگو عبادت صرف اللہ کی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مگر قوم نے یہی جواب دیا وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (ہود - ۵۳) ہم تیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ جب عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے تو انہیں جلدی ہی معلوم ہو جائے گا مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا کہ کون زیادہ بہکا ہوا ہے راستے کے اعتبار سے آج تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی ہمیں معبودوں سے ہٹا کر غلط راستے پر ڈال رہا ہے مگر جب قیامت کا دن آئے گا۔ اور یہ لوگ مستحق عذاب ٹھہریں گے تو پھر انہیں پتہ چلے گا کہ غلط راستے پر کون تھا۔

خواہشات نفسانی بطور معبود

اِسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ایک بہت بڑی قباحت کا ذکر

کیا ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چلنا اس کو معبود بنا لینے کے مترادف ہے۔ یہ بیماری انسانوں میں ابتداء سے چلی آرہی ہے، اب بھی ہے اور تا قیامِ قیامت موجود رہیگی۔ حق و باطل میں امتیاز نہ کرنا خواہشِ نفس کو پورا کرنا ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ اسی خواہش میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں اور پھر جدھر خواہش چاہتی ہے اُدھر ہی چلتے رہتے ہیں یہ بات اللہ نے یہاں پر اس طرح بیان فرمائی ہے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا آپ نے اُس شخص کی طرف دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو ہی اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ یہاں پر الٰہ کو مقدم اور ہویٰ کو مؤخر کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ ترکیب بات میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے جس کا مطلب ہے کہ ایسے لوگوں کے نزدیک صرف خواہش ہی اُن کا معبود ہے۔ جدھر خواہش جاتی ہے۔ ادھر ہی وہ جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک حق اور باطل میں امتیاز کرنے والی اور کوئی چیز نہیں ہے۔

خواہش کی آفرینش کبھی خاندان کی وجہ سے ہوتی ہے، کبھی سوسائٹی کی وجہ سے اور کبھی علاقائی رسم و رواج کی وجہ سے۔ لوگ قانون کی پابندی کی پرواہ کیے بغیر اسی خواہش کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خطیرۃ القدس کا ممبر بننے کی بجائے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ مفسرین کرام حضرت ابوامامہؓ سے روایت بیان کرتے ہیں جسے مفسر طبریؒ، صاحبِ حلیۃ الاولیا اور مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَا تَحْتَ ظِلِّ السَّمَآءِ مِنْ اِلٰهٍ يُّعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ هَوًى يُّتَّبَعُ یعنی آسمان کے سائے کے نیچے اللہ کے سوا سب سے بڑا معبود خواہش ہے۔ جس کی اتباع کی جاتی ہے۔ فرمایا اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا، کیا آپ اُس کے ذمہ دار

لہ تفسیر بیان القرآن صہ ۱۵ (فیاض)

ہیں ۔ مطلب یہ کہ خواہش کے پجاریوں کی ذمہ داری آپ پر نہیں آتی بلکہ اللہ تعالٰی خود ہی ان سے قیامت کو نپٹے گا اور ان سے وہی سلوک کرے گا جس کے یہ لوگ مستحق ہیں۔

چار چیزیں ذریعہ آزمائش

تفسیر حسینی[1] والے مفسر لکھتے ہیں کہ آدمؑ اور حوا کے ملاپ سے انسان پیدا ہوا اور جب شیطان کا ملاپ دنیا سے ہوا تو اس سے خواہش پیدا ہوئی۔ گویا شیطان کا عقد دنیا سے ہوا ہے۔ اس بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

اِنِّی بُلِیتُ بِاَرْبَعٍ مَّا سُلِّطُوا
اِلَّا لِعَظْمِ بَلِیَّتِی وَشَقَائِی
اِبْلِیْسُ وَالدُّنْیَا وَنَفْسِی وَالْھَوٰی
کَیْفَ الْخَلَاصُ وَکُلُّھُمْ اَعْدَائِی

میری آزمائش اور شقاوت کو بڑا بنانے کے لیے مجھے چار چیزوں سے آزمایا گیا ہے یعنی یہ چیزیں مجھ پر مسلط کی گئی ہیں۔ ابلیس، دنیا، نفس اور خواہش۔ یہ ساری چیزیں انسان کی دشمن ہیں جو اسے حق کے راستے سے بہکاتی ہیں۔ ابلیس نے تو شروع سے ہی وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ انسان کو قیامت تک گمراہ کرتا رہے گا۔ دنیا بھی ہمیشہ انسانوں کو اپنی طرف راغب کر کے غفلت میں مبتلا کرتی ہے۔ نفس کے متعلق قرآن میں موجود ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ (یوسف - ۵۳) انسان کا نفس اُسے ہمیشہ برائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اگر اس پر قابو پا لیا جائے تو پھر یہ نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ بنتا ہے۔ اور خواہش ایک ایسی چیز ہے جسے انسان الوہیت کا درجہ دے دیتا ہے اور پھر اسی کے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ بہر حال خواہش کے پیچھے لگ کر لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ تو فرمایا کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے خواہش کو ہی اپنا معبود بنا رکھا ہے؟

[1] تفسیر حسینی ص ۱۴۲ / ۲۲ (فیاض)

قانون کی پابندی

قانون کی پابندی ہر مکلف کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مگر اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے والی اولین چیز انسان کی خواہش ہے۔ جب انسان اپنی خواہش کے پیچھے چل نکلتا ہے تو پھر وہ قانون کی کچھ پروا نہیں کرتا بلکہ وہی کچھ کرتا ہے جو اُس کی خواہش ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی حکمت کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ قانون کی پابندی کے بغیر انسان حظیرۃ القدس کے پاک مقام تک نہیں پہنچ سکتا مگر اسی کی اکثر لوگ خلاف ورزی کرتے ہیں حالانکہ قرآن پاک نے قانون کی پابندی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ مثلاً فرمایا یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ (البقرہ - ۱۷۲) اے لوگو! ہماری عطا کردہ روزی میں سے پاک چیزیں کھاؤ۔ دوسری جگہ آیا ہے یَاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ (البقرہ - ۲۱) اے لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اپنے عقیدے کو پاک کرو۔ جب تک عقیدہ پاک نہیں ہوگا۔ اخلاق اور عمل پاک نہیں ہوگا۔ جس کی فکر پاک نہیں ہے اس کا ذہن، روح، دل اور دماغ پاک نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ (التوبہ - ۲۸) مشرک لوگ سراپا ناپاک ہیں کیونکہ اُن کی فکر میں شرک کی ملاوٹ ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ (الحج - ۳۰) بت پرستی کی گندگی سے بچو کہ یہ بھی نجاست ہے۔ غرضیکہ قانون کی پابندی کے بغیر انسان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہمیشہ تنزل کا شکار رہتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ (البقرہ - ۱۶۸) شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو کہ یہی خواہش کی پیروی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لوگ خواہش کو ہی اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔

جانوروں سے بدتر انسان

ارشاد ہوتا ہے اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ

اَوْ یَعْقِلُوْنَ کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ ان مشرکوں میں سے اکثر لوگ سُنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟ فرمایا نہیں۔ اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ یہ تو جانوروں کی مانند ہیں بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں بے عقل لوگوں کے جانوروں سے بھی بدتر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جانوروں میں تو اللہ نے عقل کا مادہ ہی نہیں رکھا جب کہ انسان کو عقل و شعور جیسا بہترین جوہر عطا کیا جس کے ذریعے وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکتا ہے۔ جانور تو زیادہ سے زیادہ جہل بسیط میں مبتلا ہوں گے کہ انہیں شعور ہی نہیں مگر کافر اور مشرک جہل مرکب کا شکار ہیں جو صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہدایت کو گمراہی سے تعبیر کر رہے ہیں اور گمراہی کو ہدایت سمجھ رہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک روش ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

جانور ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے مالک اور محسن کو پہچانتی ہے اور اس کا حکم مانتی ہے۔ کسی بھی خدمت گزار جانور کو آواز دو تو وہ فوراً متوجہ ہوتا ہے جانور کھلانے پلانے والے مالک یا کارندے کی آواز پر چونک پڑتا ہے۔ مگر کافر اور مشرک اشرف المخلوقات کا فرد ہونے کے باوجود اپنے مالک حقیقی اور محسن حقیقی کو ذرا نہیں پہچانتا اور نہ ہی اُس کی آواز پر لبیک کہتا ہے

صاحب درس کا جانور کے بارے میں ذاتی تجربہ

ہم نے ایک بلی پال رکھی تھی جو جوان ہوئی پھر اُس نے بچے دیے۔ وہ بیچاری بیمار ہوگئی۔ اندر آنا چاہتی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ آخر دیوار پھلانگ کر اندر آئی اور میرے پاؤں کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا اسے دودھ پلاؤ، مگر اس نے نہ پیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے راستے باہر نکلی اور پھر پتہ چلا کہ بیماری میں مر گئی ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ بلی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اور آخری وقت سلام کرنے کے لیے آئی تھی۔ مقصد یہ کہ جانوروں میں بھی اتنا شعور ہوتا ہے کہ وہ اپنے محسن کو پہچانتے ہیں۔ مگر

انسان جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے جو اپنے حقیقی محسن کو نہیں پہچانتا بلکہ یا تو اس کا انکار کر کے کافر بن جاتا ہے اور یا پھر غیروں کے دروازے پر دستک دے کر مشرک ہو جاتا ہے۔ جانور بے شعور ہو کر بھی اپنا مقصدِ حیات پورا کر رہا ہے جب کہ انسان انسان ہو کر بھی اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہے اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ اپنی خواہش کو ہی اپنا معبود بنا لیتے ہیں، وہ حقیقی معبود سے کٹ جاتے ہیں اور ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ لِبَاسًا وَّالنَّوۡمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا ﴿۴۷﴾

ترجمہ:- (اے مخاطب) کیا تو نے نہیں دیکھا اپنے پروردگار کی طرف کہ اس نے سائے کو کیسے دراز کیا۔ اور اگر وہ چاہتا تو بنا دیتا اس کو ٹھہرا ہوا۔ پھر ہم نے مقرر کیا سورج کو اس کے اوپر راہ بتلانے والا ﴿۴۵﴾ پھر ہم نے سمیٹ لیا اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹنا ﴿۴۶﴾ اور وہ وہی ذات ہے جس نے بنائی ہے تمہارے لیے رات بمنزلہ لباس کے اور نیند کو ذریعہ آرام۔ اور بنایا ہے دن کو اٹھ کر باہر نکلنے کا ذریعہ ﴿۴۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں تسلی کا مضمون تھا۔ اس کے بعد مشرکوں کا رد تھا۔ عبرت کے لیے بعض سابقہ اقوام کا حال بیان ہوا اور اُن کی سزا کا ذکر کیا گیا۔ اللہ نے فرمایا کہ کافر اور مشرک لوگ اللہ کے نبی کو دیکھ کر اُس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ اور اپنے باطل عقیدے پر پختگی کا اظہار کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ عنقریب عذابِ الٰہی کو دیکھیں گے تو پھر انہیں پتہ چلے گا کہ گمراہ کون تھا اور راہِ راست پر کون۔ نیز یہ کہ ان لوگوں سے قبولیتِ حق کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ جو شخص اپنی خواہش کو ہی معبود بنا لیتا ہے، وہ حق و باطل کی تمیز سے

محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ نہ تو حق بات سنتے ہیں اور نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر کیونکہ جانور تو اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر رہے ہیں مگر مشرک اور کافر اس سے بھی عاری ہیں۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض دلائل قدرت بیان فرمائے ہیں اور اسی ضمن میں نبوت و رسالت کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔

سایہ بطور دلیلِ قدرت

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ کفار و مشرکین سننے اور سمجھنے سے محروم ہیں اگر یہ دلائل قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، تو توحید خداوندی آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی۔ اب آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دلیل توحید ہی کے سلسلے میں سائے کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف یہاں پر رویت بصری مراد نہیں بلکہ رؤیت قلبی اور رؤیت علمی مراد ہے کیا تمہارے علم و فہم میں یہ بات نہیں كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ کہ تیرے پروردگار نے سائے کو کس طرح دراز کیا ہر چیز کا سایہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور وہ چاہتا تو اس سائے کو ساکن یعنی ایک جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا اور ہر چیز کا سایہ گھٹنے بڑھنے کی بجائے ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم رہتا۔ گویا سایہ میں کمی بیشی دلیل قدرتِ خداوندی ہے۔ پھر فرمایا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا کہ ہم نے سورج کو اس پر راہ بتلانے والا بنایا ہے۔ سورج کی روشنی کی وجہ سے چیزوں کے سائے بنتے اور آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ گویا سائے کا گھٹنا اور بڑھنا سورج پر موقوف ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز کا سایہ مغرب کی جانب پھیلتا ہے۔ پھر جوں جوں سورج اوپر کی طرف آتا ہے۔ سایہ گھٹتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ عین دوپہر کے وقت سایہ اپنے اصل کے ساتھ آکر مل جاتا ہے۔ پھر جب سورج مغرب کی طرف سفر شروع کرتا ہے تو سایہ مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور غروبِ شمس کے ساتھ

ہی سایہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ سائے کا وجود سورج کے ساتھ متعلق ہے۔

سائے کی نوع

قرآن و سنت میں سائے کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ سایہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے۔ بعض حالات میں سایہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے جب کہ بعض حالات میں یہ ایک نعمت ہوتا ہے۔ دھوپ اور شدید گرمی میں انسان کسی درخت، پہاڑ یا دیوار کے سائے کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان موجود ہے کہ جب مجاہد جہاد کے لیے جاتے ہیں تو اس وقت بہترین صدقہ ظِلُّ فُسْطَاطٍ یعنی خیمہ کا سایہ ہے۔ مجاہدین کو خیمہ مہیا کر دینا جسے وہ دوران سفر و حضر سائے کے طور پر استعمال کر سکیں، بہت بڑی نیکی ہے۔ سائے کا ذکر دوزخیوں کی سزا کے سلسلے میں بھی آتا ہے فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (الواقعہ ۴۲-۴۳) ان کے لیے تند و تیز ہوا اور سخت تپش ہوگی۔ نیز دھوئیں کا سایہ ہوگا، جو بہت ہی تکلیف دہ ہوگا۔ جس طرح ہائیڈروجن بم سے زہریلا دھواں نکل کر تباہی پھیلاتا ہے۔ اسی طرح دوزخیوں کے لیے بھی نہایت ہی مہلک دھوئیں کا سایہ ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت کا شاعر ابو کبیر ہذلی اپنے شکار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

وَلَقَدْ صَبَرْتُ عَلَى السَّمُوْمِ يُكِنُّنِيْ
قَرِدٌ عَلَى اللِّيْتَيْنِ غَيْرُ مُرَجَّلِ

میں نے سخت لو میں بڑا صبر کیا، جب کہ میرے پاس کوئی چیز نہ تھی سوائے سر کی لٹوں کے جو کہ غیر کنگی شدہ تھیں اور میری گردن پر سایہ فگن تھیں۔ مطلب یہ کہ اس قدر شدید تپش میں میرے سر کے بالوں کی لٹیں ہی میری گردن کو لو سے بچا رہی تھیں۔ گردن کے پٹھے بڑے نازک ہوتے ہیں جو دھوپ لگنے سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کو لو لگنا یا (SUN STROKE)

کتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے عرب کے لوگ سر پر رومال باندھتے ہیں۔ جو اُن کی گردن کو لو لگنے سے محفوظ رکھتی ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے اِتَّقُوا اللَّعَّانَیْنِ یعنی دو لعنت والی چیزوں سے بچو۔ لوگوں نے عرض کیا، حضورؐ! وہ دو چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا راستے میں یا سائے کی جگہ میں پاخانہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ اگر ان مقامات پر کوئی شخص گندگی پھیلائے گا تو راستہ چلنے والے یا سائے میں تھوڑی دیر آرام کرنے والے مسافروں کو تکلیف ہوگی۔ لہٰذا ان دو جگہوں پر بول و براز کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے والوں کے حق میں مسافر لعنت کرینگے

غزوہ فتح مکہ ماہ رمضان میں پیش آیا۔ سخت گرمی کے ایام تھے۔ حضور علیہ السلام دس ہزار صحابہؓ کی جماعت لے کر مدینہ سے نکلے۔ حضور علیہ السلام نے سفر میں روزہ افطار کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب ایک دن کا سفر باقی رہ گیا تو فرمایا کہ کل تو دشمن سے مٹھ بھیڑ ہو جانے کا احتمال ہے لہٰذا روزہ نہ رکھو۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ اس سفر کے دوران ہم میں سے سایہ صرف اُسی شخص کے پاس ہوتا تھا جس کے پاس کوئی کمبل ہوتا تھا جسے وہ تان کر سایہ بنا لیتا تھا، ورنہ ہم میں سے اکثر لوگ سورج کی تپش سے بچنے کے لیے اپنے چہروں کو ہاتھوں سے ہی ڈھانپتے تھے۔ سایہ کے لیے کوئی خیمہ، کپڑا یا درخت نہیں تھا۔

سایہ کے نقصانات

موسم گرما میں جہاں سایہ راحت کا باعث ہوتا ہے وہاں سخت سردی میں سایہ تکلیف کا باعث بھی ہوتا ہے۔ جوں جوں سورج خطِ استوا سے دُور اور قطبین سے قریب ہوتا جاتا ہے تو سردی بڑھتی جاتی ہے۔ اور دھوپ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ سکندر اعظم کے زمانے میں یونان میں بڑے بڑے حکماء گزرے ہیں۔ اُن میں سے ایک دیوجانس کلبی تھا جو کتوں کے ساتھ بڑا انس رکھتا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ یہ شخص دھوپ میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اسی اثنا میں آدھی دنیا کا حکمران سکندر اعظم اس

کے سامنے آکھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کیا، جناب عالی! کوئی کام خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ کلبی نے نگاہ اٹھا کر سکندرِ اعظم کی طرف دیکھا تو بولا، مہربانی کرکے اپنا سایہ یہاں سے ہٹا دو اور مجھے دھوپ سے لطف اندوز ہونے دو ۔۔۔ بڑے آئے ہو۔ دنیاوی حاجتیں پوری کرنے والے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ علم کے استغنا کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہر حال اُس وقت ایک آدمی کا سایہ بھی ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا جب کہ یہی سایہ بعض اوقات باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ دنیا میں دو سکندر بڑے مشہور گزرے ہیں۔ ایک سکندر ذوالقرنین ہے جس کا ذکر سورۃ الکہف میں ہے جس نے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا اور لوگوں کو یاجوج ماجوج کی یلغار سے بچانے کے لیے سدِ سکندری تعمیر کی تھی۔ یہ شخص ایماندار تھا۔ دوسرا سکندر جو سکندرِ اعظم کے نام سے مشہور ہے، یونان میں ہوا ہے۔ اس نے ۳۲/۳۱ سال کی عمر میں نصف دنیا کو فتح کیا۔ اس کا زمانہ مسیح علیہ السلام سے کچھ عرصہ پہلے کا ہے۔ یہ شخص مشرک تھا اور مذکورہ بالا واقعہ اسی کا ہے۔

سائے کی حقیقت

سایہ حقیقت میں ایک تاریکی ہوتی ہے جو کبھی ہلکی اور کبھی بھاری ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ نے سائے کو بطور دلیل بیان فرمایا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ دن کے پہلے پہر کسی چیز کا سایہ سورج کی الٹی طرف گھٹتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اصل چیز کی جڑ سے آکر مل جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا کا یہی مطلب ہے کہ ہم اس کو سمیٹ لیتے ہیں اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹنا۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ متعلقہ شے کی جڑ سے آملتا ہے۔

ہر چیز کی اصل تو ذاتِ خداوندی ہے اور اُس کا ارشاد ہے ۔ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (ہود - ۱۲۳) سب چیزیں اُسی کی طرف

لہ موضح القرآن ص۴۳۵ (فیاض)

رجوع کرتی ہیں۔ کائنات کی کسی چیز کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں بلکہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا عکس یا سایہ ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر چیز اس کی طرف لوٹتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ دن کے پہلے پہر میں ہر چیز کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں۔ اور جب پچھلے پہر دوسرا رُخ شروع ہوتا ہے تو سایہ دوسری طرف لمبا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو سایہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانیؒ اور بعض دیگر مفسرینؒ بیان کرتے ہیں کہ اسی سلسلے سے ہم دنیا کی ہستی کی مثال بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اول عدم یعنی کچھ نہیں تھا۔ پھر نور یعنی دنیا کا وجود آیا اور آخر میں یہ سب کچھ پھر عدم میں چلا جائے گا یعنی پوری کائنات ختم ہو جائے گی۔ جس طرح جسمانی نور اور سائے کی مثال ہے۔ اسی طرح روحانی نور اور ظلمت کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جب انسانیت کفر، شرک اور معاصی کی تاریکی میں مبتلا ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آفتاب نبوت کی روشنی بھیجتا ہے جس کے ذریعے لوگوں کو صحیح راستہ نصیب ہوتا ہے۔ گویا انبیاء کے ذریعے نورِ ہدایت میسر آتا ہے۔ توحید روشنی ہے اور کفر، شرک اور معاصی ظلمت ہے۔ یہ ظلمت نبوت کی تعلیم یعنی آسمانی ہدایت کے ذریعے ہی دور ہوتی ہے۔[1]

غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ اے مخاطب! کیا تم نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں سائے کو کس طرح دراز کیا، اور اگر وہ چاہتا تو یہ سایہ ایک ہی مقام پر ٹکا رہتا۔ مگر اُس نے نظامِ شمسی اس طریقے سے قائم کیا ہے کہ سورج کی رفتار کے ساتھ ساتھ سایہ بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور آخر میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ سائے کا گھٹنا بڑھنا سورج پر موقوف ہے اور یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تفسیر عثمانی ص۴۷۰ (فیاض)

کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب۔ ۴۶) فرمایا ہے یعنی آپؐ روشن چراغ ہیں۔ اسی طرح قرآن، تورات اور انجیل کو بھی اللہ نے نور یعنی روشنی کا لقب دیا ہے۔ تو گویا جو روشن چراغ انبیاء کرام کتب سماویہ کی صورت میں لے کر آتے ہیں اُس سے نورِ ہدایت پھیلتا ہے اور کفر، شرک اور معاصی کی تاریکی دُور ہوتی ہے۔ تو گویا یہ سایہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلیل ہے تو دوسری طرف نبوت کی دلیل بھی بنتی ہے کہ نورِ نبوت کی بدولت ہی دنیا سے تاریکی دُور ہوتی ہے۔

رات، نیند اور دن

آگے اللہ نے مزید تین چیزوں کو اپنی قدرت و وحدانیت کی دلیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے بنایا ہے۔ لباس سے انسان کو دو فوائد حاصل ہوتے ہیں، ایک زینت اور دوسرا پردہ۔ اللہ نے قرآن پاک میں لباس کی حکمت اس طرح بیان فرمائی ہے يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (اعراف۔ ۲۶) اے آدم کے بیٹو! ہم نے تم پر لباس نازل کیا جو تمہارے لیے پردہ پوشی کرتا ہے اور باعث زینت بھی ہے۔ ویسے بھی یہ عام مقولہ ہے اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ یعنی لوگ لباس پہن کر ہی اچھے لگتے ہیں جب کہ برہنگی ایک عیب ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ تمام متمدن دنیا کے لوگ خواہ وہ کسی مذہب، مسلک یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اس بات پر متفق ہیں۔ کہ لباس باعثِ زینت اور برہنگی عیب ہے۔ برہنہ انسان جانوروں کی طرح ہوتا ہے۔ اللہ نے لباس نازل کر کے انسان کو شرف بخشا ہے۔ گویا جس طرح انسان لباس پہن کر آرام پکڑتے ہیں۔ اسی طرح رات بھی لوگوں کے لیے آرام و سکون کا باعث ہوتی ہے۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفہ ۲ (فیاض)

پھر اللہ نے نیند کے متعلق فرمایا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا یعنی ہم نے نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا۔ انسانی صحت کے لیے نیند بہت ضروری ہے۔ اطبائے کے مطابق دن رات میں سات گھنٹے سونا ضروری ہے۔ مختلف طبائع کے مطابق کم و بیش بھی ہوتا ہے۔ اگر کئی دن تک نیند نہ آئے تو دماغ میں خشکی پیدا ہو کر انسان شدید قسم کے مالیخولیا میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ جب نیند آتی ہے تو انسان کی تحلیل شدہ قوتیں بحال ہو جاتی ہیں اور وہ تازہ دم ہو کر دوبارہ کام کاج کے قابل ہو جاتا ہے۔

بہرحال فرمایا کہ اللہ نے رات کو تمہارے لیے زینت اور پردہ پوشی کا ذریعہ بنایا اور نیند کو آرام و استراحت کا سبب بنایا۔ وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا اور دن کو اٹھ کر باہر نکلنے کا ذریعہ بنایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل ہیں۔ اگر انسان شب و روز کے اس نظام پر ہی غور کرے تو اسے اللہ کی وحدانیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ جان سکتا ہے کہ یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ ہی کا قائم کردہ ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

درس دہم ۱۰ | آیت ۴۸ تا ۵۲

وَهُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ الرِّيٰحَ بُشۡرًۢا بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ‌ۚ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوۡرًا ۝۴۸ لِّنُحۡـىِ َۦ بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا وَّنُسۡقِيَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيۡرًا ۝۴۹ وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ بَيۡنَهُمۡ لِيَذَّكَّرُوۡا ۖ فَاَبٰٓى اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا ۝۵۰ وَلَوۡ شِئۡنَا لَبَـعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ قَرۡيَةٍ نَّذِيۡرًا ۖ ۝۵۱ فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا ۝۵۲

ترجمہ:۔ اور اللہ کی ذات وہی ہے جس نے چلائی ہیں ہوائیں خوشخبری لانے والی اُس کے بارانِ رحمت سے پہلے۔ اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی پاک کرنے والا ۝۴۸ تاکہ ہم زندہ کریں اس کے ساتھ مردہ شہر کو۔ اور پلائیں ہم اس کو اُن کو جو پیدا کیے ہیں ہم نے مویشی اور بہت سے انسان ۝۴۹ اور البتہ تحقیق ہم نے تقسیم کیا ہے اس کو اُن کے درمیان تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ پس انکار کیا اکثر انسانوں نے مگر ناشکر گزاری ہی ۝۵۰ اور اگر ہم چاہتے تو بھیجتے ہر بستی میں ڈر سنانے والا ۝۵۱ پس آپ نہ بات مانیں کافروں کی۔ اور جہاد کریں اُن سے اس (قرآن) کے ذریعے بڑا جہاد ۝۵۲

ربطِ آیات

گزشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے دلائلِ توحید کے سلسلے میں سائے کی ذکر کیا کہ اس کا تعلق سورج کے ساتھ ہے۔ سورج اس کی راہنمائی کرتا ہے اور یہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ پھر اللہ نے رات اور دن کا ذکر فرمایا کہ یہ بھی قدرتِ الٰہی کے نمونے ہیں۔ اللہ نے رات کو بمنزلہ لباس قرار دیا، اور نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا۔ پھر دن کے وقت کاروبار اور محنت مزدوری کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اُس کی توحید سمجھ میں آتی ہے

بارانِ رحمت کی دعائیں

اب دلائلِ قدرت ہی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَهُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جو چلاتا ہے خوشخبری سنانے والی ہواؤں کو اُس کی بارانِ رحمت سے قبل۔ ظاہر ہے کہ بارش سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں جن کے دوش پہ پانی سے لبریز بادل اٹھتے ہیں۔ پھر جہاں اللہ تعالیٰ کو بارش برسانا مطلوب ہوتا ہے، ہوائیں بادلوں کو وہاں لے جاتی ہیں۔ اِن ہواؤں کو دیکھ کر ہی انسان پُرامید ہوتے ہیں کہ اب اللہ کی رحمت بارش کی صورت میں نازل ہوگی اور خطے کی خشک سالی دور ہوگی انسانوں اور جانوروں کی حیات کا سامان ہوگا۔ اور کھیتیاں اور درخت پھل پیدا کریں گے۔ گھاس پھونس ہوگا، اور اس طرح انسانوں اور جانوروں کے لیے اکل وشرب کا انتظام ہوگا۔ گویا یہ ہوائیں ہیں جو بارش کی آمد سے پہلے بارش کی خوشخبری دیتی ہیں۔

پاکیزہ پانی کا نزول

ارشاد ہوتا ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور ہم نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا۔ آسمان کا اطلاق بادل، فضا، ہوا اور ہر بلندی پر ہوتا ہے۔ بظاہر تو پانی اللہ تعالیٰ بادلوں میں سے اتارتا ہے۔ مگر یہ صرف بادلوں کا کمال نہیں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم بھی شامل ہوتا ہے۔ چونکہ بارانِ رحمت کے نزول کا فیصلہ اُدپر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے نزول

کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

فرمایا ہم نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا جو کہ طَہُوْرًا خود پاک ہے اور دوسری چیزوں کو پاک کرتا ہے۔ چنانچہ پانی کے علاوہ کسی دوسری چیز سے طہارت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مثال کے طور پر دودھ، عرق گلاب، پٹرول وغیرہ خود پاک اشیا ہیں مگر ان کے ذریعے دوسری چیزوں کو پاک نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کو ازالہ نجاست کے لیے بوقت مجبوری استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کپڑے کو نجاست لگ گئی اور پانی میسر نہیں تو اس نجاست کو پٹرول وغیرہ سے دور کیا جاسکتا ہے مگر ان سے وضو یا غسل نہیں کیا جاسکتا۔ پانی کا بدل اللہ نے مٹی کو قرار دیا ہے۔ جیسے فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (النسآء - ۴۳) اگر پانی میسر نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کیا جاسکتا ہے جو وضو یا غسل کا بدل ہوگا۔ تاہم جونہی پانی میسر آجائے وضو یا غسل ضروری ہو جائے گا۔ طہور مبالغے کا صیغہ ہے یعنی یہ پانی خود پاک ہے اور دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا ہے چنانچہ ہم روزمرہ کپڑے، برتن، جسم، فرش غرضیکہ ہر چیز پانی ہی سے پاک صاف کرتے ہیں اور یہی اس کی صفت ہے۔

پانی کی افادیت

آگے اللہ تعالیٰ نے پانی کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ اللہ کی یہ نعمت انسان، حیوان اور نباتات کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ اللہ نے اس کو بقائے حیات کا ذریعہ بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے پاکیزہ پانی کو نازل فرمایا لِّنُحْيِۦَ بِهِۦ بَلْدَةً مَّيْتًا تاکہ ہم اس کے ساتھ مردہ شہر یا خشک زمین کو زندہ کریں۔ جب زمین بالکل خشک ہو کر سبزہ اگانے کے قابل نہیں رہتی تو اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت کے ذریعے پانی بہم پہنچاتا ہے، اور زمین نرم ہو کر روئیدگی کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس میں سبزیاں، پھل اور اناج پیدا ہوتا ہے۔

فرمایا پانی کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے زمین سیراب ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ وَنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ۞ تاکہ ہم پلائیں یہ پانی اپنے پیدا کردہ مویشیوں اور بہت سے انسانوں کو جیسا کہ پہلے عرض کیا پانی انسانوں، حیوانوں اور نباتات کے لیے بنیادی ضرورت ہے نباتات کا ذکر آیت کے پہلے حصہ میں ہوا کہ پانی کے ذریعے ہم مُردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں۔ اور انسانوں اور حیوانوں کا ذکر اس حصہ آیت میں آگیا ہے کہ یہ دونوں انواع پانی کی محتاج ہیں۔ اگرچہ پانی کی ضرورت ہر قسم کے حیوانات کے لیے مسلّم ہے مگر یہاں پر مویشیوں کا ذکر انسانوں کی مناسبت سے کیا ہے کہ ان کو پانی کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ مویشی انسان سے زیادہ مانوس ہیں، انسان کے خادم ہیں اور انسان ان کا دودھ پیتے ہیں۔ سورۃ المائدہ میں ان کو بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ یعنی چوپائے جانور کہا گیا ہے، اور سورۃ الانعام میں ان کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ یعنی آٹھ جوڑے ہیں۔ ان میں بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ کے نر، مادہ شامل ہیں۔ تاہم پانی تمام جانوروں، درندوں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کو بھی پانی کی ضرورت ہے اور ان کی زندگی کا انحصار بھی پانی پر ہے۔ البتہ بعض جانور ایسے ہیں جنہیں پانی کی فوری ضرورت نہیں پڑتی۔ بعض جاندار چھ چھ ماہ بعد پانی پیتے ہیں۔ جیسے گوہ ہے جو مٹی میں رہتی ہے اور کبھی کبھار پانی استعمال کرتی ہے۔ تاہم مذکورہ مویشی دن میں کئی کئی دفعہ پانی پیتے ہیں اس لیے اللہ نے بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ پانی اس کی غذا کا لازمی حصہ ہے۔ انسان جو بھی غذا استعمال کرتا ہے وہ خون پیدا کرتی ہے اور خون میں اسی فیصد پانی اور باقی بیس فیصد

دیگر اجزا مثلاً نمک، چربی، پروٹین، لحمیات، شحمہ، پنیر وغیرہ ہوتے ہیں۔ گویا انسانوں کے لیے بھی پانی اشد ضروری ہے۔

پانی کی فری سپلائی

انسان کے لیے سب سے ضروری چیز ہوا ہے۔ اس کے بغیر انسان چند لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر پانی ہے اللہ نے اس کو بھی بافراط پیدا کیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی ضرورت ہے جو مفت مہیا ہونی چاہیئے۔ ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ انسانوں اور جانوروں کے لیے پانی کی فری سپلائی کا بندوبست کرے۔ ہوا اور پانی کے بعد غذا ضروری چیز ہے جس کے حصول کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر لباس اور رہائش کا حصول ہے۔ یہ بھی جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں صحت بھی شامل ہے۔ ہر بیمار کو مناسب علاج معالجے کی سہولت حاصل ہونی چاہیئے۔ اور تعلیم بھی کم از کم اتنی تو لازمی ہے کہ انسان کو اپنے فرائض کا علم ہو سکے۔ یہ ہر انسان پر فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔ غرضیکہ پانی انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے مگر اکثر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور اسے ضائع کرتے رہتے ہیں۔ پانی کی قدر ان علاقوں میں ہے جہاں یہ مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں پورے ایک دن کی مسافت سے پانی لانا پڑتا ہے۔ لہٰذا جہاں پانی وافر دستیاب ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے اور جہاں نایاب ہے وہاں مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

فرمایا وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ ہم نے پانی کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے یعنی پانی کی فراہمی کو تمام خطوں میں یکساں نہیں رکھا بلکہ کہیں بافراط موجود ہے، کہیں مشقت سے حاصل ہوتا ہے اور کہیں نایاب ہے۔ زیرِ زمین پانی عام طور پر میٹھا ہوتا ہے مگر بعض علاقوں میں کھاری بھی ہے۔ بارش، ندی، نالے اور دریاؤں کا پانی انسانی

زندگی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر کھاری پانی تمام معمولات میں استعمال نہیں ہو سکتا بعض جگہوں پر پانی بالکل کڑوا ہے جو نہ پینے کے کام آتا ہے اور نہ کھیتی باڑی کے پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر ہے مگر وہ پینے کے قابل نہیں ہے۔ بڑے بڑے صحراؤں میں پانی بالکل نایاب ہے۔ اب جدید دور میں سمندر کے پانی کو صاف کر کے قابل استعمال بنایا جا رہا ہے۔ مگر اس پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ ہم نے پانی کو لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا لِيَذَّكَّرُوا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ مگر حقیقت یہ ہے فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا مگر اکثر لوگوں نے انکار کیا اور اس نعمت کی ناقدری کی۔ لوگوں کو چاہیئے تھا کہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتے مگر انہوں نے نعمت کا حق ادا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شکوہ بھی کیا ہے۔

منذرین کی بعثت

کافروں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اللہ نے ہر ہر بستی اور ہر ہر مقام پر اپنے رسول کیوں نہیں بھیجے۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا ہے وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈرانے والے بھیج دیتے۔ یہ کام ہماری قدرت سے باہر نہیں ہے مگر یہ ہماری حکمت کے خلاف ہے۔ اللہ نے مختلف علاقوں میں خاص خاص لوگوں میں اپنے رسول بھیجے، اُن پر وحی نازل کی اور اس طرح لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کا انتظام فرمایا۔ اور پھر آخر میں اقوام عالم اور تمام ہی نوع انسان بلکہ جنات کے لیے اپنا آخری رسول مبعوث فرمایا لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام - ۱۹) تاکہ وہ اس قرآن کے ذریعے اپنے مخاطبین اور تمام ان لوگوں کو ڈرائے جن تک یہ قرآن پہنچے۔ اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے بیہودہ اعتراض کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنا کام کرتے چلے جائیں۔

جہادِ کبیر

آخر میں اللہ نے فرمایا ہے فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ آپ

کافروں کی بات نہ مانیں بلکہ ان کے خلاف قرآن پاک کے ذریعے ایک ضروری کام یہ ہے وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ جہاد کبیر کریں۔ بِہٖ کا مرجع قرآن ہے کہ اس کے ذریعے آپ جہاد کریں جس طرح اللہ نے بارش نازل فرما کر انسان کی جسمانی ضروریات پوری کیں اسی طرح وحی الٰہی کے ذریعے قرآن نازل فرما کر انسان کی روحانی اور عقلی ضرورتوں کی تکمیل کی اور اس کی روحانی پیاس کو بجھایا۔ گویا اللہ نے قرآن نازل فرما کر انسان کی ہدایت کا سامان مہیا فرمایا

جہاد اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے مراد محض جنگ نہیں بلکہ جنگ بھی جہاد کا ایک حصہ ہے۔ جہاد سے مراد اپنی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کو دشمن کے مقابلے میں صرف کرنا ہے۔ جہاد کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ اپنی کافروں اور مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی زبانوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ مطلب یہ کہ جہاد صرف قتال کا نام نہیں بلکہ زبان کے ذریعے ذریعہ تبلیغ ادا کرنا، دین کے احکام لوگوں تک پہنچانا۔ لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرنا۔ بوقت ضرورت بحث مباحثہ کرنا۔ تصنیف تالیف کے ذریعے لوگوں تک علم پہنچانا، مال خرچ کرنا سب جہاد میں آتا ہے۔ مگر قرآن کی تبلیغ کو اللہ نے جہاد کبیر سے موسوم کیا ہے۔ حضور علیہ السلام جب کسی جنگ کے لیے جاتے تو دیگر دعاؤں کے علاوہ یہ دعا بھی فرماتے اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتٰبِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ۔ اے بادلوں کو چلانے والے، کتاب کو نازل کرنے والے اللہ! مخالف لشکروں کو شکست دے اور ہماری مدد فرما کر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ ہمارا مقصد ملک گیری نہیں بلکہ اس کتاب کے پروگرام کو آگے چلانا ہے تاکہ لوگوں کی فکر پاک ہو جائے اور ان

له معالم التنزیل ص ۹۵/۳۲ خازن ص ۱۰۵/۵۲ (فیاض)

سے اعمال درست ہو جائیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ دشمن کے مقابلہ میں ظاہری، باطنی، مالی اور جانی قوتوں کو صرف کرنا جہاد کا ایک حصہ ہے۔

اعدائے دین

دین کے چار مسلمہ دشمن ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن نے تعلیم دی ہے۔ سب سے پہلا دشمن دین خود نفس انسانی ہے جس کے متعلق فرمایا اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ تمہارا بڑا دشمن تو خود تمہارا نفس ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان ہے اور انسان کو ہمیشہ برائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ نفس کا مقابلہ عبادت و ریاضت سے ہوتا ہے۔ جو شخص عبادت الٰہی میں مصروف ہوتا ہے اس کا نفس مغلوب ہو جاتا ہے۔ فرمایا دین کا دوسرا دشمن شیطان ہے۔ قرآن نے اس کو اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (البقرہ۔ ۱۶۸) کہا ہے یعنی یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ شیطان کا مقابلہ اللہ کے ذکر کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کو کثرت سے ذکر کرو گے تو شیطان دفع ہو گا۔ فرمایا دین کا تیسرا دشمن کافر ہے جو خدا تعالیٰ کی توحید اور شریعت کا انکار کرتا ہے اور اس کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ (الانفال۔ ۶۰) ان دشمنوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرو۔ تیر کمان سے لے کر ٹینک اور بم تک اور جن جن اسباب جتنے بھی وسائل میسر ہوں سب کو بروئے کار لاؤ۔ چوتھا فرمایا کہ دین کا چوتھا دشمن منافق ہے۔ جو اندرونی طور پر ہمیشہ دنیا کی خاطر جماعت المسلمین اور ان کے دین کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ (التوبہ۔ ۷۳) اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کی شرارتوں اور سازشوں کو بے نقاب کرو اور انہیں خوب رسوا کرو تاکہ وہ بھی حرکتوں سے باز آجائیں بہرحال ان چاروں دشمنان دین کا مقابلہ کرنا

ضروری ہے۔

جہادِ مسلسل

دشمن کے خلاف جہاد تو وقتی طور پر ہوتا ہے جو بالآخر ختم ہو جاتا ہے مگر قرآن کے ذریعے جس جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ مسلسل اور دائمی ہے۔ جب تک پوری دنیا کفر، شرک، بدعات اور معاصی سے پاک نہ ہو جائے جب تک لوگوں کی فکر پاک نہ ہو جائے، جب تک ظلم و ناانصافی کا خاتمہ نہ ہو جائے یہ جہاد جاری رہے گا۔

مخالفینِ قرآن بھی اپنی تگ و دو جاری رکھیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں شرک و شبہات پیدا کرنے کے لیے غلط پراپیگنڈا کریں گے ان سب کے خلاف جہاد کرنا جہادِ کبیر ہے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب تک دنیا میں کفر، شرک، بدعملی اور بداخلاقی پائی جاتی ہے، ان کی اصلاح کرنا اور توحید کا پرچم بلند کرنا، فسق و فجور اور جہالت کو دور کرنا اور نیکی کو پھیلانا ضروری ہے۔ قرآن کی یہ آیات چیخ چیخ کر جہادِ کبیر کی دعوت دے رہی ہیں جب تک برائی کو ختم نہیں کرو گے تم فلاح نہیں پا سکتے۔ آج مسلمان اسی فریضہ کو ترک کرنے کی وجہ سے ذلت کی پستی میں جا گرے ہیں۔ آج بھی دنیا کی پانچ ارب آبادی میں چار ارب لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں اور باقی ایک ارب بھی برائے نام توحید پرست ہیں۔ ان میں سے بہت قلیل تعداد راہِ راست پر ہے۔ بہرحال برائی کے خلاف قرآن کے ذریعے جہاد ہر وقت جاری ہے اور جاری رہے گا۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿۵۴﴾ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿۵۵﴾

ترجمہ:- اور وہ (اللہ تعالیٰ) وہی ذات ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو۔ ایک میٹھا ہے اور خوشگوار یعنی پیاس بجھانے والا، اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے۔ اور بنا دی ہے ان دونوں کے درمیان ایک آڑ، روک بنائی ہوئی ﴿۵۳﴾ اور وہ وہی ذات ہے جس نے پیدا کیا ہے پانی سے انسان۔ پس بنا دیا اُس کے لیے نسب اور سسرال اور تیرا پروردگار قدرت رکھنے والا ہے ﴿۵۴﴾ اور پرستش کرتے ہیں یہ لوگ اللہ کے سوا اُن چیزوں کی جو نہیں پہنچاتیں ان کو فائدہ اور نہ نقصان۔ اور کافر اپنے رب کے سامنے (پشت پھیرنے والا) اور (شیطان کا) مددگار ہے ﴿۵۵﴾

ربط آیات — گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے نمونے اور توحید کے دلائل

بیان فرمائے۔ پہلے سائے کا ذکر ہوا، پھر شب و روز کے تغیر و تبدل اور ہواؤں کے چلنے کا ذکر ہوا۔ اللہ نے خاص طور پر پانی کے نزول اور اس کی افادیت کا ذکر کیا۔ پھر کافروں کی مذمت بیان ہوئی اور اللہ نے اپنے پیغمبر کو قرآن کے ساتھ بڑا جہاد کرنے کا حکم دیا۔ معترضین کے رسالت کے متعلق اعتراضات کا شافی جواب بھی دیا۔ اب آج کی آیات بھی خدا تعالیٰ کی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل ہیں۔

دو متضاد پانیوں کا ملاپ

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی پہلی دلیل یہ بیان فرمائی ہے وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کمال قدرت کی مالک وہ ذات خداوندی ہے جس نے دو پانیوں کو ملا دیا ہے۔ مرج کا معنی خلط ملط کرنا ہے۔ اور آپس میں ملا دینا ہوتا ہے۔ اس لیے عربی زبان میں مروج سبزہ زار کو کہا جاتا ہے جہاں مختلف قسم کے پودے اور گھاس وغیرہ ملے جلے ہوتے ہیں۔ صحیح حدیث میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَصِيْرَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَّاَنْهَارًا[1] قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک عرب کی سرزمین میں سبزہ زار اور نہریں نہ جاری ہو جائیں۔ فرمایا اس وقت عرب کا علاقہ وسیع ریگستان اور لامتناہی سلسلۂ کوہ پر مشتمل ہے مگر ایک وقت آئے گا جب بہت سے مقامات پر سبزہ زار ہوں گے اور وہاں پر نہریں چلیں گی۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے دو دریاؤں، دو سمندروں یا دو پانیوں کو اکٹھا چھوڑ دیا اور عجیب شان ہے کہ ان دو پانیوں میں هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ ایک پانی میٹھا اور پیاس بجھانے کے لیے خوشگوار ہے وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے جو کہ پینے کے قابل نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ کی دلیل ہے۔ یہاں پر دو مختلف دریا، سمندر یا نہریں مراد نہیں جن کے پانی کا ذائقہ مختلف ہو، بلکہ اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ

[1] مسلم ص ۳۲۶ ج ۱ (فیاض)

نے بعض مقامات پر ایسے پانیوں کو اکٹھا رواں دواں کیا ہے کہ جن کے ذائقے مختلف ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں قسم کے پانی اکٹھا بہنے کے باوجود آپس میں خلط ملط نہیں ہوتے بلکہ اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ بہتے ہیں اللہ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخاً ہم نے اُن کے درمیان ایک آڑ قائم کر دی ہے وَحِجْراً مَّحْجُوراً اور ایک رکاوٹ کھڑی کر دی ہے جو دونوں قسم کے پانیوں کو خلط ملط ہونے سے روکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر میٹھا اور کڑوا پانی آپس میں خلط ملط ہو جائیں تو سارے کا سارا پانی ہی کڑوا ہو جاتا ہے۔ دنیا کے تمام دریاؤں کا پانی میٹھا ہے اور جہاں جہاں سے یہ گزرتے ہیں لوگ اس پانی کو پیتے ہیں اور اس سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ سمندر کا پانی کڑوا ہے اور جونہی کسی دریا کا پانی سمندر میں جا کر گرتا ہے تو وہ بھی ویسا ہی کڑوا ہو جاتا ہے مگر اللہ نے اپنے جس شاہکار کا بیان ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی ایک دریا، سمندر یا ندی نالے میں دو مختلف الذائقہ پانی اکٹھے چلتے ہیں مگر آپس میں مل کر اُن کے ذائقہ میں فرق نہیں آتا اور اُن کی اپنی اپنی نوعیت قائم رہتی ہے۔

مشاہدات قدرت

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے بعض مشاہدات کا ذکر کیا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ کی اس بیان کردہ حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے اپنے ایک بنگالی شاگرد کو لکھا کہ بنگال چونکہ دریاؤں اور سمندروں کا علاقہ ہے۔ لہٰذا آپ وہاں کسی دریا وغیرہ کے حالات لکھیں جہاں مختلف خواص کے پانی اکٹھے بہتے ہوں۔ تو انہوں نے دو معتبر علماء کی شہادتیں لے کر مولانا تھانویؒ کو آگاہ کیا جس کو آپ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں نوٹ کیا ہے[1]۔ لکھتے ہیں کہ بنگال میں اراکان سے لے کر چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کے پیٹ میں دو مختلف نوعیت کے پانی چلتے ہیں۔ ایک پانی سفید ہے جب کہ دوسرا سیاہ۔ سفید پانی میٹھا ہے

[1] بیان القرآن صفحہ ۸۶/۵۵ (نیاض)

اور سیاہ پانی کڑوا ہے۔ سیاہ پانی میں سمندر کی طرح تلاطم ہوتا ہے جب کہ سفید پانی ساکن رہتا ہے کشتی رانی بھی سفید پانی میں ہی ہو سکتی ہے تو اس طرح دریا ایک یا دو مختلف الانواع پانی الگ الگ نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ پانی الاحمر دو کناروں کے درمیان اکٹھے بہتے ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے کہ بنگال کے ضلع باریسال کے بعض طلبا نے بیرت ساتھ یہ حقیقت بیان کی کہ اُن کے علاقہ میں دو ندیاں ایک ہی منبع سے نکلتی ہیں مگر ایک کا پانی تیز اور ناقابل استعمال ہے جب کہ دوسرے کا شیریں اور لذیذ ہے۔ آپ سورت میں بھی قیمت میں۔ آپ وہاں کے حالات لکھتے ہیں کہ صوبہ گجرات میں ضلع سورت کے مقام دھا پل سمکک سے سمندر تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ہے جب سمندر میں مد آتا ہے تو اس کا پانی سمندر میں گرنے والی ندی میں چڑھ آتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سمندر کا کڑوا پانی ندی کے میٹھے پانی کے اوپر تہہ کی صورت میں آجاتا ہے اور دونوں پانی آپس میں خلط ملط بھی نہیں ہوتے۔ کڑوا پانی اوپر بہتا ہے اور میٹھا نیچے۔ پھر جب جذر ہوتا ہے تو کھاری پانی سمندر میں واپس چلا جاتا ہے۔ جب کہ ندی کا میٹھا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ سمندر کا پانی ندی میں کئی کئی میل تک چلا جاتا ہے مگر دونوں پانیوں کا آپس میں امتزاج نہیں ہوتا۔

یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ زیر زمین پانی کہیں کھاری ہے اور کہیں میٹھا۔ کسی ایک ہی بستی میں کھاری اور میٹھے پانی کے کنوئیں قریب قریب ہوتے ہیں مگر یہ پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ مدینہ طیبہ کے اکثر کنوؤں کا پانی کھاری تھا۔ مگر بیئر رومہ کا پانی میٹھا تھا۔ جو یہودیوں کی ملکیت تھا حضور علیہ السلام کے ترغیب دلانے پر حضرت عثمانؓ نے یہ کنواں پینتیس ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا یہ بھی کمال قدرت کا نمونہ ہے۔ اللہ نے اپنا احسان جتلاتے ہوئے فرمایا ہے۔ لَمْ نُنَشِّءْ جَعَلْنَا جَاجًا فَمَا

لہ تفسیر عثمانی صـ ۴۷۲ (فیاض)

لَا تَشْكُرُوْنَ (الواقعہ - ۷) اگر ہم چاہتے تو سارے پانی کو کڑوا بنا دیتے اور تم مصیبت میں مبتلا ہو جاتے۔ تم میٹھا پانی پا کر اللہ کا شکر کیوں نہیں ادا کرتے؟ فرمایا اس پانی کی بہم رسانی ہو رہے ذمے ہے۔ بتاؤ تو ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (الواقعہ - ۶۹) کیا تم نے اس پانی کو بادلوں سے اتارا ہے یا ہم اس کے اتارنے والے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ آسمان کی طرف سے میٹھا اور قابل استعمال پانی نازل فرماتا ہے۔ مخلوق میں یہ طاقت کہاں ہے؟

سمندر کا پانی کڑوا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے خاص مصلحت رکھی ہے۔ اس کی کڑواہٹ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس میں مختلف قسم کے نمکیات اور دیگر کیمیائی اجزاء رکھے ہیں جن کی وجہ سے یہ گلنے سڑنے اور تعفن پیدا کرنے سے محفوظ ہے۔ اگر تمام سمندروں کا پانی میٹھا ہوتا، تو اس میں تعفن پیدا ہو کر انسانوں اور جانوروں کے لیے وبال جان بن جاتا۔ آبی جانوروں کی گندگی اور ان کے مرنے کے باوجود نمکیات کی وجہ سے گل سڑ جاتے ہیں مگر بدبو پیدا نہیں ہوتی یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک نمونہ ہے۔

پانی پینے کی دعا

حضور علیہ السلام نے میٹھا پانی پینے کے بعد یہ دعا بھی سکھلائی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ یَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا آپ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس پانی کو میٹھا بنایا ہے اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اسے کڑوا نہیں کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے گناہوں کا اثر مختلف چیزوں پر پڑتا ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ حجر اسود جب جنت سے اترا تھا تو یہ بالکل سفید تھا، پھر ابن آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی نعمتیں کھاتا ہے اور ٹھنڈا پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور الحمد للہ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہو جاتا ہے۔

قطرۂ آب سے تخلیق انسانی

اللہ نے اپنی دوسری دلیل قدرت یہ بیان فرمائی ہے وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے قطرۂ آب سے انسان جیسی ہستی کو پیدا کیا۔ اور وہ قطرہ بھی ایسا کہ کپڑے کو لگ جائے تو کپڑا ناپاک ہو جائے۔ اللہ نے اسی قطرۂ آب کے متعلق فرمایا ہے اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِيْنٍ (المرسلات۔۲۰) کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ اللہ نے اس ناپاک قطرہ سے حسین و جمیل انسان کو پیدا کیا جو بہت سی خوبیوں کا مالک ہے۔ اللہ نے اس کو بہت سی قوتیں اور حواس بخشے فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا پھر انسان کو سلسلہ نسب اور سلسلہ مصاہرت قائم کیا۔ اس کی مختلف گوتیں اور خاندان بنائے بیٹوں سے نسبی سلسلہ چلتا ہے اور بیٹیوں سے سسرالی اس طرح اللہ نے سلسلہ انسانی کو پھیلا دیا۔ یہ سارا سلسلہ آدم علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ گویا پوری نسل انسانی کا سلسلہ مٹی کے ساتھ جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا كُلُّكُمْ اَبْنَآءُ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ غرضیکہ یہ سارا سلسلہ اللہ نے قطرۂ آب سے چلایا۔ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا اور تیرا پروردگار کمال قدرت کا مالک ہے۔ یہ سارا سلسلہ اس نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ بنایا ہے۔

غیر اللہ کی عبادت

فرمایا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کے اس قدر دلائل کے باوجود حالت یہ ہے وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔ النافع و الضار تو فقط ذات خداوندی ہے۔ بھلا دوسری کون سی ذات ہے جو نفع نقصان کی مالک ہو۔ پرستش کے لائق تو وہ ذات ہے جو علیم کل اور

قادرِ مطلق ہے۔ اللہ کے سوا باقی سب عاجز مخلوق ہے۔ لہٰذا ان صفات کا حامل بھی کوئی نہیں تو ایسی ہستیوں کی عبادت کرنا اور ان کو خدا کا شریک بنانا کتنی بے عقلی کی بات ہے۔ وہ تو خود اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ بھلا وہ دوسروں کی حاجت برآری کیسے کر سکتے ہیں؟

فرمایا وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا دیکھو! کافر آدمی کس طرح اپنے رب سے پشت پھیر کر شیطان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ شرکیہ امور میں ملوث ہونا شیطان کی اتباع کے مترادف ہے۔ شیطان کفر اور شرک کو پسند کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دیتا ہے۔ لہٰذا شیطان کے بہکاوے میں آکر غیر اللہ کی عبادت نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ ایسا جرم ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔ لہٰذا اس سے بچنا چاہیئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ﴿۵۸﴾ ڔ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ڔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ ۚ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ ع

سجدہ

ترجمہ:- اور اے پیغمبر! نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا ﴿۵۶﴾ آپ کہہ دیجئے میں نہیں مانگتا تم سے اِس پر کوئی بدلہ، مگر جو چاہے بنالے اپنے پروردگار کی طرف راستہ ﴿۵۷﴾ اور آپ بھروسہ کریں اُس زندہ ہستی پر جو کبھی نہیں مرے گا۔ اور تسبیح بیان کریں آپ اُسکی تعریف کے ساتھ۔ اور کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا ﴿۵۸﴾ وہ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، چھ دن کے وقفہ میں۔

پھر وہ مستوی ہوا عرش پر۔ وہ بڑی رحمت والا ہے۔
پس پوچھیں آپ اس کے بارے میں خبر رکھنے والے سے (۵۹)
اور جب کہا جاتا ہے ان لوگوں سے کہ سجدہ کرو رحمان
کے سامنے تو کہتے ہیں کیا ہے رحمان؟ کیا ہم سجدہ کریں اس
کے لیے جس کے لیے تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ اور بڑھ جاتی
ہے ان کی نفرت اور زیادہ (۶۰)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ تامہ کی دو باتوں کا ذکر کیا تھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ وہ دو مختلف پانیوں کو کھلے چھوڑ کر ان کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ اس نے انسان کا سلسلہ نسب قطرہ آب سے چلایا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس کی قدرت کا نمونہ اور توحید کے دلائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے مگر ان تمام تر دلائل وشواہد کے باوجود لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ فرمایا یہ لوگ خدا کی طرف سے پشت پھیر کر شیطان کے مددگار بنے ہوئے ہیں۔

آج کے درس کی ابتدائی آیات میں رسالت کا ذکر ہے۔ کفار ومشرکین حضور علیہ السلام سے من مانی نشانیاں طلب کرتے تھے جس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ آپ کا کام نشانیاں دکھانا نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ جب چاہے کوئی نشانی ظاہر کر دے۔ آپ کے فرائض کے متعلق فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا اور اس کی توحید کو مانے گا اس کے متعلق آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اسے خوشخبری سنا دیں اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (یونس۔ ۲) کہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں سچائی کا پایہ ہے۔ ان کے درجات بلند ہوں گے۔

وہ حظیرۃ القدس کے ممبر بنیں گے اور بالآخر جنت میں پہنچ جائیں گے فرمایا
آپ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے دیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ کفر اور شرک
میں، معاصی اور ظلمتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اُن پر خدا کا غضب ہوگا۔ جنت
نہ ملے گی اور وہ ناکام ہو کر جہنم رسید ہوں گے۔ آپ اُن کو اُن کے برے انجام
سے ڈرا دیں۔ غرضیکہ آپ کے ذمے نیکوکاروں کو خوشخبری دینا اور بُرے لوگوں
کو ڈر سُنانا ہے۔

بے لوث تبلیغ

فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ میں جو کچھ اللہ کا
پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور جو تعلیم تمہیں دیتا ہوں، یہ بے لوث اور بلا معاوضہ
ہے مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ میں اس پر تم سے کوئی اجرت
مزدوری یا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ مجھے تم سے کوئی دنیاوی غرض نہیں، میرا
کوئی مالی مفاد وابستہ نہیں۔ نہ میں تم سے اس سلسلہ میں کوئی فیس مانگتا ہوں۔ ہاں
میری غرض یہ ہے اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ
سَبِيْلًا کہ تم میں سے جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ بنائے
اور اُس کی اطاعت کرکے اُس کی رضا کے مقام تک پہنچ جائے۔

بلا معاوضہ خدمت کی پیشکش صرف حضور علیہ السلام تک ہی محدود نہ
تھی۔ بلکہ اللہ کے تمام انبیاء علیہم السلام یہی پیش کرتے آئے رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ
وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ
الرُّسُلِ (النساء - ۱۶۵) تمام رسول خوشخبری سُنانے اور ڈرانے تھے
تاکہ ان کے بعد لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ تمام رسولوں نے یہی
کہا وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء - ۱۰۹) لوگو! میں پیغامِ خدا پہنچانے پر
تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ وہی مجھے
صلہ دے گا۔ تم میری بات ماننے کی بجائے مجھ سے بد سلوکی سے پیش آتے

ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے یہ بھی کہلوایا ہے کہ اے لوگو! میں تم سے کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کرتا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ۔ ۲۳) کم از کم میری قرابت داری کا ہی خیال کرو۔ میں بھی تمہارے خاندان اور برادری کا آدمی ہوں تمہارے فائدے کی بات کرتا ہوں مگر تم مجھ سے اس طرح بدسلوکی تو نہ کرو۔ بعض مفسرینؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں طلب کرتا بلکہ چاہتا ہوں کہ تم نیکی اور تقرب کے کاموں کو اختیار کرو۔ ظاہر ہے جو شخص اپنا کوئی ذاتی مفاد پیش نظر نہیں رکھتا، اس کی سچی بات کی مخالفت کرنا شقاوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

توکل علی اللہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی بھی دی ہے کہ آپ کفار و مشرکین کی بدسلوکی پر دل برداشتہ نہ ہوں وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اُس زندہ ذات پر بھروسہ رکھیں جس پر کبھی موت نہیں آئے گی، اور اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے چلے جائیں، مخالفین آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

امام ابن ابی دنیاؒ نے اپنی کتاب "توکل" میں اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں عقبہ ابن ابی ثبیسقؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ تورات میں یہ بات موجود ہے لَا تَتَوَكَّلْ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ فَاِنَّ ابْنَ اٰدَمَ لَيْسَ لَهٗ قِوَامٌ آدم کے کسی بیٹے پر بھروسہ نہ کرو کیونکہ آدم کے بیٹے کے لیے کوئی اثبات نہیں ہے۔ وہ تو فانی ہے، اُس کی ہر چیز مستعار ہے اس پر تم کیسے بھروسہ کر سکتے ہو؟ وَلٰكِنْ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ بلکہ توکل ہمیشہ اس ذات خداوندی پر کرو جو زندہ ہے اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اسی لیے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ دنیا میں رہ کر اسباب کو اختیار کرو مگر اُن پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ صرف خدا کی ذات پر ہونا چاہیے۔ وہ چاہے گا تو اسباب کو مؤثر بنا دیگا، ورنہ وہ

۔ تفسیر کبیر صفحہ ۱۰۲ / ۲۴ ۲ درمنثور صفحہ ۷۳ / ۵ (فیاض)

لیے ہی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَ
عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (آل عمران - ۱۲۲) مومن لوگ تو
اللہ پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُونَ (ابراہیم - ۱۲) بھروسہ کرنے والے صرف اللہ تعالیٰ پر ہی
بھروسہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اے پیغمبر! آپ اللہ کی ذات پر اعتماد کرتے
ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھیں۔

اور دوسری بات یہ فرمائی وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ اور اس کی تسبیح بیان
کریں اس کی تعریف کے ساتھ۔ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا
اور کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا۔ تمام مجرم اس
کی نگاہوں میں ہیں اور اس کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔

تخلیق ارض و سما

اگلی آیت کریمہ میں پھر توحید کے دلائل میں ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِىْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو
کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں کے وقفہ میں۔ قرآن کی متعدد آیات
میں آسمان و زمین کی چھ دنوں میں تخلیق کا ذکر آیا ہے۔ اور یہ ذکر تورات میں
بھی بیان ہوا ہے۔ البتہ یہودیوں نے تورات میں ایک بات بڑھا دی ہے
جہاں زمین و آسمان کی چھ دن میں تخلیق کا ذکر ہے وہاں آگے یہ اضافہ ہے
ثُمَّ اسْتَرَاحَ یعنی ارض و سما کی تخلیق کے بعد اللہ نے آرام کیا گویا اللہ تعالیٰ
یہ کام کر کے تھک گیا تھا جس سے آرام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی العیاذ باللہ
حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ اور اس کا ارشاد
ہے وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق - ۳۸) ہم نے آسمان و زمین
کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ
تو ایک لحظ میں تمام چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ یہ چھ دن کا وقفہ تو اس کی

خاص مصلحت پر مبنی ہے۔ اس کی طرف حدوث کو منسوب کرنا تو کفر کی بات ہے

استویٰ علی العرش

تخلیق ارض و سما کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

پھر اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا۔ بعض مفسرین استویٰ کا معنیٰ کرتے ہیں یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی وہ معاملے کی تدبیر کرتا ہے۔ سورۃ الٓمّٓ السجدہ میں موجود ہے

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (آیت - ۵) وہ

آسمان کی بلندیوں سے لیکر زمین کی پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر کرتا ہے۔

نوعِ انسانی کے متعلق خاص طور پر ارشاد ہے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

عِبَادِهٖ (الانعام - ۶۱) وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ تفسیر جلالین والے

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح مستوی ہے كَمَا يَلِيْقُ

بِشَانِهٖ جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ وہ اس طرح عرش پر نہیں

بیٹھا جیسا کہ ہم چارپائی یا کرسی پر بیٹھتے ہیں کیونکہ وہ جسمیت اور جہت سے پاک

ہے۔ ہم اس کے استویٰ کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لیے بعض بزرگان دین فرماتے ہیں:

رَبُّ الْعَرْشِ فَوْقَ الْعَرْشِ لٰكِنْ

بِلَا وَصْفِ التَّمَكُّنِ وَالْاِتِّصَالِ

عرش کا مالک عرش کے اوپر ہے لیکن ایسا نہیں جیسا کہ کوئی اوپر ٹکا ہو یعنی

اتصال نہیں ہے۔ اتصال ماننے سے جسمیت لازم آئے گی مگر اللہ تعالیٰ

جسم سے پاک ہے۔ اس کا استویٰ علی العرش متشابہات میں سے ہے اور

انسانی عقل فہم کرنے سے بعید ہے۔ استویٰ علی العرش کی مثال بھی ایسی ہی ہے

جیسے قربِ خداوندی۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ

مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق - ۱۶) ہم بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ

قریب ہیں مگر وہ قرب بلا کیفیت ہے۔ اس کی کیفیت کو وہ خود ہی جانتا ہے

ہست رب الناس را با جانِ ناس

اتصالِ بے تکیف بے قیاس

لوگوں کا پروردگار اُن کی جانوں سے متصل ہے مگر اُس کی کیفیت کو کوئی نہیں
جانتا۔ اسی طرح استویٰ علی العرش کے متعلق بھی یہی عقیدہ رہنا چاہیئے کہ وہ عرش
پر اسی طرح مستوی ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

فرمایا اَلرَّحْمٰنُ وہ بڑا ہی مہربان ہے فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا پس
پوچھ لیں آپ کسی خبر رکھنے والے سے۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں تورات
کے عالم موجود تھے۔ یہ انہی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو ان سے پوچھ لیں
وہ بھی بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ارض و سما کو چھ دن کے وقفہ میں پیدا فرمایا۔
عام مفسرینؒ بِهٖ کی ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف لوٹاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت
کے بارے میں اہلِ علم سے دریافت کریں۔ بعض مفسرینؒ بِهٖ کا معنی مِنْهُ
بھی کرتے ہیں یعنی آپ اُس سے پوچھ لیں جو خبر رکھنے والا ہے۔ کیونکہ دیگر
کو تو علم ہی نہیں ہے۔

رحمان کے سامنے سجدہ

ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ
جب اُن کفار سے کہا جاتا ہے کہ خدائے رحمان کے سامنے سجدہ کرو
تو وہ اس سے بدکتے ہیں۔ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ کہتے ہیں رحمان
کیا ہے؟ ہم کسی رحمان کو نہیں جانتے۔ واقعہ حدیبیہ میں بھی معاملہ اسی بات
پر آکر رُک گیا تھا۔ صلح نامہ کی ابتداء میں جب حضور علیہ السلام نے بِسْمِ اللّٰهِ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھوایا، تو مشرکوں نے فوراً اعتراض کر دیا۔
کہ ہم کسی رحمان اور رحیم کو نہیں جانتے، لہٰذا بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھو
جیسا پہلے لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی لکھا گیا۔

مشرکین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ نبوت کا دعویدار ہمیں تو توحید
کی دعوت دیتا ہے اور خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمان اور رحیم کو پکارنے کے
لیے بھی کہتا ہے۔ اللہ نے اس اعتراض کا جواب متعدد مقامات پر دیا ہے
جیسے فرمایا وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۱۸۰)

۱؎ تفسیر کبیر ص ۱۰۳ ج ۲۴ ۲؎ کبیر ص ۱۰۵ ج ۲۴ ۳؎ تفسیر ابن کثیر ص ۳۲۳ ج ۳ (فیاض)

خدا کی ذات تو ایک ہی ہے البتہ اس کے اسمائے پاک اور صفات بہت سی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جس نام سے بھی پکارو گے۔ وہ راضی ہوگا۔ وہ رحمان۔ رحیم ستار غفار اور رازق ہے۔ اس کے تمام نام کتنے ہیں اور تو کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ اور صرف اسی کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا کسی کے لیے سجدہ روا نہیں۔ اللہ نے سورۃ حٰم سجدہ میں صراحت فرمائی ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (آیت۔ ۳۷) نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ ان کے خالق اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

ابن ابی حاتم محدث نے روایت[1] بیان کی ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام مدینے کی کسی گلی بازار میں جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت سلمان فارسیؓ ملے۔ ایران کے لوگ اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے تھے۔ تو سلمان فارسیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ اس پر آپ نے اس کو سمجھایا! لَا تَسْجُدْ لِیْ یَا سَلْمَانُ وَاسْجُدْ لِلْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ اس زندہ جاوید ہستی کو سجدہ کرو جس کو موت نہیں۔ دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ روا ہوتا تو میں عورت سے کہتا کہ وہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے کیونکہ اللہ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ آج کل کی مغربی تہذیب والے زن و شوہر کی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو بیوی پر فضیلت عطا کی۔

ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا حضور! ہم غیر ممالک میں جا کر دیکھتے ہیں کہ وہاں لوگ اپنے ملوک کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ تو آپ تو اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم آپ کے سامنے سجدہ کیا کریں۔

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۰۲ ج ۴ (فیاض)

آپ نے فرمایا کہ میری وفات کے بعد اگر تمہارا گذر میری قبر سے ہوا تو کیا میری قبر پر بھی سجدہ کرو گے؟ اُس نے عرض کیا حضور! ایسا تو نہیں ہوگا۔ فرمایا جس طرح میری قبر پہ سجدہ روا نہیں اسی طرح میری زندگی میں بھی میرے سامنے سجدہ روا نہیں۔ سجدہ صرف اللہ کے سامنے کرو۔

اس زمانے میں لوگ قبروں پہ سجدہ کرتے ہیں جو کہ شرک اور قطعی حرام ہے مرید اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ حالانکہ خود حضور علیہ السلام نے اپنے سامنے سجدہ کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ کسی ہندو پیر کے متعلق اخبار میں آیا تھا کہ وہ کرسی پہ بیٹھ جاتا اور اُس کے چیلے اُس کے سامنے آکر سجدہ کرتے یہ تو انسانیت کی توہین ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو نافع اور ضار سمجھ کر سجدہ کرتا ہے تو وہ کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور ایسا نہیں سمجھتا تو سجدہ بہرحال حرام ہے۔ اس آخری امت میں نہ عبادت کا سجدہ روا ہے اور نہ تعظیمی سجدہ۔

فرمایا جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کے سامنے سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں ہم کسی رحمان کو نہیں جانتے۔ اور ساتھ یہ بھی اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا کیا ہم اُس کے لیے سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ کافر اور مشرک لوگ جہالت میں مبتلا تھے۔ وہ خدائے رحمان کے سامنے سجدہ کرنے سے بدکتے تھے مگر انسانوں اور بتوں کے سامنے جھکنے میں ذرا عار محسوس نہیں کرتے تھے وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا اور خدا تعالیٰ کو سجدہ کرنے کے متعلق اُن کی نفرت مزید بڑھ جاتی تھی۔ قرآن پاک میں کل ۱۴ سجدہ آیاتِ سجدہ ہیں جن کو پڑھنے سننے سے سجدہ لازم آتا ہے۔ اُن میں سے ایک یہ آیت بھی ہے۔ تمام سامعین بعد میں سجدہ کر لیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

ترجمہ :- بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رکھا ہے اُن میں ایک چراغ اور روشنی کرنے والا چاند (۶۱) اور وہ وہی ذات ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا اس شخص کے لیے جو ارادہ کرتا ہے کہ نصیحت پکڑے یا جو ارادہ کرتا ہے شکرگزاری کا (۶۲)

آسمانی برج

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب کفار و مشرکین کو خدائے رحمان کے سامنے سجدہ کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ کہتے کہ ہم کسی رحمان کو نہیں جانتے۔ اب آج کی پہلی آیت میں اسی اعتراض کا جواب ہے اور اُس ذات کی تعریف بیان کی گئی ہے جس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا بڑی بابرکت ہے وہ ذاتِ خداوندی جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے ہیں۔ وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا اور ان آسمانوں میں ایک روشن چراغ بھی رکھا ہے۔ وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا اور اجالا کرنے والا چاند بھی رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو ان صفات کی حامل ہے کہ اُس نے آسمانوں میں بُرج سورج اور چاند جیسی چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ روشن چراغ سے مراد سورج ہے جو ساری دنیا کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے

اللہ تعالیٰ کی صفت بابرکت اس سورۃ میں دو دفعہ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے سورۃ کی ابتدا میں پڑھ چکے ہیں تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ (آیت - ۱) بڑی برکتیں دینے والی ہے۔ وہ ذات جس نے فرقان کو نازل فرمایا ہے۔ پھر دوسرے رکوع کی ابتدا میں رسالت کے باب میں فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ (آیت - ۱۰) بابرکت ہے وہ ذات کہ اگر چاہے تو اپنے پیغمبر آپ کو اس سے بہتر چیزیں عطا کر دے۔ اور اب تیسری مرتبہ یہی لفظ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے سلسلہ میں آیا ہے

بعض[1] فرماتے ہیں کہ برج سے مراد آسمان کے بڑے بڑے ستارے ہیں جو رات کو نظر آتے ہیں اور ان میں کسی کی روشنی سفید کسی کی سرخ اور کسی کی نیلی ہوتی ہے۔ اللہ نے ان میں مختلف قسم کے خواص رکھے ہیں۔ اور بعض[2] فرماتے ہیں کہ آسمان کے مختلف مقامات پر بڑے بڑے قلعے اور دروازے بنے ہوئے ہیں جہاں اللہ نے فرشتوں کی ڈیوٹیاں لگا رکھی ہیں اور وہ وہاں پہرہ دیتے ہیں۔ ان قلعوں اور دروازوں کو برج کا نام دیا گیا ہے۔

معروف بارہ برج

البتہ بعض[3] کا نظریہ ہے کہ یہاں پر بروج سے مراد وہ معروف بارہ برج ہیں جو سات بڑے بڑے سیاروں کی منزلیں ہیں جن کے اندر یہ سیارے چلتے ہیں۔ سورج اور چاند بھی ان سبع سیارات میں شامل ہیں جن کی منازل کا ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ روزانہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور پھر ان کے ذریعے سے موسم اور عام موسم نمایاں طور پر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ان بارہ برجوں میں جو ستارے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی ایک خاص شکل بن جاتی ہے اور اسی شکل کی مناسبت سے ان برجوں کے نام بھی رکھے گئے ہیں۔ بارہ برجوں کے نام اور ان کی شکلوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر ص۳۲۳/ج۲ [2] ابن کثیر ص۳۲۳/ج۲ [3] السراج المنیر ص۲۲۹/ج۲ (فیاض)

	نام برج	جن میں موجود ستاروں سے بننے والی شکلیں
۱۔	حمل	بھیڑ کا بچہ
۲۔	ثور	بیل
۳۔	جوزا	اخروٹ درخت
۴۔	سرطان	پانی کا کیکڑا
۵۔	اسد	شیر
۶۔	سنبلہ	اناج کا خوشہ
۷۔	میزان	ترازو
۸۔	عقرب	بچھو
۹۔	قوس	کمان
۱۰۔	جدی	بکری کا بچہ
۱۱۔	دلو	ڈول
۱۲۔	حوت	مچھلی

سبعہ سیارات کی منازل

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے ہمارے اس نظامِ شمسی میں سات بڑے بڑے سیارے ہیں جو ان برجوں میں چلتے ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

	نام سیارہ	نام برج
۱۔	مریخ	حمل اور عقرب
۲۔	زہرہ	ثور اور میزان
۳۔	عطارد	جوزا اور سنبلہ
۴۔	قمر	سرطان
۵۔	شمس	اسد
۶۔	مشتری	قوس اور حوت
۷۔	زحل	جدی اور دلو

اکثر اخبارات کے بعض اداریوں میں ان سیاروں اور برجوں کی مدد سے نجومی لوگ
بعض پیشین گوئیاں بھی کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ نجوم کے ذریعے
غیب کی خبریں معلوم کرنا سحر اور شرک میں شمار ہوتا ہے۔ البتہ ان سیاروں و
برجوں کے ذریعے موسموں کے تغیر و تبدل وغیرہ معلوم کرنا درست ہے
بعض منجم لوگوں کی سعادت اور شقاوت کو ان سیاروں کے ساتھ وابستہ
کرتے ہیں اور پھر غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ ایسا کرنا باطل ہے۔

سورج اور چاند کے فوائد

سات بڑے بڑے سیاروں میں سے سورج اور چاند کا ذکر اللہ نے
اس آیت میں کیا ہے اور دیگر بہت سے مقامات پر بھی ہے۔ مثلاً سورۃ
نوح میں فرمایا ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ
الشَّمْسَ سِرَاجًا (آیت ۱۶) اللہ نے سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر
کرنے کے بعد فرمایا کہ ان میں چاند کو اجالا کرنے والا اور سورج کو چراغ بنایا۔
چاند اور سورج دونوں بڑے نمایاں سیارے ہیں جن کا تعلق براہ راست
مخلوق کے ساتھ ہے۔ رات کے وقت چاند کی مدھم روشنی اور ستاروں کی
ادلا بدلی رات کے مسافروں کے لیے رہنمائی کا کام دیتی ہے۔ اور سورج
سب سے چمکدار سیارہ ہے اللہ نے اس میں روشنی اور حرارت کا بہت بڑا
ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ پورے نظام شمسی کو یہ دونوں چیزیں مہیا
کر رہا ہے۔ جب سے اللہ نے سورج کو پیدا کیا ہے اس کا ایندھن مہیا ہو رہا
ہے اور قیامت تک جلتا رہے گا اور اس کی حرارت اور روشنی میں کوئی فرق
نہیں آئے گا۔ لیکن آخر میں ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ ایندھن بھی ختم
ہو جائے گا پھر اس نظام کو تبدیل کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا
نظام لایا جائے گا۔

آجکل ہم مشینی دور سے گزر رہے ہیں سائنس بہت ترقی کر چکی ہے
ابتدا میں لکڑی سے ایندھن کا کام لیا جاتا تھا۔ جب آبادی بڑھتی گئی اور

[illegible] میں اضافہ ہو تو پیداوار کو کم کر دیتا
ہے یا بالکل ختم کر دیتی ہے۔ پیٹرول اور بجلی اب دریافت ہوئے ہیں مگر ان تمام چیزوں سے
[illegible] پیدا ہوتی ہے اور اس سے نباتات کی غذا کو پہنچا
سکتے ہیں۔ مگر اس کی پیداوار کا انحصار بھی تیل یا پانی پر ہے اور یہ چیزیں بھی محدود
ہیں۔ لہٰذا سائنسدان آئندہ کی اپنی ضروریات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں
اور ایندھن کے نئے نئے وسائل بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ایک سورج
کی حرارت اور [illegible] SOLAR ENERGY کو عام استعمال میں لانے
کے لیے تجربات ہو رہے ہیں اور کسی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے
اور امید کی جاتی ہے کہ اکیسویں صدی میں شمسی توانائی کا استعمال عام ہو جائے
گا۔ اور عام گھریلو استعمال کے علاوہ اس سے بڑے بڑے کارخانے،
بجلی گھر اور گاڑیاں بھی چلنے لگیں گی۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سورج
میں اس قدر حرارت اور روشنی رکھی ہے جو صدیوں سے کام آ رہی ہے
اور آئندہ نامعلوم کب تک اور کس کس طرح استعمال میں آتی رہے گی۔ تو یہاں پر
اللہ نے بطور احسان یاد دلایا ہے کہ وہ ایسی بابرکت ذات ہے جس نے
آسمانوں میں برج کھڑے کئے ہیں اور ان میں خاص طور پر دو نہایت ہی
مفید سیارے چاند اور سورج مقرر کیے ہیں جن سے جاندار اور نباتات مستفید
ہو رہے ہیں۔

جس طرح شمس ایک نہایت ہی کارآمد سیارہ ہے۔ اسی طرح چاند سے بھی
بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ قمر کی مدھم اور دھیمی روشنی اپنے اندر خاص
اثرات رکھتی ہے۔ مثلاً پھلوں میں رس چاندنی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے انسانوں
جانوروں اور نباتات پر بھی اس کے خاص اثرات پڑتے ہیں۔ سمندروں میں مدوجزر
بھی چاند کے اثرات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت
اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔

شب و روز کے تغیر کی حکمت

آگے پھر اللہ نے فرمایا وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والے بنایا۔ یہ آپس میں بدلتے رہتے ہیں۔ رات گئی تو دن نمودار ہوگیا۔ اور دن ختم ہوا تو رات کی تاریکی چھا گئی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ نشانات اُس شخص کے غور و فکر کے لیے ہیں لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا یا جو شکر ادا کرنا چاہتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مناظرِ قدرت سے جو شخص مستفید ہونا چاہے گا۔ اِن میں غور و فکر کریگا اور آخر کار۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو جائے گا۔ مگر جو شخص ان میں دھیان ہی نہیں کرتا۔ سوچتا سمجھتا ہی نہیں، وہ نہ تو ان سے کوئی نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اُس کے لیے سارا نظامِ قدرت محض بیکار ہے۔ اُس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی دن کے وقت بھی آنکھیں بند کرے اور پھر کائنات کی ہر چیز کا انکار کر دے۔

صحیح حدیث[1] میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِالَّیْلِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ النَّھَارِ اللہ تعالیٰ اپنی شفقت کا ہاتھ رات کو پھیلا دیتا ہے تاکہ دن کے وقت برائی کرنیوالا رات کو توبہ کرے اسی طرح فرمایا یَبْسُطُ یَدَہٗ بِالنَّھَارِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ الَّیْلِ اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ دن کے وقت پھیلا دیتا ہے تاکہ رات کو گناہ کرنیوالا دن کے وقت معافی مانگ لے۔ شب و روز کے تغیر و تبدل کی ایک یہ حکمت بھی بیان کی ہے۔

ایک دوسری حدیث[2] میں دن رات کی حکمت اور مصلحت اس طرح بھی بیان کی گئی ہے۔ مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِہٖ اَوْعَنْ شَیْءٍ مِّنْہُ فَقَرَاَہٗ فِیْمَا بَیْنَ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَصَلٰوۃِ الظُّھْرِ کُتِبَ لَہٗ کَاَنَّمَا قَرَاَہٗ مِنَ الَّیْلِ (مسلم) جو آدمی رات کو اپنا ورد پورا کیے بغیر سو گیا۔ پھر اگر اس نے وہ عمل فجر اور ظہر کے درمیان ادا

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۲ [2] احکام القرآن للجصاص صفحہ ۳۲۴/۳ (فیاض)

کر لیا تو ایسا ہی ہے جیسا اُس نے وہ عمل رات کے وقت ہی کیا۔ کسی شخص نے کسی ورد، تلاوت یا نماز کا معمول بنا رکھا ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر یہ عمل کرے گا۔ مگر نہیں کر سکا تو اس کی تلافی بھی حضور علیہ السلام نے بتا دی کہ وہ اپنا عمل دن کے وقت کرے تو اُسے پورا پورا ثواب ملے گا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے چاشت کی نماز بڑی دراز کر کے پڑھی۔ لوگوں نے پوچھا حضرت اس کی کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا، آج رات کی نماز تہجد رہ گئی تھی جسے میں نے اب ادا کیا ہے۔ نیز فرمایا بُدِلُ مَا فَاتَكَ مِنْ لَيْلِكَ فِي نَهَارِكَ جو چیز تم سے رات کے وقت رہ گئی ہے اس کا بدل دن میں ادا کر لو کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً کہ اُس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا بنایا ہے۔ مگر یہ اُس شخص کے لیے ہے جو دھیان کرتا ہے نصیحت پکڑتا یا شکر گزاری کرتا ہے۔ جو شخص غور و فکر سے عاری ہے، وہ رات دن کی مصلحت کیا سمجھے گا؟ اُس کا تو نصیحت پکڑنے یا شکر کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور پھر رات دن کا سلسلہ اس لیے قائم کیا ہے تاکہ لوگ پورے طریقے سے اس میں غور و فکر کریں اور پھر خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں تمام تقلبات اور تصرفات خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ سب کی کارسازی اُسی کے پاس ہے۔ رات اور دن کے فوائد کو دیکھ کر انسان کو شکر گزار رہنا چاہیے۔ یہ سارا اُس خدا نے جہان کا کارخانہ قدرت ہے جس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ حالانکہ پورے نظامِ کائنات میں بے شمار مصلحتیں ہیں جن سے نصیحت حاصل کی جا سکتی ہے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔

لہ احسن القرآن جلد [illegible] ص ۲۲۳ (فیاض)

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

ترجمہ:- اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر وقار کے ساتھ۔ اور جب خطاب کرتے ہیں اُن سے نادان لوگ تو وہ کہتے ہیں سلام ﴿۶۳﴾ اور وہ لوگ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے ﴿۶۴﴾ اور وہ لوگ جو کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہٹا دے ہم سے جہنم کے عذاب کو۔ بیشک اس کا عذاب لازم ہونے والا ہے ﴿۶۵﴾ بیشک وہ (جہنم) بہت بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور رہنے کی ﴿۶۶﴾ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل۔ اور ہوتا ہے اس کے درمیان اُن کا گزران ﴿۶۷﴾

ربطِ آیات گزشتہ رکوع کے آخر میں مشرکین کا ذکر ہوا کہ جب انہیں خدائے رحمان کے

سامنے سجدہ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں، کون ہے رحمان؟ ہم کسی رحمان کو نہیں جانتے۔ اللہ نے اُن کے اس بیہودہ کلام کے جواب میں خدائے رحمان کی صفات اور اُس کے کمالات کا تذکرہ فرمایا کہ رحمان وہ برکتیں دینے والی ہستی ہے جس نے آسمانوں میں برج قائم کیے، سورج جیسا روشن چراغ اور چاند جیسا اجالا کرنے والا سیارہ بنایا۔ اُس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا بنایا اور اس تغیر و تبدل میں خاص مصلحت رکھی جو نصیحت پکڑنے اور شکر ادا کرنے والوں کو دعوت غور و فکر دے رہی ہے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے خدائے رحمان کے بندوں کی چیدہ صفات بیان کی ہیں تاکہ مشرکوں کو معلوم ہو جائے کہ جس رحمان کے بندوں میں یہ اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں، خود رحمان کن کمالات کا مالک ہے جس کے سامنے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلکہ بیہودہ اعتراضات کرتے ہیں۔

عباد الرحمان کی صفات (۱) چال میں طمانیت

ارشاد ہوتا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر وقار اور طمانیت کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ عباد الرحمن کی پہلی صفت ہے کہ وہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں غرور و تکبر اور اکڑ کا اظہار نہیں کرتے بلکہ خدا کی زمین پر چلتے وقت پر سکون اور پر وقار نظر آتے ہیں۔ ان کی چال ڈھال میں کمال درجے کی تواضع اور متانت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف کفار و مشرکین ہمیشہ غرور میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ اُن کا تکبر ہی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خدائے رحمان کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک نوجوان سینہ آگے نکال کر اکڑتے ہوئے جا رہا تھا۔ آپ نے اُس کو بلا کر کہا کہ اکڑ کی چال اللہ کو پسند نہیں ہے سوائے جہاد کے وقت کافروں کے مقابلے میں کہ ایسے موقع پر اکڑ درست ہے۔ تاکہ دشمن مرعوب ہو۔ سورۃ لقمان میں ہے وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (آیت ۱۹) یعنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، جس طرح غرور و تکبر والی چال درست نہیں۔

---

۱ ابن کثیر ص ۳۲۴/۳ در منثور ص ۷۵/۶ (انیس)

اسی طرح ضعیفوں والی چال ڈھال بھی ٹھیک نہیں۔ حضور علیہ السلام کے بارے میں
آتا ہے کہ آپ تو اشعارہ دینے پر چلتے تھے مگر پاؤں زمین سے اٹھا کر۔
بیماروں کی طرح پاؤں زمین پر گھسیٹ کر چلنا بھی ٹھیک نہیں۔ حضور علیہ السلام[۱] چلتے
وقت آگے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے تھے گویا کہ آپ کسی ڈھلوان میں اتر
رہے ہیں۔ سینہ تان کر تکبر کی چال چلنا اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں
ہے کہ اگر اکڑ کر چلوگے۔ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ
تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (آیت ۳۷) تو نہ تو زمین کو پھاڑ سکے گا۔ اور نہ تمہارا
سر آسمان سے ٹکرائیگا، ہلکہ رہو گے۔ پھر بھی انسان ہی۔ لہذا اکڑ کی چال اللہ
کو ہرگز پسند نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کے بندے زمین پر ہمیشہ وقار کے
ساتھ چلتے ہیں۔ سکون اور اطمینان کو اپنا وطیرہ بناتے ہیں۔ بلاوجہ دوڑنا بھی بیوقوفوں
والی بات ہے۔ ایسا بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ حدیث[۲] میں آتا ہے کہ جب نماز
کے لیے آؤ تو تیز مت چلو بلکہ عَلَیْکُمُ السَّکِیْنَةُ وَالْوَقَارُ تم پر
اطمینان اور وقار لازم ہے آرام سے آؤ۔ نماز کا جتنا حصہ جماعت سے مل جائے ادا
کرو۔ اور باقی حصہ بعد میں پڑھ لو مگر طمانیت کا دامن مت چھوڑو کہ یہ ناپسند ہے۔

(۲) سلام متارکت

عباد الرحمٰن کی دوسری صفت اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے وَاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا جب ان سے جاہل لوگ بات چیت
کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں سلام ہو۔ کفار و مشرکین بے ادب، گستاخ اور
بے وقوف لوگ ہیں مگر اللہ کے بندے بے ادبی اور گستاخی کا جواب اس
طرح نہیں دیتے بلکہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ یہ سلام متارکت کہلاتا ہے نہ
ہم تمہارے ساتھ الجھیں گے نہیں۔ تمہاری اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں
دیں گے، گالی کا جواب گالی نہیں ہوگی۔ کیونکہ جہالت کا جواب جہالت سے
دینا جاہلوں کا کام ہے۔ عرب کے مشرک کہتے تھے

اَلَا لَا یَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا — فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِیْنَا

۱؎ ابن کثیر ص۳۲۴ ج۳ و قرطبی ص۶۹ ج۱۳
۲؎ ابن کثیر ص۳۲۴ ج۳ (فیاض)

نیز اگر کوئی بات ساتھ جہالت سے پیش نہ آئے۔ ورنہ یہ تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت سے پیش آئیں گے۔ غرضیکہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ جب جاہل لوگ کوئی ایسی بات کرتے ہیں تو اللہ کے بندے مناسب طریقے سے صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں اور بیہودہ لوگوں کو منہ نہیں لگاتے روزے والی حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص روزے دار کے ساتھ بیہودہ بات کرے تو روزے دار کو چاہیئے کہ وہ کہہ دے بھائی! اِنِّیۡ اِمۡرَءٌ صَائِمٌ میں روزہ دار ہوں۔ میں تمہاری بیہودہ بات کا جواب بیہودگی سے نہیں دوں گا۔ اسی طرح عباد الرحمان کی صفت یہ ہے کہ جاہلوں کے ساتھ الجھنے کی بجائے سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

(۳)
سجود و قیام

فرمایا وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

اللہ کے بندے وہ ہیں جو اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے یعنی نماز پڑھتے ہوئے رات گزارتے ہیں یہ ان کی تیسری صفت بیان ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کی راتیں لہو و لعب، کھیل تماشے اور غفلت میں نہیں گزرتیں بلکہ اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑاتے ہوئے بسر ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ رات کے وقت بڑی بڑی مجلسیں قائم کیا کرتے تھے جہاں قصے کہانیاں سنائے جاتے، شعر و شاعری ہوتی، لطیفہ گوئی ہوتی۔ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں لوگوں کی راتیں سینما، آرٹ گیلری اور کلب میں گزر جاتی ہیں۔ جہاں گانا بجانا، رقص و سرود اور بیہودہ باتیں ہوتی ہیں۔ عریانی اور فحاشی کا بازار گرم ہوتا ہے مگر جو اللہ کے بندے ہیں وہ پرانے زمانے میں بھی ان لغویات سے مبرا تھے اور آج بھی ان کی راتیں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ہی گزرتی ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے[1] کہ تہجد کی نماز نفلی عبادتوں سے افضل ہے۔ مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اَفۡضَلُ الصَّلٰوةِ

[1] مسند احمد ص — و ترمذی ص۹ (فیاض)

بَعْدَ الْمَفْرُوْضَةِ صَلوٰۃٌ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ یعنی فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز وہ ہے جو رات کو پڑھی جائے۔ ترمذی شریف[1] میں آپ کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ عَلَیْکُمْ بِقِیَامِ اللَّیْلِ فَاِنَّہٗ دَاْبُ الصّٰلِحِیْنَ قَبْلَکُمْ وَھُوَ قُرْبَۃٌ لَّکُمْ اِلٰی رَبِّکُمْ وَمَکْفَرَۃٌ لِّلسَّیِّاٰتِ وَمَنْھَاۃٌ عَنِ الْاِثْمِ لوگو! رات کے قیام کو لازم پکڑو کہ تم سے پہلے نیک لوگوں کی یہی عادت تھی۔ یہ تمہارے لیے خدا تعالیٰ کا قرب دلانے، برائیوں کو مٹانے اور گناہوں سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ غرضیکہ فرمایا کہ اللہ کے بندوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ اُن کی راتیں سجود و قیام میں گزرتی ہیں۔

جہنم سے ڈر رہنے کی دُعا

فرمایا اللہ کے بندوں کی چوتھی صفت یہ ہے وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کے عذاب کو دُور کر دے۔ اللہ کے بندوں کو ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں وہ دوزخ کے عذاب کا شکار نہ ہو جائیں اس لیے وہ ہمیشہ اس سے پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں موجود ہے کہ اللہ کے بندے اپنے پروردگار سے جہاں دنیا اور آخرت کی بھلائی طلب کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی درخواست کرتے ہیں وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آیت - ۲۰۱) پروردگار! ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔ سورۃ آل عمران میں ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ (آیت ۱۸۵) جو شخص دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ اللہ کے بندے ہمیشہ ایسی ہی کامیابی کی دعائیں کرتے ہیں۔ بہرحال اللہ کے بندوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ جہنم کے عذاب سے رہائی چاہتے ہیں کیونکہ اِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَامًا بیشک جہنم کا عذاب لازم ہونے والا یعنی چمٹ جانے والا ہے۔ غرام تاوان کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ متعلقہ شخص کو چمٹ

[1] ترمذی ص۵۱۵ (فیاض)

جانتے ہے إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا یعنی بے شک یہ دوزخ رہائش کی بہت بری جگہ اور بہت برا ٹھکانا ہے۔

مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ دوزخ میں پڑا ہوا ایک شخص ایک ہزار سال تک یَاحَنَّانُ یَامَنَّانُ یعنی اے شفقت کرنے والے اور احسان کرنے والے خدا پکارتا رہے گا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا کہ جاؤ اس شخص کو پکڑ کر لے آؤ۔ فرشتے جا کر دیکھیں تو سب دوزخی اوندھے منہ پڑے ہوں گے اور مطلوبہ شخص کی شناخت نہیں ہو سکے گی۔ واپس آ کر اللہ کے سامنے صورت حال بیان کریں گے۔ اللہ فرمائے گا، جاؤ اس کو لے کر آؤ۔ فرشتے اس شخص کو پکڑ کر لے آئیں گے جب وہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ تو اللہ فرمائے گا، اے میرے بندے! دوزخ کا ٹھکانا کیسا ہے؟ وہ کہے گا، بہت ہی برا ہے نہایت ہی تکلیف دہ ہے۔ اللہ فرمائے گا، جاؤ واپس اُسی میں چلے جاؤ۔ وہ بندہ عرض کرے گا۔ مولا کریم! تیری رحمت سے مجھے یہ امید تو نہ تھی کہ ایک دفعہ دوزخ سے نکالنے کے بعد پھر اُسی میں داخل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئے گی اور حکم ہوگا کہ اس کو دوزخ سے رہا کر دو۔ بہرحال دوزخ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

۱۵۰
خرچ میں میانہ روی

عباد الرحمان کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا اللہ کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل۔ اسراف دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک اسراف تو یہ ہے کہ انسان حرام، مکروہ اور ناجائز مقاصد پر مال خرچ کرے جیسا کہ دعوتوں، شادیوں اور پارٹیوں پر کیا جاتا ہے۔ مختلف تقریبات اور باطل رسوم پر روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یا پھر مکان کی زیبائش، لباس پر فضول خرچی اور دیگر ناجائز امور پر خرچ ہوتا ہے۔ دوسرا اسراف یہ

ے ابن کثیر صفحہ ۳۲۵ (فیاض)

ہے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔ ایک کام تھوڑے خرچہ سے بآسانی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے مگر ذاتی نمود و نمائش کی خاطر بے دریغ روپیہ بہانا اسراف ہے۔ ایک دعوت کا انتظام دو سو روپے میں ہو سکتا ہے تو اس پر ایک ہزار روپے خرچ کر دینا اسراف میں داخل ہے۔ چار چھ ڈش کی بجائے اگر ایک دو ڈش پر گزارا کر لیا جائے تو مال ضائع نہیں ہوگا۔ مگر اب تو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نمائش کی جاتی ہے اور پھر اس کے لیے کسی حد کا تعین نہیں ہو سکتا۔ جتنا بڑھاؤ گے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی اسراف ہے حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ نفس کی ہر خواہش کو پورا کرنا، جو جی چاہے کھانے کے لیے فوراً مہیا کر لینا بھی اسراف میں داخل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت[1] میں آتا ہے مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ جو میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ کا فرمان ہے كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف۔ ۳۱) کھاؤ، پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔

جس طرح فضول خرچی ناپسندیدہ ہے اسی طرح بخل بھی بہت بری بیماری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2] اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ بخل سے بڑھ کر کونسی بیماری ہو سکتی ہے۔ اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات بھی پوری نہ کرنا بخل ہے۔ غرباء و مساکین کی حق تلفی کرنا، عزیز و اقارب سے روگردانی کرنا وغیرہ بخل کی علامات ہیں جو کہ حرام اور ممنوع ہیں۔ بخل اور فضول خرچی کے درمیان بہترین راستہ میانہ روی کا راستہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا بھی سکھلائی ہے۔ اے پروردگار! میں تجھ سے میانہ روی کا سوال کرتا ہوں۔ جب کوئی انسان فقر، غنیٰ اور معیشت میں میانہ روی اختیار کرے گا تو اس کو پریشانی لاحق نہیں ہوگی کیونکہ اس کی معیشت کا توازن برقرار رہے گا۔ جونہی کوئی شخص اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ مقروض ہو کر ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

---

[1] السراج المنیر صفحہ ۱۹۱/۳، وابن کثیر صفحہ ۳۲۵/۳ [2] مسند احمد صفحہ ۳۰۸/۳، دکنز العمال صفحہ ۲۵۷/۳ (فیاض)

فرمایا، رحمان کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا بلکہ ان کا گذران ان دونوں کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ قِوام اگر قاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے انسان کی ضرورت پوری ہو جائے اور قَوام کا معنی گذران ہے دونوں لحاظ سے معنی ایک ہی ہے کہ اللہ کے بندے خرچ کرتے وقت روی میانہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنی جائز ضروریات بخوشی پورا کرتے ہیں مگر ناجائز امور پر اپنا مال خرچ نہیں کرتے۔

لہ بیضاوی ص ۱۵/ج ۲ (فیاض)

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

ترجمہ:- اور (عباد الرحمان) وہ لوگ ہیں جو نہیں پکارتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو الٰہ۔ اور نہیں قتل کرتے اُس جان کو کہ اللہ نے اُسے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور نہیں وہ بدکاری کرتے۔ اور جو شخص ایسا کرے گا، وہ پائے گا، گناہوں کی سزا ﴿۶۸﴾ دگنا کیا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن، اور ٹھہرے گا وہ اس میں خوار کیا ہوا ﴿۶۹﴾ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا عمل کیا۔ پس یہی لوگ ہیں کہ تبدیل کر دے گا اللہ تعالیٰ اُن کی برائیوں کو نیکیوں میں اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا مہربان

ہے ﴿۷۰﴾ اور جس شخص نے توبہ کی اور اچھا عمل کیا پس بیشک وہ شخص رجوع رکھتا ہے اللہ کی طرف رجوع رکھنا ﴿۷۱﴾ اور وہ لوگ جو نہیں شامل ہوتے جھوٹے کام میں اور جب وہ گزرتے ہیں کسی بیہودہ بات کے پاس سے تو گزرتے ہیں شریفانہ طریقے پر ﴿۷۲﴾

ربط آیات

پہلے خدائے رحمان کے اوصاف اور کمالات کا ذکر ہوا۔ پھر اللہ نے عبادالرحمان کی صفات بیان فرمائیں۔ اب تک پانچ صفات کا بیان ہو چکا ہے یعنی خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو (۱) زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ وقار اور سکینت کے ساتھ چلتے ہیں۔ (۲) جب اُن سے نادان لوگ بات کرتے ہیں تو وہ الجھنے کی بجائے سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔ (۳) اللہ کے بندوں کی راتیں سجود و قیام میں گزرتی ہیں (۴) وہ اپنے پروردگار سے دوزخ کو دور کرنے کی دعائیں کرتے ہیں (۵) وہ لوگ خرچ کرنے وقت نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔

(۶) شرک سے بیزاری

اب آج کی آیات میں عبادالرحمان کی چھٹی صفت یہ بیان ہوئی ہے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو الٰہ نہیں پکارتے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کسی کو شریک نہیں بناتے۔ یہ بڑی عظیم اور سب سے مقدم صفت ہے۔ خدا کا بندہ کسی کو الوہیت میں شریک نہیں کرے گا، چونکہ خالق، مالک، قادرِ مطلق، مختارِ مطلق اور علیمِ کل صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے لہٰذا اُس کے سوا مستحقِ عبادت بھی کوئی نہیں۔ قولاً، فعلاً، عملاً غایت درجے کی تعظیم کے لائق صرف ذاتِ خداوندی ہے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ کا شریک ٹھہرائے

ل بحر المحیط ص۵۱۴ ج۶ احکام القرآن جصاص ص۲۲۲ ج۳ کشاف ص۲۹۲ ج۳ (فیاض)

حالانکہ اسی نے تمھیں پیدا کیا ہے، عرض کیا، اس کے بعد کونسا گناہ ہے۔ فرمایا اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ تو اپنے بچے کو اس وجہ سے قتل کرے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہو جائے گا۔ اولاد کی پرورش کے خوف سے اُسے مار ڈالے۔ ابن مسعودؓ نے پھر عرض کیا، اس کے بعد کون سا گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ گویا یہ اکبرالکبائر میں سے بعض جرائم ہیں، اور ان میں سے سرِفہرست اشراک باللہ ہے اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی دوسرے کو اللہ کی عبادت میں یا صفت میں شریک کرے گا، کسی کو نافع اور ضار سمجھ کر اُس سے حاجت طلب کرے گا، مراد مانگے گا۔ یا کسی کی نذر و نیاز پیش کریگا تو یہ شرک ہو گا جسے سب سے بڑا جرم شمار کیا گیا ہے

(۷) قتلِ نفس سے اجتناب

فرمایا اللہ کے بندوں کی ساتویں صفت یہ ہے وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ کہ وہ کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ صرف تین صورتوں میں قتل کرنا روا ہے ایک ایسا قتل جو قتل کے بدلے میں قصاص کے طور پر کیا جائے۔ دوسرا مرتد کا قتل ہے جو دینِ اسلام سے پھر جائے اور سمجھانے بجھانے اور شکوک و شبہات دُور کرنے کے باوجود دین میں واپس نہ آئے، اور تیسرا قتل محصن زانی کا ہے جسے سنگسار کر دیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندے وہ ہیں جو اللہ کی حرام کردہ کسی جان کو قتل نہیں کرتے سوائے قتلِ حق کے۔

(۸) زنا سے پرہیز

آگے فرمایا اللہ کے بندے وہ ہیں وَلَا يَزْنُوْنَ جو بدکاری کا ارتکاب نہیں کرتے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، زنا بھی اکبرالکبائر میں شامل ہے پھر اس میں بھی قبیح بدکاری وہ ہے جو اپنے پڑوسی کی بیوی سے کی جائے۔ کیونکہ اِنَّ لِلْجَارِ عَلَى الْجَارِ حَقًّا پڑوسی کا پڑوسی پر بڑا حق ہوتا ہے۔ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے مال اور عزت و ناموس کا محافظ ہوتا ہے

اور اگر وہی اُس کی آبرو ریزی کرے تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ دس گھروں سے چوری کرنا زیادہ ہلکا ہے اس سے کہ پڑوسی کے ایک گھر سے چوری کی جائے۔ چوری تو مطلق حرام ہے مگر پڑوسی کی چوری دس گنا زیادہ قبیح ہے۔

فرمایا وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا جو کوئی ایسے فعل کا ارتکاب کرے گا، وہ گناہوں کے جرم کو پائے گا۔ آثام، اثم کی جمع ہے جس کا معنی گناہ ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ جس میں سخت سزا دی جائے گی۔ اگر یہ معنی ہو تو جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص جہنم کی اُس وادی کو پائے گا یعنی اُس میں پہنچ جائے گا۔ فرمایا ایسے مجرم کے لیے يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت والے دن اُس کے عذاب کو دگنا کر دیا جائے گا۔ نہ اس کا جرم ختم ہوگا اور نہ سزا ختم ہوگی۔ بلکہ بڑھتی ہی جائے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ اُس کی سزا کو ڈبل کر دیا جائے گا۔ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا اور وہ اس میں ذلیل و خوار ہو کر رہے گا۔ یہ تو ایک گناہ کی سزا ہے۔ اگر اس کے علاوہ دیگر جرائم بھی ہیں تو ہر جرم کی الگ الگ سزا ملے گی اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

(۵)
توبہ اور انابت

فرمایا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا مگر جس شخص نے توبہ کر لی، وہ ایمان لے آیا، اور اس نے اچھا عمل بھی کیا۔ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ پس یہی لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل کر دے گا یعنی پہلے جرائم معاف ہو کر اُن کی جگہ نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔ جب تک انسان کے ہوش و حواس قائم ہیں اور اس پر موت کا غرغرہ طاری نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ ہر گناہ سے حتیٰ کہ کفر اور شرک جیسے بدترین گناہوں سے بھی تائب ہو کر اللہ کے نیک بندوں میں شامل ہو سکتا ہے۔

ـــــــــــــــ
[1] ابن کثیر ص ۳۲۶ ج ۳، درمنثور ص ۷۹ ج ۵ (فیاض)

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے کو حاضر کرنے کا حکم دیں گے۔ جب وہ حاضر ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو شمار کیا جائے۔ پھر اُس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے یہ گناہ کیا۔ وہ شخص اقرار کرتا جائے ـــــ گا اور ساتھ ساتھ خائف بھی ہوگا کہ کہیں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے جرائم کے متعلق نہ پوچھ لے۔ پھر حکم ہوگا، جاؤ ہم نے تمھارے یہ چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دیئے اور ان کے بدلے میں ایک ایک نیکی دے دی۔ وہ شخص دلیر ہو جائے گا کہ گناہوں کے بدلے میں نیکیاں بھی مل رہی ہیں تو کیوں نہ بڑے بڑے گناہوں کا تذکرہ بھی ہو جائے تاکہ ان کے بدلے میں بھی نیکیاں مل جائیں پھر وہ عرض کرے گا۔ کہ مولا کریم! ابھی میرے بعض گناہوں کا ذکر نہیں ہوا۔ یہ بیان کرتے ہوئے حضور علیہ السلام نے تبسم فرمایا کہ دیکھو یہ شخص پہلے تو اپنے گناہوں سے خائف تھا مگر اب اللہ کی مہربانی دیکھ کر اتنا دلیر ہو گیا کہ خود اُن کا تذکرہ کر رہا ہے۔ بہر حال بعض لوگوں پر اللہ تعالیٰ اس قدر راضی ہو جائے گا کہ اُن کے گناہوں کی بجائے اُن کے نامہ اعمال میں نیکیاں درج ہو جائیں گی۔ یہ سب سچے دل سے توبہ کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا اور بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے

اللہ نے یہ بھی فرمایا وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا جس نے توبہ کرلی اور نیک عمل انجام دیا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا پس بے شک وہ شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رکھتا ہے۔ رجوع رکھنا۔ یہ ایمان والوں کی خاص صفت ہے کہ کوتاہی ہو جاتی ہے تو فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا کرنے والے شخص کے نہ صرف گناہ معاف ہو جائیں گے بلکہ اُس کے گناہ نیکیوں میں بدل دیئے جائیں گے۔

(۱۰) جھوٹ سے پرہیز

اس کے علاوہ اللہ کے بندوں کی دسویں صفت یہ ہے وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ کہ وہ جھوٹے کام میں حاضر نہیں ہوتے بلکہ ہر جھوٹے

لے در منثور صفحہ ۲۷۹ ج ۵ (فیاض)

فعل سے پرہیز کرتے ہیں۔ بعض اس سے مراد جھوٹی گواہی لیتے ہیں یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے کہ جھوٹی گواہی بھی اکبر الکبائر میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق-۲) یعنی اللہ کے لیے گواہی صحیح صحیح دو۔ چنانچہ گواہ کا عادل ہونا ضروری ہے۔ کسی فاسق فاجر اور غیر عادل گواہ کی گواہی معتبر نہیں ہے کیونکہ جھوٹی گواہی سے یا تو کسی کا جائز حق ضائع ہوتا ہے یا ناجائز حق ثابت ہوتا ہے۔ کسی مسلمان کی حق تلفی بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اسی لیے مصنف ابن ابی شیبہؒ اور مصنف عبدالرزاقؒ جیسی کتب احادیث میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس شخص کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی معاملہ میں جھوٹی گواہی دی ہے تو اس کو چالیس درے لگائے جائیں۔ اس کا منہ سیاہ کر کے اس کی تشہیر کی جائے کہ یہ جھوٹا گواہ ہے۔ نیز اس کو قید میں بھی ڈالا جائے وہ تینوں سزاؤں کا مستحق ہے۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری عدالتوں کا سارا نظام ہی جھوٹی گواہیوں پر چل رہا ہے۔ پولیس والے گواہ کو اچھی طرح پڑھا کر عدالت میں پیش کرتے ہیں کہ یوں کہنا اور یوں نہ کہنا۔ درحقیقت ہونا تو یہ چاہیے کہ گواہ جو کچھ جانتا ہے یا اس نے جو دیکھا ہے بے کم و کاست بیان کر دے۔ مگر اس طرح تو مقدمہ خراب ہو جاتا ہے۔ جب تک اس میں جھوٹ کی ملاوٹ نہ ہوگی۔ مقدمے کا فیصلہ حسب منشا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ سارا قانون شہادت ہی غلط ہے۔ عدالتوں میں روزمرہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ تھوڑی سی فیس کے بدلے پیشہ ور اجرتی گواہ مل جاتے ہیں۔ بعض تو ایک سگریٹ کے بدلے جھوٹی گواہی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لوگ گواہی کی اہمیت سے اس قدر بے خوف ہو چکے ہیں ایسے حالات میں عدالتوں کا نظام کیسے درست ہو سکتا ہے اور سوسائٹی کیسے پاک ہو سکتی ہے؟ بہرحال عباد الرحمان کی ایک صفت یہ

بھی ہے کہ نہ وہ جھوٹی گواہی دیتے ہیں اور نہ کسی مطلق جھوٹ کے معاملے میں شریک ہوتے ہیں۔

(۱۱) لغویات سے کنارہ کشی

اللہ کے بندوں کی گیارہویں صفت یہ ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا کہ جب وہ کسی لغویات کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفانہ طریقے پر گزر جاتے ہیں۔ ہر بیہودہ، ناجائز اور فحش بات لغو کے زمرہ میں آتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور امام ابوحنیفہؒ لغو بات سے گانا، بجانا مراد لیتے ہیں۔ کھیل تماشہ، گانا بجانا، عشق و محبت کی داستانیں سب لغویات میں شامل ہیں بعض آثار میں آتا ہے يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ کہ یہ چیزیں دل میں نفاق پیدا کرتی ہیں۔ مگر آج آپ معاشرے میں نظر مار کر دیکھ لیں، کوئی گھر، کوئی مکان، کوئی رفاہِ عامہ کا ادارہ، کوئی کلب اور آرٹ گیلری اس قباحت سے پاک نہیں ہے۔ ریڈیو ہوائی وی ہر وقت موسیقی کا پروگرام چل رہا ہے کھیل تماشے کے لیے وزارتیں بنی ہوئی ہیں۔ لاکھوں روپیہ کا زرمبادلہ خرچ کر کے بین الاقوامی کھیلوں میں حصہ لیا جاتا ہے اور پھر جیتنے پر صدر اور وزیر اعظم کی طرف سے مبارکباد دی جاتی ہے۔ اللہ کے بندو! انہوں نے کون سا قلعہ فتح کر لیا ہے۔ کوئی قوم اور ملک کی خدمت کی ہوتی، دین کی خدمت کی ہوتی تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔ یہی حال پہلوانی اور باڈی بلڈنگ کے فن کا ہے۔ محض فضولیات اور تضیع اوقات ہے۔ پیسے کی بربادی ہے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور دہریوں کے نقش قدم پر بلا سوچے سمجھے چل رہے ہیں۔ آخر ان ڈراموں سے قوم کی کون سی اصلاح ہوتی۔ یہ تو الٹا چوری، ڈکیتی اور عشق و محبت کی تربیت گاہیں بن چکی ہیں مگر ساری قوم انہی لغویات میں الجھ کر رہ گئی ہے، کوئی نہیں کہتا کہ بھائی ان لغویات کی بجائے کوئی اچھا کام کرو۔ اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو ایسی لغویات سے شریفانہ طریقے سے گزر جاتے ہیں اور ان میں ملوث نہیں ہوتے

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

ترجمہ:- اور وہ لوگ جب کہ ان کو یاد دلائی جاتی ہیں اپنے پروردگار کی آیتیں، تو نہیں گرتے اُن پر بہرے اور اندھے ہو کر ﴿۷۳﴾ اور وہ لوگ جو کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار عطا فرما ہم کو ہماری بیویوں سے اور ہماری اولادوں سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا دے ہمیں متقیوں کا پیشوا ﴿۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جن کو بدلہ دیا جائے گا بالاخانوں کا اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا، اور وہ دیے جائیں گے اس میں دعا اور سلام ﴿۷۵﴾ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اچھی ہے وہ ٹھہرنے کی جگہ اور قرار گاہ ﴿۷۶﴾ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، نہیں پروا رکھتا تمہاری میرا پروردگار اگر نہ ہو تمہارا پکارنا اُس کو۔ پس بیشک تم نے جھٹلا دیا ہے۔ لہٰذا

عنقریب مستقر بہتر ہو گی (۷۷)

(۱۲) آیاتِ الٰہی میں غور و فکر

عبادالرحمٰن کی صفات ہی کا ذکر ہو رہا ہے

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ اور اللہ کے بندے وہ ہیں کہ جب انہیں اُن کے پروردگار کی آیات یعنی احکام اور دلائل یاد دلائے جاتے ہیں سمجھائے جاتے ہیں۔ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا تو وہ اُن پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ اس کے برخلاف وہ اللہ تعالیٰ کے دلائلِ قدرت میں غور و فکر کر کے اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں، اس کے احکام کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور پھر اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کے بندے آیاتِ الٰہی کے ساتھ کفار و مشرکین جیسے بہرے اور اندھوں کا سا سلوک نہیں کرتے کہ اُن کو سنا نہ سمجھا، نہ غور و فکر کیا اور نہ اُس پر عمل کیا۔ بہرحال عباد الرحمان آیاتِ الٰہی سے غفلت نہیں برتتے۔ جن باتوں پر یقین رکھنا ضروری ہوتا اُن کو دل و دماغ میں جگہ دیتے ہیں اور جن پر عمل کرنا ہوتا ہے اُن پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، یہ اُن کی بارھویں صفت ہے۔

تعلیم و تعلم

ذُكِّرُوْا کا معنیٰ یاد دلانا یا سمجھانا ہوتا ہے۔ گویا آیاتِ الٰہی کا سمجھانا ضروری امر ہے۔ سب سے پہلے اللہ کا نبی وحی الٰہی کو اپنے مخاطبین تک پہنچاتا ہے اور اس کی جزئیات سمجھاتا ہے۔ پھر امت کے اہلِ علم لوگ احکامِ الٰہی کو نسل در نسل سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اِس سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ علم سمجھانے سے آتا ہے اور جو لوگ خود بخود محض مطالعہ کے زور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اُستاد کے بغیر کوئی شخص کسی بھی علم میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ دنیا کا کوئی بھی کسب و ہنر خواہ وہ موچی، بڑھئی، درزی یا لوہار کا ہو، اُستاد کے

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵ (فیاض)

سمجھائے بغیر نہیں آتا۔ کوئی ڈاکٹر خود بخود مطالعہ کر کے ڈاکٹر نہیں بن جاتا اور نہ
ہی کوئی انجنیئر ذاتی مطالعہ کے ساتھ کامیاب انجنیئر بن سکتا ہے۔ ہر شعبہ میں
تحقیق کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کسی فن کو سیکھنے میں مہارت حاصل کرنی ہو تو
وہاں قرآن کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہے۔ پرویز وغیرہ جیسے لوگ جو تھوڑی سی
عربی زبان پڑھ کر قرآن کریم کا ترجمہ شروع کر دیتے ہیں تو پھر وہ گمراہی کا باعث
بھی بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ
اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل۔ ۴۳) جس چیز کا تمھیں علم نہیں وہ
یاد کرنے والے یعنی اہلِ علم سے دریافت کر لو۔ قرآن پاک میں اس بات کا
بار بار تذکرہ آیا ہے کہ ناواقف لوگ جاننے والوں سے پوچھ لیا کریں تاکہ
اُن کا رُخ سیدھا ہو جائے۔ جب بھی کسی معاملہ میں مشکل درپیش ہو یا
کسی بات کی سمجھ نہ آتی ہو تو پھر لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ
مِنْهُمْ (النساء۔ ۸۳) اہلِ علم کے پاس جاؤ، وہ استنباط و استخراج کر کے
تمھارا مسئلہ حل کر دیں گے۔ اور اس طرح گویا اُستاد سے صرف سیکھنا ہی کافی
نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے سچے پیروکاروں کا نمونہ بھی سامنے رکھنا
ضروری ہے۔ اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا بھی لازم ہے۔

(۱۳) ازواج و اولاد کی فکر

عباد الرحمان کی ایک صفت یہ بھی ہے وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ
اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! بخش
دے ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی
یہ کہ ہماری بیویوں کو ایسی ہدایت عطا فرما کہ وہ قلب و نظر کا سرور بن جائیں
اور اولاد بھی ایسی ہو کہ جسے دیکھ کر دل مطمئن اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں جس
کامل الایمان آدمی کی بیوی نیز اولاد ہو، اس کا عقیدہ اور اخلاق درست ہو
اور عملِ صالح ہو تو وہ اس کے لیے مسرت کا باعث ہوگی۔ اسی طرح

جس کی اولاد نیک اور باعمل ہوگی وہ بھی اُس شخص کے لیے اطمینان کا باعث ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر بیوی یا اولاد کا عقیدہ خراب ہوگا، یا عمل میں کوتاہی ہوگی۔ اخلاق غیر معیاری ہوگا تو ایسے شخص کو سرور اور اطمینان کیسے حاصل ہوسکے گا؟

حدیث میں آتا ہے کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد اُس کی اولاد اس کے حق میں جو دُعا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ اُس کا صلہ مرنے والے کو دیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْلَهٗ یعنی وہ نیک اولاد جو اس کے لیے دُعا کرے۔ ظاہر ہے کہ اگر اولاد نیک ہوگی تو وہ دُعا بھی کرے گی اور اس کا فائدہ بھی ہوگا اور اگر اولاد نیک ہی نہیں ہے تو وہ والدین کو اُن کے مرنے کے بعد کیا فائدہ پہنچا سکے گی۔ اسی لیے اللہ کے بندے یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اُن کی اولاد اطاعت کے راستے پر گامزن رہے وہ مفید علم حاصل کرے اور اچھی باتوں کے ساتھ شغل رکھے تاکہ اُس کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ اگر اولاد نالائق، نافرمان اور بدمعاش ہوگی تو مومن کا دل کیسے مطمئن ہوگا؟ جو اولاد نقصان پہنچائے، والدین کے مال کو ضائع کرے تو ایسی اولاد سے تو سانپ اچھا ہوتا ہے بدکار اولاد والدین اور خاندان کو بدنام کرتی ہے اور اُن کی عزت و شرافت کو بٹہ لگاتی ہے۔ چنانچہ عباد الرحمان یہی دُعا کرتے ہیں کہ مولا کریم! اُنکی بیویوں اور اولادوں کو نیک بنائے جن کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں مطلب یہ ہے کہ ہر مومن آدمی کو اپنی بیوی اور اولاد کی فکر کرنی چاہیئے کہ وہ صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ اُن کو خود بھی سمجھانا چاہیئے اور صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۱۴) ذاتی اصلاح

ایک مومن آدمی جہاں اپنے اہلِ خانہ کی بہتری اور اصلاح کے لیے دُعا کرتا ہے، وہاں وہ اپنی ذات کے لیے بھی ایسی ہی خواہش رکھتا ہے

ل ابن کثیر ص۳۳۰ (فیاض)
ج۳

چنانچہ عباد الرحمان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اللہ سے یوں دعا کرتے ہیں وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اے پروردگار! کر خود ہمیں ایسا اصلاح یافتہ بنائے کہ ہم متقیوں کے پیشوا بن جائیں یعنی آئندہ آنے والے لوگ ہمارے نقش قدم پر چلنے میں فخر محسوس کریں۔ انسان کی ابدی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے درجے میں ایسی روحانی ترقی حاصل کرے کہ دوسروں کے لیے پیشوا بن جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے لیے یہی دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (الشعراء - ۸۴) ”پچھلے لوگوں میں میرا نیک ذکر جاری فرما۔ ہمارے بعد آنے والے ہمارے نقش قدم پر چلیں۔“

ظاہر ہے کہ نیکی، ایمان اور توحید کا راستہ ہی ایسا راستہ ہے جس پر چل کر لوگ فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ جو شخص ایمان سے عاری حیا سے خالی، اور کھیل تماشے کا دلدادہ ہوگا، وہ آئندہ آنے والوں کے لیے کیسے نمونہ بن سکتا ہے۔ ہمارے سلف صالحین نے کیا اچھا نظام قائم کیا جس پر چل کر دنیا و آخرت میں سرخرو ہوئے۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ اُن کی تعلیم کو بھول چکے ہیں۔ آج ہمارے پاس اپنا کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ ہم یہود و نصاریٰ اور دہریوں کے نظام کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور اُسی کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہاں! جو اللہ کے بندے ہیں وہ ہمیشہ متقیوں کی پیشوائی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

عباد الرحمان کے لیے انعامات

یہ اوصاف بیان کرنے کے بعد اللہ نے عباد الرحمان کے انعامات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا یہی لوگ ہیں جن کو بالاخانے دیے جائیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان[1] ہے کہ جنتیوں کے لیے عجیب و غریب بالائی منزلیں ہوں گی جو اس قدر شفاف ہوں گی کہ اندر کا منظر باہر سے نظر

[1] درمنثور صفحہ ۸۱ ج ۵ (فیاض)

آئے گا اور باہر کا منظر اندر سے دیکھا جا سکے گا۔ یہ اُن کے صبر کا اجر ہوگا۔ کیونکہ صبر بھی دین کے بڑے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ خدا کی وحدانیت، اُس کا ذکر، اس کی نعمتوں کی قدردانی، اُس کا شکر ادا کرنا، شعائر اللہ کی تعظیم، خدا کی عبادت وغیرہ بڑے بڑے اصول ہیں جن میں سے صبر بھی ایک اصول ہے جو اطاعت کے وقت بھی کام آتا ہے اور معصیت کے وقت بھی۔

فرمایا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا اللہ کے نیک بندوں کو جنت میں دُعا اور سلام کے تحفے ملیں گے۔ اُن سے جو بھی ملے گا اچھے دعائیہ کلمات کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ مومن اور فرشتے سب سلام کریں گے۔ سورۃ یٰسین میں بھی ہے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (آیت۔ ۵۸) اہل جنت کو مہربان پروردگار کی طرف سے بھی سلام ہوگا۔ خٰلِدِيْنَ فِيهَا وہ اس جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے۔ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا یہ اُن کے لیے بہترین قرارگاہ (ٹھہرنے کی جگہ) ہوگی اور بہترین رہنے کا مقام ہوگا۔ جنت کی خوبصورتی، پاکیزگی اور سہولتوں کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَمَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا یعنی جنت میں ایک کوڑا بھر جگہ ساری دنیا اور اس میں موجود ہر چیز سے بہتر ہے۔ وہاں اہل جنت کے سامنے اعلان کرنے والا اعلان کرے گا، اے اہل جنت! اِنَّ لَكُمْ اَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقَمُوْا وَاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَحْيَوْا وَلَا تَمُوْتُوْا وَاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَشِبُّوْا وَلَا تَهْرَمُوْا وَاَنْ تَنْعَمُوْا وَلَا تَبْاَسُوْا اَبَدًا اب تم ہمیشہ کے لیے تندرست رہو گے اور بیمار نہیں ہو گے۔ تم

ہمیشہ زندہ رہو گے اور کبھی موت نہیں آئے گی۔ تم ہمیشہ جوان رہو گے اور تم پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ تم ہمیشہ خوشحال رہو گے اور کبھی بدحالی اور تکلیف کا شکار نہیں ہو گے اسی لیے فرمایا کہ جنت کے بالاخانے ٹھہرنے کی بہترین جگہ اور رہنے کے لیے بہترین مقام ہو گا۔

ابتہال الی اللہ

آخر میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ میرے پروردگار کو کچھ پروا نہیں اگر تم اس کو نہیں پکارو گے۔ اگر تم خدا تعالیٰ کی اطاعت یا اس کی عبادت نہیں کرو گے تو اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اسے پکارو یا نہ پکارو، وہ اپنے تمام تر اختیارات کے ساتھ قائم و دائم ہے بعض اس کا معنی یوں کرتے ہیں کہ "اگر میرے پروردگار کو تمہارا پکارنا نہ ہوتا تو وہ تمہاری کچھ پروا نہ کرتا" جب مصیبت آتی ہے تو کافر اور مشرک لوگ بھی خدا تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہیں۔ فرمایا تمہاری یہی پکار تمہارے لیے مہلت کا باعث بن رہی ہے، ورنہ اسے تمہاری کچھ پرواہ نہیں ہے۔ وہ جب چاہے تمہیں ہلاک کر دے اور آخرت بھی برباد ہو جائے۔ اس کے علاوہ بعض نے یہ ترجمہ بھی کیا ہے "اگر تمہیں ایمان کی طرف دعوت دینا مقصود نہ ہوتا تو میرا پروردگار تمہاری کچھ پروا نہ رکھتا" ظاہر ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد ہی اللہ کی عبادت ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذریت - ۵۶) میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس کا معنی ایمان کی دعوت بھی ہو سکتا ہے۔

فرمایا فَقَدْ كَذَّبْتُمْ پس تم نے جھٹلا دیا ہے یعنی تم نے اللہ کی توحید، رسالت، وحی الٰہی اور قیامت کا انکار کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا کہ عنقریب تم سے مٹھ بھیڑ

ہوگی۔ جنگ و جہاد ہوگا اور عقریب تمہاری سرکوبی ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ جنگِ بدر کے موقع پر پورا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی تو بڑے بڑے سرداران کفر مارے گئے، کچھ قیدی بنے اور باقی بھاگ گئے۔ حضور علیہ السلام نے بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہو کر کفار کو خطاب کیا کہ اے فلاں! اے فلاں! اللہ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تو آج پورا ہوگیا۔ اللہ نے ہمیں فتح مبین عطا فرمائی اُس وعدے کو تو ہم نے سچا پایا۔ اب تم بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا کہ نافرمانی کرو گے تو سزا دوں گا۔ وہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں، اور کیا تم نے سزا پائی یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا حضور! یہ تو مردہ لاشیں پڑی ہیں۔ آپ ان سے خطاب فرما رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بےشک یہ مردہ ہیں مگر تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو میری بات سنا رہا ہے مگر ان کو جواب دینے کی قدرت نہیں۔ غرضیکہ اللہ نے مکذبین کو حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوا دیا کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا، لہٰذا اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ سورۃ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حقانیت سے شروع کی، پھر معاد کا مسئلہ بیان ہوا۔ رسالت کے متعلق شکوک و شبہات کرنے والوں اور منکرین کا رد فرمایا۔ بعض دیگر باتوں کے علاوہ اللہ نے عباد الرحمٰن کی چودہ صفات بیان فرمائی ہیں اور آخر میں کفار و مشرکین کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمہارے ساتھ میدانِ جنگ میں مٹھ بھیڑ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو غالب کرے گا اور تمہیں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔

سُورَة
الشعراء
مکمل

درسِ اوّل ١ — آیت ١ تا ٩

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسَبْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ الشعراء مکی ہے۔ اس کی دو سو ستائیں آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

طٰسٓمٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿٤﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿٧﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٩﴾ ع ٥

ترجمہ:۔ طٰسٓمٓ ﴿١﴾ یہ آیتیں ہیں کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی ﴿٢﴾ شاید کہ آپ اپنا گلا گھونٹ دیں گے اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان قبول نہیں کرتے ﴿٣﴾ اگر ہم چاہیں تو اتار دیں ان پر آسمان کی طرف سے ایسی نشانی کہ

تو ہو جائیں ان کی گردنیں اس کے سامنے جھکنے والی (۴) اور نہیں
آتی ان کے پاس کوئی نصیحت نئی خدائے رحمان کی طرف
سے مگر یہ لوگ اس سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں (۵)
پس بیشک جھٹلایا انہوں نے، پس عنقریب آئے گی
ان کے پاس خبر اس چیز کی کہ جس کے ساتھ یہ ٹھٹھا
کیا کرتے تھے (۶) کیا انہوں نے نہیں دیکھی زمین کی طرف
کہ ہم نے اس میں کتنی عمدہ قسم کی چیزیں نکالی ہیں (۷)
بیشک اس میں البتہ نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر
ایمان قبول کرنے والے نہیں ہیں (۸) اور بیشک تیرا پروردگار
زبردست ہے اور رحم کرنے والا (۹)

وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام سورۃ شعراء ہے۔ اس کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے شعر و شاعری اور شاعروں کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اسی مناسبت سے سورۃ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ البتہ امام مالکؒ کے قول کے مطابق اس سورۃ کا ایک نام سورۃ الجامعۃ بھی ہے کیونکہ یہ نصیحت کی بہت سی باتوں کو جمع کرنے والی سورۃ ہے۔

یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی بعض کے مطابق اس سورۃ کا نزول سورۃ واقعہ کے بعد ہوا یعنی ہجرت سے دو یا تین سال قبل۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ۲۲۷ آیات اور گیارہ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۱۳۲۷ الفاظ اور ۵۵۴۲ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ میں مختلف مضامین بیان ہوئے ہیں۔ ابتداء میں قرآن کریم کی حقانیت و صداقت اور اس کے فضائل کا ذکر ہے۔ اصولِ دین کے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و ہارونؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور آخر میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح اللہ کا پیغام اپنی اپنی امت تک پہنچاتے تھے۔ حضور علیہ السلام کے فرائض اور ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے۔

معاندین اور مکذبین توحید و رسالت کے شکوک و شبہات کو رفع کیا گیا ہے اور اُن کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اخلاقی تعلیمات ہیں۔ توحید کے عقلی اور نقلی دلائل ہیں۔ بعث بعد الموت کا ذکر ہے اور اس ضمن میں لوگوں پر پڑے ہوئے حجابات کا ذکر ہے جن کو اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حروف مقطعات

اِس سورۃ مبارکہ کی ابتدا حروف مقطعات طٰسٓمٓ سے ہوئی ہے جو قرآن پاک کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سورۃ کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے۔ اِن حروف سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے یہ تو وہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم تقریبِ فہم کے لیے بعض مفسرین نے اِن حروف کے معانی بتلانے کی کوشش کی ہے چنانچہ مفسرین فرماتے ہیں کہ طٰسٓمٓ میں سے حرف طٰ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کے اسمِ پاک طاہر کی طرف ہے۔ س سے مراد اسمِ پاک ستار یا سلام ہے اور م کا اشارہ اسمِ پاک مجید یا محیط کی طرف ہے۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ طٰ سے مراد طول یعنی طاقت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذِی الطول بھی ہے کہ وہ طاقت کا مالک ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ س سے مراد تقدیس ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک اسمِ پاک قدوس بھی ہے۔ اس طرح م سے مراد مِن الرحمٰن ہے کہ یہ سارا سلسلہ خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمان کی رحمت کا نتیجہ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ طٰ کا اشارہ طوبیٰ کی طرف ہے جو ایک درخت کا نام ہے۔ س سے مراد سدرۃ المنتہیٰ ہے اور م کا اشارہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اِن تینوں اسماء کا تعلق واقعہ معراج سے ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کا تذکرہ تو سورۃ النجم میں بھی موجود ہے۔

صاحبِ تفسیر کبیر امام رازیؒ نے بعض بزرگوں کے حوالے سے اِن حروف کی تشریح اس طرح بیان کی ہے کہ طٰ کا اشارہ قلوب عارفین میں

ك تفسیر کبیر ص ۲۴۶/۱۱ (نیاض)

پیدا ہونے والے طرب یعنی خوشی کی طرف ہے۔ س سے مراد سیر الی اللہ یعنی خدا تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے لوگ ہیں اور م سے مراد مناجات المریدہے کہ ادنیٰ درجے کے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے سامنے مناجات اور دعائیں کرتے ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ طٓ کا اشارہ طائران وحدت یعنی خدا تعالیٰ کی توحید کی طرف تیزی سے چلنے والے لوگوں کی طرف ہے۔ س سے مراد سیر الی اللہ یعنی خدا کی طرف چلنے والے عام لوگ ہیں اور م سے وہ لوگ مراد ہیں جو راہِ حق کی طرف پیدل یعنی آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی حکمت[1] کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ طٰسٓمّٓ اجمال ہے اور اس کی تفصیل آگے سورۃ میں بیان ہوگی۔ ان حروف میں انبیاء علیہم السلام کی منازل کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عالم بالا کی طرف کس طرح حرکت کرتے تھے جس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کا فیضان اس مادی جہان میں سرایت کرتا ہے اور پھر آفاق میں پھیل جاتا ہے۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ طٰسٓمّٓ خدا تعالیٰ کی ذاتِ مقدس ہے جیسا کہ تقدیس کا حق ہے اور اس کا فیضان اس عالم تخلیط میں سرایت کرتا ہے۔ جو کہ پاک سرایان ہوتا ہے۔ گویا کہ یہ اشارہ ہے خدا تعالیٰ کے ان اسمائے پاک کے فیضان اور ان کے احکام کی طرف جو اس عالم متدنس میں قدسی طریقے پر سرایت کرتے ہیں۔ بہرحال زیادہ آسان بات وہی ہے جو امام جلال الدین سیوطیؒ[2] نے فرمائی ہے کہ ان حروف کے متعلق زیادہ کرید نہ کی جائے بلکہ ان کے بارے میں یہی عقیدہ رکھا جائے اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان سے کیا مراد ہے۔ تاہم اللہ کی جو بھی مراد اور منشاء ہے۔ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ زیادہ سلامتی والی یہی بات ہے

۱؎ فوز الکبیر ص۱۲ ۲؎ تفسیر جلالین ص۲ (فیاض)

کتابِ مبین

حروفِ مقطعات کے بعد فرمایا تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں جو آپ کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں یہ آیات ایسے عمدہ طریقے پر احکام کو بیان کرتی ہیں کہ حق و باطل کو الگ الگ کر دیتی ہیں اور کوئی تشنگی باقی نہیں رہنے دیتیں۔ بعض مقامات پر یہ آیات اپنی تفسیر خود آپ ہیں کہ اگر کسی مقام پر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ہے یا پھر اللہ تعالیٰ اِن آیات کی تفسیر اپنے پیغمبر کی زبان سے کرا دیتا ہے۔ اصول تو کتاب الٰہی بیان کرتی ہے اور اس کی جزئیات اللہ کا نبی اپنے قول اور عمل سے کر کے دکھا دیتا ہے۔ غرضیکہ فرمایا یہ واضح طور پر بیان کرنے والی کتاب کی آیات ہیں۔

نبی کا مضمون

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دی ہے۔ کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے حضور علیہ السلام سخت متفکر رہتے تھے اور آپ کو شدید غم لاحق ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ اتنا غم نہ کریں بلکہ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے جائیں اور نتیجہ خدا تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ شاید کہ آپ اپنا گلا گھونٹ لیں اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ تو فرمایا کہ کیا اِن کے پیچھے آپ اپنی جان کو ضائع کر لیں گے؟ ۔ ان کم بختوں کے ساتھ اتنی دلسوزی اور شفقت کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے عمل کے خود ذمہ ہیں وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (البقرہ - ۱۱۹) اہل دوزخ کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ دوزخ میں کیوں گئے؟ بلکہ خود ان سے پوچھا جائے گا مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (المدثر - ۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پہنچے؟

فرمایا اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً اگر ہم چاہیں تو آسمان کی طرف سے ایسی نشانی اتار دیں فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ

لَهَا خٰضِعِيْنَ جس کے سامنے اُن کی گردنیں دب کر رہ جائیں۔ وہ مجبور ہو جائیں اور اُن کی ساری سرکشی ختم ہو جائے مگر یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کا اختیار سلب نہ کیا جائے بلکہ ہدایت کی ہر چیز واضح کردی جائے۔ اس کے بعد جو کوئی اس ہدایت کو قبول کرے گا تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور جو اس سے اعراض کرے گا وہ جہنم رسید ہوگا۔

آیاتِ الٰہی سے اعراض

ارشاد ہوتا ہے وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ اور نہیں آتی ان کے پاس خدائے رحمان کی طرف سے کوئی نئی نصیحت مگر یہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہ تو ان کی بہتری کی ضامن ہوتی ہے مگر یہ ان کی بدبختی ہے کہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ فَقَدْ كَذَّبُوا پس بے شک انہوں نے ہر بہتری کی آمدہ بات کو جھٹلا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبٰؤُا مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ پس عنقریب ان کے سامنے اُس چیز کی خبر یا حقیقت آجائے گی جس کے ساتھ یہ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ ان کی ساری مجرمانہ کارگزاریاں ان کے روبرو کر دی جائیں گی جن کا نتیجہ ان کو بھگتنا پڑے گا۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ، اس کے انبیاء، ملائکہ، قرآن اور احکامِ شریعت کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔ جب ان کی حقیقت سامنے آئیگی تو پھر ان کو پتہ چلے گا کہ وہ دنیا میں کس رستے پر چلتے رہے اس وقت یہ پچھتائیں گے مگر اُس وقت کا پچھتانا کسی کام نہ آئے گا اور انہیں اپنے کئے کا بدلہ مل کر رہے گا۔

معجزات کا مطالبہ

اکثر کفار و مشرکین ایمان لانے کی شرط کے طور پر طرح طرح کی نشانیاں طلب کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے اس بیہودہ مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی عمدہ قسم کی چیزیں اگائی ہیں۔ بھلا اس سے بڑا معجزہ اور نشانی کیا ہو سکتی ہے؟ ایک اناج سے پودے کو ہی دیکھو۔ کسی پھلدار درخت پر نگاہ ڈالو، پھولوں کی مختلف قسمیں ملاحظہ کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں کیسے کیسے رنگ بکھیرے ہیں اور کیسی کیسی خوشبوئیں بخشی ہیں۔ اللہ نے چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں اناج پیدا کر کے انسانوں کی خوراک کا بندوبست کیا ہے۔ اور چارہ پیدا کر کے جانوروں کی زیست کا سامان مہیا کیا ہے۔ اللہ نے زمین میں ایسی قوتِ روئیدگی رکھ دی ہے کہ وہ تمام جانداروں کے لیے خوراک اگاتی ہے۔ یہ چیزیں خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر منصف مزاج آدمی خدا کی وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

فَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

ہر چیز میں ایسی نشانیاں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ مگر جو لوگ ضدی اور متعصب ہیں انہیں اتنی واضح نشانیاں بھی نظر نہیں آتیں لہٰذا وہ ظلم و ناانصافی پر ہی قائم رہتے ہیں اور نئے نئے مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔

فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بیشک ان مشاہدات یعنی زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں میں نشانی ہے، مگر حقیقت حال یہ ہے۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کہ کفار و مشرکین کی اکثریت ایمان قبول کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا کی اکثر آبادی ہمیشہ ایمان سے بے بہرہ رہی ہے آج بھی دیکھ لیں، دنیا کی کل آبادی کا صرف پانچواں یا چھٹا حصہ ایسا ہے جو خدا کی وحدانیت کو تھوڑا بہت مانتا ہے، وگرنہ باقی سارے کے سارے کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ فرمایا یاد رکھو اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ

بے شک تیرا پروردگار عزیز یعنی زبردست اور مہربان ہے۔ اُس کی مہربانی کا تقاضا ہے کہ وہ جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا رہتا ہے۔ پھر جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو نافرمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور پھر آخری اجتماع قیامت کے دن ہوگا۔ جب زندگی بھر کے عقائد و اعمال کا حساب لیا جائے گا اور ہر ایک کو اپنا اپنا حساب کتاب دینا ہوگا۔ وہ کمالِ قدرت کا مالک، ہر چیز پہ غالب اور مہربان ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿١١﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿١٢﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿١٨﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢١﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿٢٢﴾

ترجمہ:- (اُس واقعہ کو یاد کرو) جب کہ پکارا تیرے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو (اور فرمایا) جاؤ ظالم قوم کے پاس ﴿١٠﴾ (یعنی) فرعون کی قوم (اور کہو کہ) کیوں نہیں ڈرتے ﴿١١﴾

کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) اے میرے پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے (۱۲) اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان اچھے طریقے سے نہیں چلتی۔ پس پیغام بھیج دے تو ہارون علیہ السلام کی طرف (۱۳) اور ان کے لیے مجھ پر گناہ بھی ہے، اور میں خوف کھاتا ہوں کہ وہ مجھے مار نہ ڈالیں (۱۴) فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) ہرگز ایسا نہیں ہوگا، پس تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر ہم تمہارے ساتھ ہیں اور سننے والے ہیں (۱۵) تم دونوں جاؤ فرعون کے پاس اور دونوں اس سے کہو کہ بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں (۱۶) (اور ہمارا مطالبہ ہے) کہ بھیج دے تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو (۱۷) کہا (فرعون نے) کیا ہم نے نہیں پالا تھا تم کو اپنے درمیان بچپن میں۔ اور گزارے تو نے ہم میں اپنی عمر کے کئی سال (۱۸) اور کیا تو نے وہ کام جو تو نے کیا، اور تھا تو ناشکر گزاروں میں (۱۹) کہا (موسیٰؑ نے) کیا تھا میں نے وہ کام اُس وقت کہ تھا میں بے خبروں میں سے (۲۰) پس بھاگ گیا میں تم سے جب کہ میں نے خوف کھایا تم سے۔ پس بخشا مجھ کو میرے پروردگار نے حکم اور بنایا مجھ کو رسولوں میں سے (۲۱) اور کیا یہ احسان ہے جو تو احسان جتلاتا ہے مجھ پر کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے (۲۲)

فرعون کو دعوتِ توحید

سورۃ کی ابتدائی آیات میں قرآن کریم کی حقانیت اور تسلی کے مضمون کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے

جس سے اصل مقصود اصولِ دین یعنی توحید اور ایمان کی دعوت دینا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی واقعات تو سورۃ قصص اور بعض دیگر سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں تاہم یہاں یہ مضمون کی ابتدا تبلیغ حق سے ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور پھر اُن کو تبلیغ کے لیے فرعون اور اس کی ظالم قوم کے پاس بھیجا۔ ارشاد ہوتا ہے، وہ بات قابل ذکر ہے وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ جب کہ تیرے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا اور کہا أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ کہ تم ظالم قوم کے پاس تبلیغ کے لیے جاؤ۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ جو کہ فرعون کی قوم ہے۔

اللہ نے ساری قوم فرعون کو ظالم کا خطاب دیا ہے۔ اگرچہ اصل ظالم فرعون تھا مگر اس کے امیر، وزیر، حواری، موالی، دوست احباب، عزیز و اقربا سب اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، اس لیے سب کو ظالم کہا گیا ہے۔ اُن میں کوئی بھی ظلم کے دائرے میں نہیں رہا تھا۔ اس قسم کی مثالیں بعض دوسری اقوام کے متعلق بھی ملتی ہیں۔ مثلاً نوح علیہ السلام کی قوم کے متعلق اللہ نے فرمایا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ (الاعراف - ۶۴) بے شک وہ ساری کی ساری قوم اندھی تھی۔

پوری قوم فرعون میں بعض استثنا کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مثلاً آگے سورۃ مومن میں آتا ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ (المومن - ۲۸) کہ فرعون کی قوم میں ایک ایماندار آدمی بھی تھا جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا۔ اسی طرح فرعون کی بیوی آسیہ بھی صاحب ایمان تھی۔ بہرحال چند ایک کو چھوڑ کر ساری قوم ظالم تھی، اسی لیے پوری قوم کے لیے ظالم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر دورانِ سفر ہی نبوت عطا ہوئی تھی اور دوسرا حکم یہ تھا کہ فرعون کے پاس جا کر تبلیغ حق کرو۔ فرمایا اس قوم کو جا کر کہو أَلَا يَتَّقُونَ کیا وہ خدا

کی ناراضگی اور غصے سے ڈرتے نہیں؟

موسیٰ کا عذر

اللہ تعالیٰ کا حکم سن کر موسیٰ علیہ السلام نے بعض رکاوٹوں اور کمزوریوں کا ذکر کیا جو انہیں راہِ حق میں نظر آ رہی تھیں، چنانچہ بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ پروردگار! میں خوف کھاتا ہوں کہ فرعون اور اس کی قوم مجھے جھٹلا دیں گے۔ وہ لوگ نہ میری نبوت و رسالت کو تسلیم کریں گے اور نہ میری بات کو مانیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام اسی قوم میں پیدا ہوئے تھے اسی ماحول میں پل کر جوان ہوئے لہٰذا وہ ان کی نفسیات اور ان کے اخلاق و اطوار سے خوب واقف تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ میری بات نہیں سنیں گے۔ انہوں نے یہ بھی عرض کیا وَيَضِيقُ صَدْرِي اور میرا دل تنگ ہوتا ہے۔ وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي اور میری زبان بھی اچھے طریقے سے نہیں چلتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں قدرے لکنت تھی اس لیے عرض کیا فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَٰرُونَ پروردگار میرے بھائی ہارون علیہ السلام کی طرف بھی پیغام بھیج تاکہ وہ میرے کام میں میرا معاون بن جائے سورۃ طٰہٰ میں واضح طور پر عرض کیا وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَٰرُونَ أَخِي (آیت ۲۹، ۳۰) میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر یعنی معاون بنا دے تاکہ ہم دونوں مل کر تبلیغ کا کام بطریق احسن انجام دے سکیں۔ سورۃ قصص میں اپنے مقصد کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ ہارون میرا بھائی ہے هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ مدعا کی اچھے طریقے سے وضاحت کر سکتا ہے فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي (آیت - ۳۴) اسے میرے ساتھ بھیج دے جو کہ میری پشت پناہی اور تصدیق کرے گا میں جو بات کروں گا، ہارون اس کی تصدیق و تائید کرے گا تو بات چل نکلے گی۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا بھی کی قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي (آیت ۲۵ تا ۲۸) اے پروردگار!

میرا سینہ کھول دے، میرے کام کو آسان کر دے۔ میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو سمجھنے لگیں۔ جواب میں اللہ نے فرمایا قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَـٰمُوسَىٰ (آیت ۳۶) اے موسیٰ! ہم نے تمہاری درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ اللہ نے زبان کو کھول دیا۔ اور ہارون علیہ السلام کو وزیر یعنی معاون بھی بنا دیا اور اس طرح آپ کے کام کو آسان بنا دیا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے ایک اور عذر بھی پیش کیا۔ وَلَهُمْ عَلَىَّ ذَنبٌ فرعونیوں کا مجھ پر ایک گناہ بھی ہے۔ فَأَخَافُ أَن يَقْتُلُونِ لہذا مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ مجھے قتل ہی نہ کر ڈالیں۔ وہ الزام یہی تھا کہ میں نے اُن کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ قتل عمد نہیں تھا مگر اُن کا آدمی تو بہرحال میرے ہاتھوں سے مارا گیا تھا اور اسی وجہ سے میں مصر چھوڑ کر دس سال تک مدین میں مقیم رہا۔ اب اگر اُن کے پاس دوبارہ جاؤں گا تو وہ مجھے سابقہ جرم میں گرفتار کر لیں گے۔

اللہ کی طرف سے ہدایت

اِن معروضات کے جواب میں قَالَ اللہ نے فرمایا كَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ فرعونی تجھے قتل کر دیں اور تم میرا پیغام ہی اُن تک نہ پہنچا سکو فرمایا فکر نہ کرو فَاذْهَبَا بِـَٔايَـٰتِنَآ بلکہ ہماری نشانیاں لے کر تم دونوں جاؤ۔ نشانیوں سے مراد عصا اور ید بیضا جیسے دو واضح معجزات ہیں کہ یہ معجزات لے کر ان کے پاس جاؤ إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور سننے والے ہیں۔ تمام معاملات اور ان کا حسن و قبح ہمارے علم میں ہے تم گھبراؤ نہیں فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ پس دونوں فرعون کے پاس جاؤ فَقُولَآ إِنَّا رَسُولُ رَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ اور دونوں کہو کہ ہم پروردگارِ عالم کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں۔ یعنی ہم از خود تمہارے پاس نہیں آئے بلکہ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے پیغام لیکر آئے ہیں

اس مقام پر زیادہ تفصیلات ذکر نہیں کی گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر چھیالیس مرتبہ سے زیادہ بیان کیا گیا ہے کہیں اجمال

ہے اور کہیں تفصیل۔ کہیں واقعہ کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے تو کہیں دوسرا۔ اس مقام پر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی زیادہ وضاحت نہیں کی گئی۔ البتہ بعض دوسرے مقامات میں کچھ مزید باتیں بھی ذکر کی گئی ہیں مثلاً سورۃ طٰہٰ میں اللہ نے اپنے دونوں انبیاء سے فرمایا کہ تم دونوں بھائی فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۝ (آیت۔ ۴۴) پس تم دونوں اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے، اور تمہاری بات اس کے ذہن میں اثر کر جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے تبلیغِ دین کے سلسلے میں ایک کلیہ بتا دیا کہ تبلیغ کے وقت ہمیشہ نرم لہجہ اختیار کرو کہ یہ مؤثر ہوتا ہے، سخت کلامی سے بات بگڑ جاتی ہے۔ اسی طرح سورۃ النّٰزعٰت میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے فرمایا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کر لی ہے فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی (آیت۔ ۱۹) اور اس سے یوں کہو کیا تم میں پاک ہونے کی کوئی خواہش ہے؟ تاکہ میں تمہاری راہنمائی کروں۔ اور تمہیں کفر، شرک، کی گندگی سے طہارت حاصل ہو جائے بہر حال اس مقام پر صرف اسی قدر ذکر ہے کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں جہانوں کے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔

بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ

اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں جا کر پہلے فرعون کو دعوتِ توحید دو اور پھر اس سے یہ مطالبہ کرو اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ بنی اسرائیل کا اصل وطن شام اور فلسطین تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آپ کے خاندان کے کم و بیش بہتر افراد مصر میں آکر آباد ہوئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک ساڑھے چار سو یا پانچ سو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں بنی اسرائیل کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ چنانچہ جب وہ مصر سے نکلے تھے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اللہ نے کا منشاء یہ تھا کہ انہیں ان کے اصلی وطن میں دوبارہ آباد کیا جائے اور اس مقصد کے

لیے فرعون کی غلامی سے آزادی کی ضرورت تھی۔ اللہ نے یہی مطالبہ دے کر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا۔

فرعون کا احسان جتلانا

جب فرعون نے اللہ کے نبیوں کی یہ باتیں سنیں تو سخت برہم ہوا۔ اسے یہ گمان نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جیسا اس کا اپنا پروردہ اس کے سامنے یوں جرأت کے ساتھ بات کر سکے گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتلانا شروع کیا۔ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا کہنے لگا کیا ہم نے تمہیں اپنے درمیان بچپن میں نہیں پالا تھا؟ تمہاری ماں نے تمہیں صندوق میں بند کر کے پانی میں بہا دیا تھا۔ ہم نے تمہیں نکال لیا اور پھر تمہاری پرورش کی۔ اب تم ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے ہو اس نے یہ بھی کہا وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ تم اپنی عمر سے کئی سال ہمارے درمیان ٹھہرے۔ ظاہر ہے کہ تقریباً تیس ۳۰ سال کی عمر میں موسیٰ علیہ السلام مدین چلے گئے۔ دس سال تک وہاں رہے۔ اور پھر واپسی کے سفر میں آپ کو نبوت عطا ہوئی جب کہ آپ کی عمر چالیس ۴۰ سال ہو چکی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی دور کا ذکر سورۃ قصص میں موجود ہے۔

فرعون نے کہا کہ تو اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ساتھ رہا وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِىْ فَعَلْتَ اور پھر تو نے وہ کام کیا جو تو نے کیا۔ یعنی تو نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ ہم نے تو تمہیں پالا پوسا، تمہاری جان بچائی اور تو نے یہ صلہ دیا کہ ایک قبطی کو قتل کر کے مدین چلا گیا۔ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ تو تو ناشکر گزاروں میں سے نکلا تو نے ہمارے احسان کا بدلہ احسان فراموشی کے ساتھ دیا۔ ان واقعات کا تفصیلی ذکر سورۃ قصص اور دیگر سورتوں میں موجود ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا جواب

فرعون کی بات کے جواب میں قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے کہا فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ میں نے وہ کام (قبطی کا قتل) اس وقت کیا جب کہ میں بے خبروں میں سے تھا۔ ہم نے یہاں پر ضال کا معنی بے خبر کیا ہے جب کہ اس کا معنی گمراہ بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ معنی یہاں پر مناسب حال نہیں۔

اس لفظ کا معنی بے خبر کے علاوہ حیران، سرگردان اور پریشان بھی ہوتا ہے، چنانچہ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (الضحیٰ - ۷) کا بھی یہی معنی ہے کہ ہم نے آپ کو سرگرداں پایا، پس راہنمائی فرمائی۔ بعض ضال کا معنی خطا کرنے والا کرتے ہیں۔ مولانا شبیر احمد بھی کہنے والا کہتے ہیں کہ مجھ سے خطا ہوئی۔ اکثر مفسرین اس کا ترجمہ بے خبر کرتے ہیں اور یہ زیادہ درست ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کے ارادے سے مکہ نہیں مارا تھا۔ اور قتل عمد نیت اور ارادے سے ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقصد تو ایک مظلوم اسرائیلی کو ظالم قبطی سے نجات دلانا تھا مگر وہ ایک مکہ برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یہ جواب دیا کہ ان سے قبطی کا قتل بے خبری میں غیر ارادی طور پر ہو گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی وضاحت کی کہ قبطی کے قتل کے بعد خود میری جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ مجھے گرفتار کرنے کے منصوبے بن رہے تھے جس کی اطلاع مجھے میرے ایک خیر خواہ نے دی فَفَرَرْتُ مِنكُمْ پس میں تم سے بھاگ گیا لَمَّا خِفْتُكُمْ جب کہ میں نے تمہاری طرف سے خوف محسوس کیا۔ پھر اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا کہ اس نے مجھے حکم یعنی علم عطا کیا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ اور مجھے رسولوں میں سے بنایا یعنی میرے سر پر تاج نبوت رکھا۔ نبوت و رسالت کا تذکرہ بھی مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے دوران سفر موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ پھر آپ کی فرمائش پر آپ کے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنایا۔ البتہ موسیٰ علیہ السلام عظیم المرتبت رسول تھے اور کتاب تورات بھی آپ ہی پر نازل ہوئی۔

تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں اللہ کا رسول بن کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ البتہ جہاں تک تم نے میری پرورش کا مجھ پر احسان جتلایا ہے وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ تو یہ ایک احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ میری پرورش بھی تیرے اس ظلم کی وجہ سے ہی ہوئی تھی تو نے بنی اسرائیل

پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ سکتے تھے۔ اُن کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کروا دیتا تھا۔ تیرے اسی ظلم کے ڈر سے ہی میری والدہ نے مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا۔ اللہ کو اسی طرح منظور تھا۔ وہ صندوق تمہارے محل میں پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ۔ ۳۹) اللہ نے مجھ پر ایسی محبت ڈال دی کہ جو بھی دیکھتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جب فرعون نے دیکھا تو وہ بھی میری زندگی بچانے پر مجبور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھنا تھا اور بڑا کام لینا تھا، اس لیے اُس نے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ میری زندگی بچ گئی۔ مقصد یہ کہ میری پرورش میں تیرا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سکیم کو کامیاب بنایا کہ تیرے دل میں میری محبت پیدا کر دی گویا تیرے ہاتھوں سے میری پرورش بھی کسی احسان کی وجہ سے نہیں بلکہ تیرے ظلم کی وجہ سے ہوئی تھی۔

فرمایا، تیرے ظلم و ستم کی داستان تو یہ ہے جسے تو احسان بتلا رہا ہے۔ کیا یہی تیرا احسان ہے اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کہ تو نے ساری قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟ ایک فرد کی پرورش کر کے لاکھوں افراد کو غلام بنانا اور اُن سے مشقت لینا کہاں کا انصاف ہے؟ بنی اسرائیل نے فرعون کے ہاتھوں واقعی بڑے مظالم برداشت کیے تھے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو آزادی نصیب ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہی مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے ہمارے ساتھ بھیج دے تاکہ وہ اپنے اصلی وطن پہنچ کر آزادی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی عبادت کر سکیں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ ع ۲

ترجمہ:- کہا فرعون نے اور کیا ہے رب العالمین؟ (۲۳) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اگر تم نے یقین کرنا ہے (۲۴) کہا (فرعون نے) ان سے جو اس کے اردگرد تھے، کیا تم سنتے نہیں؟ (۲۵) کہا (موسیٰؑ نے) جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا پروردگار بھی ہے (۲۶)

کہا (فرعون نے) بیشک تمہارا یہ پیغام لانے والا ، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ، دیوانہ ہے (۲۷) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ اِن دونوں کے درمیان ہے ، اگر تم عقل رکھتے ہو (۲۸) کہا (فرعون نے) اگر تو بنائے گا کسی کو الٰہ میرے سوا ، تو میں کر دوں گا تجھ کو قید میں ڈالے ہوئے لوگوں میں سے (۲۹) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) اگرچہ میں لاؤں تیرے پاس کوئی کھلی چیز؟ (۳۰) کہا (فرعون نے) لاؤ اُس کو اگر تم سچے ہو (۳۱) پس ڈالا (موسیٰ علیہ السلام نے) اپنی لاٹھی کو ۔ پس اچانک وہ ایک اژدھا بن گیا کھلا (۳۲) اور کھینچا انہوں نے اپنے ہاتھ کو ، پس وہ اچانک سفید تھا دیکھنے والوں کے لیے (۳۳)

ربطِ آیات اس سورۃ کی ابتداء سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا تذکرہ بیان کیا گیا ۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے سر پہ تاجِ نبوت رکھا تو آپ کو حکم دیا کہ فرعون کے سامنے جا کر کلمۂ حق بلند کرو ۔ موسیٰ علیہ السلام نے بعض مشکلات کا ذکر کیا تو اللہ نے آپ کے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا فرمائی اور پھر دونوں کو حکم ہوا کہ فرعون سے جا کر کہو کہ ہم دونوں رب العالمین کے فرستادہ ہیں ۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تم اللہ کی وحدانیت کو قبول کر لو اور دوسری بات یہ کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دو ۔ اس کے جواب میں فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو طعن کیا کہ کیا تم وہی نہیں جس کی ہم نے بچپن میں پرورش کی تھی ۔ تم نے ہمارے درمیان اپنی عمر کا کافی حصہ گزارا ۔ پھر تم نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا ۔ موسیٰ علیہ السلام نے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا بے خبری میں ہوا تھا ، ورنہ میرا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا ۔ فرمایا ۔ پھر میں خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا ۔ اللہ نے مجھے نبوت و رسالت عطا فرمائی ہے اور میں اسی فرضِ منصبی

کی تکمیل کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں مگر یاد رکھو! بچپن میں میری پرورش کرنا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ تمہارے ظلم ہی کی وجہ سے ہوا تھا مگر تم نے ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ اس کے مقابلے میں تمہارا پرورش کرنے کا احسان کیا حیثیت رکھتا ہے؟

رب العلمین کی تعریف

گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون کو دعوت توحید دیتے ہوئے فرمایا اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (آیت - ۱۶) کہ ہم رب العلمین کے بھیجے ہوئے تیرے پاس آئے ہیں۔ اس کے جواب میں فرعون نے خود سوال کیا قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہ رب العالمین کیا ہے جس کی طرف سے تم رسول بن کر آئے ہو۔ سورۃ النزعٰت میں موجود ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، بلکہ علی الاعلان کہتا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى سب سے بڑا رب تو میں ہوں۔ تم کس رب العلمین کی بات کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے پروردگارِ عالم کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا رب العلمین وہ ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے، سب کا رب ہے اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ اگر تم نے یقین کرنا ہے تو رب العلمین تو وہی ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی تدبیر کر کے اُسے حدِ کمال تک پہنچانے والا ہے۔

رب العلمین کی حیثیت کے بارے میں سوال منطقی کہلاتا ہے۔ جب فرعون نے اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق سوال کیا تو جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی صفات کو بیان کیا۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات اور حقیقت کو تو کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ وہ تو وراء الوراء ہے۔ وہ ایسی ذات ہے جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے لَا فِكْرَةَ فِى الرَّبِّ رب تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو۔ وہ انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہے

لہذا اس کی پہچان اس کی مصنوعات کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی مصنوعات میں غور کرو گے تو اس کی صفت سمجھ میں آئے گی۔ اور پھر خدا کی ذات کا تصور قائم ہو گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر کیا۔ کہ رب العٰلمین وہ ہے جس نے زمین و آسمان اور تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور جو ان کی تدبیر کرتا ہے۔

یہ سن کر فرعون اپنے حواریوں کی طرف متوجہ ہوا۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ اور اپنے ارد گرد والوں سے کہنے لگا، کیا تم سنتے نہیں؟ کہ یہ شخص کیا کہتا ہے۔ میں نے اسے رب العٰلمین کے متعلق پوچھا ہے تو یہ ارض و سما کی تخلیق کی بات کرتا ہے۔ دراصل فرعون اپنے حواریوں کو موسیٰ علیہ السلام کے خلاف برگشتہ کرنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ اس کے کہنے میں نہ آ جائیں۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی دوسری تعریف بیان کی قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ کہنے لگے رب العٰلمین وہ ہے جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا بھی وہی پروردگار ہے۔ نہ یہ سمجھو کہ کسی نے تمہیں پیدا نہیں کیا، یا اپنی پیدائش کو اپنے آباؤ اجداد تک ہی محدود نہ سمجھو بلکہ تمہارا ایک حقیقی خالق بھی ہے جس نے تمہیں بھی اور تمہارے باپ دادوں کو بھی پیدا کیا۔ اور وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں ہر طرح کا سامان زیست مہیا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار کی یہ صفت اس لیے بیان کی کہ شاید کہ فرعون کے دماغ پر چوٹ لگے۔ وہ خود الٰہ کہلواتا تھا اور کسی دوسرے کو الٰہ نہیں مانتا تھا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کی طرف دلائی کہ الٰہ تو وہ ہو سکتا ہے جو خالق ہو جب تم نے کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی تو تم کیسے الٰہ ہو سکتے ہو۔ الٰہ اور رب العٰلمین تو وہ ہے جو سب کا خالق ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی اس دلیل کا فرعون کو کوئی جواب نہ آیا تو اپنے حواریوں کو موسیٰ علیہ السلام سے بدظن کرنے کیلئے کہنے لگا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ بیشک تمہارا یہ

پیغام لانے والا جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے (یعنی موسیٰ علیہ السلام) یہ البتہ دیوانہ ہے یہ تو بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ نہ صرف ہمیں کوستا ہے بلکہ ہمارے آباؤ اجداد کی خبر بھی لیتا ہے۔ اس نے ہماری حکومت اور شان و شوکت کی کچھ پرواہ نہیں کی، اور نہ ہی مجھے الٰہ ماننے کے لیے تیار ہے۔ یہ تو پاگلوں والی باتیں کرتا ہے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہ لینا۔

مگر موسیٰ علیہ السلام بات کو چھوڑنے والے نہ تھے۔ انہوں نے تیسری دلیل پیش کی قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا فرمایا رب العٰلمین تو وہ ہے جو مشرق و مغرب اور اُن کے درمیان ہر چیز کا پروردگار ہے۔ شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک اُسی کی بادشاہی ہے۔ فرمایا تمھاری سلطنت تو ایک محدود علاقے پر مشتمل ہے جس کے باہر تمھارا حکم نہیں چلتا بلکہ کسی دوسرے بادشاہ کا سکہ چلتا ہے۔ مگر پروردگارِ عالم وہ ہے جس کی بادشاہت کا کوئی کنارہ نہیں۔ اُس کا تسلط پوری زمین پر بھی ویسا ہی ہے جیسا آسمانوں پر۔ اُس کا تسلط سمندروں پر بھی ہے اور فضاؤں پر بھی۔ وہ پہاڑوں کا بھی خدا ہے اور صحراؤں کا بھی۔ اس کا حکم ہر جگہ چلتا ہے اور کوئی چیز اُس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ میرا رب تو وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ اگر تمہیں کچھ عقل ہے۔ تو اب بھی سمجھ جاؤ اور اسی وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آؤ جو ہر چیز کا خالق مالک اور پرورش کنندہ ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ایک ایک بات کیے جاتے تھے اور خدا کی قدرت پر دلائل دیتے تھے مگر فرعون اپنے حواریوں کو موسیٰ علیہ السلام سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا تھا[۱] تاکہ وہ آپ کے دلائل سے متاثر نہ ہو جائیں۔

بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی حکومت کو چیلنج کیا اور بتایا کہ تمہیں ایک محدود خطے میں تسلط حاصل ہے تو وہ اس کا کوئی جواب تو نہ دے سکا۔

[۱] موضح القرآن صـ۴۴۰ (فیاض)

البتہ غصے میں آکر موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دی قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ کہنے لگا۔ اے موسیٰ! اگر تو نے میرے سوا کسی دوسرے کو معبود تسلیم کیا۔ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ تو میں تجھے قید میں ڈالے ہوئے لوگوں میں سے بنا دوں گا یعنی تمہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دوں گا۔ کہنے لگا ملک مصر میں تو میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اگر تو نے کسی دوسرے کو معبود مانا تو یاد رکھنا میں تمہیں سزا دینے پر بھی قادر ہوں۔ پھر بلنک اپنے رب کو میرے مقابلے پر لے آنا۔

معجزات کا انکار

موسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے سچے نبی تھے۔ وہ ایسی دھمکیوں سے کہاں مرعوب ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی حیثیت کو منوانے کے لیے پہلے انہوں نے عقلی دلائل پیش کیے جن کا فرعون پر اثر نہ ہوا۔ لہٰذا اب انہوں نے اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزات پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا کہ تم عقلی دلائل کو تو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ اگر میں تیرے پاس کوئی واضح چیز یا نشانی لے آؤں تو کیا پھر بھی تم اپنے نظریہ پر قائم رہو گے اور میری صداقت اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو تسلیم نہیں کرو گے؟ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ فرعون نے فوراً کہا۔ اگر تم سچے ہو تو ایسی کوئی نشانی لا کر پیش کرو۔ پتہ چل جائے گا تم اپنے دعوے میں کس حد تک سچے ہو۔

موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے نشانیاں پیش کرنے آئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس چیلنج کو فوراً قبول کر لیا۔ اور پہلی نشانی کے طور پر فَاَلْقٰى عَصَاهُ آپ نے اپنی لاٹھی پھینک دی۔ آپ کے ہاتھ میں ہمیشہ معجزانہ لاٹھی ہوتی تھی جسے آپ نے زمین پر ڈال دیا فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ پس اچانک وہ ایک بڑا اژدھا بن گئی جسے دیکھ کر فرعون کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ تمام درباری خوفزدہ ہو گئے۔ آخر انسان تھے۔ ایسی عجیب و غریب چیز دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے دوسری نشانی پیش کی وَنَزَعَ يَدَهٗ آپ نے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا کر باہر نکالا فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ تو وہ ایسا تھا دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔ آپ کے دست مبارک میں سورج جیسی چمک آگئی تھی ــــــــــــ اور یہ کوئی ایسی سفیدی نہیں تھی۔ جیسی کہ برص کے مریض کی ہوتی ہے مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (طٰہٰ۔ ۲۲) اس میں کوئی نقص یا خرابی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو معجزانہ طور پر سفید اور چمکدار بنا دیا تھا۔ مگر فرعون پھر بھی ایمان نہ لایا اور اس نے ان معجزات کو سحر پر محمول کیا۔ اِس بات کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے

ــــــــــــ

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ
اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾
قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾
يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ
يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾
فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا
اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ
الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ
مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا
بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى
عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِىَ
السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ
اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِىْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ
فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۚ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۖ اِنَّاۤ اِلٰى

رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿٥٠﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾

ترجمہ:- کہا (فرعون نے) اپنے سرداروں سے جو اس کے اردگرد تھے کہ بیشک یہ شخص البتہ جادوگر ہے علم والا ﴿٣٤﴾ یہ چاہتا ہے کہ تم کو نکال دے تمہاری سرزمین سے اپنے جادو کے زور سے، پس تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ﴿٣٥﴾ کہا انہوں نے مہلت دے اس کو اور اس کے بھائی کو، اور بھیج لے مختلف شہروں میں اکٹھا کرنے والے ﴿٣٦﴾ تاکہ وہ لائیں تمہارے پاس ہر قسم کا علم ور جادوگر ﴿٣٧﴾ پس اکٹھے کیے گئے جادوگر ایک معلوم دن کے وعدے پر ﴿٣٨﴾ اور کہا گیا لوگوں کو کہ تم بھی اکٹھے ہو جاؤ ﴿٣٩﴾ شاید کہ ہم پیروی کریں جادوگروں کی اگر وہ غالب رہیں ﴿٤٠﴾ پس جب آئے جادوگر تو انہوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لیے کوئی بدلہ ہوگا؟ اگر ہم غالب آگئے ﴿٤١﴾ کہا (فرعون نے) ہاں (بدلہ ہوگا)

اور بیشک تم اس وقت میرے مقربین میں ہو گے ﴿٤٢﴾ کہا ان (جادوگروں) سے موسیٰ علیہ السلام نے کہ ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ﴿٤٣﴾ تو انہوں نے ڈالی اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور کہنے لگے، فرعون کی عزت و اقبال کی قسم۔ بیشک ہم غالب ہوں گے ﴿٤٤﴾ پھر ڈالا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی کو، پس اچانک وہ نگلتی تھی اس چیز کو جو ان لوگوں نے بنایا تھا ﴿٤٥﴾ پس گر پڑے جادوگر سجدے میں ﴿٤٦﴾ کہنے

لگے ہم ایمان لائے ہیں رب العلمین پر (۴۷) وہی جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو پروردگار ہے (۴۸) کہا فرعون نے ، کیا تم اس پر ایمان لائے ہو قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں ۔ یہ تمہارا بڑا استاد ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے ۔ پس عنقریب تم جان لوگے کہ میں کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور پاؤں الٹے سیدھے ۔ اور لٹکاؤں گا تم سب کو سولی پر (۴۹) وہ کہنے لگے ، کوئی ڈر نہیں ہے ۔ بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں (۵۰) اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ بخش دے گا ہمارا پروردگار ہماری غلطیاں ۔ اس وجہ سے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں (۵۱)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون کے دربار میں پہنچ کر اللہ کا پیغام پہنچایا اور کہا کہ ہم رب العلمین کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں اُس نے متکبرانہ انداز میں سوال کیا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے ؟ اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بیان کیں اور اُس کی پہچان کی نشانیاں بتلائیں کہ رب العلمین وہ ہے جو ارض و سما کا پرورش کنندہ ہے اور جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو بھی پیدا کیا ہے ۔ مشرق و مغرب کی تمام اشیاء بھی اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں ۔ اس پر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دی کہ اگر تم نے میرے سوا کسی دوسرے کو الٰہ تسلیم کیا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا ۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں کوئی کھلی نشانی پیش کروں تو کیا تم پھر بھی اپنی قبیح حرکت سے باز نہیں آؤ گے ؟ فرعون کہنے لگا ، اچھا تم کون سی نشانی پیش کرنا چاہتے ہو ۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے دو نشانیاں پیش کیں ۔ اپنی لاٹھی کو زمین پر پھینکا تو وہ ایک بڑا اژدھا بن گئی جسے دیکھ کر سارے درباری مع فرعون خوفزدہ

ہو گئے۔ آپ نے دوسری نشانی یہ پیش کی کہ اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا کر نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکدار نظر آنے لگا۔ یہ واضح نشانیاں دیکھ کر فرعون اور اس کے حواری سمجھ گئے کہ یہ شخص سچا ہے مگر اپنے ظلم و تعدی کی بنا پر انہوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

فرعون کا درباریوں سے مشورہ

فرعون کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس کے حواری درباری کہیں موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے معترف نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اُس نے اُن کو موسیٰ علیہ السلام سے بدظن کرنے کے لیے ایک تدبیر سوچی اور قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ اور اپنے ارد گرد کے حواریوں سے کہنے لگا کہ یہ (موسیٰ علیہ السلام) تو پڑھا لکھا جادوگر ہے۔ فرعون کی یہ افتراء پردازی کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ کافروں، مشرکوں اور جابروں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب وہ انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ معجزات سے لاجواب ہو جاتے ہیں تو پھر اسے جادو کہہ کر ہی رد کرتے ہیں۔ فرعون نے بھی یہی حربہ استعمال کیا اور اپنے مصاحبین سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ نشانیاں بہت بڑا جادو ہے۔ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ یہ شخص اپنے جادو کے ذریعے تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال باہر کرنا اور تمہارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اِن حالات میں فَمَاذَا تَأْمُرُونَ بتاؤ تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو۔ ہمیں اپنے ملک کی کس طرح حفاظت کرنی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نبی کسی کا ملک یا حکومت غصب نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں سلطنت کی کوئی خواہش نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ کی زمین پر اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اور اصلاح میں دونوں چیزیں آتی ہیں۔ یعنی عقیدے کی درستگی اور امن و امان کا قیام۔ اللہ کے ہر نبی نے انہی دو چیزوں کو اپنی تبلیغ کا خاص موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ

(ہود - ۸۴) اے میری قوم کے لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو کہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ نیز عام اصلاح کے متعلق فرمایا اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ (ہود - ۸۸) میں تو حسب استطاعت تمہاری اصلاح چاہتا ہوں۔ زمین کو کفر و شرک اور فتنہ و فساد سے پاک کرنا چاہتا ہوں، میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ میں کسی کا مال و دولت یا حکومت و اقتدار نہیں چھیننا چاہتا بلکہ خدا کی زمین پہ خدا کے حکم سے اصلاح چاہتا ہوں

جادو کے ذریعے مقابلے

فرعون کے درباریوں نے جب اس کی بات سنی تو کہنے لگے کہ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام نہیں لینا بلکہ اس معاملے کو حکمت کے ساتھ سلجھانا چاہیے قَالُوۡۤا اَرۡجِهۡ وَاَخَاهُ کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کو مہلت دے دیں یعنی ان کے خلاف کوئی فوری کارروائی نہ کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا معاملہ ہی بگڑ جائے۔ لہذا احسن طریقہ یہ ہے وَابۡعَثۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ آپ مختلف شہروں میں (جادوگروں کو) اکٹھا کرنے والے بھیج دیں مطلب یہ کہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں آدمی بھیج کر ماہر جادوگروں کی خدمات حاصل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ وہی کر سکیں گے تمہارے بھیجے ہوئے ایلچی یَاۡتُوۡكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيۡمٍ تمہارے پاس بڑے بڑے علم والے جادوگر لے آئیں گے۔ سحار مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ عالم فاضل جادوگر آجائیں گے۔ فرعون نے اپنے درباریوں کے مشورہ پہ عمل کرتے ہوئے اپنے عمال مختلف شہروں میں دوڑا دیے جو ماہر ترین جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ چنانچہ ایک معلوم دن کے وعدے پہ جادوگر اکٹھے ہو گئے جادوگروں کے اجتماع کا ایک دن مقرر کر دیا گیا کہ فلاں دن تمام کے تمام جادوگر فلاں جگہ پر اکٹھے ہو جائیں۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ فرعونیوں کے میلے والے دن جادوگروں کو اکٹھا کیا گیا۔ اس دن بہت سے لوگ جشن منانے کے

لیے مُلک بھر سے اکٹھے ہونے تھے لہذا اس دن سب کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَنْ يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى (آیت۔ ۵۹) وہ وعدے کا دن ان کی زیب و زینت اور جشن کا دن تھا اور لوگوں کو چاشت یعنی دوپہر کے وقت یہ مقابلہ دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُونَ اور عام لوگوں سے بھی کہا گیا کہ فلاں دن اور فلاں وقت پر اکٹھے ہو کر جادوگروں کا مقابلہ دیکھو۔ ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ شاید کہ ہم ان بڑے بڑے جادوگروں کا اتباع کریں اگر وہ غالب آجائیں۔ مطلب یہ تھا کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہمارا دین، عقیدہ، اور پورا نظام سلطنت تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے جادوگروں نے ان دونوں کو شکست دے دی تو پھر ہم اپنے موجودہ طریقے پر قائم رہتے ہوئے انہی کی پیروی کرتے رہیں گے اور ہمیں اپنا دین تبدیل نہیں کرنا پڑے گا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ مقررہ دن پر ہزاروں کی تعداد میں جادوگر اکٹھے کیے گئے فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ جب وہ سارے کے سارے فرعون کے دربار میں اکٹھے ہو گئے تو اس سے کہنے لگے أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ کیا ہمارے لیے کچھ مزدوری بھی ہوگی۔ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے جادوگر تو اسی لیے آئے تھے کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو ہمیں انعام و اکرام ملے گا۔ ہماری عزت افزائی ہوگی اور اس طرح ہمیں ملک بھر میں شہرت حاصل ہوگی۔ جادوگروں اور انبیاء علیہم السلام میں یہی تو بنیادی فرق ہے۔ جادوگر دنیا کے مال و دولت اور عزت و حشمت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ جب کہ اللہ کے نبیوں کا یہ اعلان ہوتا ہے وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء ۱۰۹) اے لوگو! میں دعوتِ حق کا تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کیونکہ میرا اجر تو رب العلمین کے پاس ہے۔ میں اسی کے حکم کی بجا آوری کر رہا ہوں اور وہی مجھے اس کا صلہ بھی عطا کرے گا۔ پیغمبر نے یہ کہا کہ میری خدمت بے لوث ہے أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَأَنْصَحُ لَكُمْ (الاعراف ۶۲) میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچا رہا ہوں اور تمہیں نصیحت کر رہا ہوں۔ مجھے تمہاری خیر خواہی مطلوب ہے۔ لہٰذا میری بات کی طرف توجہ کرو۔

جادو کا فتنہ

جادوگری بڑا رذیل قسم کا فن ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اعلیٰ درجے کا جادو کفر اور شرک پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے کہ جو دو آدمی جادو سکھاتے تھے وہ لوگوں پر واضح کر دیتے تھے إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (البقرہ ۱۰۲) کہ ہم تو آزمائش میں مبتلا ہیں مگر جادو کر کے تم کفر نہ کرو۔ جادو میں ایسا کلام پڑھنا پڑھتا ہے اور ایسی حرکات و سکنات اور اعمال کرنا پڑتے ہیں جن سے کفر لازم آتا ہے۔ اسی لیے اعلیٰ درجے کا جادوگر کفر اور شرک کا مرتکب ہوگا۔ البتہ جادو کا کم تر درجہ بھی بدعت کے ارتکاب سے کم نہیں ہے اور اس میں بھی فسق و فجور اور گناہ پایا جاتا ہے۔ جادو کا شعبہ غیر نافع یا مضر علم میں شمار کیا گیا ہے یہ دنیا میں تو کسی حد تک مفید ہو سکتا ہے مگر آخرت کے اعتبار سے سخت مضر ہے اور انسان کو جہنم رسید کر کے چھوڑتا ہے۔

نجوم کے ذریعے غیب کی باتیں معلوم کرنے کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ یہ بھی سحر ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں بھی جادوگروں کی طرح رذیل حرکتیں کرنا پڑتی ہیں۔ کہیں مردوں کا گوشت، ہڈیاں یا بال حاصل کرنا پڑتے ہیں۔ کہیں زندہ انسانوں کو قتل کر کے ان کا خون حاصل کیا جاتا ہے کہیں قبر یا شمشان کی مٹی یا راکھ حاصل کی جاتی ہے۔ یہ سب شیطانی حرکات ہوتی ہیں

جو محض دنیا کی کمائی کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ جادوگر جو جادو کے ذریعے لوگوں کی جانیں تلف کرتا ہے۔ اس کی سزا تو سزائے موت ہے۔ تلوار کے ساتھ اس کا سر قلم کیا جائے اور اگر سحر کی وجہ سے کوئی جان تو ضائع نہیں ہوئی بلکہ کم تر نقصان ہوا ہے تو حاکم مقدمے کی نوعیت کے اعتبار سے قید و بند کی سزا بھی دے سکتا ہے۔ بہرحال جادوگری، ٹونے ٹوٹکے تعویذ گنڈے جن کے ذریعے مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچایا جائے صریح حرام اور شدید گناہ کا کام ہے۔

انعام و اکرام کا وعدہ

بات یہ ہو رہی تھی کہ جادوگروں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو ہمیں کچھ معاوضہ بھی ملے گا یا نہیں۔ اس کے جواب میں فرعون نے کہا قَالَ نَعَمْ ہاں تمہیں نہ صرف معقول معاوضہ ملے گا بلکہ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ تم میرے مقربوں میں سے ہو جاؤ گے تم کرسی نشین ہو گے، مجلسِ شوریٰ کے ممبر بن جاؤ گے یا تمہیں فلاں خطاب مل جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اس دور میں نجومیوں، ساحروں اور کاہنوں کو بھی وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کے دور میں بڑے بڑے سپیشلسٹ ڈاکٹروں، انجینیروں اور سائنس دانوں کو حاصل ہے۔ آج کے زمانے میں ہر کام کی سکیمیں ماہرین ہی ملکی سطح پر بناتے اور ان پر عملدرآمد کراتے ہیں۔ اسی طرح فرعونی دور میں یہ کام بڑے بڑے ساحروں سے لیا جاتا تھا۔ وہ اپنے جادو کے زور پر جس چیز کی نشاندہی کر دیتے تھے، حکومتی سطح پر اسی کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔ آج حکومت کے موجودہ مشیر بڑی بڑی مراعات حاصل کرتے ہیں، تو اس زمانے میں جادوگروں کی چاندی تھی۔

جادوگروں کا کرتب

جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں فرعون، تمام جادوگر اور عام لوگ جمع ہو گئے تو مقابلے کی تیاری شروع ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے

۱؎ ترمذی ص ۲۴۳ (فیاض)

تو جادوگروں کے سامنے نصیحت کی اور فرمایا وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (طٰهٰ ۶۱) تمہاری ہلاکت ہو خدا تعالیٰ پر افترا نہ باندھو جادو جیسا غلط کام کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کرو اور اس سے باز آجاؤ۔ اس نصیحت آمیز بات سے جادوگروں کے دل ہل گئے مگر فرعون کے خوف سے انہوں نے مقابلہ کا چیلنج دے دیا۔ چنانچہ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا چیلنج قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم ڈالنا چاہتے ہو یعنی جادو کا جو کرتب تم دکھانا چاہتے ہو اس میں پہل کرو اور اس عام مجمع کے سامنے اپنی کارکردگی ظاہر کرو۔ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ پس ڈالیں انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں جادوگروں نے اپنا بہترین کرتب پیش کیا۔ سورۃ الاعراف میں ہے۔ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ (آیت ۱۱۶) کہ جادوگر بہت بڑا جادو لائے تفسیری روایات میں آتا ہے کہ ملک مصر سے پندرہ سو جادوگر اکٹھے کیے گئے

اپنا کرتب پیش کر کے جادوگروں نے نعرہ لگایا وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ کہنے لگے "فرعون کی جے" گویا انہوں نے زبانی طور پر مرعوب کرنے کے لیے فرعون کی فتح مندی کا نعرہ بھی بلند کیا۔ اسی قسم کا نعرہ میدان احد میں ابوسفیان نے بھی لگایا تھا جب مسلمانوں کو وقتی طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تو ابوسفیان نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر کہا اُعْلُ هُبَل یعنی ہبل بت کی جے اس کے جواب میں حضور علیہ السلام نے یہ نعرہ لگانے کا حکم دیا اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ یعنی اللہ تعالیٰ ہی بلند و برتر ہے۔

اس مقام پر یہ تفصیل موجود نہیں ہے کہ جادوگروں کی طرف سے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکنے کے بعد کیا ہوا۔ البتہ سورۃ طٰہٰ میں موجود ہے کہ جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ (آیت ۶۶) تو موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسا آیا گویا کہ وہ میدان میں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ وہ رسیاں اور لاٹھیاں چھوٹے چھوٹے سانپ بن کر دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس شعبدہ بازی پر جادوگروں

نے فرعون کی قسم اٹھا کر کہا اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ بیشک ہم ہی غالب ہوں گے۔ انہوں نے اپنے فن کی پختگی کی بنا پر اپنی کامیابی کا پیشگی دعویٰ کر دیا۔

موسیٰ کی طرف سے جواب

جادوگروں کا کرتب دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے دل میں کچھ قدرتی خوف پیدا ہوا کہ ممکن ہے یہ لوگ جادو اور معجزے میں فرق نہ کر سکیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی اور فرمایا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ - ۶۸) کہ ڈرو نہیں بیشک تم ہی غالب ہو گے۔ خدا تعالیٰ تمہیں بلندی عطا فرمائے گا۔ اب پورے میدان کی نظریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ وہ جادوگروں کے کرتب کا جواب کس طرح دیتے ہیں۔ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ پس موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی لاٹھی پھینک دی جونہی وہ زمین پر پڑی تو وہ بہت بڑا اژدھا نظر آنے لگا۔ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ پس اچانک وہ نگل گیا جو کچھ جادوگروں نے بنایا تھا۔ ان کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے سانپ موسیٰ علیہ السلام کا بڑا اژدھا کھا گیا۔ یہ دیکھ کر تمام لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے حتیٰ کہ فرعون کا پیشاب بھی خطا ہو گیا اور اس طرح جادوگروں کا بنایا ہوا سارا کھیل بگڑ گیا اور وہ مغلوب ہو گئے۔

جادوگروں کا ایمان لانا

جب جادوگروں نے یہ ماجرا دیکھا فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ تو وہ سب سجدہ میں گر پڑے اور انہوں نے اقرار کیا قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہنے لگے ہم رب العالمین پر ایمان لائے۔ جو پروردگار ہے رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا بھی پروردگار ہے۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں اور ان کا کارنامہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کا کام نہیں، لہٰذا اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔ بہرحال جادوگروں میں ہمت ہی نہ رہی کہ اس معجزے کے مقابلے میں کوئی دوسرا جادو لا سکتے۔

فرعون کی برہمی

جب جادوگر ایمان لے آئے تو فرعون سخت طیش پا اور اب وہ جادوگروں
کو خطاب کرکے کہنے لگا ۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ
کیا تم اس پر ایمان لے آئے ہو قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دیتا؟ تم میری رعیت
ہو اور تمھاری زندگی میرے رحم وکرم پر ہے۔ تم کیسے ایمان لے آئے ہو۔ لیکن
لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔ دراصل تم سب ایک ہی ہو اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ
الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ دراصل موسیٰ علیہ السلام تمھارا بڑا یعنی تمھارا استاد
جادوگر ہے جس نے تمھیں سارا جادو سکھایا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے تمھاری ملی بھگت
سے ہوا ہے فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ پس عنقریب تمھیں پتہ چل جائے گا
کہ میں تم سب کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ یاد رکھو! لَاُقَطِّعَنَّ
اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ میں تمھارے ہاتھ پاؤں الٹے
سیدھے کاٹ دوں گا جیسا کہ ڈاکوؤں کو سزا دی جاتی ہے وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ
اَجْمَعِیْنَ اور تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ ایسی سخت سزا دوں گا۔

ایمان پر استقامت

اس کے جواب میں جادوگروں نے کہا قَالُوْا لَا ضَیْرَ کوئی ڈر نہیں۔ اب ہم
خوف کی حدود سے نکل چکے ہیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جو لوگ کفر
میں شدید تھے جب ان میں تغیر آیا تو وہ ایمان میں بھی درجہ کمال تک پہنچے اور اللہ
کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ فرعون تو انھیں اپنا مقرب بنانا چاہتا تھا۔ مگر
اس کی بجائے اللہ نے انھیں اپنا مقرب بنا لیا۔ کہنے لگے اِنَّآ اِلٰی
رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ بے شک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے
والے ہیں۔ ابھی تمھارے ہاتھوں شہادت کا جام پی لیں یا کچھ دیر کے بعد طبعی موت
سے ہمکنار ہوں۔ ہم ایمان کی دولت لے کر اس دنیا سے جائیں گے انھوں
نے یہ بھی کہا۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ ہمیں امید
ہے کہ ہمارا پروردگار ہماری سابقہ غلطیوں کو معاف فرمائے گا۔ اَنْ كُنَّآ
اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اس وجہ سے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لائے ہیں۔

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لی ہے اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ایمان پر ثابت قدم ہو گئے ہیں، لہٰذا ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا یقین ہو گیا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جادوگروں نے فرعون سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم پر ہدایت واضح ہو چکی ہے اور ہم اس پر تجھے ترجیح نہیں دے سکتے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (آیت ۷۲) تو جو چاہے فیصلہ کر لے۔ تیرا فیصلہ تو بس دنیا تک محدود ہو گا۔ تو زیادہ سے زیادہ ہماری اس فانی زندگی ہی کو ختم کر سکتا ہے تو جو چاہے کر لے۔ اب ہم ایمان کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس کے بعد کا واقعہ قرآن نے بیان نہیں کیا کہ فرعون نے جادوگروں کے ساتھ فی الحقیقت کیا سلوک کیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ فرعون مسرف آدمی تھا، اس نے اپنے فیصلے پر ضرور عمل درآمد کیا ہو گا اور جادوگروں کو یقیناً سزا دی ہو گی۔

اس کے بعد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام چالیس سال مصر میں مقیم رہے اور وقتاً فوقتاً خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ساتھ ساتھ فرعونیوں کے مظالم بھی برداشت کرتے رہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ‌ۚ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ لَشِرۡذِمَةٌ قَلِيۡلُوۡنَۙ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمۡ لَـنَا لَغَآئِظُوۡنَۙ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيۡعٌ حٰذِرُوۡنَؕ ﴿۵۶﴾ فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍۙ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوۡزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيۡمٍۙ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۵۹﴾

ترجمہ:- اور ہم نے وحی نازل کی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ بیشک تمہارا پیچھا کیا جائے گا (۵۲) پھر بھیجا فرعون نے مختلف شہروں میں اکٹھا کرنے والوں کو (۵۳) کہا فرعون نے، بیشک یہ (بنی اسرائیل) ایک جماعت ہے بہت تھوڑی (۵۴) اور بیشک یہ ہمیں بہت غصہ دلانے والے ہیں (۵۵) اور بے شک ہم (ان سے) خطرہ رکھتے ہیں (یا ہم سب مسلح ہیں) (۵۶) پس نکالا ہم نے اُن (فرعونیوں) کو باغوں اور چشموں سے (۵۷) اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے (۵۸) اسی طرح، اور وارث بنایا ہم نے ان چیزوں کا بنی اسرائیل کو (۵۹)

ربطِ آیات

جب موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغِ حق کا آغاز کیا تو فرعون نے آپ پر جادوگری کا الزام لگایا اور آپ سے مقابلہ کے لیے ملک بھر کے جادوگروں کو اکٹھا کیا۔ فرعونیوں

کے قومی میلے کے دن سب لوگ ایک کھلے میدان میں جمع ہو گئے۔ جہاں جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنا تھا۔ جادوگروں نے پہل کی اور کچھ رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں جو دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ بہت بڑا اژدھا بن گئی اور جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گئی۔ یہ معجزہ دیکھ کر جادوگر تو ایمان لے آئے مگر فرعون اور اس کے حواری اپنی ضد پر اڑے رہے۔ فرعون نے جادوگروں کے ایمان لانے کا بھی بہت بُرا منایا اور اُن کو سخت سزا دینے کی دھمکی بھی دی۔ مگر اُن کو اللہ نے ایمان پر استقامت بخشی اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ انہیں اب کچھ خوف نہیں ہے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف ہی پلٹ کر جانے والے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد تقریباً چالیس سال تک موسیٰ علیہ السلام مصر میں مقیم رہ کر اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے اور فرعون کو درس توحید دیتے رہے آپ اس سے اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ بھی کرتے رہے تاکہ وہ اپنے اصل وطن شام وفلسطین جا سکیں مگر فرعون نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے کی بجائے اسرائیلیوں کو مزید تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ بنی اسرائیل نے فرعون کے مظالم سے تنگ آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (الاعراف۔ ۱۲۹) کہ آپ کی مدد سے واپسی سے پہلے بھی ہم تکلیف میں مبتلا تھے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہمارے مصائب میں کمی نہیں آئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے۔ زمین کا وارث بناتا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف۔ ۱۲۸) اور آخری کامیابی متقین ہی کے حصے میں آتی ہے۔ سورۃ یونس میں اس مضمون کو مزید دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ فرعونی لوگ بنی اسرائیلیوں کو کھلے بندوں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مصر ہی میں اپنے گھروں میں رہو وَاجْعَلُوْا

بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (آیت ۸۷) اپنے گھروں میں قبلہ رخ نماز ادا کرتے تھے۔ اس دوران فرعونی بنی اسرائیلیوں کو قتل کرتے تھے ان سے سخت مشقت کے کام لیتے تھے اور وہ بچارے ظلم کی چکی میں پستے تھے۔ بعض اوقات جب فرعونیوں پر قحط سالی یا کوئی دوسری مصیبت آتی تو وہ موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست بھی کرتے اور ساتھ وعدہ بھی کرتے کہ اگر یہ تکلیف دور ہوگئی تو وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد بھی کر دیں گے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اُن سے وہ تکلیف دور کر دیتا تو وہ اپنے عہد کو توڑ دیتے۔ یہ سارے واقعات سورۃ یونس میں مذکور ہیں۔

بنی اسرائیل کا خروج

اس مقام پر ان درمیانی واقعات کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ جادوگروں کے مقابلہ کا ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل کے مصر سے خروج اور فرعونیوں کی ہلاکت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ اسریٰ رات کے سفر کو کہتے ہیں جیسا کہ واقعہ معراج میں بھی بیان کیا گیا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (بنی اسرائیل ۔۱) پاک ہے وہ خدا تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات کے وقت لے گیا۔ تو یہاں پر موسیٰ علیہ السلام کو رات کے وقت سفر کرنے کا حکم دیا گیا۔

بنی اسرائیل کے خروج کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ بنی اسرائیل ہر سال شہر سے باہر کھلے میدان میں چند دن کے لیے کوئی تقریب منایا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی جب وہ دن قریب آئے تو انہوں نے جشن منانے کی تیاری شروع کی۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ انہوں نے تقریب کے موقع پر پہننے کے لیے بعض قبطیوں سے کچھ زیورات بھی مستعار لیے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ دوران سفر استعمال کے لیے خوراک کا مختصر ذخیرہ بھی ہمراہ لے لیں۔ اُدھر کسی وبائی مرض کی وجہ سے قبطیوں کے گھروں میں کچھ نوجوان اموات

بھی واقع ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ تر اُدھر مصروف ہوگئے۔ اِدھر بنی اسرائیل کو راتوں رات نکلنے کا حکم مل گیا۔ فرعونی لوگوں نے اس بات کا زیادہ نوٹس نہ لیا وہ جانتے تھے کہ بنی اسرائیل ہر سال چند دن کے لیے جشن منانے کے لیے جایا ہی کرتے ہیں۔ بہر حال بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ رات کے وقت نکل چلو اور ساتھ اس بات سے بھی آگاہ کردیا گیا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا، مگر گھبرانا نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔

فرعون کی منصوبہ بندی

بنی اسرائیل کے خروج کے تین دن بعد فرعونیوں کو خیال آیا کہ اس مرتبہ سارے کے سارے بنی اسرائیلی میلے میں چلے گئے ہیں اور اُن کا ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہا، آخر بات کیا ہے؟ انہیں بنی اسرائیل کے فرار کا شبہ پیدا ہونے لگا چنانچہ فرعون نے فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کا تعاقب کر کے معلوم کیا جائے کہ وہ کہاں گئے ہیں فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ پس بھیجا فرعون نے مختلف شہروں میں اکٹھا کرنے والوں کو۔ منصوبہ یہ تھا کہ تمام فوجی جوان اور سرکردہ قبطی اکٹھے ہو کر بنی اسرائیل کا تعاقب کریں۔ آجکل کی اصطلاح کے مطابق پورے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ تمام سرکاری ملازمین اور فوجیوں کی چھٹیاں منسوخ کر کے انہیں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پہ حاضر ہو جانے کا حکم دے دیا گیا۔ بہت سے تیز رفتار گھوڑ سواروں کے ذریعے فوجی سرکردہ عہدیداروں اور دیگر اہم لوگوں کو اکٹھا کیا گیا۔ اس وقت مصر میں ایک ہزار بڑے بڑے شہر اور بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ سب میں آدمی بھیج کر لشکر جمع کیا گیا۔ اُن کو بنی اسرائیل کے تعاقب کے فیصلے سے آگاہ کیا گیا اور ساتھ ڈھارس بھی بندھائی گئی کہ اس مہم سے ڈرنا نہیں اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ یہ بنی اسرائیل ایک چھوٹی سی جماعت ہے جسے ہم نے پکڑنا ہے اور ہماری کثرتِ تعداد کے پیشِ نظر یہ ایک معمولی سا کام ہے۔ نیز اپنے لوگوں کو ابھارنے کے لیے یہ بھی کہا وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ اور بیشک

بنی اسرائیلی ہمیں غصہ دلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کا راتوں رات نکل جانا فرعون کے لیے غصے کا باعث تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنے حوالیوں موالیوں کو تعاقب پر آمادہ کیا اور ساتھ یہ بھی کہا وَإِنَّا لَجَمِيعٌ حَاذِرُونَ اور بے شک ہم سب ان سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی کئی دفعہ تخت پر حملہ ہو چکا تھا اور آپ نے ہر دفعہ فرعونیوں کو لاجواب کیا حتیٰ کہ فرعون کے بڑے بڑے جادوگر بھی آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ لہٰذا فرعون پوری اسرائیلی قوم کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا کہ یہ کسی بھی وقت اُس کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔

مفسرین کرام حٰذِرُونَ کا معنی یہ بھی کرتے ہیں کہ ہم مسلح ہیں۔ جیسا کہ جہاد کے ضمن میں آتا ہے کہ نماز پڑھتے وقت بھی خُذُوا حِذْرَكُمْ (النساء-۱۰۲) اپنے ضروری ہتھیار اپنے پاس رکھو کہ کہیں دشمن دورانِ نماز ہی حملہ نہ کر دے۔ اس لحاظ سے یہ معنی بھی درست ہے کیونکہ فرعون کی پوری فوج ہتھیار بند تھی جب کہ اسرائیلی قوم غیر مسلح اور بے سر و سامان تھی۔

فرعون کی طرف سے تعاقب

فرعونی لشکر کو جمع ہوتے ہوتے کئی دن گزر گئے اور اس اثنا میں بنی اسرائیل بحرِ قلزم کے کنارے پہنچ گئے۔ فرعونیوں کا بارہ تیرہ لاکھ کا لشکر اسرائیلیوں کے تعاقب میں چل پڑا۔ اسی واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَأَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ہم نے نکالا ان کو باغات اور چشموں سے۔ مصر بڑا سرسبز ملک تھا اس میں دریا اور نہریں بھی جاری تھیں۔ دریائے نیل سارا سال بہتا تھا۔ زمین سیراب ہوتی تھی جس سے فصل اور باغات پیدا ہوتے تھے اس لیے اس کو باغات اور چشموں کی سرزمین کہا گیا ہے کہ ہم نے قبطیوں کو ایسی جگہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے دائمی نہریں اور چشمے، فصل سے بھرپور کھیت اور پھل سے لدے باغات کو چھوڑ کر اسرائیلیوں کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ہم نے انہیں خزانوں اور عمدہ مکانوں سے نکالا۔ ظاہر ہے کہ خوشحال ملک کے باشندوں کے پاس

مال و دولت اور خزانے بھی وافر ہوں گے اور ان کی رہائش گاہیں بھی اعلیٰ درجے کی ہوں گی، جن میں ہر قسم کی آرام و آسائش ہوگی۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم نے انہیں ایسی جگہوں سے نکال کر بحر قلزم کی لہروں کے سپرد کر دیا اور پھر وہ لوٹ کر اپنے باغات اور گھروں میں واپس نہ آسکے۔ فرمایا کَذٰلِکَ ہم نے اُن کو اسی طرح نکالا جس کا نقشہ سورۃ ہود میں کھینچا گیا ہے یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ (آیت - ۹۸) کہ آگے آگے فرعون تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے سارا لشکر اور موالی درباری تھے فرمایا قیامت والے دن بھی ایسا ہی ہوگا کہ فرعون آگے آگے چل رہا ہوگا۔ اس کا سارا لشکر اُس کے پیچھے پیچھے ہوگا۔ جنہیں لے کر وہ دوزخ میں پہنچ جائے گا۔

بنی اسرائیل بحیثیت وارث مصر

فرمایا ہم نے فرعونیوں کو ان کے باغات، چشموں، خزانوں اور عمدہ ٹھکانوں سے نکالا وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اور ان چیزوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ مفسرین کے نزدیک یہ حصہ آیت اس لحاظ سے اشکال پیدا کرنے والا ہے کہ فرعونیوں کی بحر قلزم میں غرقابی کے بعد بنی اسرائیل تو اُن کی املاک کے وارث نہیں بنے مگر یہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو وارث بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل بحر قلزم کو معجزاتی راستوں کے ذریعے عبور کر گئے تو پھر وہ واپس مصر نہیں آئے بلکہ آگے صحرائے سینا پہنچ گئے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ (المائدہ - ۲۶) چالیس سال تک وہیں بھٹکتے رہے ان کے لیے حکم یہ تھا کہ ارض مقدس میں واپسی کے لیے وہاں کے قابضین سے جہاد کریں مگر انہوں نے پس و پیش کیا اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ اسی دوران موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فوت ہو گئے۔ پھر نئی نسل آئی اور انہوں نے حضرت یوشع ؑ کی سرکردگی میں جہاد کیا اور ارض مقدس شام و فلسطین پر دوبارہ قابض ہوئے

اس ضمن میں مفسر قرآن حضرت قتادہؒ کے قول سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ممکن ہے بنی اسرائیل صحرائے سینا کی قید کے بعد دوبارہ مصر گئے ہوں اور انہوں نے فرعونیوں کی املاک پر قبضہ بھی کیا ہو جس کا ذکر اس آیت میں اللہ نے کیا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب فرعون غرق ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کا مایہ ناز لائو لشکر بھی لقمہ اجل بن گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کچھ اسرائیلیوں کو واپس مصر بھیج دیا تھا تاکہ جاکر وہاں کا نظم سنبھال لیں کیونکہ فرعونیوں کی اکثریت اور ان کے سرکردہ لوگ تو ختم ہو چکے تھے اور مصر میں نظم ونسق کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ بنی اسرائیل اُس وقت واپس مصر نہیں گئے۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں انہیں مصر پر دوبارہ اقتدار حاصل ہوا جو کہ بہت عرصہ بعد کی بات ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی فرعون کی ہلاکت کے بعد مصر پر قبطیوں کو ہی اقتدار حاصل رہا۔ حتیٰ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مصر دوبارہ آپ کے زیر نگیں آیا۔

اندریں حالات مفسرین کرام اس آیت کا حل یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو باغات، چشموں اور محلات و خزائن کا وارث مصر میں نہیں بلکہ شام و فلسطین میں بنایا تھا۔ یہ سرزمین بھی بڑی زرخیز ہے یہاں دریا، نہریں اور چشمے جاری ہیں۔ اناج، پھل اور میوے پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ خوشحال ہیں، خزانوں اور عمدہ رہائش گاہوں کے مالک ہیں۔ تو اس وراثت سے مراد ارضِ مقدس کی وراثت ہے نہ کہ مصر کی۔ چنانچہ سورۃ الدخان میں آتا ہے وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (آیت۔ ۲۸) وہاں پر باغات، چشموں کھیتی باڑی اور محلات کا ذکر ہے کہ ہم نے دوسروں کو اس کا وارث بنایا۔ دوسروں میں اسرائیلیوں کا ذکر نہیں ہے، البتہ یہ نعمتیں انہیں ملکِ شام میں جاکر حاصل ہوئیں۔ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء مبعوث ہوئے۔

بڑے بڑے بادشاہ اور جرنیل پیدا ہوئے۔ پھر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا دور آیا۔ مختلف اقوام سے مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد بخت نصر نے پھر ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اور انہوں نے سو سال تک غلامی کی زندگی بسر کی۔ اس کے بعد اللہ نے پھر انہیں اس غلامی سے رہائی دلائی اور ان نعمتوں کا وارث بنایا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس حصۂ آیت کا یہی معنیٰ راجح ہے

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾

ترجمہ:- پھر پیچھے آئے وہ اُن کے سورج نکلنے کے وقت (٦٠)
جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں جماعتیں تو کہا موسیٰ علیہ السلام
کے ساتھیوں نے بیشک ہم تو پکڑے گئے (٦١) کہا
موسیٰ نے: ہرگز نہیں۔ بیشک میرے ساتھ میرا پروردگار ہے
وہ ضرور مجھ کو راہ بتلائیگا (٦٢) پھر وحی نازل کی ہم نے
موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ مار اپنی لاٹھی سمندر پر۔ پس پھٹ
گیا وہ۔ پس ہو گیا ہر ایک حصہ ایک بڑے پہاڑ کی
طرح (٦٣) اور قریب کیا ہم نے وہاں پر دوسروں کو (٦٤)
اور نجات دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھ

والوں سب کو (۶۵) پھر ہم نے پانی میں ڈبو دیا دوسروں کو (۶۶)
بیشک اس میں البتہ نشانی ہے۔ اور ان میں سے اکثر
ایمان لانے والے نہیں ہیں (۶۷) اور بیشک تیرا پروردگار البتہ
زبردست اور رحم کرنے والا ہے (۶۸)

ربط آیات

گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو لے کر راتوں رات مصر سے نکل جائیں اور ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون کا لشکر آپ کا تعاقب کرے گا۔ حسب حکم موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ جیسا کہ پہلے درس میں بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل ہر سال خاص دنوں میں اپنا قومی میلہ منایا کرتے تھے۔ حسب معمول اس سال بھی انہوں نے شہر سے باہر جا کر جشن منانے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلے میں بعض نے قبطیوں سے زیورات بھی مانگے جو انہوں نے بخوشی دے دیے۔ پروگرام کے مطابق موسیٰ علیہ السلام بمع قوم بنی اسرائیل مصر سے نکل گئے اور چلتے چلتے بحر قلزم کے کنارے پر پہنچ گئے۔ اب انہیں اپنے وطن ارض مقدس شام و فلسطین پہنچنا تھا مگر راستے میں بحر قلزم پڑتا تھا۔ اس دوران میں فرعونیوں کو شک گزرا کہ بنی اسرائیل کہیں بھاگ ہی نہ جائیں۔ چنانچہ فرعون نے بڑے بڑے شہروں میں گھڑ سوار دوڑا دیے تاکہ وہ تمام چھاؤنیوں سے فوج کو اکٹھا کریں اور ساتھ ساتھ ملک کے سرکردہ آدمیوں کو بھی بلا لائیں تاکہ بنی اسرائیل کا تعاقب کر کے انہیں پکڑا جا سکے۔ اس حکم کی تعمیل میں دو تین دن گزر گئے۔ اتنے میں بنی اسرائیل بحر قلزم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ فرعون نے تمام جمع شدہ فوج اور دیگر سرکردہ لوگوں کو بتلایا کہ بنی اسرائیل کی ایک قلیل سی جماعت ہمیں تنگ کرتی ہے اور اب وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمیں بہت غصہ دلا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کا تعاقب کر کے انہیں اپنی غلامی میں رہنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ سب فرعونیوں نے اس تجویز کی حمایت کی اور وہ بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل نکلے۔ اب آج کے درس میں واقعہ کا اگلا حصہ بیان کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل کی خوفزدگی

ارشاد ہوا ہے فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ دن نکلنے کے وقت ہی بنی اسرائیل کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ بڑی شان و شوکت سے بنی اسرائیل کو تہس نہس کرنے کے ارادے سے نکلے اُن کی کل تعداد تفسیری روایات کے مطابق بارہ ہزار لاکھ تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن میں سے ایک لاکھ تو صرف سیاہ رنگ کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق سیاہ رنگ کے گھڑسواروں کی تعداد آٹھ لاکھ تھی۔ تاہم یہ روایات قابل اعتماد نہیں کیونکہ قرآن پاک یا کسی صحیح روایت میں ان کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ بہرحال یہ لشکر تعاقب کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے قریب پہنچ گیا فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعٰنِ جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسری کو دیکھا قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑے گئے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے کنارے کھڑے تھے۔ سمندر میں کود جانے کے لیے ان کے پاس کوئی کشتیاں بھی نہیں تھیں اور پیچھے سے فرعون کا لشکر بھی پہنچ گیا تو اُن کی تشویش ایک فطری امر تھا۔ انہوں نے گھبرا کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ موسیٰ علیہ السلام حکم الٰہی کی تعمیل ہی میں مصر سے نکلے تھے۔ لہٰذا انہیں اللہ تعالیٰ کی اعانت پر مکمل بھروسہ تھا چنانچہ انہوں نے قوم کو تسلی دیتے ہوئے قَالَ كَلَّا فرمایا فرعون تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ ہم اُسی کے حکم سے مصر سے نکلے ہیں۔ اسی کی مدد ہمارے شاملِ حال ہے سَیَهْدِیْنِ وہ ضرور مجھ کو راہ بتلائے گا۔ یعنی ہمارے بچاؤ کی کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ بالکل اسی قسم کا واقعہ حضور علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آیا ہے ہجرت پر روانہ ہوتے وقت جب حضور علیہ السلام اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی نے غار ثور میں قیام فرمایا تو قریش مکہ آپ کی تلاش میں غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ حتیٰ کہ ان کے پاؤں بھی نظر آ رہے تھے۔ اگر وہ نیچے جھک کر دیکھ لیتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پا لیتے مگر انہیں ایسا کرنے کی توفیق نہ ملی۔ غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تھا اور وہ

سمجھ بیٹھے تھے کہ اس غار کے اندر کسی شخص کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بہرحال اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پریشانی بجا تھی۔ چونکہ حضور علیہ السلام بھی اپنے پروردگار کے حکم سے ہجرت کے لیے نکلے تھے۔ اس لیے انہیں بھی خدا تعالیٰ کی نصرت پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ تسلی دی لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ۔ ۴۰) آپ خوف نہ کھائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ وہی ہمیں دشمنوں سے بچانے گا۔ وہاں آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شامل کر کے جمع کا صیغہ مَعَنَا فرمایا جب کہ آیت زیر درس میں موسیٰ علیہ السلام نے صیغہ واحد مَعِیَ استعمال کیا ہے مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور میری وساطت سے پوری قوم کا حامی ناصر ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے خشک راستے

اس پریشانی کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی فَاَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ کہ اپنی لاٹھی کو سمندر پر ماریں۔ یہ وہی متبرک لاٹھی تھی جسے مقابلے کے میدان میں پھینکا تھا تو یہ بہت بڑا اژدھا بن گئی اور پھر اس نے جادوگروں کے بنائے ہوئے تمام سانپوں کو نگل لیا۔ اب اس کو پانی پر مارنے کا حکم ہوا۔ جونہی آپ نے پانی پر لاٹھی ماری فَانْفَلَقَ تو پانی پھٹ گیا لاٹھی مارنے کی جگہ کے اطراف میں پانی منجمد ہو کر پہاڑوں جیسے بڑے بڑے برف کے تودوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا اور بیچ میں چلنے کے لیے راستہ بن گیا۔ فرمایا فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ پانی کا ہر حصہ بڑے بڑے پہاڑوں کی مانند کھڑا ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور سمندر میں بارہ راستے بن گئے تاکہ ہر قبیلہ ایک ایک راستے پر چلتا ہوا سمندر کو عبور کر لے۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ اس رات اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف پہلے ہی وحی بھیج دی تھی کہ جب میرے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام آئیں اور تجھے لاٹھی ماریں

تو ان کی سُننا اور ماننا۔ چنانچہ سمندر رات بھر تلاطم میں رہا۔ اس کی موجیں ادھر اُدھر سر ٹکراتی رہیں کہ نامعلوم موسیٰ علیہ السلام کب اور کدھر سے آکر مُجھے لاٹھی مار دیں اور مجھے خبر ہی نہ ہو جس کی وجہ سے اُن کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکے۔ جب آپ سمندر کے بالکل کنارے پہنچ گئے تو آپ کے ساتھی یوشع بن نون علیہ السلام نے پوچھا، اللہ کے نبی! آپ کو کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے سمندر پر لاٹھی مارنے کا حکم ہے۔ انہوں نے کہا پھر دیر کیا ہے؟ پھر موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر لاٹھی مار کر کہا کہ مجھے چلنے کا راستہ دے دے۔ بس اُسی وقت پانی پھٹ گیا اور درمیان میں بارہ راستے صاف نظر آنے لگے۔ ہوا کو حکم ہوا کہ ان راستوں کو خشک کر کے چلنے کے قابل بنا دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر بارہ راستوں کے درمیان طاق کھلے بن گئے۔ جن کے ذریعے بارہ قبائل ایک دوسرے کو دوران سفر دیکھ سکتے تھے۔

بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنا ہاتھ ہلاؤ۔ جب آپ نے ایسا کیا تو ہوا نے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ درست نہیں ہے بلکہ لاٹھی مارنے والا واقعہ درست ہے۔ بعض سر سید جیسے گمراہ لوگوں کی نام نہاد تحقیق یہ ہے کہ سمندر میں مدوجزر جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ مدوجزر میں سمندر کا پانی کئی کئی میل تک خشکی پر چڑھ جاتا ہے اور پھر واپس بھی چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سمندر کا پانی مدو کی حالت میں پیچھے ہٹ گیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس کو پار کر گئے۔ پھر جب مد آیا تو فرعونی لشکر غرق ہو گیا۔ یہ سب ملحدانہ باتیں ہیں صحیح بات یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے لاٹھی ماری تو پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بڑے بڑے پہاڑوں جیسے برفانی تودوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا اور درمیان میں بارہ راستے بن گئے۔ جن پر سے بنی اسرائیل گزر گئے۔

فرعونیوں کی غرقابی

ارشاد ہوتا ہے وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ پھر ہم نے پہنچا دیا وہاں پر دوسروں یعنی فرعونیوں کو۔ جب فرعون اور اس کے لشکر نے دیکھ کر

بنی اسرائیل سمندر کے بیچوں بیچ بنے ہوئے راستوں پہ جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی پیچھے جانا چاہا۔ پہلے تو انہوں نے کچھ پس و پیش کیا مگر جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور انہوں نے اپنا گھوڑا فرعون کے گھوڑے کے آگے لگا دیا جسے دیکھ کر فرعون کا گھوڑا بھی سمندر میں اتر گیا اور پھر اس کے پیچھے سارا لشکر اسی راستے پہ چل نکلا۔ جب وہ سارے کے سارے سمندر کے اندر پہنچ گئے تو اتنے میں بنی اسرائیل سمندر کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے جب آخری اسرائیلی خشکی پر پہنچا تو عین اسی وقت آخری فرعونی سمندر میں اتر چکا تھا۔ چنانچہ اللہ کے حکم سے سمندر کا منجمد پانی پھر سے آپس میں مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے تمام ساتھیوں کو بچالیا۔ اُن میں سے فرد واحد بھی ضائع نہ ہوا۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ پھر ہم نے دوسروں یعنی فرعونیوں کو سمندر میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً اس سارے واقعہ میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے فرمانبرداروں کو محفوظ رکھتا ہے اور نافرمانوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے باوجود وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ لوگوں کی اکثریت ایمان سے خالی رہتی ہے۔ آج پوری دنیا میں دیکھ لیں پانچ ارب کی آبادی میں سے غالب اکثریت کفر و شرک میں مبتلا ہے اور ایمان سے خالی ہے ایک قلیل تعداد ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔ باقی سب بے دین اور ملحد ہیں۔ فرمایا وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ بے شک تیرا پروردگار غالب بھی ہے اور از حد مہربان بھی ہے۔ وہ سزا فرمان، مشرک اور کافر کے لیے زبردست اور اُس کو سزا دینے پر قادر ہے جب کہ ہر اطاعت گزار کے لیے نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿٧٢﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٥﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾

ترجمہ:- اور (اے پیغمبر!) آپ ان کو ابراہیم علیہ السلام کی خبر سنا دیں ﴿۶۹﴾ جب کہا اُس نے اپنے باپ سے اور اُس کی قوم سے کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو ﴿۷۰﴾ کہا انہوں نے ہم مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ پس ہم سارا دن ان کے سامنے جھکے رہتے ہیں ﴿۷۱﴾ کہا (ابراہیم علیہ السلام نے) کیا وہ تمہاری بات کو سنتے ہیں جب تم اُنہیں پکارتے ہو؟ ﴿۷۲﴾ یا تم کو نفع پہنچاتے ہیں یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ ﴿۷۳﴾ انہوں نے کہا نہیں بلکہ پایا ہے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو۔ وہ اسی طرح کرتے تھے ﴿۷۴﴾ کہا (ابراہیم علیہ السلام نے) بھلا کیا تم دیکھتے ہو جن چیزوں کی تم عبادت کرتے رہے ہو ﴿۷۵﴾ تم بھی اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد بھی ﴿۷۶﴾ پس وہ میرے دشمن ہیں مگر رب العلمین۔

میرا دوست ہے (۲۲)

ربط آیات

گذشتہ تین رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بالتفصیل بیان فرمائے۔ اس سورۃ مبارکہ میں موسیٰ علیہ السلام کے حالات آپ کی فرعون کی طرف روانگی سے شروع کر دیئے۔ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ فرعون اور اس کی ظالم قوم کو میرا پیغام توحید سناؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ ہارون علیہ السلام کی تائید چاہی اور ساتھ ہی خدشہ کا اظہار کیا کہ میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا، شاید کہ وہ مجھے بھی نہ مار ڈالیں۔ اللہ نے تسلی دی تو آپ فرعون کے پاس پہنچے۔ اپنی رسالت کا اعلان کیا اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ فرعون نے آپ پر بچپن میں کیے گئے احسانات یاد دلائے اور کہا کہ تو ہماری ناشکری کا مرتکب ہو رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو میرے رب کا احسان ہے کہ اس نے مجھے تمہارے ظلم سے بچایا اور نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ فرعون کے استفسار پر رب العلمین کا تعارف بھی کرایا کہ وہ وہی ہے جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤاجداد کو پیدا کیا اور وہ مشرق و مغرب کا رب ہے۔ فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو تجھے قید میں ڈال دوں گا۔ پھر فرعون کے مطالبہ پر آپ نے عصا اور ید بیضا کے معجزات پیش کیے۔ فرعون نے مقابلے کے لیے ملک بھر سے جادوگر اکٹھے کیے۔ تمام لوگوں کی موجودگی میں ایک کھلے میدان میں موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ جس میں موسیٰ علیہ السلام غالب آئے اور جادوگر کھڑے کھڑے ہی ایمان لے آئے۔ پھر اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر راتوں رات نکل کھڑے ہوئے۔ فرعون کے لشکر نے پیچھا کیا تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی پانی پر مارو۔ ایسا کرنے سے سمندر میں بارہ خشک راستے بن گئے جن کے ذریعے بنی اسرائیل سمندر پار جانے کے لیے چل پڑے۔ لشکر فرعونی بھی انہی راستوں پر سمندر میں اتر آیا مگر اللہ نے سب کو مع فرعون غرق کر دیا اور اس طرح بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو

گئے۔ اب اگلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے باپ اور قوم کے سامنے پیش کی اور عقلی دلائل دیے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے اور جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو انہیں کچھ اختیار نہیں اور وہ تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے

ابراہیمؑ کے ابتدائی حالات

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جنہیں جد الانبیاء بھی کہا جاتا ہے۔ آپ عراق کے قصبہ برمزحیدہ میں پیدا ہوئے۔ مؤرخ ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کے والد کا نام تارخ اور لقب آزر تھا۔ دراصل آزر ایک بت کا نام تھا اور اسی لقب سے آپ نے شہرت پائی۔ قرآن میں دو مقام پر آپ کے باپ کے لیے آزر کا لفظ آیا ہے۔ جیسے فرمایا وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ (الانعام ۷۵) آزر خود بت ساز بت پرست اور بت پرستی کا مرکز اور پوری قوم کا محور بن چکے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد اور قوم سے جدا ہو کر دریائے فرات کے مغربی کنارے پر اور کلدانیین نامی بستی میں کچھ عرصہ رہائش پذیر رہے۔ آپ کی بیوی حضرت سارہؑ اور آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ تھے۔ یہاں سے آپ حران کی طرف چلے گئے اور پھر آ کے فلسطین کے مغربی حصے میں کنعانیوں کے زیر اثر شہر نابلس میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے مغرب کی جانب مصر جا پہنچے۔ مصر میں ملک جبار والا واقعہ پیش آیا جو بخاری اور مسلم میں مذکور ہے۔ فرعون بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرح سامی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس نے حضرت سارہؓ کی بددعا اور ان کی کرامت کو دیکھا تو اپنی بیٹی ہاجرہؓ کو ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ خاندان ابراہیم اللہ کے نزدیک ایک مقرب خاندان ہے اور اگر اس کی بیٹی حضرت سارہؓ کی خدمت بھی کرے گی تو اس کے لیے باعث سعادت ہوگی۔ بعض بنی اسرائیل مانتے ہیں کہ حضرت ہاجرہؓ بادشاہ مصر کی لونڈی تھی اور اس طرح اسماعیلی خاندان لونڈی کی اولاد میں۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ بعض یہودی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ہاجرہؓ یا تو خود

فرعونِ مصر کی بیٹی تھی یا پھر کوئی دوسری شہزادی تھی جو فرعون کے قبضہ میں تھی۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے یہی بیان فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

ابراہیم علیہ السلام کی مادری زبان سریانی تھی مگر جب آپ آزر کلدانیین پہنچے تو وہاں پر عبرانی زبان بولی جاتی تھی لہٰذا آپ یہ زبان بھی بولنے لگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ متعدد انبیاء کا سلسلہ وابستہ تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام آپ کے بھتیجے تھے جن کو اللہ نے شرقِ اردن کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام آپ کے حقیقی فرزند اور اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت اُس وقت ہوئی جب ابراہیم علیہ السلام اسّی یا تراسی ۸۳ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ پھر جب آپ کی عمر سو سال ہوئی تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کل دو سو سال عمر پائی اور اس دوران آپ کے پوتے یعقوب علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر قرآن پاک کی ۲۳ مختلف سورتوں میں آیا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوائل عمر میں سمجھ بوجھ، رشد و ہدایت اور بصیرت سے نواز دیا تھا۔ آپ ابتداء ہی سے بت پرستی کے سخت خلاف تھے اور آپ کو یقین تھا کہ یہ مورتیاں نہ تو سن سکتی ہیں، نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتی ہیں۔ مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے یہ بت کسی نفع و نقصان کے مالک نہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوتِ توحید کا آغاز اپنے والد اور خاندان سے کیا۔ آپ نے نہایت نرمی اور لطف کے ساتھ پند و نصیحت کا حق ادا کیا مگر باپ نے کوئی بات نہ مانی بلکہ دھمکی دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے توحید کے حق میں بڑے جاندار اور منطقی دلائل پیش کیے مگر پوری قوم اُن کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ آخر انہوں نے وہی جہال والا طریقہ اختیار کیا اور آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ نمرود نے سات سال تک آپ کو قید میں بھی رکھا مگر آپ دعوتِ توحید

دینے سے باز نہ آئے بالآخر اُس نے آپ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے بہت بڑا آگ کا الاؤ جلا کر آپ کو اُس میں پھینک دیا گیا مگر اللہ نے وہاں بھی آپ کو صحیح سلامت رکھا اور مشرکین کی ہر تدبیر کو ناکام بنایا۔

آپ عراق سے ہجرت کر کے شام و فلسطین پہنچے اور تین دفعہ مکہ مکرمہ کا سفر بھی اختیار کیا۔ آپ نے اپنی دوسری بیوی ہاجرہؓ اور نومولود بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں آباد کیا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور حج کا اعلان فرمایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام آپ کی پہلی بیوی سارہؓ سے تھے جو کہ سو سال کی عمر میں پیدا ہوئے۔ سارہ کی وفات کے بعد آپ نے بنی کنعان کی ایک خاتون قنطورہ سے نکاح کیا جس سے چار فرزند پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ایک اور خاتون حجرنی سے نکاح کیا جس سے سات بیٹے پیدا ہوئے۔ اس طرح آپ کے جملہ بیٹوں کی تعداد تیرہ بنتی ہے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کی والدہ کا نام نوابنت کرنبا یا نبوتا تھا۔

درسِ توحید

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے اُس درسِ توحید کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے باپ اور قوم کو دیا۔ ارشاد ہوتا ہے وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ اے پیغمبر! ذرا آپ ان مشرکین مکہ کو ابراہیم علیہ السلام کی خبر سنا دیں۔ یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور اُن کے دینِ حنیف کے پیروکار ہونے کے دعویدار ہیں۔ ذرا ان پر واضح کر دیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے کونسا دین پیش کیا اور تم کہاں جا پہنچے ہو۔ تمہیں تو دینِ ابراہیمی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ جب کہ کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے مَا تَعْبُدُوْنَ تم کس چیز کی پوجا کرتے ہو؟ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ پس ہم متواتر انہی پر جھکے رہتے ہیں۔ صنم وہ بت ہوتا ہے جو کسی انسان، جانور، یا ستارے یا سلسلے کی شکل پر بنایا گیا ہو اور وثن وہ بت ہوتا ہے جو اَن گھڑ پتھر، لکڑی وغیرہ

جو مشرکین مکہ نے بھی مختلف ناموں اور مختلف شکلوں پر بے شمار بت تراش رکھے تھے حتیٰ کہ بیت اللہ شریف کی دیواروں کے ساتھ بھی تین سو ساٹھ بت لگا رکھے تھے اور ہر وقت ان کی پوجا پاٹ میں لگے رہتے تھے کبھی اُن کو غسل دیتے، کبھی کپڑے پہناتے، کبھی ان کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے اور کبھی اُن سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے طالب ہوتے۔ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے مشرکوں کا بھی یہی حال تھا کہنے لگے کہ ہم تو ہمہ وقت ان بتوں کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔

اب ابراہیم علیہ السلام نے مشرکین کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے چوٹ لگائی۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ کہنے لگے کیا یہ تمہاری بات کو سنتے ہیں جب کہ تم ان کو پکارتے ہو؟ ظاہر ہے کہ وہ تو مٹی، پتھر اور دھات کی بنی ہوئی مورتیاں تھیں، بھلا وہ کیسے کسی کی پکار کو سن سکتی تھیں۔ مشرکین لاجواب تھے، وہ بتوں کی سماعت کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے پھر ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا سوال کیا أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ یا وہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آخر بتاؤ تو سہی کہ تم کس مقصد کے لیے ان بتوں کی پرستش کر رہے ہو؟

اندھی تقلید

جب مشرکوں سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہی اندھی تقلید والی پرانی رٹ لگائی قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ کہنے لگے، بلکہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح کرتے پایا ہے۔ وہ بھی ان بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کو نذر و نیاز پیش کرتے تھے اور پھر ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم کسی دلیل کو نہیں جانتے۔ مشرکوں کی یہ حیلہ سازی اللہ نے قرآن میں جگہ جگہ بیان فرمائی ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے مشرکوں سے پوچھا کہ تم ان مورتیوں کی پوجا کیوں کرتے ہو قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ (آیت ۵۳) کہنے لگے ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا تو ہم بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ تقریباً یہی الفاظ سورۃ الشعراء اور سورۃ الزخرف میں بھی ہیں۔ سورۃ البقرہ میں بھی مشرکوں کا یہی جواب بیان کیا

گیا ہے کہ ہم تو اس چیز کا اتباع کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرہ۔ ۱۷۰) اگرچہ تمہارے باپ دادا بے عقل اور غیر ہدایت یافتہ ہوں تو پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلو گے؟ بہرحال مشرکین نے ابراہیم علیہ السلام کو یہی جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح بتوں کی پوجا کرتے پایا ہے، لہٰذا ہم بھی ویسے ہی کیے جا رہے ہیں۔

ابراہیمؑ کا اعلانِ حق

پھر ابراہیم علیہ السلام نے دوسرے طریقے سے قوم کو سمجھانے کی کوشش کی قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ کہنے لگے کیا تم نے دیکھا ہے یعنی کیا تمہیں خبر ہے کہ جن کی تم پوجا کرتے ہو اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ تم بھی اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد بھی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ یہ سب میرے تو دشمن ہیں۔ چونکہ میں موحد ہوں اور ان کی مذمت بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا، لہٰذا یہ بھی میرے دوست نہیں ہو سکتے

اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

سوائے تمام جہانوں کے پروردگار کے کہ وہی میرا دوست ہے اور وہی میرا کارساز ہے۔ میں نے انہی کے حکم کے مطابق ان تمام جھوٹے معبودوں کی دشمنی لی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ان سب کے مقابلے میں اکیلا ہی میری مدد کرے گا اور ان سب پر غالب بنائے گا۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾

ترجمہ:- وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پس وہی میری راہنمائی فرماتا ہے ﴿۷۸﴾ اور وہ جو مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے ﴿۷۹﴾ اور وہ کہ جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے ﴿۸۰﴾ اور وہ جو مجھ پر موت طاری کرے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا ﴿۸۱﴾ اور وہ کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ میری کوتاہی کو انصاف کے دن معاف فرمائے گا ﴿۸۲﴾ اے پروردگار عطا فرما دے مجھے حکم (حکمت) اور ملا دے مجھے نیکوکاروں کے ساتھ ﴿۸۳﴾ اور رکھ دے میرے لیے سچی زبان پچھلوں میں ﴿۸۴﴾ اور بنا دے مجھے نعمت کے باغ کے وارثوں میں

سے ﴿۸۵﴾ اور معاف کردے میرے باپ کو ، بیشک وہ ہے گمراہوں میں سے ﴿۸۶﴾ اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے ﴿۸۷﴾ جس دن فائدہ نہ پہنچائے گا مال اور نہ بیٹے ﴿۸۸﴾ مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر ﴿۸۹﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا کہ انہوں نے اپنے باپ اور قوم کو توحید کا درس دیا۔ آپ نے یہ انداز اختیار کیا کہ خود ان مشرکین سے ہی پوچھا کہ تم کن چیزوں کی پوجا کرتے ہو انہوں نے کہا کہ ہم تو ان بتوں پر جھکے پڑتے ہیں۔ فرمایا کیا یہ بت تمہاری بات کر سکتے ہیں یا تمہارے لیے کسی نفع نقصان کے مالک ہیں۔ کہنے لگے ، ہم یہ باتیں تو نہیں جانتے ، البتہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے لہٰذا ہم بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کی پوجا کرتے ہیں۔ فرمایا تم تو ان کو اپنا معبود اور کارساز سمجھتے ہو ، مگر یہ سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے کہ فقط وہی میرا دوست اور کارساز ہے اور مجھے اسی پر بھروسہ ہے کہ وہ مجھے بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

صفاتِ ربانی تخلیق اور ہدایت

مشرکین تو اپنے جھوٹے معبودوں کا کوئی کام پیش نہ کر سکے ، البتہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی بعض صفات بیان کیں جن پر مشرکین کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ فرمایا میرا پروردگار ، کارساز ، حاجت روا اور مشکل کشا وہ ہے اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ جس نے مجھے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر چیز کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس نے نسلِ انسانی کی ابتداء مٹی سے کی اور پھر اسے نطفہ کے ذریعے آگے چلایا۔ سورۃ النجم میں ہے وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ اسی نے نطفہ کے ذریعے مرد و زن کے جوڑے پیدا کیے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔

پھر فرمایا فَهُوَ يَهْدِيْنِ پس وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ساتھ ساتھ اُس کی ہدایت کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ انسان کو عقل و شعور عطا کیا تاکہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں غور و فکر کرے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات دیکھے اور پھر اُس کی وحدانیت پہ ایمان لائے۔ یہی نہیں بلکہ اُس نے انسان کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً نبی اور رسول بھیجے۔ ان کے نائبین اور مبلغین نے آ کر اللہ کا راستہ دکھایا۔ پھر اللہ نے اپنی کتابیں نازل فرما کر انسان کی راہنمائی کے لیے مستقل انتظام فرما دیا۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جس نے نہ صرف مجھے پیدا کیا بلکہ میری راہنمائی کا بندوبست بھی کر دیا۔

خورد و نوش کا بندوبست

آپ نے اپنے پروردگار کی تیسری صفت یہ بیان کی وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ میرا پروردگار وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر جاندار کی روزی بھی اللہ ہی کے ذمے ہے۔ اس کا اعلان ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود-٦) زمین پر چلنے پھرنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ وہی وسائل رزق مہیا کرتا ہے تو انسان اور دوسرے جانداروں کو غذا ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا ذکر قرآن پاک میں بار بار کیا ہے کہ وہ سمندروں سے بادلوں کی صورت میں بخارات اٹھاتا ہے۔ پھر ہوا اُن بادلوں کو مطلوبہ خطے کی طرف لے جاتی ہے۔ وہاں پہ اس کے حکم کے مطابق بارش ہوتی ہے جس سے مردہ زمین میں زندگی کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ زمین میں پھل اناج اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں جو انسانوں اور جانوروں کی خوراک بنتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی کسی خطے سے بارش کو روک لے تو وہاں کچھ پیدا نہ ہو اور نہ کسی جاندار کو خوراک میسر آئے۔ اسی لیے فرمایا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جس نے میرے لیے اکل و شرب کا انتظام کر دیا ہے۔

شفا منجانب اللہ

پھر چوتھے نمبر پہ فرمایا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ اور جب میں بیمار ہو جاتا

ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔ بیماری اور شفا دونوں قبضہ قدرت میں ہیں مگر یہاں پر ابراہیم علیہ السلام کے کمالِ ادب کا نمونہ دیکھیے کہ انہوں نے مَرِضْتُ کہہ کر بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا ہے وگرنہ آپ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ کی طرح مَرَّضَنِیْ کہہ کر بیمار کرنے کو بھی اللہ کی طرف منسوب کر سکتے تھے مگر آپ نے بیماری جیسی تکلیف دہ چیز کو اللہ کی بجائے خود اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ اکل و شرب میں بے اعتدالی یا لود و باش میں کسی بے احتیاطی کی بنا پر خود بیمار ہوتا ہوں اللہ تعالیٰ کسی کو بلا وجہ تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ اور پھر جب بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا وہ بخشتا ہے گویا بندے کے حق میں بہتر چیز شفا کو اللہ کی طرف منسوب کیا کہ وہ چاہے تو شفا ہوتی ہے وگرنہ نہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے حکیم اور ڈاکٹر گزرے ہیں جو بڑی بڑی پیچیدہ بیماریوں کا علاج کرتے رہے مگر کسی دوائی میں شفا کی خاصیت پیدا کرنے والی اللہ ہی کی ذات ہے۔ جب تک اُس کا حکم نہ ہو کوئی دوائی کارگر نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ حیلے کے طور پر علاج کرنا تو درست ہے مگر دوائی کو مؤثر بالذات سمجھنا شرک میں ملوث ہونے کے مترادف ہے۔ شفا ہمیشہ منجانب اللہ ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے امت کو یہ دعا سکھائی ہے اَذْھِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَآءَ اِلَّا شِفَآؤُکَ[1] اے سب لوگوں کے پروردگار تکلیف کو دُور کر دے۔ اور شفا دے کہ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیرے سوا کہیں بھی شفا نہیں ہے۔

موت و حیات

ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی پانچویں صفت یہ بیان کی وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ کہ وہی مجھے موت دے گا اور وہی قیامت کو دوبارہ زندہ کریگا۔ موت اور زندگی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی انسان کو پیدا کرتا ہے۔ کسی کو کم عمر دیتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ انسان کی انفرادی موت بھی اور قوم کی مجموعی موت

[1] بخاری ص۸۴۷، ابن کثیر ص۲۹۴

إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (الاعراف ۳۴) جب مقرر وقت آجاتا ہے تو پھر گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی۔ اللہ کا یہ بھی فرمان ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آلِ عمران ۱۸۵) ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حفاظت کرنا چاہے تو کوئی دوسرا شخص لاکھ کوشش کرے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ الغرض! ابراہیم علیہ السلام نے واضح طور پر فرمایا کہ میری موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم لاکھ تدابیر اختیار کر لو، اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مجھے ختم نہیں کر سکتے کیونکہ مجھے موت دینے والا بھی وہی ہے۔

موت ایک مصیبت ہے مگر اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام نے موت کی نسبت اپنی طرف کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے کہ وہی مجھے موت سے ہمکنار کرے گا۔ مفسرین کرام اس اشکال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دراصل موت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کے عزت کے مقام کی طرف انتقال کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لحاظ سے موت ایک نعمت بھی ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بالکل درست ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں جہاں جمعہ کی فضیلت کا ذکر ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی دن آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی، اسی دن اُن کو جنت میں داخل کیا، اور اسی روز آپ کو جنت سے نکالا گیا۔ یہاں بھی یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ تو نعمتِ خداوندی ہے اور اللہ نے اس کا ذکر فضیلت جمعہ کے طور پر کیا مگر جنت سے اخراج تو نعمت نہیں، پھر اس سے جمعہ کی فضیلت کیسے ثابت ہوئی۔ تو یہاں بھی محدثین کرام فرماتے ہیں کہ جنت سے اخراج دراصل اس میں دوبارہ اور ابدی دخول کا سبب اور ذریعہ ہے لہٰذا یہ اخراج نعمت میں شامل ہے۔

مشرکین بعث بعد الموت کے بھی منکر تھے اور کہتے تھے کہ کوئی قیامت

برپا ہوگی، نہ مردے دوبارہ زندہ ہوں گے اور نہ حساب کتاب کی منزل کے بعد کوئی جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام پر یُحْیِیْنِ کا لفظ بول کر کفار و مشرکین پر واضح کر دیا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو مجھے دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور وہ تمہیں بھی دوبارہ زندگی دینے پر قادر ہے۔ وہ ضرور تمہیں قیامت کو دوبارہ زندہ کرکے اپنے سامنے لا کھڑا کرے گا اور پھر تمام کردہ عقائد و اعمال کا حساب ہوگا۔ مکہ کے مشرک بھی قومِ ابراہیم کی طرح قیامت اور جزائے عمل کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جب ہم مرکر مٹی میں مل جائیں گے، ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی۔ تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ جیسا کہ دوسری سورۃ میں مذکور ہے۔ اللہ نے فرمایا

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (یٰسٓ ۔ ۵۱) جب صور میں پھونکا جائیگا تو سب لوگ اپنی خوابگاہوں سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف جائیں گے۔ پھر حساب کتاب کی منزل آنے گی اور اعمال کے فیصلے ہوں گے۔

اچھائی اور برائی کی نسبت

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا اچھائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور برائی کو اپنی طرف منسوب کرنے کا اصول خود اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (آیت ۔ ۷۹) تمہیں جو بھی اچھائی پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو بھی برائی پہنچے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے سفر کے واقعہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ خضر علیہ السلام نے اچھی بھلی کشتی کو عیبناک کر دیا تو اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کشتی بعض مسکین لوگوں کی تھی جو اس کے ذریعے روزی کماتے تھے مگر پیچھے بادشاہ ہر اچھی کشتی پر قبضہ کر رہا تھا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا (الکہف ۔ ۷۹) پس میں نے ارادہ کیا کہ اس کو داغدار کر دوں اگرچہ یہ فعل بھی کشتی کے مالکان کے حق میں تھا۔ مگر عیبناک کرنے کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا کہ ادب کا یہی تقاضا تھا۔ اور آگے جہاں گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کیا

کی خاطر دوبارہ تعمیر کرنے کا فعل تھا تو اُسے اللہ کی طرف منسوب کیا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا (الکہف ۸۲) تیرے رب نے ارادہ کیا کہ دیوار کو اس وقت تک قائم رہنا چاہیئے جب تک یتیم بچے بالغ ہو کر اس کے نیچے سے خزانہ حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

معافی کی درخواست

اللہ تعالیٰ کی مذکورہ پانچ صفات کا ذکر کرنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے عبدیت کے کمال انداز میں اپنی خطاؤں کی بخشش کی دعا کی۔ عرض کیا میرا اللہ وہ ہے جس کی یہ صفات ہیں وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـــَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ میرا پروردگار وہ ہے کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دے گا۔ اللہ کے نبی اور رسول اس کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی خود حفاظت کرتا ہے اور ان سے گناہ سرزد نہیں ہونے دیتا۔ اس کے باوجود اللہ کے نبی جتنے زیادہ مقرب ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے بھی ہیں۔ نوح علیہ السلام نے اپنے ڈوبتے ہوئے بیٹے کے لیے براہِ راست دعا نہیں کی بلکہ کمال عجز کے ساتھ پروردگار کی بارگاہ میں عرض کیا رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ (ہود ۴۵) پروردگار میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے۔ مطلب یہ کہ اسے بچا لے مگر جواب ملا کہ اپنے غیر صالح اعمال کی وجہ سے وہ تیرے اہل خانہ میں سے خارج ہو چکا ہے اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی اور بھائی کی کوتاہیوں کی معافی کی درخواست کی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ (الاعراف ۱۵۱) پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے۔ خود حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (المومنون ۱۱۸) پروردگار! مجھے معاف کر دے اور رحم فرما کہ تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے اپنی کوتاہیوں کی معافی اس انداز میں چاہی کہ میں اُمید رکھتا ہوں۔

کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میری کوتاہی کو معاف فرمائے گا۔

ابراہیم کی دعا

پھر عرض کیا رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا پروردگار مجھے حکم یعنی حکمت عطا فرما
امام رازیؒ[1] فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد نبوت نہیں کیونکہ یہ تو پہلے ہی آپ کو حاصل تھی
البتہ اس سے مراد قوت علمی و نظری کا کمال ہے جس کے ذریعے اشیائے عالم کو کماحقہ
سمجھنے کی اہلیت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس کام پہ مامور کیا تھا۔
اس کے لیے ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی لہذا آپ نے ان چیزوں کے لیے دعا
کی اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ اور مجھے نیکوکاروں کے ساتھ
ملا دے۔ اس سے آخرت میں نیک لوگوں سے ملاقات
مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ میرا انجام بخیر فرما اور مجھے عزت والے مقام میں جگہ عطا
فرما۔ یہ دعا اللہ کے سب نبی اور صالحین کرتے رہے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام
کی دعا کا ذکر بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ آپ نے عرض کیا تھا: اے آسمان و زمین
کے پیدا کرنے والے۔ دنیا و آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے تَوَفَّنِي مُسْلِمًا
وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ (یوسف۔ ۱۰۱) مجھے اسلام کی حالت میں وفات دینا
اور اپنے نیک بندوں کی رفاقت نصیب کرنا۔ ایک حدیث[2] میں حضور علیہ السلام
کی یہ دعا بھی منقول ہے اَللّٰهُمَّ أَحْيِنَا مُسْلِمِينَ وَأَمِتْنَا مُسْلِمِينَ
وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِينَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مُبَدِّلِينَ اے اللہ! ہمیں اسلام
پر زندہ رکھ اور اسلام کی حالت میں ہی موت دے اور نیکوں کے ساتھ ملا دے درآنحالیکہ
نہ رسوائی ہو اور نہ تبدیلی۔ اس سے مراد قوت عملیہ بھی ہے کہ جس کے ذریعے اعمال و
افعال کو صحیح طریقے پہ انجام دیا جا سکے۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ
فِي الْآخِرِينَ اور میرے لیے سچی زبان یعنی میرا ذکر خیر پچھلے لوگوں میں بھی باقی

---

[1] تفسیر کبیر ۱۳۷/ج۲۲ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۳۳۹/ج۳ (ریاض)

رکھے۔ اسی لیے اہل اللہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا طریق باقی رہے تاکہ ان کو اجر و ثواب ملتا رہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد آنے والی نسلیں بھی میرے طریقے پر چلیں اور اس طرح میرا ذکرِ خیر کرتی رہیں۔ آپ کی دعا کی قبولیت کا یہ عالم ہے کہ یہودی، عیسائی اور اہلِ ایمان بیک وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جدالانبیاء تسلیم کرتے ہیں اگرچہ اہلِ کتاب آپ کی تعلیمات سے منحرف ہو چکے ہیں مگر وہ آپ کا ذکرِ خیر ہمیشہ ادب و احترام سے کرتے ہیں۔ جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کو ملتِ ابراہیمی کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ سورۃ بقرہ میں اللہ نے اہلِ کتاب کی بات نقل کی ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو یہودی یا نصرانی بن جانے کا مشورہ دیتے ہیں مگر اللہ نے اپنے آخری نبی کو فرمایا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آیت۔ ۱۳۵) آپ ان سے کہہ دیں کہ ہم تو دینِ ابراہیمی کو اختیار کیے ہوئے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر صرف خدائے واحد کی طرف رجوع کرنے والے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اگر ریا مقصود نہ ہو تو کوئی حرج نہیں کہ کوئی شخص پسند کرے کہ اس کی تعریف کی جائے۔

ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں یہ دعا بھی کی وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ اور مجھے نعمت کے باغوں کے وارثوں میں سے بنا۔ یعنی آخرت میں مجھے کامیابی عطا کرنا اور بہشت میں داخل کرنا ظاہر ہے کہ ہر شخص کی آخری خواہش یہی ہے کہ اسے جنت میں داخل مل جائے۔ سورۃ آل عمران میں جہاں جزائے عمل کا ذکر ہے وہاں اللہ نے فرمایا فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (آیت ۱۸۵) تو جو دوزخ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے لیے نعمت والے باغ یعنی جنت کی دعا کی۔

پھر عرض کیا مولا کریم! وَاغْفِرْ لِأَبِي میرے باپ کو معاف کر دے

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ بیشک وہ گمراہوں میں سے تھا۔ مشرکین کے لیے دُعا کا مسئلہ بھی وضاحت طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں فیصلہ کر دیا ہے کہ کسی نبی اور اہل ایمان کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش طلب کریں اگرچہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ ان کا جہنمی ہونا واضح ہو چکا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام کے باپ بیشک مشرک اور جہنمی تھے مگر یہاں وہ بنے گمراہ باپ کے لیے بخشش کی دُعا کر رہے ہیں۔ اس بات کی وضاحت سورۃ توبہ ہی کی اگلی آیت میں موجود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی باپ کے لئے دعائے مغفرت ایک وعدے کی بنا پر تھی جو وہ اپنے باپ سے کر چکے تھے۔ سورۃ مریم میں ہے کہ بتوں کی مذمت کی پاداش میں جب ابراہیمؑ کو ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا تو جاتے وقت انہوں نے کہا تھا سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (مریم۔ ۴۷) میں تیرے لیے اپنے رب سے بخشش کی دُعا کروں گا۔ بے شک میرا پروردگار بڑا ہی مہربان ہے۔ چنانچہ اسی وعدے کے مطابق آپ نے بخشش کی دُعا کی جو آیت زیر درس میں مذکور ہے۔ مگر سورۃ توبہ میں فرمایا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (آیت ۔ ۱۱۴) مگر جب آپ پر واضح ہو گیا کہ باپ اللہ کا دشمن ہے تو آپ اس سے بیزار ہو گئے اور پھر کبھی باپ کے لیے دُعا نہیں کی۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی عرض کیا وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ مولا کریم! مجھے رسوا نہ کرنا جس دن لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اس دُعا کا تعلق بھی ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے مشرک ہونے سے ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرک کی مغفرت نہیں اور اسی وجہ سے ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دوبارہ دُعا بھی نہیں کی۔ اب قیامت والے دن جب سب اگلے پچھلے لوگ جمع ہوں گے تو اس دن ابراہیم علیہ السلام کے باپ کی ذلت آپ کے لیے رسوائی کا سبب بن سکتی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ قیامت والے دن ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد سے

ملاقات ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا منہ ذلت اور گرد و غبار سے آلودہ ہو رہا ہے دوسری روایت میں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ پروردگار! تیرا وعدہ ہے تو ل ہے کہ مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے جنت کو کافر پر قطعاً حرام کیا ہے ایک اور روایت میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر فرمائیں گے کہ باپ! میں تجھے نہ کہتا تھا کہ میری نافرمانی نہ کر۔ باپ جواب دے گا۔ اچھا اب نہ کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ رب العزت میں عرض کریں گے، پروردگار! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس دن مجھے رسوا نہ کرے گا مگر اس سے بڑھ کر کیا رسوائی ہو گی کہ میرا باپ اس طرح رحمت سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے خلیل! میں نے جنت کو کافروں پر حرام کر دیا ہے۔ پھر حکم ہوگا، ابراہیم! دیکھو تیرے پیروں تلے کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک بدصورت بجو کیچڑ پانی میں لتھڑا کھڑا ہے جس کو پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ ہوں گے جن کی شکل تبدیل کر دی جائے گی۔

مال و اولاد

فرمایا قیامت کا دن ایسا ہوگا يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ اس دن کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا اور نہ کوئی کسی کی طرف سے وکیل پیش ہو کر مقدمہ پیش کر سکے گا وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (مریم - ۹۵) قیامت والے دن ہر شخص اکیلا ہی حساب کتاب کے لیے پیش ہوگا۔ سورۃ آل عمران میں بھی فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا (آیت - ۱۰) کافروں کو ان کے اموال اور اولاد کچھ کام نہیں آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہاں کا مال تو یہیں رہ جائے گا اور انسان خالی ہاتھ اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا۔ جہاں تک اولاد اور دیگر عزیز و اقارب کا تعلق ہے تو وہ سب اپنی اپنی فکر میں ہوں گے۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ○

وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (سورۃ عبس ۳۴،۳۶) انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹے سے بھاگے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی نیکی نہ طلب کرے۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی کہ کس طرح میں بچ جاؤں۔

البتہ بعض مال اور اولاد کام بھی آئیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین چیزوں کا فائدہ اس کو مرنے کے بعد میں پہنچتا رہتا ہے۔ پہلی چیز صدقہ جاریہ ہے کہ آدمی اپنا مال اچھی جگہ صرف کر کے گیا جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن فائدہ دے گا۔ دوسری چیز نافع علم ہے جس سے دوسرے لوگ مستفید ہوں، اور تیسری نیک اولاد ہے جو باپ کے حق میں دعائیں کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ بچپن میں فوت ہونے والا بچہ بھی والدین کے حق میں سفارش کرے گا۔ تو یہ چیزیں موت کے بعد بھی نافع ہوتی ہیں۔ تو اس آیت کریمہ میں غیر مفید ہونا غیر مومن کے لیے ہے۔ ایسے شخص کو نہ مال کام آئے گا اور نہ اُس کی اولاد بلکہ اس کا فیصلہ اُس کے اعمال و عقائد کے مطابق ہوگا۔

قلب سلیم

فرمایا قیامت والے دن ہر شخص کا مال و اولاد تو مفید نہیں ہوگی، البتہ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ مگر جو کوئی اللہ تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا، وہ کامیاب ہوگا، اس دن قلب سلیم ہی مفید ہوگا، مطلب یہ کہ جس انسان کا دل کفر، شرک، نفاق اور بد عقیدگی کی آلودگیوں سے پاک ہوگا اسے لیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کیا ہوا مال بھی مفید ہوگا اور اس کی نیک اولاد بھی مفید ہوگی جو اس کے لیے دعائیں کرے گی۔

حضرت خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ اپنی کتاب سلک السلوک میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ قلب سلیم کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ قلب سلیم ایسا دل ہے جو بیس خصلتوں سے پاک اور بیس خصلتوں سے پُر ہو۔ فرمایا بُری خصلتیں یہ ہیں۔ شرک، کفر، نفاق، عداوت (بلا وجہ) ، رغبت

(لایعنی امور کی طرف) حرص، تساہل، جہالت، اصرار (گناہ پر) تجبر، تعلق (متعلقہ باتوں سے) طمع، لمبی آرزو، بے صبری، خود پسندی، بخل، مایوسی، بے فکری (خدا کی گرفت سے) حسد، بدگمانی اور نسیان (حق و انجام کو فراموش کر دینا) پھر فرمایا اچھی خصلتیں یہ ہیں۔ جو انسان میں موجود ہونی چاہئیں یعنی توحید، اخلاص، نصیحت، زہد، قناعت، یقین، علم، تفویض (اپنے امور کو اللہ کے سپرد کرنا) لوگوں سے مایوسی، آرزو کا اختصار، صبر، موت کی یاد، سخاوت، توبہ، تواضع، خوف و رجاء، تبوک، حسن ظن، اللہ کا ذکر اور اس کی محبت۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ ع

ترجمہ:- اور قریب کر دی جائے گی جنت متقین (ڈرنے والے) کے لیے ﴿۹۰﴾ اور ظاہر کر دیا جائے گا دوزخ کو گمراہوں کے لیے ﴿۹۱﴾ اور کہا جائے گا اُن سے کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کرتے تھے ﴿۹۲﴾ اللہ کے سوا، کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں، یا وہ بدلہ لے سکتے ہیں؟ ﴿۹۳﴾ پھر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے اس میں وہ سب اور

گمراہ ﴿۹۴﴾ اور ابلیس کے تمام لشکروں کو بھی ﴿۹۵﴾ اور کہیں گے وہ جب کہ وہ اس دوزخ میں جھگڑا کرتے ہوں گے ﴿۹۶﴾ اللہ کی قسم، بیشک ہم تھے البتہ کھلی گمراہی میں ﴿۹۷﴾ جب کہ ہم تمہیں پروردگار عالم کے ساتھ برابر کرتے تھے ﴿۹۸﴾ اور نہیں بہکایا ہم کو مگر مجرموں نے ﴿۹۹﴾ پس اب نہیں ہے کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ﴿۱۰۰﴾ اور نہ کوئی محبت کرنے والا دوست ﴿۱۰۱﴾ پس کاش کہ ہمارے لیے دنیا میں دوبارہ پلٹنے کا موقع ہوتا تو ہم ایمان والوں میں سے ہوتے ﴿۱۰۲﴾ بیشک اس میں البتہ نشانی ہے، اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۳﴾ اور بیشک تیرا پروردگار ہی زبردست اور رحم والا ہے ﴿۱۰۴﴾

ربط آیات

اس رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ گذشتہ درس میں آپ کی بعض دعاؤں کا ذکر تھا جو اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیں۔ اور ساتھ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بھی بیان کی گئی تھیں کہ وہی خالق ہے اور صراط مستقیم بھی وہی دکھاتا ہے۔ مجھے روزمرہ کی روزی کا وہی ذمہ دار ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا بھی وہی بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی مجھے موت دیگا اور پھر قیامت کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ پروردگار! میری خطاؤں کو معاف فرما، مجھے حکمت عطا فرما اور نیکوں کے ساتھ الحاق فرما۔ آپ نے پچھلے لوگوں میں اپنے ذکرِ خیر کے جاری رکھنے کی دعا بھی کی۔ اپنے لیے جنت کی درخواست اور باپ کے لیے بخشش کی دعا مانگی۔ اب آج کے درس میں نیکوکاروں کے لیے جنت کی بشارت اور سرکشوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جہنمیوں کے بعض حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جو قیامت کو پیش آنے والے ہیں۔

متقین کے لیے جنت

ارشاد ہوتا ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اور جنت متقیوں کے قریب

کر دی جائے گی۔ قرآن پاک میں جنت تک رسائی دو طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ مگر مفہوم ایک ہی ہے ایک طرز بیان یہ ہے جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جنت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی۔ سورۃ قٓ میں بھی یہی الفاظ ہیں اور آگے اضافہ ہے غَيْرَ بَعِيْدٍ (آیت۔ ۳۱) جو کہ دور نہیں ہوگی۔ اسی طرح سورۃ التکویر میں۔ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (آیت۔ ۱۳) جب جنت قریب کر دی جائے گی۔ بیان کا دوسرا طریقہ عام ہے کہ اہل ایمان کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ جیسے سورۃ النحل میں متقیوں کے متعلق فرمایا جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا (آیت۔ ۳۱) ہمیشہ رہنے کے باغات میں جن میں وہ داخل ہوں گے۔ اسی طرح سورۃ زمر میں ہے کہ فرشتے نیکوکاروں کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائیں گے۔ اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ تو اس کے داروغے ان سے کہیں گے۔ تم پر سلام ہو۔ تم بہت اچھے رہے ہو۔ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (آیت۔ ۷۳) اب اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جنت یا دوزخ لوگوں سے حجاب میں ہوں گے۔ پھر جب وہ حجاب اٹھا دیا جائے گا تو جنتی جنت کو قریب ہی پائیں گے۔ ایک عام مقولہ بھی ہے کہ جب کوئی مسافر سفر کرتے ہوئے کسی شہر یا بستی میں پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ فلاں بستی قریب آگئی ہے حالانکہ بستی تو اپنی جگہ قائم ہوتی ہے اور مسافر خود وہاں پہنچتا ہے۔ اسی طرح جنت تو اپنی جگہ پہ قائم ہے مگر جب جنتی وہاں قریب پہنچیں گے تو اسی کو کہا گیا ہے کہ جنت ان کے قریب کر دی جائے گی۔ اگر اس جملے کو بعینہٖ ظاہری معنوں میں لیا جائے تو بھی درست ہے۔ جیسا کہ دوزخ کے متعلق مسلم شریف میں آتا ہے یوتی بجھنم یومئذ لھا سبعون الف زمام مع کل زمام سبعون الف ملک اس دن جہنم کو کھینچ کر میدان محشر کے قریب لایا جائے گا جس کی ستر ہزار زنجیریں ہوں گی اور ہر زنجیر کے ساتھ ستر ہزار کھینچنے والے فرشتے ہوں گے۔

گمراہوں کا انجام

فرمایا وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ اور ظاہر کر دیا جائے گا۔

دوزخ کو گمراہوں کے لیے۔ جو لوگ عمر بھر کفر و شرک اور گمراہی میں پھنسے رہے ان کو دوزخ کا نظارہ کرا دیا جائے تا جس سے تعلق ہو۔ المعارج میں فرمایا۔ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ (آیت ۱۵-۱۶) یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو کھال ادھیڑ کر رکھ دے گی۔ امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس جہنم میں سے ایک گردن نکلے گی جو گنہگاروں کی طرف غضبناک تیوروں سے دیکھے گی اور ایسا شور مچائے گی کہ دل اڑ جائیں گے۔ کلیجے مل جائیں گے اور مشرکوں سے ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرمایا جائے گا وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ کہاں ہیں تمہارے وہ باطل معبود جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے هَلْ يَنصُرُونَكُمْ کیا آج وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں؟ أَوْ يَنتَصِرُونَ یا وہ بدلہ لے سکتے ہیں؟ مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکیں گے فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ پھر وہ اور تمام گمراہ جہنم میں اوندھے منہ ڈال دیے جائیں گے۔ تابع اور متبوع سب کا ایک ہی ٹھکانا ہوگا اور کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ شیطان کے تمام لشکر بھی جہنم رسید کر دیے جائیں گے۔ جو لوگوں کو بہکا کر کفر اور شرک پہ آمادہ کرتے رہتے۔ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ دوزخ میں پہنچنے والے آپس میں جھگڑتے ہوئے کہیں گے تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ اللہ کی قسم ہم تو کھلی گمراہی میں تھے۔ اس وقت اقرار کریں گے کہ دنیا میں ہم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا اور ادھر ادھر بھٹکتے رہے إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ جب کہ ہم تمہیں پروردگار عالم کے برابر کرتے تھے وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ہمیں تو ان مجرموں یعنی گنہگاروں نے گمراہ کر دیا تھا۔ اس وقت چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کی طرف اشارہ کریں گے اور تابعین اپنے متبوعین کو مورد الزام ٹھہرائیں گے کہ یہ ہم سے اپنی عبادت کراتے رہے۔ ہم ان کے حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر عمل کرتے رہے ان کو نذرانہ پیش کرتے رہے مگر یہ آج ہماری کچھ مدد نہیں کر پائے بلکہ ہمارے ساتھ یہ بھی جہنم

لہ تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۳۹ ج ۴ (فیاض)

ہیں پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں تو انہوں نے مروا دیا

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ آج ہماری سفارش کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا جو ہمیں اس عذاب سے چھڑا سکے وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ اور نہ ہی کوئی محبت کرنے والا دوست ہے جو دوستی کا حق ادا کر سکے۔ اس وقت تابعین سخت مایوسی کا اظہار کریں گے۔ یہاں پر یہ نقطہ غور طلب ہے کہ لفظ شافعین کو جمع لایا گیا ہے جب کہ صدیق مفرد ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ صدیق اسم جنس کی طرح ہے جس کا اطلاق مفرد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سفارشی تو تعداد میں بہت ہوتے ہیں اس لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جب کہ مخلص دوست عزیز الوجود یعنی بہت کم ہوتے ہیں اس لیے صدیق مفرد لایا گیا ہے۔

دنیا میں واپسی کی حسرت

پھر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں دوبارہ لوٹ جائیں اور وہاں جا کر ایمان لانے والوں میں ہو جائیں۔ اب کی بار ہم کفر اور شرک کے قریب نہیں جائیں گے اور نہ شیطان اور دوسرے معبودان باطلہ کے جھانسے میں آئیں گے بلکہ صدق دل سے اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آئیں گے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ مگر ان کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ تابعین کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے، تو ہم ان متبوعین سے اسی طرح بیزاری کا اظہار کریں گے جس طرح آج یہ ہم سے کر رہے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو حسرت کی صورت میں دکھائے گا وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (آیت ۱۶۷) مگر وہ دوزخ سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ ان کی حسرت ان کے دل میں ہی رہ جائے گی۔ سورۃ السجدہ میں بھی ہے کہ مجرم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے سرنگوں کھڑے ہوں گے اور کہیں گے پروردگار! ہم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور سن لیا فَارْجِعْنَا

نَعْمَلْ صَالِحًا (آیت ۱۲) ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے۔ اب ہم اچھے
اعمال انجام دیں گے۔ مگر جواب ملیگا کہ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (آیت ۱۴) اب اپنی کارگزاری کے بدلے میں ہمیشہ کا
عذاب چکھو۔ اب تم واپس نہیں جا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بدبخت اگر دوبارہ
بھی دنیا میں لوٹا دیے جائیں تو پھر وہی بداعمالیاں شروع کر دیں جو پہلے کرتے رہے ہیں

حرفِ آخر

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بیشک اس میں البتہ نشانی ہے اور
وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اللہ کی وحدانیت کی جو دلیلیں
پیش کیں اور قوم کو جس طریقے سے سمجھایا، اس میں خدا تعالیٰ کی یکتائی کی برہان صاف
موجود ہے۔ انسان اگر ذرا سا بھی غور و فکر کرے تو اس کے تمام شکوک و شبہات
رفع ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
ان میں سے لوگوں کی اکثریت ایمان سے محروم رہتی ہے۔ انہیں توحید کی بات
سمجھ میں ہی نہیں آتی اور اس طرح کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں فرمایا یاد رکھو!
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ بیشک تیرا پروردگار زبردست
ہے۔ آج تو یہ لوگ اس کی توحید کو تسلیم نہیں کرتے مگر قیامت والے دن ان کو
پتہ چلے گا کہ جس کے ساتھ غیروں کو شریک بناتے رہے وہ کتنا زبردست اور
غالب ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (آیت ۲۱) اللہ تعالیٰ اپنے
ہر کام پر غالب ہے۔ اس کے ارادے اور مشیت میں کوئی چیز حائل نہیں ہو
سکتی مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے اور وہ گمراہی میں لاپرواہ پڑے رہتے
ہیں۔ فرمایا اس کے ساتھ ساتھ وہ الرحیم بھی ہے۔ اس کا کوئی بندہ جب سرکشی
کو چھوڑ کر اس کے دروازے پر آ جائے اور اس کی وحدانیت کو تسلیم کر لے تو
وہ نہایت رحم والا ہے۔ اور معاف کر دیتا ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ (الانعام ۱۲) اس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر رکھا ہے۔

اس کا یہ بھی فرمان ہے۔ وَرَحْمَتِی وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۵۶)
میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ جب بھی اُس کا کوئی بندہ اُس کی طرف رجوع کرتا ہے
اُس کی رحمت بندے کو ڈھانپ لیتی ہے اور وہ بندے کو معاف کر کے اپنی آغوش
رحمت میں لے لیتا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ ِۨ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ
نُوحٌ اَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ اِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ اَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾
قَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُونَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا
عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى
رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ
يٰنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ
قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ
نَجِّنِي وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ
الْبٰقِينَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾ ع ١٨ / ١

ترجمہ:- جھٹلایا نوح علیہ السلام کی قوم نے اللہ کے رسولوں
کو (١٠٥) جب کہا اُن سے اُن کے بھائی نوح علیہ السلام نے

کیا تم ڈرتے نہیں؟ (۱۰۶) بیشک میں تمہارے لیے رسول ہوں امانت دار (۱۰۷) پس ڈرو اللہ سے اور میری اطاعت کرو (۱۰۸) اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ۔ نہیں ہے میرا بدلہ مگر رب العالمین کے ذمے (۱۰۹) پس ڈرو اللہ سے اور میری اطاعت کرو (۱۱۰) کہا انہوں نے کیا ہم ایمان لائیں تجھ پر حالانکہ تیری پیروی رذیل لوگ کرتے ہیں (۱۱۱) کہا (نوح نے) اور مجھے کیا علم ہے اُن باتوں کا جو کچھ وہ کر رہے ہیں (۱۱۲) اُن کا حساب میرے رب کے ذمے ہے، اگر تم میں کچھ شعور ہے (۱۱۳) اور میں نہیں دھکیلنے والا ایمان والوں کو (۱۱۴) میں نہیں ہوں مگر ڈر سنانے والا کھول کر (۱۱۵) کہا انہوں نے اگر تو باز نہیں آئے گا اے نوحؑ! البتہ ہوگا تو سنگسار کیے ہوؤں میں (۱۱۶) کہا (نوح نے) اے میرے پروردگار! بیشک میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے (۱۱۷) پس فیصلہ کر میرے درمیان اور ان کے درمیان واضح فیصلہ۔ اور نجات دے مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں ایمان والے (۱۱۸) پس ہم نے نجات دی اُن کو اور جو اُن کے ساتھ تھے بھری ہوئی کشتی میں (۱۱۹) پھر ہم نے غرق کر دیا اس کے بعد دوسروں کو (۱۲۰) بیشک اس (واقعہ) میں البتہ نشانی ہے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ ایمان لانے والے (۱۲۱) اور بیشک تیرا پروردگار البتہ زبردست اور نہایت رحم کرنے والا ہے (۱۲۲)

ربط آیات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نصیحت

کے لیے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کا حال بیان کیا ہے۔ ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم مشرکین مکہ کے تعصب اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا اور اپنے پیغمبر کو تسلی دی کہ آپ اتنی دل سوزی نہ کریں۔ پھر اہل ایمان کی تسلی کے لیے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم کا حال بیان کیا۔ فرعون اور قبطیوں کی غرقابی کا ذکر کیا اس سورۃ مبارکہ میں مختلف انبیاء کے ادوار کی ترتیب کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہاں پر مختلف اقوام کے غرور و تکبر کی شدت کے پیش نظر ان اقوام اور ان کے انبیاء کا حال بیان کیا گیا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم چونکہ سب سے زیادہ متکبر تھی، لہٰذا اس سورۃ میں تاریخِ انبیاء اور ان کی اقوام کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کیونکہ آپ کا مخالف نمرود جیسا مغرور بادشاہ تھا۔ اس کے بعد اب نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر آرہا ہے کہ غرور و تکبر میں نمرود کے بعد قوم نوح کا نمبر آتا ہے۔ فرعون کے تکبر کا حال یہ تھا کہ اس نے کہہ دیا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (النّٰزِعٰتِ - ۲۴) میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اور نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار اس طرح کیا اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ (البقرۃ - ۲۵۸) میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ اب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے غرور و تکبر کا ذکر ہو رہا ہے۔

نوح علیہ السلام کا قوم سے خطاب

ارشاد ہوتا ہے کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۣ الْمُرْسَلِيْنَ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں صرف آپ ہی ان کی طرف رسول مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ سورۃ نوح میں صاف موجود ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (آیت - ۱) ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، مگر یہاں پر فرمایا ہے کہ آپ کی قوم نے مرسلین یعنی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔ مفسرین کرام

فرشتے ہیں کہ یہاں پر جمع کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی ایک کا جھٹلانا سب کے جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اللہ کے تمام نبی توحید اور ایمان ہی کی دعوت دیتے رہے۔ تمام انبیاء کے بنیادی اصول دین ایک ہی ہیں لہٰذا یہاں پر جمع کا صیغہ مرسلین استعمال کیا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ جب ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ تم اللہ کے نبی کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہو بلکہ طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی تکلیفیں بھی پہنچاتے ہو۔ کیا تم خدا تعالیٰ کی گرفت سے خوف نہیں کھاتے؟ یہاں پر نوح علیہ السلام کو آپ کی قوم کا بھائی کہا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ اپنی قوم اور برادری کے ایک فرد تھے اس لیے نسب میں ان کے بھائی تھے۔ بعض نبیوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر اقوام کی طرف بھی مبعوث فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے مگر اللہ نے ان کو شرق اردن کی دوسری قوم کی طرف مبعوث فرمایا۔ آپ ان کے خاندانی بھائی نہیں تھے۔ بھائی بندی کے بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً ایک ہی دین کے پیروکار آپس میں دینی بھائی ہوتے ہیں۔ ایک ملک کے باشندے یا ایک زبان بولنے والے لوگوں میں بھی ملکی یا لسانی رشتہ اخوت موجود ہوتا ہے۔ جب کسی غیر ملک میں جا کر ایک ہی ملک کے رہنے والے دو آدمی اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ ملکی بھائی کہلاتے ہیں۔ بہرحال نوح علیہ السلام بھی قومی اور نسبی اعتبار سے اپنی قوم کے فرد اور ان کے بھائی تھے اسی لیے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کی قوم سے ان کے بھائی نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ دیکھو اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ میں تمہاری طرف امانتدار رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ ظاہر ہے کہ حق تبلیغ کی ادائیگی میں اللہ کا پیغمبر امانت دار ہوتا ہے۔ جو تبلیغ کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ

علی ندوی کے اشراف لوگ میں یہی تکبر کی بات تھی۔ جو قوم فرعون اور نمرود نے بھی کی تھی۔ قریش مکہ بھی اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ وہ بھی کہتے تھے کہ تیرے پاس گھٹیا درجے کے لوگ آکر بیٹھتے ہیں ہم ان کی ہمنشینی کیسے اختیار کر سکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں یہی کچھ ہوا۔ صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ جیسے اشراف بہت کم تھے۔ جو ابتدائی دور میں ایمان لائے۔ ورنہ جمہور خاندانی آدمیوں کا حال یہی تھا کہ جب کوئی دوسر راستہ نہ رہا تو چاروناچار ایمان لے آئے۔ ابوسفیانؓ نے بیس سال تک سخت مخالفت کی جنگیں لڑیں۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ان میں بڑا اخلاص پیدا ہو گیا تھا اور وہ جاہلیت کی زندگی پر سخت افسوس کیا کرتے تھے خود اپنے خاندان کے لوگوں کے روبرو کہا کرتے تھے کہ ہم نے سخت غلطی کی۔ لہٰذا اس غلطی کی تلافی کی صورت یہی ہے کہ باقی زندگی میں دین کی بڑھ چڑھ کر خدمت کی جائے۔ چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ اکثر انبیاء کی امتوں میں غرباء ہی پہلے اسلام لائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ اسلام کی ابتدا غریبوں سے ہوئی اور پھر یہ غریبوں ہی میں سمٹ کر رہ جائے گا۔ لہٰذا غرباء لوگ ہی خوشخبری کے مستحق ہیں۔ نسل، رنگ یا خاندان کی بناء پر کسی کو حقیر جاننا سخت جہالت کی بات ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے كُلُّكُمْ أَبْنَاءُ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آپ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ لہٰذا پیدائشی طور پر کوئی حقیر یا اشرف نہیں ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۱۳) اللہ تعالیٰ کے ہاں باعزت اور شریف وہ ہے جو زیادہ متقی ہے لہٰذا کسی کو کسی نسل پیشے کی بناء پر کم تر خیال کرنا نہایت ہی بری بات ہے۔ بلکہ یہ تو انسانیت کی توہین ہے۔

فقہائے کرام نے پیشوں کے لحاظ سے جو کفو کا مسئلہ نکالا ہے وہ محض انتظامی سہولت کے لیے ہے کہ ہم پیشہ لوگوں کو آپس میں زیادہ مناسبت ہوتی ہے

ص مسلم ص۸۴ ج ۱ (فیاض)

لہٰذا اگر وہ آپس میں رشتے ناطے کریں گے تو ان کے لیے آسانی ہوگی۔ اہلِ لغت فرماتے ہیں کہ یہ کوئی لازم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ہر مسلمان دوسرے کا کفو ہے اور رشتہ کر سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سادات کی عورتوں کا نکاح امتیوں سے نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی غلط بات ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے اپنے منہ بولے بیٹے زید جو آزاد کردہ غلام تھے، کا نکاح قریشی خاندان کی حضرت زینبؓ سے کرایا۔ اگرچہ بوجوہ ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ مگر ہر مومن دوسرے مومن کا کفو ہے۔ ہاں اگر کوئی مرد یا عورت دینی یا اخلاقی اعتبار سے معیوب ہے تو اس میں خرابی آنے کی۔ گویا شرافت یا رذالت دین اور اخلاق کے اعتبار سے ہے نہ کہ برادری، خاندان اور پیشوں کے اعتبار سے۔ بعض خاندانوں کو اللہ نے دنیاوی طور پر بھی معزز بنایا ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کریں، ورنہ حقیقت میں تو سارے اولادِ آدم ہی ہیں۔ بہرحال نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ سے کہا کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں جب کہ آپ کے ہم نشین اور اتباع کرنے والے تو رذیل لوگ ہیں۔

اہلِ ایمان کی قدر و قیمت

ارشاد ہوتا ہے قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ نوح علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے کیا علم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ان کا حساب تو میرے رب کے پاس ہے اگر تم کچھ شعور رکھتے ہو۔ مطلب یہ کہ جن لوگوں نے صدقِ دل سے ایمان قبول کیا ہے ان کی نیت اور ارادے کو تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے، ان کے اعمال سے بھی اللہ تعالیٰ واقف ہے۔ تم ان کو حقیر سمجھتے ہو مگر میں تو ایسا نہیں سمجھتا لہٰذا میں ان کو اپنی مجلس سے کیوں اٹھا دوں۔ میں تو تمہارے کہنے پر ایسا کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تمہارا خیال غلط ہے کہ ہدایت قبول کرنے والے کمین لوگ ہیں بلکہ اللہ کے ہاں یہی اہلِ ایمان عزت و احترام کے قابل ہیں۔ لہٰذا وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ میں ان مخلص ایمان والوں کو اپنی مجلس سے نہیں نکال سکتا۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

سنگدل کے ذمے تھے وہ حق بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر جب تنگ آگئے نوح علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَتْحًا پس میرے اور ان کے درمیان کھلا فیصلہ کر دے وَّنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اور مجھے اور میرے ساتھ دوسرے ایمان والوں کو نجات دے۔ اللہ کے سخت ترین مصائب پر صبر کرتے تھے مگر آخر اللہ کے سامنے اپنی مدد کے لیے درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (المومنون - ۳۹) پروردگار! میری مدد فرما کہ یہ لوگ مجھے جھٹلاتے ہیں۔

دعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ پس ہم نے نجات دی حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی کے ذریعے۔ یہاں پر کشتی بنانے اور پھر طوفان آنے کا ذکر نہیں کیا۔ دوسری سورتوں میں مفصل حالات مذکور ہیں۔ نوح علیہ السلام کی دعا کے ضمن میں صرف اتنا فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو اور آپ کے ساتھ والے بشمول اسی افراد کو بچا لیا جو کشتی میں سوار ہو گئے۔ یہ کشتی اللہ کے حکم سے حضرت نوح علیہ السلام نے خشکی پر بنائی تھی جس کی لمبائی ساڑھے چار سو فٹ تھی۔ یہ تین منزلہ کشتی تھی اور ہمارے زمانے کے سفینہ نما جیسے بحری جہاز کے مانند تھی جس میں جانوروں کا ایک ایک جوڑا اور باقی انسان تھے جن میں نوح علیہ السلام کے دو بیٹے اور ان کی بیویاں بھی شامل تھیں۔

بہرحال فرمایا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو بچا لیا ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ پھر اس کے بعد ہم نے باقی سب انسانوں اور جانوروں کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ یہ اتنا بڑا سیلاب تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تورات کے بیان کے مطابق طوفان کا پانی بلند ترین پہاڑوں سے

بھی نیست و نابود ہوگئے اور بچا چلا گیا اور سب کچھ غرق ہوگیا فرمایا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً
اس سارے واقعہ میں ایک نشانی ہے جسے اہل مکہ اور بعد میں آنے والے بھی دیکھ
لیں کہ مجرموں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔ اس کشتی کو بھی اللہ نے نشانی کے
طور پر باقی رکھا ہے جو کہ انسانی تاریخ کا ایک نمونہ ہے۔ اس قدر برے انجام کے
باوجود اللہ نے فرمایا وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اکثر لوگ ایمان
قبول کرنے والے نہیں ہیں۔ آج بھی دیکھ لیں کہ انبیاء کی آمد کتب کے نزول اور
ہدایت کے دیگر تمام تر اسباب مہیا ہونے کے باوجود لوگوں کی اکثریت ایمان
سے خالی ہے لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور کفر، شرک اور رسم و رواج
کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ فرمایا وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ
الرَّحِیْمُ بیشک تیرا پروردگار غالب بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ حضرت
نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے حق میں خدا تعالیٰ کی صفت رحمت
کا ظہور ہوا جبکہ باقی مجرموں کے لیے اس کی صفت عزیز کا ظہور ہوا کہ وہ سب
پر غالب بھی ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾ إِنِّى لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٢٥﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٢٦﴾ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٢٧﴾ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ ءَايَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣١﴾

ترجمہ: جھٹلایا قوم عاد نے اللہ کے رسولوں کو ﴿۱۲۳﴾ جب کہا ان کے لیے ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۲۴﴾ بیشک میں تمہارے لیے رسول ہوں امانت دار ﴿۱۲۵﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ﴿۱۲۶﴾ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ، میرا بدلہ نہیں ہے مگر رب العالمین کے ذمے ﴿۱۲۷﴾ کیا بناتے ہو تم ہر جگہ پر ایک نشانی جس کے ساتھ تم کھیل کرتے ہو ﴿۱۲۸﴾ اور بناتے ہو تم مختلف کاریگریاں (یا عالیشان مکانات) شاید کہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے ﴿۱۲۹﴾ اور جب تم ہاتھ ڈالتے ہو کسی پر تو گرفت کرتے ہو تم ظلم کے ساتھ ﴿۱۳۰﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ﴿۱۳۱﴾

ربط آیات

یہ تسلی کا مضمون بیان ہو رہا ہے۔ سورۃ ہذا کی ابتدائی آیات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے رفقاء کو تسلی دی گئی تھی کہ آپ اتنی زیادہ فکر نہ کریں اگر یہ لوگ آپ کی بات کو تسلیم کیوں نہیں کرتے بلکہ آپ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہیں اور نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اب اسی سلسلے میں سابقہ اقوام کا حال بیان کیا جا رہا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر مشرکین بہت بڑے سرکش ہیں تو ان سے پہلی اقوام کے لوگ بھی کوئی کم سرکش نہیں تھے۔ انہوں نے بھی اپنے انبیاء علیہم السلام کو سخت تکالیف پہنچائیں۔ ان کی تخریب کی وجہ سے وہ خود ہی ہلاک ہوئے گذشتہ مضمون میں قوم فرعون، قوم ابراہیم اور قوم نوح کا ذکر ہو چکا ہے۔ قوم فرعون اور قوم نوح کو اللہ نے پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے بابلی لوگ بھی بڑے ظالم اور سرکش تھے۔ انہوں نے آپ کو سات سال تک قید میں رکھا، پھر آپ کو بڑی آگ میں پھینک دیا مگر اللہ نے آپ کو صحیح سلامت بچا لیا۔ پھر بابل والوں پر اللہ کی گرفت آئی اور وہ تباہ و برباد ہوئے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کا تذکرہ فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنے رسول حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان کا کیا انجام ہوا۔

قوم عاد کا بیان

ارشاد ہوتا ہے كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ قوم عاد نے بھی اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔ اگرچہ ان کے رسول تو ہود علیہ السلام ہی تھے مگر یہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ تمام رسولوں کا دین اور مشن تو ایک ہی رہا ہے لہٰذا کسی ایک رسول کو جھٹلانا تمام رسولوں کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اسی طرح خطاب کیا اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ جب کہا ان کو ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طرح حضرت ہود علیہ السلام بھی اسی قوم کے فرد تھے۔ اس لیے آپ کو ان کا بھائی کہا گیا ہے۔ تو انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا اَلَا تَتَّقُوْنَ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ اللہ کے نبی کی تکذیب کرتے ہو، اسراف اور دیگر طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کفر و شرک تمہارا شعار ہے مگر اس کے باوجود تم خدا تعالیٰ کی گرفت سے ڈرتے نہیں۔ یاد رکھو اِنِّیْ لَکُمْ

رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول اور امانتدار ہوں میں تمہیں اللہ کا پیغام بے کم و کاست پہنچاتا ہوں کسی کی رو رعایت نہیں رکھتا لہٰذا فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اس کے بعد آپ نے وہی جملہ دہرایا جو سارے نبی کہتے آئے ہیں وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ میں تم سے اس تبلیغ حق کے عوض کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا کیونکہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کیونکہ میرا بدلہ تو صرف تمام جہانوں کے پروردگار کے ذمے ہے۔ وہی مجھے حق محنتانہ ادا کرے گا۔ میرا تم سے صرف یہی مطالبہ ہے کہ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرو اور میری بات مان کر ہدایت کے راستہ پر گامزن ہو جاؤ کفر شرک اور معاصی کو ترک کر کے اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ۔

اسراف کی بیماری

مختلف اقوام میں مختلف اخلاقی بیماریاں پائی جاتی رہی ہیں۔ عقیدے کی بیماری کفر، شرک تو ہر قوم میں تھا۔ تاہم قوم نوح، قوم ابراہیم اور قوم فرعون کی اخلاقی بیماریوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح قوم عاد میں ظلم و ستم کے علاوہ اسراف کی بیماری عام تھی۔ بڑی بڑی عمارات تعمیر کرنا ان کا عام مشغلہ تھا جن کا کوئی خاص مصرف نہیں بلکہ محض نمود و نمائش مطلوب ہوتی تھی۔ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ کیا بناتے ہو ہر اونچی جگہ پر کوئی نشانی شغل کے لیے؟ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ اور طرح طرح کی کاریگریاں یا مکانات بناتے ہو لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ گویا تم نے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ آپ نے قوم کی توجہ اس طرف دلائی کہ تم عالیشان عمارات بنا کر اور اس میں نقش و نگار کر کے فضول خرچی کے مرتکب ہوتے ہو۔ رہائش یا کسی دوسرے ضروری مقصد کے لیے کوئی عمارت تعمیر کی جائے تو اس میں تو کوئی حرج نہیں مگر اتنی بڑی بڑی عمارات بنانا جن کا کوئی مصرف نہ ہو، محض اسراف ہے۔ اللہ کے نبی نے قوم کو ایسی بات سے منع فرمایا۔

قوم عاد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے سامی نسل سے تعلق رکھتی تھی
ان کا مرکز یمن کے اطراف میں وادئ دابنا اور ریگستانی علاقہ تھا۔ یہ لوگ فنِ
تعمیر کے ماہر تھے۔ انہوں نے بیشمار عمارتیں تعمیر کیں جن میں قصرِ عمدان یا غمدان
چالیس منزلہ تھا۔ اس کے کھنڈرات حضرت عثمانؓ کے دور تک پائے جاتے
تھے۔ مصر سے لے کر ترکستان، ہندوستان اور ایشیا کے دیگر ممالک پر ان
کا دبدبہ تھا۔ اہرامِ مصر بھی ساڑھے پانچ ہزار سال پرانے ہیں۔ کچھ سلامت ہیں
اور کچھ ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ جس طرح فراعین مصر کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے
کا شوق تھا، اسی طرح قوم عاد بھی نمود و نمائش کے لیے عالیشان عمارتیں تعمیر
کرتی تھیں۔

بے جا عمارات

ان آیات میں آمدہ الفاظ ریع، تعبثون اور مصانع خاص طور پر توجہ طلب
ہیں۔ ریع کا معنی درہ بھی ہوتا ہے مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں
کہ ریع کا معنی اونچی جگہ ہے۔ قوم عاد کے لوگ اونچے ٹیلے پر اونچی اونچی عمارتیں،
مینار اور گنبد وغیرہ بناتے تھے۔ دوسرا لفظ مصانع ہے جو مصنع کی جمع ہے
آجکل یہ لفظ فیکٹری یا کارخانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر یہ لفظ بطورِ مصدر
ہو تو اس کا معنی مختلف کاریگریاں یا فنون ہوگا۔ تاہم یہاں پر عالیشان مکانات،
محلات، مینار، گنبد اور کبوتر اڑانے کے اونچے چبوترے مراد ہیں جنہیں قوم
عاد کے لوگ تعمیر کرتے تھے۔ قرآن پاک کی رُو سے بلا ضرورت ایسی شاندار
عمارات تعمیر کرنا اسراف میں داخل ہے۔ جسے اس مقام پر عبث سے
تعبیر کیا گیا ہے یعنی فضول، بے مقصد۔ عبث قول سے ہو یا فعل سے
دونوں طرح نامناسب ہے۔ غرضیکہ عبث ہر وہ چیز ہے جس کا نتیجہ انسان کے
حق میں آخرت کے اعتبار سے اچھا نہ نکلے اور یہ قابلِ مذمت ہے۔
پرانی اقوام میں اس قسم کی عبث عمارات مصریوں کے ہاں بھی پائی
جاتی ہیں۔ مشہور اہرام مصر فراعین کے قبرستان اور مقبرے ہیں۔ برصغیر میں

تاج محل آگرہ، مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہاں، قطب صاحب کی لاٹ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ حیدر آباد دکن میں کسی امیر آدمی نے قصر فلک نما بنا کر افضل الدولہ کو تحفے میں دیا تھا یہ پہاڑی کے اوپر بنا ہوا عالیشان محل ہے جس کے چالیس کمرے ہیں اور ہر کمرے کی آرائش، ترتیب و زینت، فرنیچر، پردے، رنگ و روغن اور ماحول الگ الگ ہے۔ اسی طرح پاکستان کی تاریخ میں جناح صاحب کا مقبرہ کروڑوں کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے۔ لاہور میں مینار پاکستان ہے۔ علامہ اقبال کا مقبرہ ہے اس کے علاوہ کھیلوں کے لیے بڑے بڑے سٹیڈیم اور کمپلیکس تعمیر ہوئے ہیں جن پر کروڑوں روپیہ صرف ہوا ہے۔ یہ سب عمارات نام و نمود کے لیے تعمیر ہوئی ہیں ورنہ ان کا حقیقی فائدہ کچھ نہیں۔ ان کی بجائے اگر یہی روپیہ سکول کالج یا لائبریریاں بنانے پہ صرف ہوتا تو لوگوں کو اجتماعی فائدہ ہوتا۔ غریب لوگوں کے لیے مکانات تعمیر ہوتے تو ان کے بچوں کو سردی اور گرمی سے پناہ گاہ حاصل ہو جاتی جس سے ہزاروں خاندان مستفید ہو سکتے تھے۔ مگر اس قسم کی عالیشان عمارات جن کا کوئی خاص مقصد نہیں عبث کی تعریف میں آتی ہیں۔ بھلا اہرام مصر فرعونوں کو آخرت میں کیا فائدہ دیں گے۔ ان کی شہرت اسی دنیا تک محدود ہے۔ اسی طرح ستر لاکھ روپے سے تعمیر ہونے والا لاہور کا مینار پاکستان کس قدر مفید ہو سکتا ہے۔ یہی رقم اگر لوگوں کی تالیف قلوب پر ہی صرف ہوتی تو لوگ مرتد ہونے سے بچ جاتے۔ عیسائی مشنریاں اسی دولت کی بنا پر مسلمانوں کو عیسائی بنا رہی ہیں۔ نادار مسلمانوں کی دستگیری کی جائے تو لوگ اسلام جیسے اعلیٰ و ارفع دین کو فروخت کرنے پہ تو مجبور نہ ہوں۔ لبنان کی جنگ کے نتیجے میں بارہ سو لاوارث بچوں کو انگریزوں نے اپنی کفالت میں لے لیا۔ آخر وہ عیسائی ہی بنیں گے۔ دنیائے اسلام کی نظریں ان ضروری کاموں کی طرف کیوں نہیں اٹھتیں۔ ذاتی نمائش کے لیے عالیشان محلات، سر بفلک پلازے، بڑے بڑے اسمبلی ہال، پریذیڈنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس جیسی عمارات محض شان و شوکت کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے

تسکین عمارات سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ یہ سب فضول خرچی ہے جو کہ عبث ہے۔

طبرانی نے جید سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے جسے صاحب تفسیر مظہری نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس کی دولت کو مٹی اور گارے میں لگا دیتا ہے۔ دیکھ لیں آج بلڈنگ بازی کا شوق کن لوگوں کے سروں پر سوار ہو چکا ہے۔ آخرت کی کچھ فکر نہیں۔ محض دنیا کی نمود و نمائش کے لیے عمارات تعمیر کی جا رہی ہیں، ورنہ اگر محض رہائش مقصود ہو تو وہ کم خرچ سے تھوڑی جگہ پر بھی بن سکتی ہے۔ اس سے آرائش و زیبائش کے اخراجات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مگر لوگ ان کو اس طرح تعمیر کر رہے ہیں گویا کہ ہمیشہ ان میں رہائش پذیر ہوں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بھی فرمان ہے كُلُّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ إِلَّا مَا إِلَّا مَا۔ ہر عمارت اپنے بنانے والے کے لیے باعث وبال ہوگی سوائے اس کے جو ضروری ہے اور جس میں رہائش مقصود ہے۔ دوسری روایت میں آتا ہے۔ ہر بنائی جانے والی عمارت وبال ہے اِلَّا مَا كَانَ مِنْ مَسْجِدٍ اَوْ دَارٍ سوائے مسجد یا گھر کے۔ مسجد کو اگر خوشنما بھی بنا دے گا تو اُس میں کوئی حرج نہیں۔ باقی عمارتیں انسان کے لیے وبالِ جان ہیں۔ لوگ انہیں یادگار کے طور پر بناتے ہیں مگر آخرت میں ان کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ایسے لوگ اسراف کے جرم میں قابلِ مؤاخذہ ہوں گے

دنیا کی بے ثباتی

شداد اسی قوم عاد کا ایک فرد تھا جس نے باغ ارم تعمیر کرایا تھا۔ اُس نے دنیا میں جنت کا نمونہ تیار کروایا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ مگر اُس کو اس باغ میں داخلہ بھی نصیب نہ ہوا۔ ابھی دروازے پر ہی تھا کہ موت کا وقت آ گیا۔ ایک اور روایت میں کیسی دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی قلت اور وقوعِ موت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ روزمرہ مشاہدہ میں آ رہا ہے مگر ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ موت دوسروں کے لیے ہے اور وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اسی زعم میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے جو کہ سب عبث ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں حضور علیہ السلام
کے ساتھ جا رہا تھا۔ راستے میں حضور علیہ السلام کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ آپؐ
فارغ ہو کر فوراً مٹی سے تیمم کر لیا۔ میں نے عرض کیا: حضور! پانی تو قریب ہی ہے
آپ ذرا توقف فرما کر وضو ہی کر لیتے۔ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ وَمَا
يُدْرِيْنِي لَعَلِّي لَا اَبْلُغُ مجھے کیا علم کہ میں پانی تک پہنچ بھی سکوں گا
یا نہیں۔ لہٰذا میں نے فوری طور پہ تیمم ہی کر لیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہمارے پاس سے
گزرے۔ میں اور میری والدہ اس وقت اپنی جھونپڑی مرمت کر رہے تھے۔ آپ علیہ السلام
نے فرمایا: عبداللہ! کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا: حضور! جھونپڑی اصلاح طلب تھی اس کو
ٹھیک کر رہے ہیں۔ فرمایا: اَلْاَمْرُ اَعْجَلُ مِنْ ذٰلِكَ معاملہ تو اس سے بھی
جلدی کا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس جھونپڑی کی درستگی کے بعد تمہیں اس میں رہنا بھی
نصیب ہو گا یا نہیں۔ کیا پتہ کہ موت کس وقت آ جائے۔

حضرت ابو درداؓ کا وعظ

جس طرح حضرت ابوذر غفاریؓ کمال درجے کے مجذوب اور حضرت عبداللہ
ابن مسعودؓ فقیہ الامت یعنی امت محمدیہ کے بڑے فقیہ تھے۔ اسی طرح حضرت
ابو درداؓ حضور علیہ السلام کی امت کے حکیم الامت تھے۔ مسلمانوں کے عروج
کے زمانے میں آپ دمشق گئے تو دیکھا کہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں۔
آپ مسجد میں آئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر اعلان کیا۔ اے اہل دمشق!
میری بات سنو! کیا تمہیں حیا نہیں آتی کہ عالیشان عمارات بنا رہے ہو۔
تَجْمَعُوْنَ مَالَا تَاْكُلُوْنَ تم ایسی چیزیں جمع کرتے ہو جنہیں کھانا
نصیب نہیں ہو گا۔ ایسی عمارات بناتے ہو جن میں رہنا نصیب نہیں ہو گا اور
ایسی چیز کی آرزو کرتے ہو جسے پا نہیں سکتے۔ تم سے پہلے بہت سی قومیں گزری
ہیں جو جمع کرتی تھیں۔ مال و دولت سمیٹ سمیٹ کر رکھتی تھیں۔ مضبوط تعمیرات
کرتی تھیں۔ لمبی آرزوئیں باندھتی تھیں مگر یہ سب چیزیں باطل ثابت ہوئیں اور وہ

قومیں ہلاک ہوگئیں۔ فرمایا اب اُن قوموں کے مساکن قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ دیکھو! قوم عاد عدن سے عمان تک برسر اقتدار تھی۔ اُن کے گھوڑے اور اونٹ دوڑتے تھے۔ اُن کے پاس آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ مگر آج اُن کی پوری وادی ویران اور سنسان پڑی ہوئی ہے جسے کوئی ٹکے پر بھی لینے کے لیے آمادہ نہیں۔ بھلا تم لوگ کن کاموں میں مصروف ہو گئے ہو کہ بڑی بڑی عمارتیں بنانا شروع کر دی ہیں۔

بہر حال اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبث کیا بھی برا اچھا نہیں ہے۔ ایسی عمارتیں بنانا جن کا کوئی خاص مصرف نہ ہو۔ محض نمود و نمائش کا اظہار ہو۔ ان کا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایسا کرنا بری بات ہے اور حضرت ہود علیہ السلام کے بیان سے ان کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔

ظلم و زیادتی

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی دوسری خرابی یہ بیان فرمائی وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ لوگو! جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو ظلم و ستم ڈھاتے ہو قوم عاد کے لوگ اپنے ارد گرد کے کمزور لوگوں پر بڑا ظلم کرتے تھے، ان سے بیگار لیتے۔ اُن کی مزدوری ادا نہ کرتے اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے۔ اللہ کے نبی نے اُن کو ظلم و ستم سے منع کیا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر، شرک، کفر، فضول خرچی، نمود و نمائش، فضول عمارات، مینار اور گنبد تعمیر کرنے اور نادار اور کمزوروں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان باتوں سے آگاہ کیا اور یہ بھی فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ اور میری بات مانو۔ میں تمہیں اللہ کے احکام ٹھیک ٹھیک پہنچا رہا ہوں کہ میں اس کا امانتدار رسول ہوں۔ اگلی آیات میں مزید وعظ و نصیحت کا ذکر ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِیٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ﴿١٣٦﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ۗ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿١٣٩﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿١٤٠﴾

ع ٧ (١٨)

ترجمہ:- اور ڈرو اُس ذات سے جس نے تم کو مدد پہنچائی ہے اُن چیزوں کے ساتھ جن کو تم جانتے ہو ﴿١٣٢﴾ اُس نے مدد پہنچائی ہے تم کو جانوروں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ ﴿١٣٣﴾ اور باغات کے ساتھ اور چشموں کے ساتھ ﴿١٣٤﴾ بیشک میں خوف کھاتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ﴿١٣٥﴾ کہا اُن لوگوں نے (جواب میں) برابر ہے کہ تو نصیحت کرے یا نہ ہو تو نصیحت کرنے والوں میں سے ﴿١٣٦﴾ نہیں ہے یہ مگر عادت پہلے لوگوں کی ﴿١٣٧﴾ اور نہیں ہیں ہم کہ ہمیں سزا دی جائے ﴿١٣٨﴾ پس جھٹلایا انہوں نے اُس (ہودؑ) کو۔ پھر ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ بیشک اس میں البتہ نشانی ہے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ ایمان لانیوالے ﴿١٣٩﴾

اور تحقیق تیرا پروردگار وہی ہے زبردست ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے (۱۴۰)

ربطِ آیات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے رفقاء کی تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں پہلے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور ان کے ساتھ فرعون کا ذکر کیا۔ پھر نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کا حال بیان کیا۔ اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ پھر ہود علیہ السلام کی قوم عاد کا حال بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان اقوام میں پائی جانے والی بیماریوں کا تذکرہ فرمایا کہ اللہ کے نبی اپنی اپنی اقوام کو ان خرابیوں سے منع کرتے رہے۔ کفر و شرک کی بیماری تو تمام اقوام میں قدر مشترک تھی۔ اس کے علاوہ کسی میں معاملات کی خرابی تھی کسی میں ظلم و زیادتی پائی جاتی تھی اور کوئی قوم خلاف وضع فطری امر میں مبتلا تھی۔ بعض میں غرور و تکبر اس حد تک تھا کہ وہ اللہ کے نبی کو کہتے کہ ہم تمہاری مجلس میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں جب کہ تمہارے پاس حقیر لوگوں کی نشست و برخاست ہے۔ گذشتہ درس میں حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ ایک تو ان میں اسراف بکثرت تھا، وہ بڑی بڑی عمارات، گنبد، مینار اور مقبرے بناتے تھے۔ جن کا کوئی فائدہ نہ تھا، محض نمود و نمائش تھی اور دوسرے یہ کہ وہ ظالم و جابر قسم کے لوگ تھے کمزور لوگوں پر زیادتی کرتے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو نہایت سختی سے پیش آتے ہو۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی معرکۃ آلارا کتاب حجۃ اللہ البالغہ[1] میں فرماتے ہیں کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کے مشن میں جہاں عقائد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح شامل تھی وہاں "رفع التظالم من بین الناس" بھی شامل رہا ہے۔ یعنی ہر نبی کا یہ فرض منصبی رہا ہے کہ لوگوں کو ظلم و زیادتی سے منع فرمائے۔ چنانچہ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ظلم و ستم سے منع فرمایا، اور ساتھ ساتھ انعامات بھی گنوائے

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱/۱۸ (فیاض)

جو اللہ نے ان پر کیے تھے اور ان کا شکر ادا کرنے کی تلقین فرمائی۔ انعام ہمیشہ اپنے منعم کا
شکریہ چاہتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ
لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بھی
شکر گزاری نہیں کرتا۔ فرمایا جو شخص تمہارے ساتھ احسان کرے اُس کو احسان کا بدلہ دو۔
اگر بدلہ نہیں دے سکتے تو کم از کم اُس کے لیے دعائے خیر ہی کر دو۔ اب آج کے
درس میں ہود علیہ السلام کی طرف سے بیان کردہ اللہ کے بعض انعامات کا ذکر ہے
اس کے ساتھ قوم کا جواب اور پھر اُن کی ہلاکت کا تذکرہ ہے

انعاماتِ الٰہیہ کا شکریہ

ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا وَاتَّقُوا
الَّذِيٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کی اس ذات سے ڈرو جس نے
تمہیں مدد پہنچائی ہے اُن چیزوں کے ساتھ جن کو تم جانتے ہو۔ سب سے بڑی نعمت تمہارا
اپنا وجود ہے اور پھر اس جسم کو ملنے والی بے شمار بیرونی نعمتیں ہیں جن میں تم ڈوبے ہوئے
ہو۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
لَا تُحْصُوْهَا (آیت۔ ۱۸) اگر تم اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کو شمار کرنا چاہو تو
نہیں کر سکتے۔ اِن کی تعداد اور مقدار اس قدر زیادہ ہے کہ تم اِن کا احاطہ نہیں کر سکتے۔
مگر افسوس کا مقام ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم۔ ۳۴)
انسان بڑا ہی ظالم اور ناشکر گزار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عمر بھر عبادت و
ریاضت میں گزار کر اللہ تعالیٰ کی ایک ادنیٰ ترین نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔
چہ جائیکہ تمام نعمتوں کا احاطہ کر سکے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ وہ انسان
کی طرف سے تھوڑے سے شکریہ کے ساتھ بھی راضی ہو جاتا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
نے تمہارے لیے بے شمار نعمتیں پھیلا دی ہیں جو روزمرہ تمہارے مشاہدہ میں آتی ہیں
اور تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو۔

مویشی اور بیٹے

آگے اللہ نے بعض نعمتوں کا نام لے کر بھی ذکر کیا ہے۔ فرمایا اَمَدَّكُمْ
بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ اُس نے تمہاری مدد کی مویشیوں اور بیٹوں سے۔ مویشی انسانی

زندگی کے لوازمات میں داخل ہیں۔ سورۃ زمر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (آیت ۶) اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کیلئے مویشیوں کے آٹھ جوڑے پیدا کیے۔ یہ وہی آٹھ جوڑے ہیں جو انسان کے ساتھ مانوس ہیں اور انسان کے پالتو جانور ہیں اور جن کے متعلق اللہ نے سورۃ المائدہ کی ابتداء میں فرمایا اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (آیت ۔۱) لوگو! تمہارے لیے چوپائے مویشی حلال کیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل سورۃ الانعام میں موجود ہے کہ ان سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری کے نر و مادہ ہیں۔ لوگ ان کا دودھ، گھی، بال اور کھال استعمال کرتے ہیں۔ ان سے سواری اور باربرداری کا کام لیتے ہیں اور شریعت کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ یہ جانور انسان کے خادم ہیں۔ انسانی خدمت اللہ نے ان کی فطرت میں رکھ دی ہے اونٹ جیسا طاقتور جانور جب بگڑ جاتا ہے تو ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑتا مگر عام طور پر اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک تین سال کا بچہ سو اونٹ کی قطار کی مہار پکڑ کر جدھر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اونٹ اس قدر فرمانبردار ہے۔ اسی لیے اس پر سواری کے وقت اللہ نے یوں کہنے کا حکم دیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (الزخرف ۔۱۳) پاک ہے وہ ذات جس نے ان کو ہمارے بس میں کر دیا، ورنہ ان کو قابو کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ان جانوروں کے ایک بال کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ایک بال بنانے کے لیے بھی اللہ کی قدرت کا پورا کارخانہ حرکت میں آتا ہے۔ ورنہ کون ہے جو ایک بال بھی بنا کر دکھلائے یہ تو اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے کہ اس کا معمولی سا شکریہ بھی ادا کر دیا جائے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک ہے کہ انسان پانی کا گھونٹ پی کر جب الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی راضی ہو جاتا ہے کہ اس کے بندے نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسقدر قدردان ہے۔

قومِ عاد کو بھی اللہ نے اونٹوں کی نعمت عطا فرمائی۔ یمن کے صحراؤں میں ان کے

اونٹ دوڑتے تھے جہاں دوسری کوئی سواری میسر نہ تھی۔ اونٹ کو سفینۃ الصحرا یعنی صحراؤں کی کشتی بھی کہا گیا ہے۔ جب تک جدید ذرائع نقل وحمل نہیں تھے اونٹ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہمارے ہاں بھی بالاکوٹ سے گلگت تک ایک اونٹ بارہ من بوجھ اٹھا کر بیس دن میں پہنچا دیتا تھا۔ اب تو ہوائی جہاز میں لوگ راولپنڈی سے گلگت صرف سوا گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں بار برداری کے بڑے بڑے ٹرک ہیں مگر پرانے زمانے میں اونٹ ایک بہت بڑی نعمت شمار ہوتا تھا۔

اللہ نے یہاں پر انعام کے طور پر بیٹوں کا ذکر بھی کیا ہے بیٹے اور بیٹیاں بھی اللہ کی نعمت ہیں مگر بیٹوں کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ یہ انسان کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ مشقت کے سارے کام بیٹے انجام دیتے ہیں، مال وجان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور انسان کی نسل بھی انہی سے چلتی ہے۔ بیٹیاں تو فطری طور پر پردہ نشین ہیں، ان سے بھاری کام نہیں لیے جا سکتے۔ ویسے بھی انسان فطرتاً بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں بچی کی پیدائش پر خوشی نہیں کی جاتی جب کہ بچے کے لیے بڑی خوشی منائی جاتی ہے حالانکہ بیٹا اور بیٹی دونوں اللہ کی عطا ہے اور بقائے نسل کا کام دونوں کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ اللہ نے سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں مشرکوں کی مذمت بیان کی ہے وہاں فرمایا اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا (آیت - ۴۰) اللہ تعالیٰ نے تمہیں تو بیٹے عطا فرمائے ہیں۔ تم اپنے لیے بیٹے چاہتے ہو مگر اللہ کے لیے تم فرشتوں کو اس کی بیٹیاں تجویز کرتے ہو کتنی ناانصافی کی بات ہے جس جنس کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اسے اللہ کے لیے روا رکھتے ہو۔

باغات اور چشمے

اگلی آیت میں اللہ نے باغات اور چشموں کا ذکر کیا ہے کہ اس نے تمہیں مدد پہنچائی وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ باغات اور چشموں کے ساتھ۔ اللہ نے چشموں اور نہروں کے ذریعے آبپاشی کا نظام قائم کیا جس سے تمہارے باغات اور کھیتیاں پیدا ہوئیں اور جن سے تمہاری خوراک کے لیے پھل اور اناج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تقدر

کے خصوصی انعامات ہیں جن کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔

فرمایا اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ، ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو متنبہ فرمایا کہ میں تم پر بڑے دن کے عذاب کا خوف کھاتا ہوں۔ آپ نے انہیں بتلا دیا کہ تمہارے افعال و کردار اس نوعیت کے ہیں کہ تم پر اللہ کی گرفت آسکتی ہے، لہٰذا اس کی سرکشی سے باز آجاؤ۔ اس کی وحدانیت کو تسلیم کرلو۔ غرور و تکبر اور اسراف کو چھوڑ دو، اور کمزوروں پر ظلم کرنا ترک کردو، ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تم پکڑے نہ جاؤ۔ بڑے دن کا عذاب اس دنیا میں بھی آسکتا ہے اور آخرت میں بھی۔ حقیقت میں حساب کتاب کا دن ہی یوم عظیم ہے جس دن انسانوں کے اعمال کا فیصلہ ہوگا لیکن جب دن کسی قوم پر اس دنیا میں بھی عذاب آیا، ان کے لیے وہ بھی بڑا دن تھا۔ یہ دن قومِ نوح، قومِ فرعون اور قومِ عاد و ثمود پر بھی آیا جب انہیں صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا گیا۔ تو ہود علیہ السلام نے قوم کو خبردار کیا کہ کہیں تم بڑے دن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ وقت ہے کہ اب بھی سنبھل جاؤ۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

قومِ ہود علیہ السلام کا جواب

ہود علیہ السلام کے اس وعظ و نصیحت کے جواب میں قوم نے یہ کہا۔ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَکُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ کہنے لگے کہ ہمارے لیے برابر ہے تو ہمیں نصیحت کرے یا نہ ہو نصیحت کرنے والوں میں سے مطلب یہ کہ اے ہود! تو جو مرضی کہتا رہے۔ تمہارے وعظ و نصیحت کا ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا، ہم تمہاری بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ سورۃ ہود میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ قوم نے کہا قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ (آیت۔ ۵۳) تو ہمارے پاس کوئی واضح چیز لے کر نہیں آیا، لہٰذا ہمیں تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا بلکہ ہم تو تمہارے متعلق یہ سمجھتے ہیں اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ (آیت۔ ۵۴) کہ تم پر ہمارے معبودوں کی مار پڑ گئی ہے۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے (نعوذ باللہ) تم ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے

ہو گیا افسوس کہ قوم کا یہ کردار محض غرور اور جہالت کی بنا پر تھا

وعظ طریقہ مشن انبیاء

وعظ کا معنی نصیحت کرنا ہے اور یہ چیز انبیاء علیہم السلام کے مشن میں داخل ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب الخیر الکثیر میں اس کام کو قھر المدارك الظلمانیة بانوار المعارف القدسانیة سے تعبیر فرماتے ہیں یعنی لطیف چیزوں کے ذریعے انسانی اذہان کو اس طور متاثر کرنا کہ وہ صحیح چیز کو تسلیم کر کے ظلم و ستم اور فتنہ و فساد سے باز آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود حضور علیہ السلام سے یہ کہلوایا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (سبا - ۴۶) لوگو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم مجمع میں ہو یا دو دو یا تین تین کی ٹولیوں میں یا اکیلے ہو۔ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر سوچو تو تم اسی نتیجے پر پہنچو گے کہ تمہارا ساتھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیوانہ نہیں ہے۔ تم تھوڑا سا غور و فکر بھی کرو گے تو تمہیں احساس ہو جائے گا کہ میں تمہاری خیر خواہی کی بات کرتا ہوں، لہٰذا میرا اتباع کرو اور ہمیشہ کی ذلت سے بچ جاؤ۔

قوم ہود کا صریح انکار

الغرض! حضرت ہود علیہ السلام کے تمام تر وعظ کے جواب میں قوم کہنے لگی۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ یہ تو پہلے لوگوں کی عادت ہے جو تم پیش کر رہے ہو خلق یا اخلاق عادت کو کہتے ہیں خواہ اچھی عادت ہو یا بری ہو۔ کہنے لگے کہ پہلے بھی لوگ اسی طرح ہی ڈرایا کرتے تھے جس طرح تم ہمیں کسی غائبانہ عذاب سے ڈرا رہے ہو، مگر ہم نے تو ایسی کسی سزا کو آتے نہیں دیکھا۔ لہٰذا ہمیں تمہاری ان باتوں پر یقین نہیں آتا۔

اِنْ هٰذَا کا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آج ہم کر رہے ہیں یہی کچھ ہمارے پرانے آباؤ اجداد بھی کیا کرتے تھے مگر تم ہمیں ان کے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو۔ دوسری جگہ ہے کہ تم ہمیں آباؤ اجداد، ان کے معبودان، ان کے طور طریقوں اور ان کے رسم و رواج سے ہٹانا چاہتے ہو لہٰذا ہم تمہاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کے پرانے طریقے پر ہی چلتے رہیں گے۔ حضور علیہ السلام و دیگر عزم

مکہ کے درمیان بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ سورۃ البقرہ میں موجود ہے کہ جب مشرکین سے کہا جاتا کہ اس چیز کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو وہ کہتے کہ ہم تو اس چیز کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (آیت ۔ ۱۷۰) اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد ناسمجھ اور غیر ہدایت یافتہ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ اپنی ڈگر پہ چلتے رہیں گے۔ ہود علیہ السلام کی قوم نے بھی کہا کہ ہم تمھاری بات کو نہیں مانتے اور نہ تمھاری طرف سے کسی سزا کی پیشن گوئی کو تسلیم کرتے ہیں مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰمٓ السجدۃ ۔ ۱۵) بھلا ہم سے بڑھ کر کون طاقتور ہے جو ہمیں سزا دے گا۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ اور نہیں ہیں ہم کہ ہمیں سزا دی جائے مگر اللہ نے فرمایا کہ جس اللہ نے اُن کو پیدا کیا ہے وہ بڑی طاقت کا مالک ہے۔ وہ چاہے تو معمولی سی چیز کے ساتھ انہیں ہلاک کر دے۔ اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (حٰمٓ السجدۃ ۔ ۱۵)

قوم ہود کی ہلاکت

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے فَكَذَّبُوْهُ قوم عاد نے اپنے رسول ہود علیہ السلام کو صریحاً جھٹلا دیا۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہی نکلا فَاَهْلَكْنٰهُمْ کہ ہم نے اُس پوری قوم کو ہلاک کر دیا اور ہلاک بھی ہوا جیسی غیر محسوس چیز سے کیا۔ یہ بڑے طاقتور لوگ تھے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہوا کا مقابلہ نہ کر سکے جو سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقۃ ۔ ۷) اُن پر سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی۔ اس ہوا نے بڑے بڑے کڑیل جوانوں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ ریگستان میں اس طرح پڑے تھے جس طرح کھجور کے بڑے بڑے تنے اکھاڑ کر پھینک دیے گئے ہوں۔ اللہ نے فرمایا فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (الحاقۃ ۔ ۸) اے مخاطب! تم ان میں سے کسی فردِ واحد کو بھی زندہ نہیں دیکھتے۔ اللہ نے سب کو ہلاک کر دیا۔ زندہ بچ جانے والوں میں نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (ہود ۔ ۵۸)۔ صرف ہود علیہ السلام اور اُن کے ایمان دار ساتھی تھے۔ باقی سب ختم ہو گئے۔

فرمایا، اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً اس واقعہ میں عبرت کی نشانی ہے مکے کے مشرکین بھی اور دیگر نافرمان بھی غور کریں اور دیکھیں کہ غرور و تکبر اور نافرمانی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ اگر انہوں نے بھی کفر و شرک کا ارتکاب کیا۔ کمزوروں پر ظلم و ستم ڈھائے اور انبیاء کی بات کو جھٹلایا تو خدا تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے آگے انسانی تاریخ کے اعتبار سے یہ جملہ بار بار دہرایا گیا ہے وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے۔ سابقہ اقوام کے حالات دیکھ کر بھی لوگ عبرت نہیں پکڑتے تھے بلکہ ان کی اکثریت ایمان سے محروم رہتی تھی اور بالآخر وہ بھی تباہ ہوجاتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں کثرت نافرمانوں کی ہی رہی ہے اور اہلِ ایمان ہمیشہ قلت میں رہے ہیں۔

فرمایا وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ بیشک تیرا پروردگار عزیز یعنی کمالِ قدرت کا مالک ہے۔ وہ جب چاہے کسی مجرم کو شدید ترین سزا دے دے۔ وہ رحیم بھی ہے جن پر زیادتی ہوئی، اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی اور ان کی مشکلات کو دور کیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں صفات کام کر رہی ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٤٥﴾ أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هٰهُنَا آمِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِي جَنّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فٰرِهِينَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾

ترجمہ:۔ جھٹلایا قومِ ثمود نے اللہ کے رسولوں کو ﴿۱۴۱﴾ جب کہا اُن سے اُن کے بھائی صالح علیہ السلام نے ، کیا تم ڈرتے نہیں ؟ ﴿۱۴۲﴾ بیشک میں تمہارے لیے رسول ہوں امانت دار ﴿۱۴۳﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ﴿۱۴۴﴾ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ ۔ میرا بدلہ نہیں ہے مگر رب العلمین کے ذمے ﴿۱۴۵﴾ کیا تم چھوڑ دیے جاؤ گے یہاں امن میں ؟ ﴿۱۴۶﴾ باغوں میں اور چشموں میں ﴿۱۴۷﴾ اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کے خوشے نہایت ہی ملائم ہیں ﴿۱۴۸﴾ اور تراشتے ہو تم پہاڑوں میں گھروں کو بڑی آسودگی اور

تکلفت سے (۱۴۹) پس ڈرو اللہ سے اور میری اطاعت کرو (۱۵۰) اور نہ اطاعت کرو مسرفوں کی بات کی (۱۵۱) جو فساد کرتے ہیں زمین میں اور اصلاح نہیں کرتے (۱۵۲)

قومِ ثمود

تسلی کے مضمون میں قومِ عاد کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب آج کے درس میں قومِ ثمود کا تذکرہ ہے جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی۔ یہ لوگ عادِ ثانی بھی کہلاتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں یہ لوگ وادی تبوک سے وادی قری تک آباد تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس علاقے میں اس قوم کی سترہ سو بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ترکوں کے زمانے میں تبوک تک ریل بھی جاتی تھی اور وہاں پر ریلوے اسٹیشن بھی تھا جس کی عمارت آج بھی موجود ہے۔ اس جگہ کا نام اب بھی مدائن صالح ہے۔ قومِ عاد کی طرح قومِ ثمود بھی بڑی متمدن قوم تھی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اب بھی نظر آتے ہیں۔ قومِ ثمود کے لوگ زیادہ تر تاجر پیشہ تھے، کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ اور بڑے آسودہ حال تھے یہ لوگ کمال درجے کے سنگ تراش تھے۔ پہاڑوں کو کھود کر نہایت پر آسائش اور نقش و نگار والے مکانات بناتے تھے۔ ان کی صناعی کے نمونے جنوبی ہندوستان میں ایجنٹا اور الورہ کی تہذیبوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ قومِ ثمود کی طرح یہ لوگ بھی اپنے مکان پتھروں کو تراش تراش کر بناتے تھے۔ مجسمہ سازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے بنائے ہوئے مجسمے آج بھی عجائب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور مکانات کے کھنڈرات بھی نظر آتے ہیں۔

قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود نے بڑی ترقی کی۔ یہ بھی سام ابن نوحؑ کی اولاد میں سے سامی نسل کے لوگ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بھی اسی نسل کے ساتھ تھا۔ بہرحال قومِ ثمود اپنے دور میں دنیاوی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ قوم تھی۔ ان کو دنیا کی ہر قسم کی آسائش حاصل تھی۔ یہ لوگ عقلِ معاش کے بامِ عروج پر تھے۔ مگر عقلِ معاد سے یکسر خالی تھے۔ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے تھے اور آخرت پر ایمان

نہیں رکھتے تھے۔ مشرک اور دہریے تو سرے سے معاد کے منکرین میں تاہم یہود و نصاریٰ کا نظریہ بھی درست نہیں ہے۔ قرآن پاک نے ایسے لوگوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ (الروم - ۷) یہ لوگ دنیا کے ظاہری حالات کو تو نہایت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بڑی ترقی کی ہے۔ صنعت حرفت میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ چاند پر کمندیں ڈال رہے ہیں مگر آخرت کے معاملات سے بالکل غافل ہیں۔ ان کو کچھ پتہ نہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اور وہاں اس زندگی کا پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔ اس کے بعد جزائے عمل کا مرحلہ آئے گا ہر ایک کو اس کے کیے دھرے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ بہرحال قوم ثمود اپنی پوری مادی ترقی کے باوجود معاد سے غافل تھی۔

صالح علیہ السلام کا خطاب

ارشاد باری تعالیٰ ہے كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ قوم ثمود نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا۔ انہوں نے اپنے رسول صالح علیہ السلام کی تکذیب کی مگر کسی ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کے جھٹلانے کے مترادف ہے لہٰذا حسب سابق یہاں بھی جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے۔ بھائی اس لیے کہ آپ اپنی قوم کے فرد تھے۔ انہی کی برادری اور خاندان سے تعلق تھا۔ اللہ نے ان کے سر پر تاج نبوت رکھا تو انہوں نے اللہ کا پیغام سنانا شروع کیا اور قوم سے فرمایا اَلَا تَتَّقُوْنَ تم ڈرتے کیوں نہیں ؟ تم کفر، شرک، معاصی اور ناپ تول کی اخلاقی بیماری میں مبتلا ہو۔ مگر خدا تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہو چکے ہو۔ فرمایا یاد رکھو! اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ میں تمہاری طرف اللہ کا پیغام لانے والا اور امانت دار ہوں۔ میں اللہ کا ہر پیغام بلا کم و کاست تم تک پہنچانے پر مامور ہوں۔ اس ضمن میں کوئی خیانت اور رعایت یا طرفداری نہیں کرتا۔ لہٰذا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ نیز اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

غَيْرُهٗ (الاعراف ۷۳) عبادت صرف اللہ کی کرو کہ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے

آپ نے قوم سے یہ بھی فرمایا کہ میں تم تک اللہ کا پیغام بے لوث پہنچا رہا ہوں وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اور اس کام کے لیے تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کیونکہ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میرا معاوضہ تو تمام جہانوں کے پروردگار کے ذمے ہے۔ تمام انبیاء اور رسل یہی بات کہتے ہیں کہ تبلیغ حق کے ضمن میں ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے عام طور پر فیس دینا پڑتی ہے۔ کاہن اور ساحر بھی اپنا معاوضہ طلب کرتا ہے۔ شاعر بھی اپنی فیس طلب کرتے ہیں۔ ان سب کا مقصود دنیا طلبی ہوتا ہے لیکن انبیاء کی جماعت ایک ایسی جماعت ہے جو صراط مستقیم پر راہنمائی کرنے کے لیے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتی۔ اللہ کا نبی ہمیشہ یہی کہتا ہے وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (الاعراف ۶۸) میں تو نصیحت کرنے والا امانت دار ہوں۔ وَاَنْصَحُ لَكُمْ (الاعراف ۶۲) میں تمہیں نصیحت کی بات بتاتا ہوں جو تمہارے فائدے میں ہے۔ اس میں تمہاری خیر خواہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بے غرض آدمی کی بات کو سننا فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے مگر تاریخ رسالت شاہد ہے کہ اکثر اقوام نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب ہی کی۔

انعامات تذکرہ

ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے ضمیر کو مزید جھنجھوڑا اور فرمایا اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یہاں اسی طرح امن میں چھوڑ دیے جاؤ گے؟ مطلب یہ کہ کیا تم ہمیشہ اسی طرح خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہو گے اور تمہیں کبھی زوال نہیں آئے گا۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا کہ میں سب پر غالب ہوں، میری سلطنت کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ عام طور پر ملوک اور مشرکین کا یہی ذہن ہوتا ہے۔ اسی لیے تو انہیں آخرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اگر وہ لحظہ بھر کے لیے خیال کریں کہ اگر آج خوشحال ہیں تو کل کو بدحال بھی ہو سکتے ہیں تو وہ غرور و تکبر اور ظلم و ستم سے باز آ جائیں۔ مگر اس طرف تو ان کا دھیان جاتا ہی نہیں۔

بہرحال ہود علیہ السلام نے کہا کیا تم اسی طرح یہاں امن میں رہو گے؟ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ تمہارے باغات اور ان کو سیراب کرنے والے چشمے اور نہریں اسی طرح ...

رہیں گی؟ اور کیا تم اس خام خیالی میں بھی مبتلا ہو کہ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ تمہاری کھیتیاں اور کھجوریں بھی طرح لہلاتی اور بار آور ہوتی رہیں گی۔ کھجوروں کے وہ درخت طَلْعُهَا هَضِيْمٌ کہ جن کے خوشے نہایت ہی نرم ہیں۔ هضيم کا معنی نرم و نازک بھی ہوتا ہے اور مجددکا ہو بھی بشیخ اللہ اس کو معنی ملائم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کھجور کے جب نئے شگوفے پھوٹتے ہیں تو وہ نہایت ہی نرم و نازک اور ملائم ہوتے ہیں۔ پھر جب پھل اچھی طرح آجاتا ہے تو وہ اپنے وزن کی وجہ سے معمولی سا جھک بھی جاتا ہے۔ تو اس طرح یہ دونوں معانی درست ہیں۔ کھجور کا خوشہ پھوٹنے سے لے کر پھل برداشت کرنے تک کے مختلف مراحل کے عربی زبان میں مختلف نام آتے ہیں۔ مثلاً جب کھجور کا پہلا خوشہ پھوٹتا ہے تو اس کو کُفُرّٰی کہا جاتا ہے۔ اُس کا اندرونی حصہ اُس وقت سفید ہوتا ہے جو اغریض کہلاتا ہے۔ پھر جب پھل کی نمود ہوتی ہے تو اس کو خلال کہتے ہیں اور جب ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو بلح کہلاتا ہے۔ پھر جب اس کے دانے بڑے ہو جاتے ہیں۔ تو اُسے بسر کہتے ہیں جب اُن میں زردی آجاتی ہے تو وہ رطب بن جاتا ہے۔ اور آخر میں اگر کھجور خشک ہو تو تمر کہلاتی ہے۔ بہرحال ہود علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری کھیتیاں اور کھجوریں اسی طرح بار آور بنتی رہیں گی؟

کھجور کے درخت میں اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب و غریب حکمت رکھی ہے کہ اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ مادہ درخت کا خوشہ نکلنے والا حصہ بند سا ہوتا ہے جیسے دو جوتے آپس میں ملے ہوئے ہوں۔ جب نر درخت کا بور مادہ درخت کے مذکورہ حصہ پر پڑتا ہے تو اس سے پیوندکاری ہو کر پھل اچھا آتا ہے۔ اگر نر درخت کا بور مطلوبہ جگہ تک نہ پہنچ سکے تو پھل ناقص رہ جاتا ہے۔ عرب اور دوسرے گرم ممالک میں کھجور نہایت ہی مفید کار آمد اور دیرپا پھل ہے جو بیک وقت بطور پھل اور خوراک استعمال ہوتا ہے۔ قوم ثمود کے پاس کھجوروں کے بکثرت باغات تھے جس کی وجہ سے وہ بڑے خوشحال لوگ تھے۔

پر تکلف مکانات

ہود علیہ السلام نے قوم کو یہ بھی یاد دلایا وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا

فِرِھِیۡنَ تم تراشتے ہو پہاڑوں میں پُرتکلف مکانات جیسا کہ پہلے عرض کیا۔ قومِ عاد کی طرح قومِ ثمود بھی فنِ تعمیر کی ماہر تھی۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر نہایت ہی عمدہ زیب نقش و نگار والے مکانات تعمیر کرتے تھے۔ فرمایا یہ تمام آسائشیں دائمی نہیں ہیں۔ یہ کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈرجاؤ اور میری بات مانو۔ میں تمہیں سچی بات بتاتا ہوں۔ دنیا کی خوشنمائی سے نکل کر آخرت کی فکر کرو کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ یہ دنیا اور اس کی تمام رونقیں جلد ہی ختم ہونے والی ہیں۔ تمہاری موت کے بعد ایک دائمی زندگی شروع ہونے والی ہے۔ جہاں تمہارے یہ باغات، محلات اور آرام و آسائش کی کوئی چیز کام نہیں آئے گی اور تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکو گے۔

اسراف کی ممانعت

صالح علیہ السلام نے قوم کو خبردار کیا وَلَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ اور اسراف کرنے والوں کی بات مت مانو۔ قومِ عاد کے متعلق بھی بیان ہو چکا ہے کہ بڑے مسرف لوگ تھے۔ عالیشان مکانات، بڑے بڑے مینار اور گنبد تعمیر کرتے تھے جن سے نہ رہائش مقصود ہوتی تھی اور نہ کوئی دوسرا مفید کام بلکہ محض نمود و نمائش مطلوب ہوتی تھی۔ یہ بیماری اس قومِ ثمود میں بھی پائی جاتی تھی۔ فضول رسم و رواج اور لہو و لعب میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ شراب نوشی اور جوئے بازی عام تھی۔ استقبالیوں اور دعوتوں میں یہاں بھی فضول خرچی کی جاتی ہے۔ کسی وزیر امیر یا سندر کی آمد ہوتی ہے تو بیشمار جھنڈیاں اور آرائشی دروازے بنائے جاتے ہیں۔ استقبالیہ نعروں کے بورڈ آویزاں کیے جاتے ہیں۔

علاقے بھر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ رنگ برنگے قمقموں سے سڑکوں کو سجایا جاتا ہے۔ یہ سب فضول اور حرام کام ہیں۔ یہی رقم غریبوں اور محتاجوں کی بحالی پر خرچ کی جا سکتی ہے۔ بھوکوں کے لیے کھانے اور ننگوں کے لیے تن پوشی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ یا کیسے بے گھر لوگوں کے لیے گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے سایہ مہیا کیا جا سکتا ہے مگر اس فضول خرچی کو کون روکے؟ امراء کی دیکھا دیکھی غریب لوگ بھی شادی

کی رسومات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، نہ امیر غریبوں کا خیال کرتے ہیں اور نہ غریب اپنی حیثیت پر نظر رکھتے ہیں۔ نام و نمود کے لیے ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور یہی اسراف ہے جو پرانی قوموں میں بھی پایا جاتا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اسراف سے منع فرمایا اور کہا کہ مسرفوں کی بات کو نہ مانو

فساد فی الارض

اور مسرف لوگ وہ ہیں اَلَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ جو کہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وَلَا یُصْلِحُوْنَ اور اصلاح نہیں کرتے ظاہر ہے کہ اصلاح معاشرہ توحید کے ذریعے ہوتی ہے۔ غریب پروری اور عدل و انصاف سے ہوتی ہے نہ کہ جوا بازی اور شراب نوشی کے ذریعے۔ تمام بُرے کام فساد کی بنیاد بنتے ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ اخلال بالشرائع یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی ہی فساد فی الارض ہے مشرک، کافر اور منافق قسم کے لوگ فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ صالح علیہ السلام نے بھی یہی بات کی کہ مسرفوں کی بات نہ مانو۔ وہ خدا کا قانون توڑ کر زمین میں فساد کا موجب بنتے ہیں۔ لہو و لعب، رسوماتِ بد اور بدعات کو فروغ دیتے ہیں۔ فوٹوگرافی کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[1] لَعَنَ اللّٰہُ الْمُصَوِّرِیْنَ مصوروں پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔ یہ اسراف ہی تو ہے اور یہی فساد فی الارض ہے سورۃ الاعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کے یہ الفاظ بھی ہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے کہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا (آیت ۸۵) لوگو! زمین میں امن قائم ہو جانے کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ۔ بہرحال صالح علیہ السلام نے قوم کو اسراف اور زمین میں فساد پھیلانے سے منع کیا۔ آپ کی اس تقریر کے بعد اگلی آیات میں قوم کا جواب ہے۔

---

[1] قرطبی ص ۲۳۸ ج ۱۴ و احکام القرآن للجصاص ص ۲۶۳ ج ۳ (فیاض)

قَالُوٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۗ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ:- (صالحؑ کی بات کے جواب میں) کہا اُن لوگوں نے بیشک تو سحرزدہ لوگوں میں سے ہے ﴿۱۵۳﴾ اور نہیں ہے تو مگر انسان ہمارے جیسا۔ پس لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے ﴿۱۵۴﴾ کہا (صالحؑ نے) یہ اونٹنی ہے۔ اس کے لیے پانی پینے کی باری ہے۔ اور تمہارے لیے بھی پانی پینے کی باری ہے ایک مقررہ دن پر ﴿۱۵۵﴾ اور تم مت لگانا اس کو برائی کے ساتھ پس پکڑ لے گا تم کو بڑے دن کا عذاب ﴿۱۵۶﴾ پس انہوں نے کاٹ ڈالا اُس (اونٹنی) کو۔ پس ہو گئے وہ پچھتانے والے ﴿۱۵۷﴾ پس پکڑا اُن کو عذاب نے بیشک اس میں البتہ نشانی ہے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ اُن میں سے ایمان لانے والے ﴿۱۵۸﴾ اور بیشک

تیرا پروردگار زبردست ہے اور نہایت رحم کرنے والا (۱۵۹)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف نبی بنا کر مبعوث فرمایا آپ نے حقِ تبلیغ ادا کرتے ہوئے قوم کو خدا تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ اُن کی خامیاں بیان کیں اور اُن سے بچنے کی تلقین کی۔ اُن کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلائیں اور اس فانی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ آپ نے قوم کو اُن کی خوشحالی پر تنبیہ فرمائی اور اسراف سے منع فرمایا۔ اللہ کا خوف دلایا اور اپنی اطاعت کا حکم دیا۔ آپ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں تمہیں نصیحت کی بات بتلاتا ہوں جس میں خود تمہارا ہی فائدہ ہے۔

قومِ ثمود کا جواب

آپ کی قوم نے پیغامِ حق سُن کر اس کو تسلیم کرنے کی بجائے نہایت متکبرانہ طریقے سے یوں جواب دیا قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ کہنے لگے تو تو سحر زدہ لوگوں میں سے ہے۔ یہ الزام صرف قومِ ثمود نے ہی نہیں لگایا بلکہ دوسرے بعض انبیاء کو بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق کہا گیا کہ یہ جادوگر ہیں۔ قریش مکہ نے اہلِ ایمان کو خطاب کر کے کہا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (بنی اسرائیل۔ ۴۷) تم تو سحر زدہ آدمی کا اتباع کرتے ہو۔ اس پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے اور یہ شخص بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ پھر جب مشرکین نے معجزہ شق القمر دیکھا تو کہنے لگے سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر۔ ۲) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے پہلے بھی لوگ کرتے تھے اب یہ شخص بھی کرتا ہے۔ اسی طرح صالح علیہ السلام کو بھی کہا کہ تو تو مسحرین میں سے ہے یعنی تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے تمہاری عقل خراب ہو گئی ہے۔ فرعون کی طرح وہ بھی اپنی کارگزاری کو ہی عقلمندی سمجھتے تھے۔ فرعون نے اپنی قوم کو اس طرح ورغلایا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تو تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔ وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (المومن۔ ۲۹) مگر میں تمہیں ٹھیک راستہ بتلا رہا ہوں۔ ہمارے آباؤ اجداد بالکل ٹھیک تھے۔ اُن کا طور طریقہ بھی درست تھا اور ہم اسی کے پابند ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام اور اس کے حواری بہک گئے ہیں۔ جو عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں جو ہم نے اپنے بڑوں سے کبھی نہیں سنیں۔ بہرحال کبھی انہوں نے کاہن کہا، کبھی شاعر

کہا اور کبھی سحر زدہ کہہ دیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سحر پھیپھڑے کو بھی کہا جاتا ہے۔ مراد ان کی یہ تھی کہ یہ شخص تو پھیپھڑا رکھنے والا انسان ہے۔ یہ تو کھانا کھاتا ہے۔ انسانوں کی طرح سانس لیتا ہے۔ بھلا ہم ایسے شخص کو رسول کیسے تسلیم کرلیں۔ اس کے علاوہ سحر کا معنی دھوکہ بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

أرانا موضعين لأمر غيب
ونسحر بالطعام وبالشراب

ہم غیب کی طرف اپنی سواریاں تیزی کے ساتھ دوڑا رہے ہیں۔ پتہ نہیں آگے کیا ہوگا مگر ہمیں کھانے پینے سے دھوکا دیا جاتا ہے۔ ہمیں کھانے پینے کا لالچ دے کر اس طرف لگا دیا گیا ہے جس کے انجام کا کچھ علم نہیں تاہم اس مقام پر پہلا معنی ہی زیادہ متبادر ہے کہ تو سحر زدہ آدمی ہے۔

بشریت اور رسالت

قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام پر یہ اعتراض بھی کیا۔ کہنے لگے مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تو تو ہمارے جیسا ہی انسان ہے۔ تمہیں ہم پر کون سی فوقیت حاصل ہے جو تم نبوت و رسالت کا دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ مادہ پرست لوگ حقیقت کو پائے بغیر محض ظاہری صورت دیکھ کر ہی ان کے متعلق فیصلہ کر لیتے ہیں امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب الفوز الکبیر[1] میں فرماتے ہیں کہ اکثر کفار و مشرکین نے بشریت کو رسالت کے منافی سمجھ کر ہی رسالت و نبوت کا انکار کیا اور حقیقت کو نہ جانا۔ کہتے تھے کہ یہ رسالت کا دعویدار بھی ہماری طرح کھاتا پیتا ہے۔ ہماری طرح اس کے بھی بال بچے ہیں۔ بازاروں سے سودا سلف خریدتا ہے، بھلا اس کو ہم کیسے نبی مان لیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ لوازمات بشریت نبوت و رسالت کے ہرگز منافی نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ہی رسول اور نبی منتخب کرتا ہے مگر ان کے قلب و دماغ کو کمال حاصل ہوتا ہے اور ان کی روحانیت ایسی بے مثال ہوتی ہے جو عام انسانوں کے لیے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے یہی کہلوا

[1] الفوز الکبیر ص ۱۲

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ... (الکہف ۔ ۱۱۰) آپ کہہ دیں کہ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں، البتہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ مگر وحی کا نزول کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص انتخاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی استعداد اور صلاحیت کو خوب جانتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ منصب رسالت کے لائق کون انسان ہے۔ بہر حال قوم ثمود نے صالح علیہ السلام کی ظاہری شکل و صورت دیکھ کر آپ کی رسالت کا انکار کر دیا اور حقیقت کو نہ پا سکے۔

مولانا روم نے صورت پرستوں کا حال اسی طرح بیان کیا ہے ؎

چند صورت بینی اے صورت پرست

جان بے معنی است از صورت پرست

درگذر از صورت و معنی نگر

زانکہ مقصود از صدف باشد گہر

صورت پرست صرف ظاہری صورت کو ہی سمجھ رہا ہے اور وہ جان اور روحانیت کی حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ صورت سے گذر کر حقیقت کو بھی دیکھ لو کیونکہ محض ظاہری سیپ مقصود نہیں ہوتا بلکہ اُس کے اندر موجود موتی مطلوب ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ صرف ظاہری شکل و صورت دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ یہ بھی انسان ہے اور ہم بھی انسان ہیں۔ درست نہیں ہے بلکہ نبی کے اندر پائی جانے والی حقیقت اور اُس کے کمال پر بھی نگاہ ہونی چاہیئے۔ فرمایا، تم نے صرف ظاہری صورت پر انکار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

کہنے لگے، تُو تو ہمارے جیسا آدمی ہے ہماری برادری اور قوم کا جانا پہچانا ہے۔ ہم تجھے کیسے رسول مان لیں؟ مشرکین مکہ بھی کہتے تھے کہ ابوطالب کے یتیم بھتیجے کو ہم کیسے رسول مان لیں لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف ۔ ۳۱) یہ قرآن مکے اور طائف کی بستیوں میں سے کسی صاحب حیثیت آدمی پر کیوں نہ اترا۔ یہاں بڑے بڑے سردار ابوالحکم

عبدیالیل، مسعود، حبیب جیسے بڑے بڑے عظیم، عقلمند اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ اللہ نے اگر کسی کو نبی بنانا تھا تو ان میں سے کسی کو بناتا۔ یہ تو ہماری عقل و سمجھ سے باہر ہے۔ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بصورت پرست اور مادہ پرستوں کی سوچ اسی حد تک ہوتی ہے۔

اونٹنی کا معجزہ

پہلے تو قوم ثمود نے صالح علیہ السلام کی بشریت کی بنا پر انکار کیا۔ پھر کہنے لگے فَأْتِ بِآيَةٍ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی پیش کر اور نشانی بھی ایسی ہو جو ہم خود طلب کریں۔ یہ لوگ سنگ تراش تھے پتھروں کے ساتھ ان کو خاص تعلق تھا۔ لہذا انہوں نے نشانی بھی ایسی طلب کی۔ کہنے لگے کہ اس سامنے والی چٹان سے ایک اونٹنی نکال کر دکھائیں۔ اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے۔ صالح علیہ السلام نے نماز پڑھی۔ اور بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ چنانچہ تمام لوگوں کے سامنے چٹان میں سے اونٹنی پیدا ہوئی۔ پھر اس نے بچہ بھی دیا۔ یہ بہت لمبی چوڑی اونٹنی تھی۔ ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ میں نے وہ مقام دیکھا ہے جس جگہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی بیٹھتی تھی، یہ جگہ تو ستر فٹ مربع ہے۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ نشانی دکھائی۔ اونٹنی ادھر ادھر گھومتی پھرتی تھی۔ دوسرے جانور اس کی شکل و صورت سے گھبراتے تھے۔

پانی پینے کی باری

بہرحال جب وہ اونٹنی چٹان سے برآمد ہو گئی تو اللہ کا حکم ہوا قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ صالح علیہ السلام نے کہا کہ یہ اونٹنی ہے جو تم نے طلب کی ہے لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ اس کے لیے پانی پینے کی باری ہے اور تمہارے لیے بھی پانی پینے کی باری ہے ایک مقررہ دن پر۔ ایک دن چشمے سے یہ اونٹنی پانی پیا کرے گی اور دوسرے دن تم اپنے جانوروں کو سیراب کیا کرو گے۔ چنانچہ دن مقرر کر لیے گئے ایک دن اکیلی اونٹنی پانی پیتی تھی اور دوسرے دن باقی جانور۔ اس آیت [illegible] نے حضرات یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کسی چیز میں بعض لوگوں کا اشتراک ہو تو آپس میں باری مقرر کی جا سکتی ہے مثلاً اگر کسی کا کنواں مشترک ہے تو پانی نکالنے کی باری ٹھہرالی اتفاق سے تو

سے تو اس کی سواری یا دودھ وغیرہ کے لیے روزانہ ہفتہ وار یا ماہانہ بنیاد پہ باری مقرر کی جا سکتی ہے۔

اونٹنی کا قتل

یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا۔ دریں اثنا بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوا کہ یہ اونٹنی ہمارے لیے عذاب بن چکی ہے۔ اسے دیکھ کر ہمارے جانور ڈر جاتے ہیں اور پھر یہ ایک دن اکیلی سارا پانی پی جاتی ہے۔ اس سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے لوگوں کو خبردار کر دیا وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ لوگو! اس اونٹنی کو برائی کے ساتھ مت چھونا۔ اس کو بری نیت سے ہاتھ نہ لگانا، نہ اس کو زخمی کرنا۔ اگر ایسا کرو گے فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ تو تم کو بڑے دن کا عذاب پکڑ لے گا۔ تم خدا تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ اگرچہ بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے جب ثواب اور عذاب کا فیصلہ ہوگا، مگر جس دن کسی قوم پہ عذاب آیا اس کے لیے وہ بھی بڑا دن ہوتا ہے۔ تو صالح علیہ السلام نے قوم کو خبردار کیا کہ اس اونٹنی سے تعرض کرو گے تو خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

سورۃ نمل میں آتا ہے وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (آیت ۴۸) شہر میں غنڈہ قسم کے نو آدمی تھے جن کا کام ہی فتنہ و فساد کا بازار گرم کرنا تھا اور وہ معاشرے میں اصلاح نہیں چاہتے تھے۔ ان میں سے سرکردہ آدمی قدار ابن سالف تھا۔ اس اونٹنی کو راستے سے ہٹانے کے لیے ان بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ شہر میں غنیزہ نامی عورت تھی جس کی کئی جوان بیٹیاں بھی تھیں۔ اس کی بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں جنہیں اس اونٹنی کی وجہ سے پانی پلانے میں دقت پیش آتی تھی۔ اس عورت نے قدار ابن سالف سے معاہدہ کیا کہ اگر وہ اونٹنی کو قتل کر دے تو وہ اپنی لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کر دے گی۔ قدار نے اپنے غنڈہ ساتھیوں سے مشورہ کیا اور پھر وہ اونٹنی کی گزرگاہ پر ایک درّے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جونہی اونٹنی وہاں سے گزری فَعَقَرُوهَا تو انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ جب اونٹنی گر پڑی تو تمام ساتھیوں نے

مل کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اونٹنی کا بچہ بھی ساتھ تھا۔ ماں کو قتل ہوتے دیکھ کر اس نے ایک خوفناک چیخ ماری اور پھر وہ اسی چٹان میں غائب ہو گیا جہاں سے اونٹنی برآمد ہوئی تھی۔

قوم پر عذاب

اونٹنی کے قتل پر صالح علیہ السلام نے قوم کو سخت سرزنش کی اور عذاب کی آمد کی پیش گوئی کی۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھیں تین دن کی مہلت دی گئی ہے۔ اس کے بعد تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ یہ جان کر فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ۝ قوم کے لوگ سخت پشیمان ہوئے کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں۔ یہ پشیمانی توبہ والی نہیں تھی۔ بلکہ غلط کام کرنے کی محض ندامت تھی اور ان کی اکڑ بھی بدستور قائم تھی۔ جب تین دن گزر گئے فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ تو ان کو عذاب نے آن پکڑا۔ نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے سخت قسم کی چیخ آئی جس سے اس قوم کے سترہ سو شہر اور قصبات ملیامیٹ ہو گئے۔ زلزلے سے ان کی عمارات تباہ ہو گئیں۔ کچھ ان کے نیچے دب کر مر گئے اور باقیوں کے چیخ کی وجہ سے جگر پھٹ گئے۔ اور وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ صرف کم و بیش چار سو افراد بچے جو صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے۔ پھر ان کو حکم ہوا کہ وہاں سے چلے جائیں۔ چنانچہ صالح علیہ السلام اہل ایمان کو لے کر اس اجڑی ہوئی بستی سے نکل گئے۔

نصیحت کی بات

اللہ نے صالح علیہ السلام کی قوم کا واقعہ بیان کرنے کے بعد پھر نصیحت والی بات دہرائی ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً اس واقعے میں تمام لوگوں کے لیے نشانی ہے خواہ وہ کسی دور کے رہنے والے ہوں یا دنیا کے کسی خطے سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب کو جان لینا چاہیے کہ خدا کے نافرمانوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ان تباہ شدہ قوموں کی عمارات کے کھنڈرات بول بول کر درس عبرت دے رہے ہیں کہ دیکھو اللہ کے نبیوں کی نافرمانی نہ کرنا، ورنہ تمھارا حشر بھی سابقہ قوموں سے مختلف نہ ہوگا۔ ان سب تنبیہات کے باوجود اللہ نے فرمایا وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ اکثر لوگ ایمان قبول نہیں کرتے۔ توحید کو ماننے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔

آج کسی بھی دنیا بھر میں دیکھ لیں کُل آبادی کا تین چوتھائی کافر و مشرک ہے جب کہ توحید کے پرستار صرف چوتھایا پانچواں حصہ ہیں۔

فرمایا وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ بے شک تیرا پروردگار کمال قدرت کا مالک ہے وہ جب چاہے گرفت کرے اور سزا دے دے۔ وہ انتہائی مہربان بھی ہے کہ اپنے بندوں کی نہایت ہی خطرناک حالات میں بھی حفاظت کرتا ہے اور اُن کو راہ دکھلاتا ہے، چنانچہ اللہ نے صالح علیہ السلام کو اور آپ کے ساتھیوں کو اُس عذاب زدہ بستی سے چلے جانے کا حکم دیا اور آپ وہاں سے حضرموت کی طرف چلے گئے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ
لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ
مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ
تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّيْ
لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا
فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا
عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: جھٹلایا قوم لوط نے اللہ کے رسولوں کو (۱۶۰)
جب کہا اُن سے اُن کے بھائی لوط علیہ السلام نے، کیا تم
ڈرتے نہیں (۱۶۱) بیشک میں تمہارے لیے رسول ہوں امانتدار (۱۶۲)

ڈرو اللہ سے اور میری بات مانو (۱۶۳) اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ۔ نہیں ہے میرا بدلہ مگر رب العلمین کے ذمے (۱۶۴) کیا دوڑتے ہو تم مردوں پر جہان والوں میں سے (شہوت رانی کے لیے) (۱۶۵) اور چھوڑتے ہو تم جو پیدا کیا ہے تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے تمہاری بیویوں میں سے۔ بلکہ تم حد سے بڑھنے والے ہو (۱۶۶) کہا ان لوگوں نے اگر نہیں باز آؤ گے تم اے لوطؑ! (ان باتوں کے کہنے سے) تو البتہ ہو جاؤ گے تم نکالے ہوئے لوگوں میں سے (۱۶۷) (کہا لوطؑ نے) بیشک میں تمہارے عمل سے نفرت کرنیوالا ہوں (۱۶۸) اے میرے پروردگار! بچا مجھے اور میرے اہل کو ان چیزوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں (۱۶۹) پھر ہم نے نجات دی اس کو اور اس کے گھر والوں سب کو (۱۷۰) مگر ایک بڑھیا جو پیچھے رہنے والوں میں سے تھی (۱۷۱) پھر ہم نے ملیامیٹ کر دیا دوسروں کو (۱۷۲) اور برسائی ہم نے ان پر بارش۔ پس بُری تھی بارش ڈرائے ہوئے لوگوں کی (۱۷۳) بیشک اس میں البتہ نشانی ہے۔ اور نہیں ہیں اکثر لوگ ان میں سے ایمان لانے والے (۱۷۴) اور تحقیق تیرا پروردگار البتہ زبردست اور نہایت رحم کرنے والا ہے (۱۷۵)

ربط آیات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے پیروکاروں کی تسلی کے لیے اس سے پہلے بعض انبیاء علیہم السلام اور ان کی اقوام کا حال بیان ہو چکا ہے۔ گذشتہ آیات میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کا ذکر تھا کہ کس طرح انہوں نے اللہ کے نبی کی تکذیب کی اور پھر اس جرم کی پاداش میں کس طرح عذاب الٰہی کے مورد بنے۔ اب آج کے درس

ہیں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اُن پر کس طرح کا عذاب نازل ہوا۔

لوط علیہ السلام کی بعثت

ارشاد ہوتا ہے کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ قوم لوط نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ایک نبی کو جھٹلایا تو گویا تمام نبیوں کو جھٹلایا کیونکہ سب کا مشن تو ایک ہی رہا ہے۔ ہر نبی اور رسول نے اولین درس یہی دیا يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف ۳۰) لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ جب اُن کے بھائی لوط علیہ السلام نے اُن سے فرمایا۔ سابقہ دروس میں مذکور انبیاء علیہم السلام کی طرح لوط علیہ السلام کو بھی قوم کا بھائی کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ تو اپنی اپنی اقوام کے افراد تھے لہٰذا انہیں اپنی اپنی قوم کا بھائی کہا گیا، مگر لوط علیہ السلام کا تعلق تو اُس قوم سے نہیں تھا جس کی طرف اللہ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ البتہ آپ نے اُس قوم میں شادی کی عربی محاورے میں کہا جاتا ہے ابن اخت القوم منهم یعنی بھانجا اُسی قوم کا فرد سمجھا جاتا ہے اگرچہ اس کے باپ کا تعلق دوسرے خاندان سے ہو۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے انصار مدینہ کو بلا کر پوچھا کہ تم میں کوئی غیر آدمی تو نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارا ایک بھانجا ہے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تمہیں میں شمار ہوتا ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے یہاں بھی لوط علیہ السلام کو قوم کا بھائی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کی سسرالی قوم تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ اللہ نے آپ کو اُس قوم کی طرف مبعوث فرمایا اس لیے اُسی کا بھائی کہا گیا ہے۔ گویا آپ اُن کے ہم وطن بھائی بن گئے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بعثت کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی بابل سے ہجرت کی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آپ کی قوم کے لوگوں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اپنی بیوی سارہؑ اور بھتیجے لوط علیہ السلام کے ساتھ بابل

سے چل نکلے۔ بابل سے آپ حاران، پھر مصر اور پھر شام و فلسطین گئے۔ اس ہجرت کا واقعہ سورۃ عنکبوت میں مذکور ہے فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (العنکبوت ۲۶) اس وقت حضرت لوط علیہ السلام ہی ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور دوسری آپ کی بیوی تھی۔ چنانچہ یہ تینوں ہجرت کر گئے جب مصر سے شام و فلسطین کی طرف روانہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا اور حکم دیا کہ شرق اردن کے علاقے میں جا کر اللہ کا پیغام پہنچاؤ۔ اس وقت شرق اردن میں چھ بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، ادوامہ اور صبوائیم وغیرہ تھے جن کی آبادی چار لاکھ سے کم نہ تھی۔ سدوم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز تھا، کھیتی اور باغات عام تھے وسیع پیمانے پر تجارت بھی ہوتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبات بھی موجود تھے۔ تو ان لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

بہر حال شرق اردن پہنچ کر لوط علیہ السلام نے اُن لوگوں کو مخاطب کیا۔ سب سے پہلے توحید کی دعوت دی۔ کفر، شرک اور معاصی کی قباحت بیان کی اور فرمایا اَلَا تَتَّقُوْنَ کیا تم ڈرتے نہیں کہ ان قباحتوں کی وجہ سے ایک دن پکڑے جاؤ گے۔ آپ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ میں تمہارے لیے امانتدار رسول ہوں۔ میں تمہیں اللہ کا پیغام من و عن بلا کم و کاست پہنچا رہا ہوں۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں تمہیں خدا کا پیغام بے لوث طریقے پر پہنچا رہا ہوں وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اور میں اس کام کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ کیونکہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میرا معاوضہ تو پروردگار عالم کے ذمے ہے۔

مختلف اقوام کی بیماریاں

سابقہ اقوام میں کفر اور شرک تو مشترک بیماریاں تھیں۔ البتہ ہر قوم میں بعض اخلاقی بیماریاں بھی پائی جاتی تھیں۔ قوم عاد اور ثمود غرور و تکبر اور ظلم و ستم میں مبتلا تھیں۔ وہ بے جا بڑی بڑی عمارتیں، گنبد اور مینار بناتے تھے جن کا کوئی خاص مصرف نہ تھا بلکہ محض نمود و نمائش مطلوب ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی بدترین قسم کے شرک

میں مبتلا تھی۔ یہ لوگ چاند، سورج اور ستاروں کے پرستار تھے۔ اس کے علاوہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑے مغرور تھے اور اپنے عقائد و اعمال کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ فرعون اور اس کی قوم کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ وہ بھی اپنے آپ کو سب سے بڑا رب کہتا تھا۔ جہاں تک لوط علیہ السلام کی قوم کا تعلق ہے تو ان میں کفر و شرک کے علاوہ ہم جنسی کی بیماری پائی جاتی تھی۔ اللہ کا فرمان ہے کہ یہی لوگ اس بد خلقی کے موجد تھے۔ ان سے پہلے یہ بیماری کسی قوم میں نہیں پائی جاتی تھی۔

ہم جنسی کی بیماری

اسی خلاف وضع فطری عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لوط علیہ السلام نے قوم سے فرمایا اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ کیا جہان بھر میں شہوت رانی کے لیے تم مردوں کی طرف دوڑتے ہو۔ یعنی تم ہم جنسی کے مرتکب ہوتے ہو۔ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے پروردگار نے جو کچھ تمہارے لیے پیدا کیا ہے اس کو چھوڑ دیتے ہو۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے شہوت کے فرو کرنے کے لیے تمہارے لیے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں۔ تم ان سے تو التفات نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم جنس مردوں کے ساتھ ملوث ہوتے ہو۔ یہ کتنی خلاف فطرت بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ تم حد سے بڑھنے والے نہایت ہی ظالم لوگ ہو۔ تم یہ کام انسانیت کی حد سے گزر کر انجام دے رہے ہو۔ سورۃ المعارج میں ہے۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝

(آیت۔ ۳۱) جو کوئی جائز ذرائع کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا ہوگا۔ اللہ نے منکوحہ بیوی یا شرعی لونڈی کے ذریعے شہوت رانی کو جائز اور حلال قرار دیا ہے۔ باقی تمام ذرائع غیر فطری اور حرام ہیں۔ چنانچہ مشت زنی بھی مکروہ تحریمی میں آتی ہے کہ اس سے کئی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جانوروں کے ساتھ التفات بھی حرام ہے۔ اپنی بیوی کا مقام مکروہ استعمال کرنا بھی حرام ہے۔ اللہ کے نبی

کا فرمان ہے۔ مَنْ اَتٰی اِمْرَاۃً فِیْ دُبُرِھَا فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی جس شخص نے عورت کے مقامِ مکروہ میں شہوت رانی کی، اُس نے گویا شریعت محمدیہ کا انکار کر دیا۔ یہ انتہا قبیح فعل ہے۔ اور بعض مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرنا تو بالکل ہی خلاف فطرت ہے۔ اللہ نے اس کو فحش کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ زنا اور لواطت دونوں افعال کو فحش کہا گیا ہے۔ بہرحال قومِ لوط اسی فعل کی بانی تھی

لواطت قابلِ تعزیر جرم ہے۔ ائمہ کرام میں تھوڑے اختلاف ہے کہ اس جرم پر حد جاری ہوگی۔ یا تعزیر۔ بعض لواطت کو بھی زنا شمار کر کے حدِ زنا کے قائل ہیں۔ جب کہ امام ابُو حنیفہ اور بعض دیگر ائمہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص پر تعزیر عاید ہوگی جو حاکم وقت جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مقرر کرے۔ چونکہ یہ فعل خلاف فطرت ہے اس لیے تمام ائمہ کرام سخت ترین سزا کے قائل ہیں جو کہ منہائے موت تک ہو سکتی ہے۔ صاحب مشکوٰۃ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں اَحْرِقُوْھُمَا کا لفظ آتا ہے یعنی فاعل اور مفعول دونوں کو آگ میں جلا دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں ھدم علیھم حائطاً ایسے مجرموں کو دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اوپر دیوار گرا دی جائے۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ایسے معاملات پیش آئے تو انہوں نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق تعزیر لگائی کیونکہ اس جرم کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ قومِ لوط سے پہلے یہ فعل شنیع کسی قوم میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ عام ہو گیا حتیٰ کہ برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر دیا ہے کہ اگر دو بالغ مرد باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کریں تو ان پر کوئی جرم عاید نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ فعل بالجبر کیا جائے تو قابلِ مؤاخذہ ہوگا۔ خنزیر خوری کا یہی خاصہ ہے کہ لوگ بے حیا اور بے غیرت ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جرم بہرحال جرم ہے خواہ وہ رضامندی سے انجام دیا جائے یا جبراً۔ خدا تعالیٰ نے

نے اسکو بے حیائی سے تعبیر کیا ہے ۔ مگر آج دنیا کی کوئی قوم اس سے پاک نہیں ۔ مرکیہ، برطانیہ حتیٰ کہ اسلامی ممالک بھی اس لعنت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایرانی ۔ افغانی ۔ ہندوستانی ہر جگہ اس فعل کا ارتکاب ہوتا ہے ۔ امام صلحیؒ رقمطراز ہیں کہ پہلی صدی کے آخر تک کسی مسلمان ملک میں کوئی قحبہ خانہ نہیں تھا ۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کی حکومت چھتیس لاکھ مربع میل پر محیط تھی ۔ پھر انگریزوں کے زمانے میں اس فعل کو اتنی ترقی ہوئی کہ اب کوئی ملک بھی اس سے خالی نہیں ہے ۔ خود عرب ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں ۔

قوم کی دھمکی

بہر حال جب لوط علیہ السلام نے قوم کو اس بُرے کام سے منع کیا قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ کہنے لگے ۔ اے لوط علیہ السلام ! اگر تم اپنے اس وعظ و نصیحت سے باز نہ آئے لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ تو ہو جاؤ گے تم نکالے ہوئے لوگوں میں سے ۔ مطلب یہ کہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی سے باز آجاؤ ورنہ ہم تمھیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ۔ سورۃ الاعراف میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب لوط علیہ السلام نے انہیں منع کیا تو قوم کا جواب یہ تھا ۔ اَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (آیت ۸۲) ان کو اپنی بستی سے نکال دو ۔ یہ بڑے پاکباز لوگ بنے پھرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نجس کام کرتے ہیں ۔ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمھارے اس عمل سے سخت نفرت کرتا ہوں ۔ دین اور اخلاق کے خلاف چیزوں کو تو بد فطرت انسان ہی اچھا سمجھ سکتے ہیں ۔ سلیم الفطرت آدمی تو کبھی بھی ایسے کاموں سے مانوس نہیں ہو سکتا ۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ خلاف وضع فطری عمل کے دو نقصانات ہیں ۔ ایک تو انسلاخ فطرت ہو گا یعنی لوگ فطرت سے باہر نکل جائیں گے اور یہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے ، اور دوسرا یہ کہ واجبی ارتفاقات خراب ہو جائیں گے ۔ نکاح کا عمل انسانوں کے نامے کے لیے واجبی ارتفاق ہے اگر کوئی شخص عورت

سے نکاح کی بجائے مردوں یا جانوروں کے ساتھ شہوت رانی کرنے لگے تو نکاح کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس طرح بقائے نسل کا سلسلہ خراب ہو جائے گا اسی لیے لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے اس عمل سے متنفر ہوں۔

دعائے لوطؑ

اس موقع پر لوط علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں دُعا بھی کی عرض کیا رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ پروردگار! مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے نجات دے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں اس کام اور اس کے نتیجے میں آنے والے عذاب سے بچا لے۔ لوط علیہ السلام اللہ کے پاک نبی سے تو کسی بُرے عمل کی توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کام کی نحوست سے بچا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے آپ کی دُعا کو شرف قبولیت بخش دو فرمایا فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ہم نے لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں سب کو نجات دی یعنی اس سزا سے بچا لیا جو اس قوم پر نازل ہوئی۔ فرمایا إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ایک بڑھیا اس عذاب سے نہ بچ سکی جو پیچھے رہنے والوں میں تھی۔ یہ لوط علیہ السلام کی بیوی کی طرف اشارہ ہے جو لوط علیہ السلام کے ہمراہ بستی سے نہیں گئی تھی بلکہ قوم کے ساتھ پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ لہٰذا وہ بھی عذاب کا شکار ہو گئی حالانکہ وہ لوط علیہ السلام کے اہلِ خانہ میں سے تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی بیوی تھوڑی دُور تک آپ کے ہمراہ نکلی تھی مگر پھر پلٹ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے دو کافرہ عورتوں کا ذکر قرآن پاک میں کیا جو اُس کے پاک انبیاء کے گھروں میں تھیں۔ یہ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں تھیں كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا (التحریم ۱۰) یہ دونوں عورتیں ہمارے دو صالح بندوں کے گھروں میں تھیں مگر انہوں نے اُن کے ساتھ خیانت کی۔ یعنی ایمان سے خالی تھیں اور انہوں نے اپنے شوہروں کا ساتھ دینے کی بجائے کافروں کا ساتھ دیا۔ البتہ لوط علیہ السلام کی بیٹیاں ایماندار تھیں۔ انہوں نے آپ کے ساتھ بستی کو چھوڑ دیا اور عذابِ الٰہی سے بچ گئیں۔

قوم کی تباہی

لوط علیہ السلام اور آپ کے اہلِ خانہ کے بستی سے نکل جانے کا حکم سورۃ ہود میں اللہ
نے ذکر کیا ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ (آیت - ۸۱) اپنے
گھر والوں کو لے کر رات کے کسی حصے میں نکل جاؤ چنانچہ جب آپ حکم کی تعمیل
کرتے ہوئے بستی سے نکل گئے تو فرمایا ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ہم نے
باقی قوم کو ملیامیٹ کر دیا۔ اللہ نے اس قوم کو ایسی تاریخی ہولناک سزا دی جو ہمیشہ یاد رکھی
جائے گی۔ بستیوں کو اس طرح الٹ دیا کہ نیچے والا حصہ اوپر اور اوپر والا نیچے آگیا۔ اور
اسکے ساتھ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ہم نے ان پر بارش بھی برسائی اور یہ بارش
پانی کی نہیں بلکہ پتھروں کی بارش تھی۔ سورۃ الحجر میں ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً
مِّنْ سِجِّيْلٍ (آیت - ۷۴) ہم نے ان پر کھنگر کے پتھر برسائے جن پر مجرموں
کے نام لکھے ہوئے تھے کہ یہ فلاں چوہدری کے سر پر لگے گا۔ اور یہ فلاں وڈیرے
کو ہلاک کر دیگا۔ فرمایا ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی فَسَاۤءَ مَطَرُ
الْمُنْذَرِيْنَ ڈرائے ہوئے لوگوں کی یہ بہت ہی بڑی بارش تھی۔ خدا نے ساری
قوم کو ہلاک کر دیا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً اس واقعہ میں عبرت ہے۔ اہلِ مکہ اور
بعد میں آنے والوں کو بھی جان لینا چاہیے کہ بدکاری کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ مگر مقام افسوس ہے کہ اتنی واضح نشانی
کے باوجود ان میں اکثر لوگ ایمان سے خالی ہیں وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الرَّحِيْمُ اور بیشک تیرا پروردگار زبردست ہے جو کسی نافرمان کو چھوڑتا نہیں
اور نہایت مہربان ہے جو اپنے بندوں کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھنے پر بھی قادر ہے

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ
شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا
تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا
تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿١٨٣﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ
وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٨٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٨٥﴾
وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ﴿١٨٦﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ
اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٨٩﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٠﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٩١﴾

ترجمہ:- جھٹلایا ایکہ والوں نے اللہ کے رسولوں کو ﴿١٧٦﴾

جب کہا ان کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے کیا تم ڈرتے نہیں ۱۷۷ بیشک میں تمھارے لیے رسول ہوں امانت دار ۱۷۸ ڈرو اللہ سے اور میری بات مانو ۱۷۹ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی بدلہ ۔ میرا بدلہ نہیں ہے مگر رب العلمین کے ذمے ۱۸۰ (میں تم سے کہتا ہوں) پورا کرو ماپ کو ، اور نہ ہو تم گھٹانے والوں میں سے ۱۸۱ اور تولو سیدھے ترازو کے ساتھ ۱۸۲ اور نہ گھٹاؤ لوگوں سے ان کی چیزوں کو ، اور نہ چلو زمین میں فساد کرتے ہوئے ۱۸۳ اور ڈرو اس ذات سے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور پہلی مخلوق کو ۱۸۴ انھوں نے کہا بیشک تو ان لوگوں میں سے ہے جن پر جادو کیا گیا ہے ۱۸۵ اور نہیں ہے تو مگر انسان ہمارے جیسا ، اور ہم خیال کرتے ہیں تجھ کو جھوٹوں میں سے ۱۸۶ پس گرا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ، اگر تو سچا ہے ۱۸۷ کہا (شعیبؑ نے) میرا پروردگار خوب جانتا ہے جو کام تم کرتے ہو ۱۸۸ پس جھٹلایا ان لوگوں نے اس کو بس پکڑا ان کو سائبان کے دن کے عذاب نے ۔ بیشک وہ بڑے دن کا عذاب تھا ۱۸۹ بیشک البتہ اس بات میں نشانی ہے ۔ اور نہیں ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے ۱۹۰ اور بیشک تیرا پروردگار وہی عزیز اور رحیم ہے ۱۹۱

حضرت شعیب علیہ السلام

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نصیحت اور عبرت کی غرض سے چند انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا ہے ۔ گذشتہ آیات میں لوط علیہ السلام کا ذکر ہوا ، اب شعیب علیہ السلام کے

حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔ آپ کی بعثت کے سلسلہ میں دو مقامات کا نام آتا ہے۔ یعنی مدین اور ایکہ۔ بعض کہتے ہیں کہ مدین اور ایکہ کے لوگ دو مختلف اقوام تھیں اور اللہ نے دونوں کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک ہی قوم تھی، مدین اُن کے قبیلے کا نام تھا اور اسی نام کی بستی بھی تھی۔ ایکہ گھنے جنگلات کو کہتے ہیں اور یہ لوگ اپنے علاقے میں واقع جنگل سے بھی مستفید ہوتے تھے، اس لیے ان کو اصحاب الایکہ بھی کہا گیا ہے۔ بہر حال اللہ نے مدین و ایکہ کی طرف اللہ کے رسول شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ ان کا سلسلہ نسب پانچویں یا چھٹی پشت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ مشہور یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قبطی کے قتل کے بعد آپ کئی روز کی مسافت طے کرنے کے بعد مدین پہنچے تھے جہاں آپ کی ملاقات حضرت شعیب علیہ السلام سے ہوئی۔ اور انہوں نے ایک تدبیر کے ذریعے آپ کو آٹھ یا دس سال تک روکے رکھا۔ اور پھر اپنا داماد بھی بنا لیا اسی لیے شاعر لوگ کہتے ہیں کلیمی سے شعیبی دو قدم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جن کے پاس موسیٰ علیہ السلام مدین میں مقیم ہوئے تھے وہ شعیب علیہ السلام نہیں بلکہ اُن کے بھتیجے تھے۔ وہ بھی ایماندار اور نیک آدمی تھے۔ بائیبل میں ان کا نام حوب بیان کیا گیا ہے۔ اُن کو تیرو بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم مشہور یہی ہے کہ وہ اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام تھے۔ اللہ نے آپ کا ذکر سورۃ اعراف، سورۃ ہود اور دیگر سورتوں میں بھی کیا ہے۔

تسلی کا مضمون

جیسا کہ میں نے ارشاد کیا انبیاء علیہم السلام کے یہ واقعات حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی تسلی کے لیے بیان کیے جا رہے ہیں۔ انہیں علم ہونا چاہیئے کہ مختلف اقوام نے اپنے اپنے نبیوں کے ساتھ کیسے سلوک کیا، انبیاء نے کیا کیا تکالیف برداشت کیں مگر صبر و ہمت سے کام لیا۔ لہذا آپ کے ساتھ پیش آنے والے نامساعد حالات کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ راہِ حق کے مسافروں پر اس قسم کی ابتلائیں آیا ہی کرتی ہیں۔ لہذا آپ بھی ان مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ

(الاحقاف - ۳۵) آپ اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کریں اور نافرمانوں کو سزا دلوانے میں جلدی نہ کریں۔

شعیب علیہ السلام کی تقریر

ارشاد ہوتا ہے كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ جھٹلایا ایکہ والوں نے اللہ کے رسولوں کو۔ یہاں بھی وہی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ جو اس سے پہلے حضرت نوح، ہود، صالح اور لوط علیہم السلام کے لیے استعمال ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ایک رسول کی تکذیب اللہ کے سارے رسولوں کی تکذیب کے مترادف ہے کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی ایک کے انکار سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ جب کہا شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہ کیا تم ڈرتے نہیں؟ دیگر سابقہ اقوام کی طرح یہ لوگ بھی کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ غیر اللہ سے مرادیں مانگتے تھے۔ سورۃ اعراف اور ہود میں موجود ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں اور ان کی مذہبی رسوم کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم تو ان کو ادا کرتے رہیں گے۔ اللہ کے نبی نے فرمایا اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا امانت دار رسول ہوں۔ میں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچانے میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ پس اللہ سے ڈر جاؤ اور میری بات مانو۔ کہنے لگے میری یہ بات بالکل بے لوث ہے۔ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ میں اس کام کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کیونکہ میرا بدلہ تو اللہ کی ذمہ داری میں ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔ میری تبلیغ کا اجر وہی مجھے عطا کرے گا۔ اس معاملہ میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ میں تمہاری خیر خواہی کی بات کر رہا ہوں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ میری بات مانو۔

عقیدے کی درستگی

شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے قوم کو عقیدے کی اصلاح کا درس دیا۔ اور یہی درس اللہ کے سارے نبی دیتے آئے ہیں۔ نبیوں کے بعد اللہ کے نیک بندے

بھی ہمیشہ سب سے پہلے عقیدے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کیونکہ نجات کا دار و مدار اسی چیز پر ہے۔ ہر دور میں کتاب و سنت کے مطابق عقیدے کی اصلاح کی کوشش دیکھا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں اسی بات کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ اہل سنت سے مراد حضور علیہ السلام کی سنت پر چلنے والا گروہ اور جماعت سے مراد صحابہؓ کی جماعت ہے۔ ان کے مطابق اپنا عقیدہ بنا لو گے تو نجات حاصل ہو جائے گی۔ اور اگر انسان کا عقیدہ ہی درست نہیں تو اس کے کسی عمل کا کچھ اعتبار نہیں۔ اس بات کی تصریح قرآن میں جگہ جگہ کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ الانبیاء میں ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ (آیت ۹۴) جس نے نیک اعمال انجام دیے۔ بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو اس کی محنت کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ گویا اعمال کے لیے ایمان کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (الانشقاق - ۲۵) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے، ان کے لیے بے انتہا اجر ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت والے دن پہاڑوں جتنے بڑے بڑے عمل بھی هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان ۲۳) اڑتی ہوئی خاک بن کر رہ جائیں گے، ان کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان کی تہہ میں ایمان نہیں۔

غرضیکہ عقیدے کی درستگی کے متعلق سارے نبی یہی درس دیتے ہیں یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (اعراف - ۷۳) لوگو! عبادت خالص اللہ کی کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ پکارنے میں۔ نہ حاضر ناظر سمجھنے میں، نہ حاجت روا اور مشکل کشا تسلیم کرنے میں۔ غرضیکہ کسی چیز میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ ہر نبی نے درس توحید کے بعد اپنی اپنی قوم کی اخلاقی بیماریوں کی طرف توجہ دی۔

قوم شعیب کا تعارف

قوم شعیب بھی بڑی متمدن قوم تھی۔ یہ زیادہ تر تاجر پیشہ لوگ تھے۔ ان کی بستیاں بڑی شاہراہ پر واقع تھیں۔ خراسان اور ہندوستان کے تجارتی قافلے اسی شاہراہ کے

ذریعے مصر اور شام جاتے تھے اور افریقہ کے قافلے اسی راستہ سے ادھر آتے تھے۔ اس قوم
کی اخلاقی بیماری یہ تھی کہ یہ لوگ ماپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کے
حقوق ضائع ہوتے تھے۔ شعیب علیہ السلام کے قوم سے خطاب کے بعض حصے سورۃ ہود
میں بھی موجود ہیں۔ آپ نے قوم کی توجہ اس طرف دلائی کہ تجارت میں ڈنڈی مار کر لوگوں کے
حقوق ضائع نہ کرو۔ بلکہ تمام حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرو اور اس کے بعد بَقِيَّتُ اللّٰهِ
خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آیت ۸۶) جو کچھ بچ رہے۔ وہی
تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم میں ایمان کی کوئی رتی موجود ہے اور جو چیز تم بے ایمانی
سے حاصل کرو گے، وہ خیر و برکت سے خالی ہوگی۔ یہی بیماری اہل مدینہ میں بھی پائی جاتی
تھی۔ یہود زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ تھے اور دیتے وقت کم تولتے تھے جس کا ذکر
سورۃ مطففین میں موجود ہے۔

ماپ تول میں استقامت

بہرحال شعیب علیہ السلام نے قوم کو ان کی اخلاقی بیماری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے
فرمایا أَوْفُوا الْكَيْلَ پورا کرو ماپ کو وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ اور
نہ ہو تم گھٹانے والوں میں۔ اناج کو ماپ کر دینے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے
نزول قرآن کے زمانے میں مُد اور صاع وغیرہ کے پیمانے ہوتے تھے۔ ہمارے پنجاب
میں ٹوپہ اور دڑوپہ کے پیمانے اب تک رائج رہے ہیں۔ انہی پیمانوں کے متعلق فرمایا
کہ جب گندم، جو، کھجوریں یا دیگر اناج ماپ کر دو تو پورا پورا ماپو اور اس میں کمی نہ کرو۔
کہ اس سے لینے والے کا حق ضائع ہوگا۔ سورۃ مطففین میں اس چیز کی مذمت
بیان کی گئی ہے کہ ہلاکت ہے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے کہ جب
وہ ماپ کر یا تول کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب دینا ہوتا ہے تو اس
میں کمی کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ ایک دن انہوں نے
رب تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر حساب دینا ہے؟ تو یہی نصیحت شعیب علیہ السلام
نے بھی اپنی قوم کو کی کہ ماپ میں کمی نہ کرو وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ
اور جب کسی چیز کو تول کر دو تو سیدھی ترازو کے ساتھ تولو۔ اس میں کمی بیشی

نہ کرو۔ تجارت میں ڈنڈی مارنا حقوق العباد میں خیانت کرنا ہے۔ جس کا مواخذہ ہوگا۔ فرمایا وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اور لوگوں سے اُن کی چیزوں کو مت گھٹاؤ یعنی وزن کرتے وقت تول میں کمی نہ کرو۔

تاجروں کی ذمہ داری

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بازار تشریف لے گئے تو آپ نے تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ قَدْ وُلِّيتُمْ اَمْرَيْنِ قَدْ هَلَكَتْ اُمَمُ السَّالِفَةِ قَبْلَكُمْ اے تاجروں کے گروہ! آج تم دو چیزوں کے والی ہو۔ انہی دو چیزوں کی وجہ سے پہلے کئی امتیں تباہ ہوئیں۔ یہ دو چیزیں ماپ اور تول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعیب علیہ السلام کے علاوہ بھی کئی قومیں اس بیماری میں مبتلا رہی ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے خبردار کیا کہ آج تم ان چیزوں کے والی ہو، دیکھنا کسی کا حق ضائع نہ کرنا ورنہ تم بھی سابقہ قوموں کی طرح تباہ ہو جاؤ گے۔

اگر تاجروں میں یہ عیب نہ ہو تو وہ پیشے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ اور حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سچا اور امانتدار تاجر قیامت کے دن انبیاء، اصدقاء اور شہداء کی قطار میں ہوگا۔ اس کے برخلاف جھوٹی قسم اٹھا کر گاہک کو مطمئن کرنے والے کے متعلق فرمایا مُنْفِقَةٌ مُمْحِقَةٌ ایسا مال بک تو جاتا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کی برکت کو مٹا دیتا ہے۔ ایسی کمائی حرام کی کمائی ہوگی اور پھر بقول "مال حرام بود بجائے حرام رفت"، یہ کسی اچھے ٹھکانے پر بھی نہیں لگے گی بلکہ مقدمہ، بیماری، رسم و رواج یا لہو و لعب میں ہی صرف ہو گی۔ جو مال حرام راستے سے آیا، وہ اسی راستے سے چلا گیا۔ برخلاف اس کے جو مال جائز اور حلال راستے سے آتا ہے وہ تمام اہلِ خانہ کے لیے باعثِ برکت ہوتا ہے۔

تاجروں کا ایک اور عیب تدلیس ہے۔ اگر مال میں کوئی نقص ہو تو وہ اسے ظاہر نہیں کرتے بلکہ چھپا جاتے ہیں اور اس طرح گاہک کو عیب دار مال چلا جاتا ہے

لے ترمذی ص۱۹۶ لے سنن دارمی ص۱۶۳/۲۲۰ و ترمذی ص۱۹۵ (فیاض)

یہ بھی بددیانتی ہی کی ایک قسم ہے۔ اگر کپڑے کا کوئی تھان پھٹا ہوا ہے یا اس کی پیمائش کم
ہے تو گاہک کو بتا دینا چاہیے کہ اس میں یہ عیب ہے اور اس کی قیمت میں اس قدر
فرق ہے۔ اب یہ گاہک کی مرضی ہے کہ وہ ایسے مال کو خریدنا پسند کرتا ہے یا نہیں
مگر تاجر نے تو اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ اسی طرح دیسی مال کو ولائتی یا ولائتی کو دیسی
کہہ کر فروخت کرنا بھی اسی وعید کی زد میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چیز یہاں
بنی ہے مگر مہر غیر ممالک کی لگا دی جاتی ہے۔ یہ گاہک کو دھوکہ دینا ہے۔ اور یہی چیز چوری
ہے بعض اوقات ناپنے میں کمی کی جاتی ہے اگر کپڑا میٹر کے حساب سے فروخت کیا ہے تو
ناپتے وقت میٹر کی بجائے گز استعمال کیا ہے۔ یا کلو کی بجائے سیر تول دیا ہے۔ یہ سب
باتیں دھوکہ دہی میں آتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ لوگوں سے ان کی چیزیں مت گھٹاؤ۔

فساد فی الارض

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ اور نہ پھرو زمین
میں فساد کرتے ہوئے۔ اللہ کے دین اور شریعت کو توڑنا ہی فساد فی الارض ہے۔
سورۃ اعراف میں قوم شعیب کی ایک یہ خرابی بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ راستوں پر ڈاکے
ڈالتے تھے۔ مسافروں سے ان کا مال چھین لیتے اور بعض اوقات ان کو قتل بھی کر دیتے
اللہ نے فرمایا وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (آیت ۸۶) ڈاکے ڈالنے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے
کے لیے راستوں پر مت بیٹھو۔ یہ لوگ ناکہ بندی کر کے غنڈہ گردی کرتے تھے۔ قافلے
لوٹتے تھے اور جو لوگ شعیب علیہ السلام کی ملاقات کے لیے آتے تھے، ان کو آپ
تک پہنچنے ہی نہیں دیتے تھے۔ اہل مکہ بھی ایسا ہی کرتے تھے ان کی کوشش ہوتی
تھی کہ باہر سے آنے والا کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے نہ پائے۔ وہ
جانتے تھے کہ جو کوئی آپ کی صحبت میں پہنچ جاتا تھا وہ ایمان لے آتا تھا۔ حضرت
ابوذر غفاریؓ کا حال حدیث میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے ملنا چاہا
تو کفار مکہ نے دو دفعہ آپ کی پٹائی کی۔ اسی طرح حضرت عمرو ابن عبسہؓ کا بیان ہے کہ وہ
مکہ آئے تو دیکھا کہ قوم کے لوگ اس قدر مشتعل ہیں کہ آپ تک پہنچنا ہی مشکل ہے۔ کہتے

ہیں کہ یہ نے بڑے لطیف بہانے کے ذریعے آپ علیہ السلام تک رسائی حاصل کی۔ اور ایمان قبول کیا۔ یہ سب چیزیں فساد فی الارض میں شامل ہیں۔

تبلیغی جماعت والے اللہ کا دین لوگوں تک پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ اُن کے راستے میں بھی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ طرح طرح کا طعن کرتے ہیں کہ یہ بے دین لوگ ہیں۔ بستر اٹھائے پھرتے ہیں اور لوگوں کو اصل دین سے برگشتہ کرتے ہیں۔ محض الزام تراشی کے ذریعے لوگوں کو روکتے ہیں کہ کہیں ان کے دام میں نہ پھنس جانا۔ اس طرح بعض آدمی عوام کو علمائے حق کے پاس جانے سے روکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ گستاخ اور بے ادب ہیں۔ ان کی بات سنو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے، العیاذ باللہ۔ غرضیکہ اللہ کے راستے سے روکنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی اخبارات میں غلط ملط مضامین دیکر اللہ کے بندوں سے بدظن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کتابوں کے ذریعے الزام تراشی کر کے لوگوں کو متنفر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اللہ کے راستے سے روکنے کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور مختلف زمانوں میں اس کے مختلف طریقے رہے ہیں۔ یہ فساد فی الارض کی ہی قسم ہے

اس ضمن میں انگریز نے بھی بڑا جال پھیلایا ہے۔ اگرچہ سیاسی طور پر وہ بات نہیں رہی، مگر دینِ حق سے روکنے کا داؤ پیچ اب بھی چل رہا ہے انگریز مشنریاں آج بھی دنیا بھر میں سرگرمِ عمل ہیں۔ کبھی تعلیم کے ذریعے عیسائیت پھیلائی جا رہی ہے۔ سکول اور کالج قائم کر کے انجیل کی تعلیم دی جاتی ہے اور کبھی ہسپتالوں میں عیسائیت کا پرچار کیا جاتا ہے۔ کبھی تبلیغی اخبارات اور رسائل مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور کبھی امداد کے نام پر لوگوں کو اپنے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔ غرضیکہ جس طرح مکڑی شہد میں پھنس کر نکل نہیں سکتی، اسی طرح جو لوگ ان کے جال میں کسی نہ کسی طرح پھنس جاتے ہیں۔ پھر وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے فساد فی الارض کے یہ مختلف طریقے ہیں۔

اس ضمن میں مکے والوں کا واقعہ مشہور ہے، عرب کا ایک نامی گرامی شاعر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا مگر مشرکین نہیں چاہتے تھے کہ یہ ان تک

پہنچے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ شخص یہاں سے آیا تو اس کا بہت زیادہ اثر پڑے گا۔ چنانچہ اہل مکہ نے اس شاعر کو اناج سے لدے ہوئے سو اونٹ دے کر واپس کر دیا اور حضور علیہ السلام سے نہیں ملنے دیا۔ فرمایا زمین میں فساد کرتے ہوئے مت پھرو وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ اور ڈرو اس ذات سے جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو بھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ ساری باتیں قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمائیں۔

قوم کا جواب

شعیب علیہ السلام کی اس تقریر کے جواب میں قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ قوم کے لوگ کہنے لگے کہ تم تو جادو کئے ہوئے لوگوں میں سے ہو بہکی بہکی باتیں کرتے ہو اور ہمیں ہمارے دین سے روکنا چاہتے ہو۔ انہوں نے یہ اعتراض بھی کیا وَمَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تم تو ہمارے جیسے انسان ہو تمہیں ہم پر کون سی برتری حاصل ہے وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ اور ہم تو تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں تمہارے دعویٰ نبوت میں کوئی صداقت نہیں ہے گویا انہوں نے بشریت کو نبوت کے منافی خیال کیا تھا۔ مگر قرآن میں یہ بات بار بار سمجھائی گئی ہے کہ انسانوں کی تربیت کے لیے انسان کا نبی ہونا ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ انسان کسی غیر جنس سے تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی فرشتہ انسان کی تربیت کر سکتا ہے اور نہ کوئی جن۔ بلکہ انسان کو انسان ہی اپنے قول و فعل سے منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

قوم کہنے لگی۔ اگر تو سچا ہے فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرا دے۔ ہم مان لیں گے کہ تیرے کہنے سے ہمیں سزا ملی ہے۔ اگر تو سچا ہے۔ سورۃ اعراف میں کفار و مشرکین کا یہ بیان بھی نقل کیا گیا ہے فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (آیت ۷۰) جس چیز سے تو ہمیں ڈراتا ہے اس کو لے آ یعنی ہم پر عذاب نازل کر دو۔ شعیب علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا قَالَ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ میرا پروردگار خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کس مجرم کو کس وقت سزا میں مبتلا کرنا ہے۔ سزا دینا میرا کام نہیں

ہے جب خدا تعالیٰ کی گرفت وقتِ مقررہ پر آجاتی ہے لہٰذا اُس کا انتظار کرو۔

قوم پر عذاب

غرضیکہ فَكَذَّبُوهُ قوم نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلا دیا۔ آپ کی نبوت و رسالت کا کھلم کھلا طور پر انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ پکڑ لیا اُن کو سائبان کے دن کے عذاب نے۔ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ بے شک یہ بڑے دن کا عذاب تھا۔ ظلہ سائبان کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق بادل کے سائے پر بھی ہوتا ہے۔ قومِ شعیب کو تین قسم کا عذاب دیا گیا۔ نیچے سے زلزلہ آیا، اوپر سے چیخ مسلط کی گئی اور پھر اُن پر سائبان کا سایہ بھی ہوا۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جب اس قوم پر عذاب کا وقت آیا تو اللہ نے ان پر سخت گرمی پیدا کر دی۔ سات دن تک متواتر سخت ترین تپش نازل ہوئی۔ پھر ایک بادل اٹھا جس کے سائے میں قدرے سکون محسوس ہوا۔ سب لوگ دوڑ دوڑ کر بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ پھر اللہ نے اُس بادل سے ایسی آگ برسائی کہ سارے نافرمان بھسم ہو کر رہ گئے۔ اس قوم کا حال قرآن، بائبل اور تاریخ میں بھی مذکور ہے۔ اللہ نے اس قوم کا حال بیان کر کے مکے والوں اور بعد والوں کو عبرت دلائی ہے کہ دیکھنا اللہ کے نبی کی نافرمانی کر کے تم بھی کہیں عذابِ الٰہی کا شکار نہ ہو جانا۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً اس واقعہ میں عقلمندوں کے لیے نشانی ہے، وہ سابقہ اقوام کا حال دیکھ کر سنبھل سکتے ہیں اور خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لا سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ اُن میں اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ اور بیشک تیرا پروردگار البتہ زبردست اور نہایت مہربان ہے، وہ نافرمانوں کے حق میں جبار اور قہار ہے، جب کہ مومنوں کے لیے بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

ترجمہ:- اور بیشک یہ (قرآن) البتہ اتارا ہوا ہے رب العالمین کی طرف سے ﴿۱۹۲﴾ لے کر اترا ہے اس کو روح الامین ﴿۱۹۳﴾ آپ کے قلب مبارک پر تاکہ ہو جائیں آپ ڈرانے والوں

تیں سے (۱۹۴) اور بے یہ عربی زبان میں کھول کر بیان کرنے والی (۱۹۵) اور بیشک یہ البتہ پہلی کتابوں میں بھی ہے (۱۹۶) کیا ان کے لیے یہ نشانی نہیں ہے کہ جانتے ہیں اس کو بنی اسرائیل کے علماء (۱۹۷) اور اگر ہم اتارتے اس کو کسی عجمی پر (۱۹۸) پس وہ پڑھتا اس کو ان پر تو پھر بھی نہیں تھے یہ ایمان لانے والے (۱۹۹) اسی طرح ہم نے چلایا ہے اس کو مجرموں کے دلوں میں (۲۰۰) نہیں ایمان لاتے اس کے ساتھ یہاں تک کہ دیکھ لیں وہ دردناک عذاب (۲۰۱) پس آئے گا وہ (عذاب) اچانک اور وہ بے خبر ہوں گے (۲۰۲) پس کہیں گے کیا ہم کو مہلت مل سکتی ہے؟ (۲۰۳) کیا ہمارے عذاب کے ساتھ یہ جلدی کرتے ہیں (۲۰۴) آپ بتلائیں کہ اگر ہم ان کو فائدہ پہنچائیں کئی سال تک (۲۰۵) پھر آجائے ان کے پاس وہ چیز جس کا ان سے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے (۲۰۶) تو نہیں بچائے گا ان کو جس کے ساتھ یہ فائدہ اٹھاتے ہیں (۲۰۷) اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر یہ کہ اس کے لیے ڈرانے والے تھے (۲۰۸) نصیحت کے لیے اور نہیں ہم ظلم کرنے والے (۲۰۹)

ربط آیات

گذشتہ پانچ رکوع میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی اقوام کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات کو بیان کر کے حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرام رضی کو تسلی دلانا مقصود تھا کہ دیکھو سابقہ انبیاء کی اقوام نے بھی ان کو جھٹلایا، ان کو تکالیف پہنچائیں اور بالکل برے انجام سے دوچار ہوئے۔ لہٰذا اگر مکے والے بھی آپ

سے یہ سوال کرتے ہیں آپ پر ایمان نہیں لاتے تو ان کا یہ کہنا بھی سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوتا۔

اب آخر کے درس میں قرآن پاک کی حقانیت کا ذکر ہے اور اس سورۃ کی ابتدا بھی اسی مضمون سے ہوئی تھی تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (آیت ۲) یہ واضح کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ وَمَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ (آیت ۵) ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نئی نصیحت آتی ہے یہ اس سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اب سورۃ کے آخری حصے میں بھی یہی مضمون آ رہا ہے اور نزول قرآن کے بارے میں بعض حقائق بیان کیے گئے ہیں۔

مکی سورتوں کے مضامین

مکی سورتوں میں بالعموم چار بڑے مضامین بیان ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا مضمون توحید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں مختلف عنوانات کے تحت توحید کے دلائل پیش کیے ہیں اور شرک کا رد کیا ہے۔ یہ مضمون سورۃ کے آخری حصے میں بھی آ رہا ہے۔ مکی سورتوں کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ اہل مشرکین رسالت کا انکار کرتے تھے۔ سابقہ اقوام اور آخری امت کے مشرکین کا نظریہ تھا وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۹۴) جب بھی لوگوں کے پاس اللہ کی ہدایت آئی تو انہوں نے یہ کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے نزدیک بشریت رسالت کے منافی تھی۔ حالانکہ اللہ نے انسانوں کی طرف انسانوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ان کا دوسرا نظریہ تھا کہ اگر کسی انسان کو ہی رسول بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کسی صاحب حیثیت آدمی کو رسول بناتا جس کے باغات ہوتے، کوئی مال و دولت ہوتی۔ بھلا ایک نادار آدمی کیسے رسول ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں اللہ نے رسالت کے تصور کو واضح کیا ہے اور منکرین کے اعتراضات کو رد کیا ہے۔ مکی سورتوں کا تیسرا اہم مضمون معاد ہے۔ وقوع قیامت کے منکرین ہمیشہ سے یہ

قرآن میں بھی ایسا ایک طبقہ موجود ہے۔ اللہ نے مکی سورتوں میں بعث بعد الموت اور محاسبہ اعمال کے مسئلہ کو بھی کھول کر بیان کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ساری تعلیمات میں ایک تہائی حصہ بعث بعد الموت پر مشتمل ہے۔ اللہ نے آخرت کے معاملہ کو اس قدر اہمیت دی ہے اور ان سورتوں کا چوتھا مضمون قرآن پاک کی حقانیت و صداقت ہے۔ دنیا میں بیشمار لوگ ایسے ہیں جو قرآن کو خدا کا کلام ماننے کے لیے تیار نہیں اور اس ضمن میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ نے قرآن پاک کی حقانیت و صداقت کو مختلف دلائل سے واضح کیا ہے اور منکرین کے زعم باطل کا رد فرمایا ہے۔ آج کے درس میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

نزولِ قرآن

ارشاد ہوتا ہے وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ بیشک یہ قرآن پاک البتہ اتارا ہوا ہے رب العلمین کی طرف سے یہ کلام الٰہی ہے کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے اور اس کے طریقہ نزول کے متعلق فرمایا نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ اس کو ایک امانتدار فرشتہ جبرائیل علیہ السلام لے کر اترا ہے۔ روح کا معنی جبرائیل فرشتہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام پر وحی لانے پر مامور رہا ہے اور وہ امانتدار ہے کہ اللہ کا پیغام بغیر کمی بیشی اس کے انبیاء اور رسل تک پہنچاتا رہا ہے۔ یہ اللہ کی عظیم المرتبت مخلوق میں سے مقرب ترین فرشتہ ہے جس نے اس قرآن پاک کو اتارا ہے عَلَىٰ قَلْبِكَ آپ کے قلب مبارک پر لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ تاکہ ہو جائیں آپ ڈرسنانے والوں میں سے۔ گویا نزول قرآن کا یہ مقصد یہ بھی ہے کہ مجرمین کو ان کے برے انجام سے آگاہ کر دیا جائے۔ سورۃ المدثر میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اے مدثر قُمْ فَأَنذِرْ (آیت ۲) آپ اٹھ کھڑے ہوں اور مخلوق کو ان کے برے انجام سے ڈرا دیں۔ ہر نبی مبشر اور منذر ہوتا ہے۔ نیکی والوں کو اچھے انجام کی خوشخبری اور برائی والوں کو برے انجام کی اطلاع دیتا ہے سورۃ الانعام میں ہے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (آیت ۵۶) ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشخبری دینے اور ڈرانے والے بنا کر۔

نزول قرآن کی مختلف صورتیں

فرمایا ہم نے یہ قرآن روح الامین کی وساطت سے آپ کے قلب مبارک پر اتارا ہے

عام طور پر وحی کے نزول کی یہی صورت رہی ہے۔ تاہم بعض دوسرے طریقوں سے بھی وحی
کا نزول ہوتا رہا ہے۔ ایک صحابی نے آنحضور علیہ السلام سے عرض کیا حضور! کَیْفَ یَاْتِیْکَ
الْوَحْیُ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض
کبھی فرشتہ انسانی شکل میں متشکل ہو کر آتا ہے اور میں اس کی بات کو یاد کر لیتا ہوں۔ اور کبھی ایسا
ہوتا ہے یَاْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَۃِ الْجَرَسِ وحی اس طرح آتی ہے جیسے گھنٹی بجتی ہے
مگر اس کی آواز کو کوئی دوسرا شخص نہیں سن سکتا۔ اس کی کیفیت صرف آپ ہی تک محدود ہوتی ہے
اور یہ وحی قلب پر براہ راست آتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ علیہ السلام کے قلب کی تعریف
میں فرماتے ہیں کہ آپ کا قلب قَلْبٌ وَکِیْعٌ (مضبوط دل) فرمایا ہے۔ اور
سننے کے لیے دو کان اور دیکھنے کے لیے دو آنکھیں ہیں۔ بہرحال حضور نے فرمایا وحی
کی یہ قسم بہت زیادہ شدید ہوتی ہے کیونکہ فرشتہ حظیرۃ القدس سے براہ راست
آپ کے قلب کے ساتھ تعلق جوڑ کر وحی الٰہی لاتا ہے۔ آپ نے فرمایا ھُوَ اَشَدُّ عَلَیَّ[1] یہ
صورت مجھ پر بڑی شاق ہوتی ہے۔ صحابہ کرام بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ
جنوری کی شدید سردی میں بھی نزول وحی کے وقت حضور علیہ السلام کی پیشانی مبارک سے
پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ آنحضرت علیہ السلام کا رنگ بھی متغیر ہو جاتا اور ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ آپ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ مسلم شریف کی روایت
میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جب ایسی ہی حالت طاری ہوئی اور پھر آپ کی حالت معمول
پر آئی تو آپ نے فرمایا۔ لوگو! خوشخبری حاصل کرو کہ اللہ نے مجھ پر سورۃ الکوثر نازل فرمائی ہے
پھر آپ نے اس مختصر ترین سورۃ کی تلاوت فرمائی۔

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ وحی کے نزول کی صورت میں انسلاخ ہوتا ہے یعنی ایسی حالت
میں اللہ کا نبی بشریت سے نکل کر ملکیت کی طرف آتا ہے اور ادھر فرشتہ بلندی سے
نیچے اتر آتا ہے۔ اس طرح گویا دونوں طرف سے انسلاخ ہوتا ہے تاکہ وحی الٰہی پیغمبر
کے قلب پر اتر سکے۔ اس طرح وحی کے الفاظ اور ان کے مطالب پوری طرح دل پر
منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلب مبارک وہ عظیم قلب تھا،

[1] بخاری ص۲ ج۱ (فیاض)

قلبِ انسانی

جس پر پورا قرآن پاک نازل ہوا۔

انسانی جسم میں دل اور دماغ کو رئیس الاعضاء کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں اعلیٰ ترین عضو ہیں۔ دماغ انسانی اور قوت ذہنی کے اعتبار سے انسان کا قلب رئیس الاعضاء ہے۔ جب کہ امور طبعیہ و حس و حرکت کے اعتبار سے دماغ اعلیٰ عضو ہے۔ اخلاق اچھا ہو یا برا اس کا مرکز یہی انسانی دل ہے۔ اسی لیے انسانی سزا کے متعلق اللہ کریم فرماتا ہے کہ دوزخ کی آگ سب سے پہلے انسان کے دل پر اثر انداز ہوگی۔ سورۃ الہمزہ کے الفاظ ہیں۔ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (آیت ۷) یہ وہ آگ ہے جو دلوں پر چڑھے گی۔ جسم پر اس کا اثر بعد میں ہوگا۔ بہر حال جس شخص نے قلب جیسے مرکزِ اخلاق عضو کو خراب کر دیا تو سزا کا اثر بھی سب سے پہلے اسی پر ہوگا۔ ہر آدمی کے سینے میں قلب ایک بے مثال نعمت ہے اور جس دل پر قرآن نازل ہوا وہ سب سے عظیم قلب ہے۔ اس دل میں جو نورانیت اور کمال تھا وہ کسی مخلوق کے کسی دل میں نہیں ہے۔

قرآن اور عربی زبان

فرمایا اس قرآن پاک کو روح الامین لے کر آئے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ جس کی زبان عربی ہے جو کہ بالکل واضح اور فصیح زبان ہے۔ اس سے یہ بھی مراد لیا جاتا ہے کہ عربی زبان میں نازل ہونے والا یہ قرآن پاک اپنے مقدمین مطالب معانی دلائل مسائل احکام اور شواہد کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کہلانے کا مستحق وہی نسخہ ہوگا جو عربی زبان میں ہو۔ محض کسی دوسری زبان میں ہونے والا ترجمہ قرآن نہیں کہلا سکتا۔ مگر قرآن میں جو حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (المزمل ۲۰) نماز میں جتنا میسر آسکے قرآن پڑھا کریں۔ اور قرآن وہی ہے جو عربی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں نہیں پڑھی جا سکتی۔ بعض ملحد کہتے ہیں کہ ہم عربی کو سمجھتے نہیں لہٰذا اگر نماز اپنی زبان اردو، پنجابی وغیرہ میں پڑھ لیا کریں تو مطلب بھی سمجھ میں آئے گا اور نماز اچھے طریقے سے ادا ہوگی۔ یہ سخت بے دینی کی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ نماز اور قرآن پاک کی چند سورتوں کا ترجمہ

سیکھ لیا جائے۔ انہوں نے نماز کو اردو میں منتقل کرنے کی تجویز پیش کر دی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ انگریزی، فارسی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھنے میں تو کوئی دقت محسوس نہیں کرتے مگر قرآن پاک کی زبان عربی بھاری آتی ہے تو اس کو سیکھنے کی بجائے قرآن اور نماز کے ترجمے پر گزارہ کرنا چاہتے ہیں۔ آدمی تھوڑی سی کوشش کرے تو نماز کی حد تک تو قرآن کے الفاظ اور ترجمہ سیکھ سکتا ہے، اور پھر پوری دلجمعی کے ساتھ نماز ادا کر سکتا ہے۔

سابقہ کتب کی پیشین گوئیاں

فرمایا وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ اور بیشک یہ قرآن البتہ پہلی کتابوں میں بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ذکر اور اس کی پیشین گوئیاں سابقہ صحائف یعنی کتب الٰہیہ میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ تورات میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے موسیٰ! میں تیرے بھائی بندوں میں سے تیرے جیسا عظیم رسول برپا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یہ وہی کلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی صورت میں نازل فرمایا۔ اور بھائی بندوں سے مراد دوسرا خاندان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی خاندان سے تھے جب کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسماعیلی خاندان سے ہے۔ البتہ دونوں خاندان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، لہٰذا یہ آپس میں بھائی بند ٹھہرے۔

کلام منہ میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کو اپنا کلام سکھاؤں گا۔ دوسری جگہ مذکور ہے کہ قرآن پاک کے بعض مضامین پہلی کتابوں میں بھی موجود ہیں، مثلاً توحید، رسالت اور معاد مذہبی کی تعلیمات کا جزو رہے ہیں۔ بہت سے دیگر اصول بھی تمام نبیوں میں متفق علیہ رہے ہیں۔ قصاص کا مسئلہ جس طرح قرآن پاک میں ہے اسی طرح تورات میں بھی تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان وغیرہ۔ قرآن پاک میں اس قدر علوم و معارف موجود ہیں کہ کوئی انسان ان سب پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ قرآن خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے جو کہ خدا کی صفت اور اس کا علم لامحدود ہے۔ لہٰذا کوئی انسان قرآن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ البتہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ کوئی شخص جس قدر قرآن میں غور و فکر کرے گا۔

اس کے ذہن اور اس کی معلومات میں اسی قدر وسعت پیدا ہوگی اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک ترقی کرتا چلا جائے گا۔

فرمایا اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے۔ اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کہ اس قرآن پاک کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں کہ یہ واقعی وہی کتاب ہے جس کی پیشین گوئیاں سابقہ کتب سماویہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ منصف مزاج علمائے بنی اسرائیل اس کی گواہی دیتے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن سلام اور بعض دیگر علماء شامل ہیں جو سابقہ کتابوں کے عالم تھے اور جنہیں اللہ نے ایمان کی دولت بھی نصیب فرمائی۔ انہوں نے تصدیق کی یہ اللہ کی سچی کتاب ہے۔ جس کی پیشین گوئیاں سابقہ کتب میں موجود ہیں۔ فرمایا اس بات کو تو بنی اسرائیل کے علما بخوبی جانتے ہیں تو کیا یہ بات مشرکین کے لیے کافی دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟

ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ اور اگر ہم اس قرآن کریم کو کسی عجمی (غیر عربی) پر فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ پھر وہ ان کو پڑھ کر سناتا مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ تو پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، پھر ان کا بہانہ یہ ہوتا کہ ہم عربی ہیں اور اس عجمی کی بات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ کفار یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اللہ کا رسول عربی ہے اور قرآن بھی عربی ہے کہ یہ اس کا خود ساختہ ہو سکتا ہے اگر یہ قرآن کسی غیر عربی پر اترتا اور وہ ہمیں پڑھ کر سناتا تو ہم مان جاتے کہ واقعی یہ خدا کا کلام ہے جو ایک غیر عربی کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ منکرین نے ہر صورت میں انکار ہی کرنا ہوتا ہے، وہ کوئی بھی حیلہ بہانہ تلاش کر سکتے ہیں۔

انکار کے لیے حیلے بہانے

فرمایا كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ اسی طرح ہم نے اس (انکار) کو مجرموں کے دلوں میں چلایا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح کے حیلے بہانوں سے لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ اس کلام الٰہی پر ایمان نہیں لاتے حتیٰ

يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ یہاں تک کہ دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔
یہ لوگ آخر عذاب ہی کا کیوں انتظار کر رہے ہیں جب وہ آئے گا۔ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً
وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ تو وہ اچانک آجائیگا اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ فَيَقُولُوا
هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ پھر اس وقت کہیں گے کاش ہمیں کچھ مہلت مل
جائے۔ اگر یہ عذاب کسی طرح ٹل جائے تو اب ہم ایمان لے آئیں گے۔ اللہ نے
فرمایا أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے بارے میں جلدی کرتے
ہیں یہ مطالبہ کہ ان کا رویہ اس قدر غافلانہ ہے کہ یہ عذاب کو خود دعوت دے رہے
ہیں مگر جب وہ وارد ہو جائیگا تو پھر مہلت مانگنے لگیں گے۔

فرمایا أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ آپ دیکھیں اگر ہم ان کو
کئی سال تک فائدہ دیتے رہیں یہ جس طرح آج عیش و آرام میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح
ہم ان کو مزید سال ہا سال تک اس دنیا میں فائدہ پہنچاتے رہیں ثُمَّ جَاءَهُمْ
مَا كَانُوا يُوعَدُونَ پھر آجائے ان کے پاس وہ چیز جس کا ان سے وعدہ کیا
جاتا ہے یعنی سال ہا سال کے عیش و آرام کے بعد اگر ان پر عذاب آجائے۔ مَا
أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ تو یہ مال و دولت اور جاہ و اقتدار کچھ
فائدہ نہیں دے گا یعنی کوئی چیز ان کو اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکے گی۔ دنیا کے یہ
سارے ساز و سامان دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اور اس وقت یہ لوگ کف افسوس
ملیں گے۔

اتمام حجت

آگے اللہ نے تسلی کے سلسلے میں فرمایا وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا
مُنْذِرُونَ ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لیے ڈرانے والے
ہوتے تھے۔ پہلے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام یا ان کے مبلغین کو بھیج کر حجت
تمام کرتا ہے اور پھر کسی قوم پر گرفت کرتا ہے۔ ذِكْرَىٰ نصیحت کی باتیں ہیں
جو لوگوں کو سمجھائی جاتی ہیں تاکہ وہ ایمان قبول کر لیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بغیر خبردار کیے
اور بغیر موقع دیئے کسی قوم پر عذاب بھیج دیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی ہے وَمَا

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

ترجمہ:۔ اور نہیں اُتارا اس (قرآن) کو شیاطین نے ﴿۲۱۰﴾ اور نہیں لائق اُن کے لیے اور نہ وہ (ایسا کرنے کی) طاقت رکھتے ہیں ﴿۲۱۱﴾ بیشک وہ تو سُننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں ﴿۲۱۲﴾ پس آپ نہ پکاریں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود، پس ہو جائیں گے آپ سزا یافتہ لوگوں میں سے ﴿۲۱۳﴾ اور آپ ڈرا دیں اپنے قریبی

رشتہ داروں کو (۲۱۴) اور پست کر دیں اپنا بازو اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے آپ کی پیروی کی ہے ایمان والوں میں سے (۲۱۵) پس اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ کہہ دیں بیشک میں بری ہوں اُن چیزوں سے جو تم کرتے ہو (۲۱۶) اور آپ بھروسہ رکھیں خدائے عزیز پر جو نہایت رحم کرنے والا ہے (۲۱۷) وہ جو دیکھتا ہے آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں (۲۱۸) اور آپ کا پلٹنا سجدہ کرنے والوں میں (اس کو بھی دیکھتا ہے) (۲۱۹) بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (۲۲۰) (آپ کہہ دیجئے) کیا میں بتلاؤں تم کو وہ شخص جس پر اترتے ہیں شیاطین (۲۲۱) اترتے ہیں ہر جھوٹ بولنے والے گنہگار پر (۲۲۲) وہ ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات کو۔ اور اکثر اُن میں سے جھوٹے ہوتے ہیں (۲۲۳)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا ذکر کیا تھا اور اس کا اجمالی تعارف کرایا تھا۔ اس عظیم کتاب کو جبرائیل امین نے پروردگار عالم کے حکم سے نازل کیا۔ یہ کلام الٰہی پیغمبر کے قلب مبارک پر نہایت فصیح و بلیغ عربی زبان میں اُتارا گیا۔ اس کے نزول کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ اللہ کے نبی اس کے ذریعے لوگوں کو ان کے آخرت کے بُرے انجام سے ڈرا دیں۔ یہ وہی کتاب ہے جس کے مضامین اور پیشین گوئیاں سابقہ کُتب میں بھی موجود تھیں۔ ان حقائق کے باوجود جو شخص اس قرآن کا انکار کرتا ہے وہ کافر اور گمراہ تصور ہوگا۔ قرآن کے منکرین میں سے بعض اسے سحر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے اسے شعر و شاعری کی ایک قسم پر محمول کرتے ہیں بعض یہ بھی کہتے تھے کہ جنات اور شیاطین آکر یہ قرآن پیغمبر کو سکھلاتے ہیں

آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی زعمِ باطل کی تردید کی ہے اور واضح کیا ہے کہ شیاطین یا جنات قرآن نہیں بنا سکتے اور نہ ہی انہوں نے یہ اتارا ہے مشرک لوگ محض ہٹ دھرمی اور عناد کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔

شیاطین کی دخل اندازی

ارشاد ہوتا ہے وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ اور اس قرآن پاک کو شیطان نہیں اتارتے۔ نزولِ قرآن کے سلسلے میں اس رکوع کی ابتداء میں بیان ہو چکا ہے وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (آیت ۱۹۲) یہ تو پروردگارِ عالم کا نازل کردہ ہے۔ لہٰذا اس میں شیاطین کی دخل اندازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرمایا وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ شیطانوں کے تو یہ لائق ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن اتار سکیں وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اور نہ وہ ایسا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ ان کے تو بس کی بات ہی نہیں ہے۔ قرآن کا نزول تو درکنار اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ شیاطین کو تو اس جگہ سے بھی دور رکھا جاتا ہے جہاں سے قرآن سنا جا سکتا ہے۔ ان کو تو قریب تک نہیں پھٹکنے دیا جاتا، لہٰذا نزولِ قرآن ان کے ساتھ کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیاطین کا کلام تو شر و فساد پر مبنی ہوگا، جس سے لوگوں کے افکار خراب ہوں اور عقیدہ بگڑے۔ شیاطین کا تو کام ہی بداخلاقی، بد اعمالی، فحاشی، بدکاری اور لڑائی جھگڑا پیدا کرنا ہے۔ اس کے برخلاف قرآن پاک کلام پڑھنے سے فکر صحیح اور عقیدہ درست ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاق و اعمال اچھے ہوتے ہیں اور وہ شر و فساد سے دور رہتے ہیں۔ گویا تلاوتِ قرآن پاک بہترین نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس کے پڑھنے والوں میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ یہ قرآن پاک کی اثر انگیزی تھی کہ دنیا میں صحیح خلافت قائم ہوئی جس کے ذریعے بہترین نظامِ حکومت قائم ہوا۔ چنانچہ اسلامی معیشت و معاشرت، تجارت اور صنعت ایسے اصولوں پر قائم ہوئی جس کی مثال آج تک دنیا پیش نہیں کر سکی۔

قرآن کی حقانیت کا اعتراف

خلافتِ راشدہ خصوصاً پہلے دو خلفائے راشدین کے قائم کردہ نظام کی پوری دنیا

معترف ہے۔ دنیا کے تمام مسلم اور غیر مسلم سائنسدان، مورخ اور دانشور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قسم کا بہترین نظام حکومت دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ مہاتما گاندھی ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیت گزری ہے، بڑی عبادت و ریاضت کرنے والا آدمی تھا اگرچہ وہ ہندو تھا مگر دوسرے مذاہب کو سچا مانتا تھا۔ منصف مزاج تھے، انجیل، قرآن اور ویدوں کو بھی سچا تسلیم کرتا تھا۔ انگریز کے زمانے میں جب پہلی دفعہ ہندوستان میں وزارت بنی تو گاندھی نے ہندوستانی وزراء کو نصیحت کی تھی جس کے الفاظ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اگر دنیا میں کامیابی چاہتے ہو تو حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق جیسا نظام قائم کرو۔ ظاہر ہے کہ ان خلفاء کا قائم کردہ نظام معیشت، معاشرہ اور عدل قابل رشک تھا جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکی۔ یہ نظام قرآن کا پیدا کردہ تھا۔ اس کی تعلیمات کا اثر تھا۔ اس کے برخلاف عملاً شیاطین کا کلام تو کفر و شرک، بداخلاقی اور فحاشی ہی پیدا کر سکتا ہے۔ امریکی، روسی، برطانوی، چینی، سب شیطانی نظام ہائے حکومت ہیں۔ جن سے ظلم و تعدی، بدکاری، لہو و لعب اور ناانصافی ہی نشوونما پا سکتی ہے یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آج مادی ترقی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، مگر دوسری طرف انسانیت جہنم کے گڑھے میں جا رہی ہے۔ عقل معاش ترقی پر ہے مگر عقل معاد کا جنازہ نکل چکا ہے۔ چند عیش پرستوں کے سوا باقی دنیا تنگدستی میں مبتلا ہے کمزوروں پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہے لہٰذا اس کو حقیقی ترقی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اصلی ترقی وہی ہوگی جو اللہ کا قرآن پیش کرے گا۔ تو فرمایا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جسے مقدس ترین فرشتے نے کر نازل ہوا ہے۔ اس قرآن کا نزول پوری کائنات میں پاکیزہ ترین قلب محمدی پر ہوا ہے۔ اس کو شیاطین نہیں اتار سکتے اور نہ ہی یہ ان کے لائق ہے۔ وہ تو اس کو سننے سے بھی عاجز ہیں۔ جب قرآن پاک کا نزول ہوتا ہے تو پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں تاکہ شیاطین اس میں دخل اندازی نہ کر سکیں۔ لہٰذا مشرکین کا یہ دعویٰ لغو ہے کہ یہ قرآن پاک جنات اور شیاطین اللہ کے نبی کو سکھاتے ہیں

توحید کی اہمیت

ہم نے کل کے درس میں عرض کیا تھا کہ قرآن پاک کے چار اہم مضامین توحید، رسالت

معاد اور قرآن کی حقانیت و صداقت ہیں۔ ان میں سے توحید باری تعالیٰ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے توحید کی تعلیم کو قرآن پاک میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ توحید ہی دین کا مرکز و محور ہے جس کے گرد پورے دین کی عمارت گھومتی ہے۔ اگر یہی اصول بگڑ گیا تو اسلام کی عمارت کا کوئی حصہ درست نہیں رہے گا اور ساری عمارت ویران ہو جائے گی، چنانچہ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ کسی دوسرے کو اللہ کے ساتھ معبود نہ بناؤ۔ اگر ایسا کرو گے۔ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ پس ہو جائیں گے آپ سزا یافتہ لوگوں میں سے۔ اللہ نے مختلف سورتوں میں شرک کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے۔ کہیں فرمایا کہ اگر خدا کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ گے تو ملعون اور ذلیل ہو کر رہ جاؤ گے۔ کہیں فرمایا کہ جہنم کے مستحق ٹھہرو گے، اور کہیں خدا کی ناراضگی کا ذکر کیا ہے۔ غرضیکہ توحید ایک ایسا معاملہ ہے جس میں کسی طرح بھی رخنہ اندازی نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھنے کے معاملہ میں ذرا بھر بھی رعایت نہیں رکھی گئی۔ اخلاق و اعمال کے بارے میں تو کسی حد تک رعایت دی جا سکتی ہے مگر عقیدے کی خرابی کے معاملہ میں رعایت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام ۱۳)

امن ان لوگوں کو ملے گا اور ہدایت یافتہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ایمان میں ظلم یعنی شرک کی ملاوٹ نہیں کی۔ اگر ایمان میں کفر، شرک یا نفاق کی ملاوٹ ہے تو وہ ناقابل برداشت ہے۔ الٰہ صرف وہی ہے جو واجب الوجود، قادر مطلق، علیم کل، مختار مطلق، نافع اور ضار ہے۔ جو ہر ایک کی مراد پوری کرنے والا اور ہر دکھ درد کو دور کرنے والا ہے اس کے علاوہ کسی کی عبادت روا نہیں۔ کوئی بھی تکلیف آئے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو مت پکارو کہ یہ بھی عبادت میں داخل ہے۔ اللہ کی ذات، اس کی صفات یا اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بناؤ، ورنہ تم سزا یافتہ لوگوں میں ہو جاؤ گے۔ اللہ کا واضح اعلان ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ

يَشَآءُ (النساء ۔ ۴۸) اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے معاف فرمائے اللہ تعالیٰ نے یہ اہم ترین مسئلہ بھی بیان فرما دیا ہے۔

تبلیغ کا آغاز گھر سے

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسالت کے سلسلے میں ایک اصول بیان فرمایا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اور آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا دیں۔ تبلیغ کا آغاز اپنے گھر سے کرنا ایک بہت بڑا اصول ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے سارے قریش کو اکٹھا کیا۔ بخاری شریف[1] میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی پھوپھی، بیٹی اور چچی کو بھی خطاب کیا۔ آپ نے فردی خطاب بھی کیا اور عمومی بھی۔ آپ نے فرمایا اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِّنَ النَّارِ اپنی جانوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا میں اللہ کے سامنے تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ پھر فرمایا سَلُوْنِیْ مِنْ مَّالِیْ تم مجھ سے مال تو طلب کر سکتے ہو مگر میں تمہیں خدا کی سزا سے نہیں بچا سکوں گا۔ لہٰذا اپنی فکر آپ کر لو۔ آپ کوہ صفا پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا یَا صَبَاحَاهُ یہ نعرہ عرب نہایت خطرے کے موقع پر لگایا کرتے تھے جب یہ آواز سن کر چالیس کے قریب آدمی جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا اے لوگو! اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمہارا دشمن سب جرم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کر لو گے؟ لوگوں نے کہا کہ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم ضرور یقین کریں گے کیونکہ ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا یعنی آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ سخت عذاب سے پہلے اپنے آپ کو بچا لو۔ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا کلمہ طیبہ پڑھ لو، فلاح پا جاؤ گے۔ اس پر قریش سخت برہم ہوئے اور سب سے پہلے ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا تمہاری تباہی ہو، کیا اس مقصد کے لیے ہمیں جمع کیا تھا؟ غرضیکہ کسی نے آپ کی بات نہ مانی اور منتشر ہو گئے۔

مرکزیت کی ضرورت

اصلاح کا آغاز اپنے قرابت داروں سے کرنے کا اصول بالکل طبعی ہے اس

---

[1] بخاری ص ۷۰۲ ج ۲، و مسلم ص ۱۱۴ ج ۱ [2] بخاری ص ۷۴۳ ج ۲، و مسلم ص ۱۱۴ ج ۱ (فیاض)

اصول کے ذریعے جب اپنے گھر والوں اور پھر عزیز و اقارب کی اصلاح ہو جائیگی تو اصلاح عامہ کے لیے ایک بنیاد فراہم ہو جاتی ہے مرکز بناکر تبلیغ و اصلاح کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے بھی خطہ عرب کو ایک مرکز کی حیثیت سے کہ دین حق کو آگے پھیلانے کا مرکز بنایا۔ چنانچہ آپ نے نصیحت فرمائی کہ اس سرزمین میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین باقی نہیں رہنے دینا۔ آپ کی آخری وصیت یہی تھی اَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ یعنی یہود و نصاریٰ کو سرزمین عرب سے نکال باہر کرو۔ جب یہاں کا احوال درست ہو جائے گا تو پھر باہر سے آنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جب ایران کے ساتھ قادسیہ کے مقام پر شدید جنگ ہو رہی تھی تو حضرت عمرؓ نے بنفسِ نفیس وہاں جا کر جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس سے پہلے آپ دو دفعہ شام کا سفر کر چکے تھے۔ مگر حضرت علیؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ خود ایران تشریف نہ لے جائیں بلکہ یہاں مرکز اسلام میں بیٹھ کر ایک قطب (چکی کا مرکزی کیل) کی طرح ملک کی چکی کو چلائیں۔ اگر آپ نے مرکز کو چھوڑ دیا تو کوئی دشمن سازش کر کے فتنہ و فساد نہ برپا کر دے لہٰذا بہتر ہے کہ آپ مرکز کی مضبوطی کا خیال رکھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند کیا اور مرکز میں بیٹھ کر ایران کی جنگ لڑی۔ آپ وہیں سے ہدایات بھیجتے رہے۔ قادسیہ کی یہ مشہور جنگ تین دن اور تین رات تک مسلسل جاری رہی۔ بالآخر اللہ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی اور ایرانی مجوسیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اصلاح کیلئے نمونے کی ضرورت

جب کسی ملک کا احوال اصلاح یافتہ بن جائے تو وہ ملک بیرون ملک عوام کے لیے بھی مرکز اصلاح بن سکتا ہے۔ اور اگر اپنے ہی ملک میں گندگی ہوگی تو دوسروں کو اصلاح کی دعوت کیسے دی جا سکے گی۔ یہاں کے ایک طالب علم نے سویڈن کے حالات بیان کیے۔ وہ وہاں پر ڈیڑھ سال تک ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم نے وہاں کے لوگوں کو بھی کبھی اسلام کی دعوت دی۔ تو وہ کہنے لگا۔ ہاں! اپنے دوستوں میں تبلیغ کا آغاز کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تم تو غلام ملک کے باشندے ہو کیا اسلام پیش کر کے ہمیں بھی غلام بنانا چاہتے ہو۔ ایک اور دوست جو مصر اور مشرق وسطیٰ کا

دورہ کرچانی کہنے لگا کہ ان ممالک میں چور رہتے ہیں۔ اسلام قبول کر کے کیا ہم بھی چور بن جائیں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں کہ خود ہمارے ملک میں کتنے چور ہیں۔ ان کو دیکھ کر کون مسلمان ہوگا؟ جہاں تک غلامی کا تعلق ہے کچھ مسلمان روس کے غلام ہیں اور کچھ امریکہ کے۔ پہلے ہم برطانیہ کی غلامی میں تھے۔ اب امریکہ کی جھولی میں ہیں۔ نہ ہماری سیاست آزاد ہے، نہ معیشت اور نہ معاشرت۔ ہماری ٹیکنالوجی وہاں سے آتی ہے۔ اُن کے مشیر ہمارے مشورہ دیتے ہیں تو پلان بنتے تھے۔ بحیثیت غلام ہماری کوئی وقعت نہیں۔ علامہ اقبال نے بڑا زور دیا کہ اپنے مقام پر پہنچو گے تو دنیا میں عزت پاؤ گے ورنہ ذلیل و خوار ہی ہوتے رہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ اصلاحِ عالم کے لیے پہلے خود نمونہ بنو گے تو دعوت آگے بڑھے گی ورنہ کوئی شخص تمہاری بات سننا بھی گوارا نہیں کریگا۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی وجہ سے قریش کو سعادت بخشی۔ یہ لوگ ایمان لا کر آپ کے دست و بازو بنے۔ پھر اُن کے ساتھ انصار کی جماعت مل گئی۔ اس کے بعد مہاجرین اور انصار مل کر ایک مرکزی جماعت بن گئے اور دعوت نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ یہی لوگ اہلِ حل و عقد تھے اور ان کی رائے سے دنیا بھر کے معاملات طے ہونے لگے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی

آگے ارشاد ہوتا ہے۔ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ آپ اپنے بازو اپنے متبعین کے لیے پست کر دیں ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے ہیں۔ نبی کی حیثیت سے تو آپ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ۔ ۱۲۸) فرمایا بحیثیت حاکم اور امیر جماعت بھی آپ اہلِ ایمان کے ساتھ نرمی اختیار کریں۔ درشتی اور سختی کی بجائے افہام و تفہیم کو اصول بنائیں۔ البتہ جب کوئی اللہ کی حدود کو توڑے تو پھر وہ سختی کا مستحق ہے ورنہ حضور علیہ السلام سے زیادہ نرم مزاج دنیا میں کوئی نہ تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص حدود اللہ کو توڑتا تو آپ کو ایسا غصہ آتا کہ کوئی بھی آپ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ آپ مظلوم کو اس کا حق دلائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے تھے، لیکن عام حالات میں

جو بھی آپ کے قریب آتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔ تو فرمایا کہ آپ پست کر دیں اپنا بازو اُن کے لیے جنہوں نے آپ کا اتباع کیا مومنوں میں سے۔ فَإِنْ عَصَوْكَ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ تو آپ کہہ دیں کہ میں تمہارے ان اعمال سے بیزار ہوں میں ان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ فرمایا وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ہر حالت میں خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھیں۔ وہ خدا ہے ذوالجلال الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ جو دیکھتا ہے آپ کو جب آپ عبادت کے لیے رات کو کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ آپ کو اُس وقت بھی نگاہ میں رکھتا ہے وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ جب آپ پھرتے ہیں سجدہ کرنے والوں میں یعنی جس وقت باجماعت عبادت الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر کیفیت سے واقف ہوتا ہے إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بے شک وہ خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے۔

نزول شیاطین

اس درس کی ابتدائی آیت میں بتلایا جا چکا ہے کہ اس قرآن پاک کو نازل کرنے والے شیاطین ہرگز نہیں، نہ ہی وہ ایسا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اب اسی بات کو دوسرے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے کہ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ وہ کیا میں آپ کو یہ بتلاؤں کہ شیاطین کس پر اُترتے ہیں؟ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ وہ تو ہر جھوٹے اور گنہگار شخص پر اُترتے ہیں۔ شیاطین کسی سنی سنائی بات کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر کاہن اور نجومی کے کان میں ڈال دیتے ہیں جو غیب سے کر آگے لوگوں کو خبریں بتاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بات بھی سچی ہو گئی تو اس مشہور ہو گئی اور جیال کا کاروبار چل پڑا۔ فرمایا يُلْقُونَ السَّمْعَ وہ سنی سنائی بات ڈال دیتے ہیں وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ شیاطین کی حیثیت تو یہ ہے۔ برخلاف اس کے اللہ کا نبی تو پاک ہوتا ہے۔ اس کا اخلاق بہترین ہوتا ہے۔ اس کا دل پاکیزہ ہوتا ہے اور وہ بہترین صلاحیت کا

حامل ہوتا ہے جس پر اللہ کی طرف سے مقرب ترین فرشتہ قرآن لے کر نازل ہوتا ہے۔ بھلا شیاطین کی کیا مجال کہ وہاں دم مار سکیں۔ ان کا داؤ تو جھوٹے اور گنہگار شخص پر چلتا ہے

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ:- اور شاعر لوگ، پیروی کرتے ہیں اُن کی گمراہ لوگ ﴿۲۲۴﴾ کیا نہیں دیکھا تو نے کہ وہ (شاعر) ہر وادی میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں ﴿۲۲۵﴾ اور بیشک وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ﴿۲۲۶﴾ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا، اور انہوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور وہ عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم کیا کہ کس کروٹ پر وہ پلٹتے ہیں ﴿۲۲۷﴾

ربطِ آیات

اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر تسلی کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ مختلف انبیاء علیہم السلام اور اُن کی قوموں کا حال بیان کر کے قوموں کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ حضور علیہ السلام اور آپ کے ماننے والے دل برداشتہ نہ ہوں اور جان لیں کہ اہلِ حق کو ہمیشہ ایسی ہی تکالیف برداشت کرنا پڑی ہیں، تاہم انجام ہمیشہ انہیں کا اچھا ہوتا رہا ہے اور نافرمان ناکام و نامراد ہی رہے ہیں۔ دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی چار بنیادی مسائل بیان ہوئے ہیں یعنی توحید، رسالت، معاد اور قرآن پاک کی حقانیت

صداقت۔ گذشتہ درس میں صداقتِ قرآن کا بیان تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بے مثال کلام ہے اور
اور ایسا کلام نازل کرنا شیاطین کی قدرت میں نہیں ہے۔ اس کو اتارنے والا رب العالمین
لانے والا روح الامین اور جس ہستی کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا ہے وہ پوری مخلوق میں لطیف
پاکیزہ اور اعلیٰ قدروں کی حامل ہے۔

شعر و شاعری کی نفی

مشرک لوگ حضور علیہ السلام کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے تھے کبھی کاہن کہتے
کبھی جادوگر اور کبھی شاعر۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم سے شاعری
کی نفی کی ہے۔ شعر و شاعری کے رموز سے واقف لوگ خود بھی اقرار کرتے تھے کہ قرآن پاک
کو شعر و شاعری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت ابو ذر غفاریؓ کے بھائی انیسؓ جو خود بہت
بڑے شاعر تھے، انہوں نے اپنے بھائی کے پاس یہ رپورٹ پیش کی جو کہ حدیث میں موجود
ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے نبی علیہ السلام کا پیش کردہ کلام سنا ہے۔ یہ کاہنوں والا کلام نہیں
کیونکہ بحیثیت ۔۔۔ میں خود بھی اُن کے کلام سے واقف ہوں۔ پھر کہنے لگے میں ولقد و
ضعته علی اقراء الشعر میں نے اسے شاعروں کے اوزان پر بھی پرکھا ہے
مگر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کسی شاعر کا کلام بھی نہیں ہے، بلکہ یہ تو خدا تعالیٰ کا کلام اور اس
کی صفت ہے جو اس کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے
کہ یہ شیاطین کا کلام بھی نہیں ہے کیونکہ اُن کا کلام تو شر و فساد پر مبنی ہوتا ہے جب
کہ یہ کلام نہایت ہی اعلیٰ و ارفع کلام ہے جو رشد و ہدایت سے بھرپور اور امن و سلامتی
کا پیغام ہے۔

شعر و شاعری کی حقیقت

شاعری ایک فن ہے جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ شاعری ہر زبان کا موضوع
سخن رہا ہے خصوصاً عربی زبان میں تو یہ بام عروج پر تھی جب قرآن کا نزول ہو رہا تھا عربی
کے سینکڑوں اور ہزاروں بڑے بڑے شعراء گزرے ہیں جن کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے
فارسی زبان میں شاعری کو عروج نزول قرآن کے کافی عرصہ بعد حاصل ہوا۔ فارسی زبان میں
بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان کے بھی بڑے پائے کے
شعراء گزرے ہیں شعر و شاعری کا شغف ہر زمانے میں رہا ہے اور آج بھی ہے شاعر

شعور سے مشتق ہے جس کا معنی کچھ بوجھ ہوتا ہے۔ کسی حقیقت کو عام آدمی سمجھ تو سکتا ہے مگر اسے موثر طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ شاعر میں یہ ملکہ موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو نہایت موثر انداز میں شعر کی زبان میں پیش کر سکتا ہے۔ شعر سے یہی لینا ہوتا ہے کہ ایک شاعر اپنی زبان میں دوسرے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شعر و شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں اَصْوَاتٌ مُقَطَّعَةٌ بِإِزَاءِ مَعَانٍ مُتَنَوِّعَةٍ یہ موزوں آوازیں ہوتی ہیں جو طرح طرح کے معانی پر مشتمل ہوتی ہیں شعر میں وزن، قافیہ اور ردیف ہوتا ہے جس کی وجہ سے نثر کی نسبت شعر میں زیادہ کشش پائی جاتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں اصولی بات یہ ہے اَلشِّعْرُ كَلَامٌ حَسَنُهٗ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهٗ قَبِيْحٌ شعر ایک کلام ہے جس کا اچھا حصہ اچھا ہے اور برا حصہ بہرحال برا ہے۔ اشعار میں اچھے اور برے دونوں عناصر پائے جاتے ہیں اور دونوں طرح کے خیالات کو منظوم کیا جا سکتا ہے

مذموم شاعری کی قباحتیں

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شعر و شاعری پر عمومی تجزیہ فرمایا ہے جسے شعر و شاعری کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ اور شاعروں کے پیچھے چلنے والے اکثر گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ نے یہاں پر اس فن کے تین نقائص بیان فرمائے ہیں۔ پہلا نقص تو یہی ہے کہ اس کے متبعین اکثر گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور دوسرا نقص یہ ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ شاعر لوگ تخیلات کی ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ طرح طرح کے تخیلات باندھتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی بلکہ محض خیالی گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ اللہ نے اس فن کا تیسرا عیب یہ گنوایا ہے وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ یہ لوگ وہ کچھ کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔ گویا ان کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ عام طور پر شاعر لوگ نشہ باز ہوتے ہیں اور اخلاق سے گری ہوئی حرکات کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں بالعموم عشق و محبت کی داستانیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی ذہنی۔ اسی لیے فرمایا کہ ان کے پیچھے

ملنے والے بھی بالعموم گمراہ لوگ ہوتے ہیں جو حق اور جھوٹ میں امتیاز کرنے سے عاری ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی جھوٹ اور وہم پر ہو اس کا اتباع گمراہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فی الواقع کوئی شاعر جس قدر جھوٹ اور بے سروپا خیال باندھتا ہے وہ اسی قدر زیادہ داد پاتا ہے۔ بزرگانِ دین کا قول بھی ہے "احسن الشعر اکذبہ" یعنی بہترین شعر وہی ہے جس میں کوئی جھوٹی بات ہوگی، اسی قدر وہ اچھی محسوس ہوگی۔ جس شعر میں جو بات زیادہ دور لے گئے ہوں وہ زیادہ اچھا لگتا ہے۔ یا جس قدر خلافِ واقعہ اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہوگی، اُسی قدر داد کے ڈونگرے برسائے جائیں گے۔

جاہلیت کے زمانے کا امرؤ القیس بڑا مشہور و معروف شاعر گزرا ہے اس کا باپ بنی اسد کا بادشاہ تھا۔ یہ شہزادگی کے زمانے میں شعر و شاعری اور عشق بازی کی طرف راغب ہو گیا شراب نوشی بھی کرتا تھا اس لیے اس کا لقب ہی ملک الضلیل مشہور ہو گیا۔ یعنی گمراہ بادشاہ۔ دوسرے عام شاعروں کی طرح اس کے شعر میں بھی فحش اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا مذکور لقب مشہور ہو گیا۔

شاعر متنبی چوتھی صدی میں مسلمانوں کے دور کا مشہور شاعر ہوا ہے۔ اُس نے ابتدا میں نبوت کا دعویٰ بھی کیا۔ جب سخت پٹائی ہوئی تو تائب ہو گیا۔ شعراء کے اکثر دیوانوں کی طرح متنبی کے کلام میں بھی فحش اور اخلاقی لحاظ سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں کو پسند کرنے والے لوگ بھی اخلاقی لحاظ سے ویسے ہی ہوں گے۔ اسی سبب قدیم عربی شعراء کی اکثریت گمراہ ہے اور ان کے متبعین بھی ویسے ہی ہیں۔ بھلا ایسے کلام کا قرآن پاک کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ قرآن پاک کے قاری تو مثالی قسم کے باعمل لوگ ہوتے ہیں جب کہ شعراء کے قول و فعل میں غایت درجے کا تضاد پایا جاتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ (یٰسین ۶۹) ہم نے اپنے نبی علیہ السلام کو فنِ شعر نہیں سکھایا اور نہ ہی یہ اس کے لائق ہے۔ گویا شعر و شاعری منصبِ نبوت کے منافی چیز ہے۔ نبوت کی بنیاد حق و صداقت پر ہے جب کہ شاعری کی بنیاد تخیلات پر ہے۔ یہاں جتنا جھوٹا تخیل باندھا جائے گا اتنی ہی شاعری کامیاب سمجھی جاتی ہے۔

اشعار میں بادشاہ کی

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ شعر و شاعری کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ ایک شاعر نے اپنے محبوب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ؎

اے رشکِ مسیحا تیری رفتار پہ قربان
سو بار میری لاش ٹھوکر سے جلا دی

تخیل کے اعتبار سے یہ بڑا اونچے درجے کا شعر سمجھا جاتا ہے مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ پہلے تو اس نے مرنا تصور کیا ہے پھر یہ کہ اپنی لاش پر سے گزارا گویا وہ اپنی مراد پر آتی تھی اور اپنے محبوب کے پاؤں کی ٹھوکر سے تو لاش زندہ ہو گئی یعنی معقول اور خلافِ عقل بات ہے۔ اسی طرح ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

لَوْ ضَمَّ اِلٰى صَدْرِهَا
لَمْ يُحْمَلْ اِلٰى قَابِرٍ

اگر محبوب اُسے اپنی چھاتی سے لگا لے تو کوئی شخص مرنے کو قبر کی طرف نہ لے جائے یعنی محبوب کے مس سے مردہ زندہ ہو جاتا ہے اور اسے دفن کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عام طور پر ایسے ہی بے سروپا تخیلات باندھے جاتے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی سفر میں جا رہے تھے۔ راستے میں کوئی شاعر بیہودہ شعر گاتا ہوا ملا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا خُذُوا الشَّيْطٰنَ اس شیطان کو پکڑو یہ کیا گا رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا لَاَنْ يَّمْتَلِئَ جَوْفُهٗ قَيْحًا خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّمْتَلِئَ شِعْرًا اگر کوئی شخص پیٹ کو پیپ سے بھر لے تو وہ اس شعر گوئی سے بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بد اخلاق لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شاعروں کے پیچھے چلنے والے کبھی بے نماز، شراب کے رسیا اور بدکردار لوگ ہوتے ہیں جو بلا وجہ واہ واہ کرتے رہتے ہیں۔ نہ انہیں فرائض کا خیال ہے نہ کوئی اخلاق ہے اور نہ اعمال ہی قابلِ تعریف ہیں۔ میں نے خود ایک جلسے میں دیکھا کہ پچھلی طرف ایک شخص پیشاب بھی کر رہا ہے اور شاعر کو داد بھی دے رہا ہے۔ برخلاف

اس کے جن لوگوں نے قرآن پاک کو لائحہ عمل بنایا ہے اُن کے اخلاق، اعمال اور کردار اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں عام شعراء کے تجزیہ میں تین نقائص کا ذکر کیا ہے۔ اول یہ کہ شاعروں کے پیچھے چلنے والے اکثر گمراہ لوگ ہوتے ہیں جبکہ قرآن پاک پر عمل کرنے والے اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ شاعر لوگ تخیلات کے سمندر میں ہوائی گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں جب کہ قرآن کے پیروکار حقیقت کے متبع ہوتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ شاعروں کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے جب کہ عامل بالقرآن لوگ حقیقت سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ اس طرح گویا ان آیات کا تعلق سورۃ کی ابتدائی آیت تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ سے بھی ہو گیا۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں اور یہاں شعراء کے کلام کی نفی کر دی گئی ہے۔

مستثنیات

عمومی شعراء کے تذکرہ کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مستثنیات کا تذکرہ فرمایا ہے اور واضح کیا کہ مذکورہ قباحتوں کے مصداق سو فیصدی شعراء نہیں ہیں بلکہ اُن میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں اور اُن کا ذکر اس طرح فرمایا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے ایمان قبول کر لیا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیے وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اور انہوں نے کثرت سے اللہ کا ذکر کیا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا اور بدلہ لیا مظلوم بن جانے کے بعد۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعروں کا کلام بھی برحقیقت ہوگا۔ ایسے لوگ نہ تو بے حقیقت خیالی گھوڑے دوڑائیں گے نہ اُن کے قول و فعل میں تضاد ہوگا۔ لہٰذا اُن کے پیچھے چلنے والے گمراہ بھی نہیں ہوں گے۔

اِن صفات کے حامل بعض شعراء حضور علیہ السلام کے صحابہ میں بھی موجود تھے۔ تین خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور علی مرتضیٰؓ خود شعر کہتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ پوری امت میں سے اکابر صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ اسی طرح حسان بن ثابتؓ چوٹی کے شعراء میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام نے خود اُن کو کفار کی مذمت میں شعر کہنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا اُهْجُهُمْ وَجِبْرِيْلُ

ذٰلِکُمْ مَعَکَ۔ اے حسانؓ! ان کی ہجو بیان کرو۔ جبرائیل امین تمہاری تائید میں ہیں چنانچہ آپ مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر کفار کی مذمت بیان کیا کرتے تھے۔

کعب بن زہیرؓ بھی بڑے شاعر تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے۔ شماس بن نضرؓ شاعر تھے۔ عبداللہ بن رواحہؓ کا شمار اونچے درجے کے شعرا میں ہوتا تھا۔ لبیدؓ بھی شاعر تھے مگر اسلام لانے کے بعد انہوں نے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی جس میں نوے سال جاہلیت کا اور ساٹھ سال اسلام کا دور گزارا۔ کہتے تھے اب مجھے شعر و شاعری سے کوئی رغبت نہیں۔ مجھے قرآن کافی ہے۔ وہی پڑھتا رہتا ہوں۔ اسی طرح ابو سفیانؓ بھی شاعر تھے۔ ابتدائی زمانہ میں اسلام کی سخت ترین مخالفت کی مگر جب ایمان لے آئے تو آپ اور پورے خاندان نے اسلام کی خدمت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ آپ شعروں کے ذریعے کفار کی مذمت بیان کیا کرتے تھے۔ بہرحال اس قسم کے شعرا بہت قلیل تعداد میں تھے جنہوں نے خدمتِ اسلام کو اپنے شعروں کا موضوعِ سخن بنایا۔ اللہ نے ان کو عمومی شاعروں سے مستثنیٰ فرمایا ہے۔

خطۂ عرب کے باہر بھی بڑے بڑے شعرا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ صاحبِ مثنوی مولانا رومؒ کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے شعروں کے ذریعے علم عقائد بیان کیے ہیں اور بہت سے حقائق نہایت عمدہ پیرائے میں واضح کیے ہیں۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ اپنے اشعار کے ذریعے نصیحت کی باتیں بیان کرتے ہیں تو کمال کرتے ہیں۔ اُن کی کتابیں دینی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ آپ غزلیات کے بہت بڑے امام تھے۔ عالم، بزرگ اور درویش آدمی تھے۔ طبیعت میں ظرافت بھی تھی مگر بحیثیت مجموعی آپ کا کلام بہت عمدہ ہے۔ یہاں پر بیسویں صدی میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو قومی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کا بڑا دفاع کیا ہے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انگریز سے سر کا خطاب بھی پایا مگر ذہنی طور پر اُن کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں انگریزی تہذیب و تمدن کی بڑی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے مولانا ظفر علی خاں

ؤ اشعار بھی اعلیٰ پایہ کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بھی انگریزوں اور قادیانیوں کے سخت مخالف تھے۔ دین وملت کے دفاع اور انگریزوں اور مرزائیوں کی مخالفت میں آپ کے اشعار کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

بہرحال فرمایا کہ عام قسم کے شاعروں میں کچھ استثنا بھی ہیں۔ عام لوگ تو عشق ومحبت کے افسانے ہی کثرت سے سنتے ہیں جن سے قوم وملت کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے اشعار سے بے راہ روی ہی فروغ پاتی ہے۔ البتہ ایمان لانے کے بعد اعمالِ صالحہ اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنے والے شعراء جنہوں نے مظلوم ہونے کے بعد ظالموں سے بدلہ لیا، وہ پسندیدہ شعراء ہیں اور انہوں نے قوم وملت کی گراں قدر خدمت بھی کی ہے اور مسلمانوں کو اپنا اصل مقام یاد کرا کے اُسے دوبارہ حاصل کرنے کی رغبت دلائی ہے فرمایا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا ظلم کرنے والے عنقریب جان لیں گے۔ اَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ کہ وہ کس کروٹ پر پلٹتے ہیں اُن کی شعر وشاعری اور دیگر اعمال وکردار کو پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں کیا کیا کام انجام دیئے۔ انجام آگے آرہا ہے پھر پتہ چل جائے گا کہ ان کا اونٹ کس کروٹ پر بیٹھتا ہے۔ سورۃ کا آغاز صداقتِ قرآن سے ہوا تھا۔ اب آخر میں معاد کا ذکر بھی ہوگیا۔

سُوْرَةُ النَّمْل

مکمل

درس اوّل ١ آیت ١ تا ٦

سُورَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّتِسْعُونَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ نمل مکی ہے اس کی ترانوے آیات اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ① هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥

ترجمہ: طٰسٓ ۚ یہ آیتیں ہیں قرآن پاک کی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی ① جو ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے ② اور جو قائم رکھتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ، اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ③ بیشک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے مزین کر دیئے ہیں اُن کی نظروں میں اُن کے اعمال، پس وہ سرگرداں پھرتے ہیں ④ یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے اور

وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہوں گے ⑤ اور بیشک آپ کو سکھلایا جاتا ہے قرآن حکیم اور علیم پروردگار کی جانب سے ⑥

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ النمل ہے عربی زبان میں نمل چیونٹی کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے وادی نمل سے گزرنے اور وہاں پر دلائل توحید کے طور پر ایک واقعہ پیش آنے کا ذکر کیا ہے۔ اسی نسبت سے اس سورۃ کو سورۃ النمل کا نام دیا گیا ہے۔

یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ گذشتہ سورۃ الشعراء اور اس سورۃ کا زمانہ نزول قریب قریب ہی ہے۔ دونوں سورتیں مکی دور کے وسطی یا آخری حصہ میں نازل ہوئیں۔ سورۃ ہذا کی ترانوے آیتیں ہیں۔ اور یہ سات رکوع ۱۱۴۹ الفاظ اور ۴۷۹۰ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ میں بھی دیگر مکی سورتوں کی طرح چار اہم اور بنیادی مضامین بیان ہوئے ہیں۔ پہلے نمبر پر قرآن کریم کی حقانیت و صداقت کا مضمون ہے۔ اللہ کی یہ کتاب علم کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس میں توحید کا مضمون بھی آئے گا مگر گذشتہ سورۃ کی نسبت کچھ زیادہ دلائل توحید کے ساتھ ساتھ شرک اور مشرکین کا رد بھی آئے گا۔ رسالت کے ضمن میں منکرین کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگا۔ اور چوتھا اہم مضمون وقوع قیامت بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا۔

ان چار بنیادی مضامین کے علاوہ اس سورۃ مبارکہ میں اللہ نے بعض انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی کیا ہے۔ پچھلی سورۃ میں انبیاء کا تذکرہ تسلی کے مضمون کے طور پر ہوا تھا کہ اللہ نے کس طرح سابقہ نافرمان اقوام کو ہلاک کیا اور اپنے انبیاء علیہم السلام کو کامیاب بنایا۔ اب اس سورۃ میں بعض انبیاء کا تذکرہ اللہ کی قدرت کاملہ کے نمونے کے طور پر کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام اور ایک چیونٹی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر ہے۔ وہ بھی اللہ کی قدرت کا نمونہ تھی۔ ملکہ سبا کا ذکر ہے

جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایمان لائی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ کی وحدانیت کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر عقلمند آدمی توحید خداوندی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بعض ذیلی مضامین اور مسائل بھی اسی سورۃ مبارکہ میں آگئے ہیں

حروفِ مقطعات

یہ سورۃ مبارکہ بھی حروفِ مقطعات طٰسٓ سے شروع ہوئی ہے۔ ان حروف کے بارے میں زیادہ بہتر بات وہی ہے جو تفسیر جلالین[1] والے بیان کرتے ہیں اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ یعنی ان حروف سے اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے ہمارا اُس پر ایمان ہے۔ یہی طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے تقریب فہم کے لیے اور معترضین کے اعتراضات کے ازالے کے لیے ان حروف کے کچھ معانی بھی ذکر کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؓ اور بعض دوسرے اکابرین کے اقوال موجود ہیں۔ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ بیان کرتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے کشفی طور پر یہ بات سمجھائی ہے کہ حروفِ مقطعات حقیقت میں سورۃ کا اجمالی عنوان ہوتا ہے۔ جس طرح علمی ڈگریوں بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ حروف میں وسیع معانی پائے جاتے ہیں، اسی طرح قرآن پاک میں مذکورہ حروف مقطعات بھی اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ اپنی کتاب شرح حزب البحر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح مفتی، قاضی، عالم، فقیہہ وغیرہ محض انفرادی الفاظ نہیں مگر ان کے نیچے وسیع مفہوم ہوتا ہے جس کو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، اسی طرح حروفِ مقطعات سورۃ کا اجمالی مضمون ہوتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ طٰسٓ میں منازل الانبیاء یعنی انبیائے کرام کے منازل و مراتب کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس کائنات میں اللہ کا پیغامِ ہدایت کس طرح پہنچاتے رہے اور ان کے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آتے رہے۔

بعض فرماتے ہیں طٰسٓ میں طٰ سے مراد طیبات الاخبار یعنی پاکیزہ خبریں ہیں۔ سٓ سے مراد سنی یعنی خدا تعالیٰ کی عزت اور بلندی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر پاکیزہ خبریں اور اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ و ارفع مقام کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس سورۃ مبارکہ کو پڑھو۔ بعض فرماتے ہیں کہ طٰسٓ سے مراد طرق السعادت ہے

[1] جلالین ص۳۲۰ (فیاض)

یعنی اگر سعادت اور بدبختی کے راستے معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس سورۃ کی تلاوت کرو۔ بہر حال یقینی طور پر کوئی بھی معنی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ محض انسانی اذہان کو قرآن کریم سے قریب تر کرنے کے لیے مفسرین نے بعض معانی بیان کیے ہیں واللہ اعلم بالصواب

قرآن پاک کی تبیین

ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ یہ آیتیں ہیں قرآن کی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی۔ قرآن کی تبیین کبھی خود قرآن کی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی اللہ کے نبی کی زبان سے۔ اگر کسی مسئلہ میں قرآن کریم کے ایک مقام پر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر تفصیل ہوگی۔ اس طرح گویا قرآن اپنی تفصیل آپ بیان کرتا ہے اور اگر کسی معاملہ میں ایسا نہ ہو تو پھر نبی کے واسطے وضاحت کر دی جاتی ہے۔ سورۃ النحل میں موجود ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (آیت ۔۴۴) ہم نے یہ نصیحت نامہ (قرآن) آپ کی طرف اتارا ہے تاکہ اے پیغمبر! آپ لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کر دیں جو کچھ اُن کی طرف اتارا گیا ہے۔ گویا اللہ نے تبیین کا کام اپنے نبی کے ذمے لگایا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس فرض منصبی کو بطریق احسن انجام دیا۔ امام شافعیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یہی نتیجہ نکالا ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ اس کا لب لباب تو یہ بیان کرتے ہیں "پس صحیح حدیث شرح ہے قرآن کی" یہ صحیح حدیث کی بات ہے جو صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہو وگرنہ یہاں پر غلط، موضوع اور ضعیف حدیث سے حجت قائم نہیں کی جا سکتی۔

اگر قرآن پاک کی تبیین ان دو طریقوں سے نہ ہو سکے تو پھر صورت یہ ہے کہ متعلقہ مسئلہ اجتہاد کے ذریعے حل کیا جائے۔ اور یہ طریقہ بھی خود قرآن نے پیش کیا ہے۔ یعنی اگر کسی مسئلہ میں قرآن و سنت خاموش ہوں اور صحابہ کرامؓ کے اجماع سے بھی حل نہ پایا جاتا ہو تو پھر معاملہ مجتہدین کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس کا حل غور و فکر کے بعد پیش کر دیں گے۔ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے یہی اصول کو بیان کیا ہے لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (آیت ۸۳) تو پھر ایسے اہل علم کے سامنے

پیش کریں جو تحقیق کر کے مسائل کو حل کرنے کے اہل ہیں۔ اسی لیے اصولِ فقہ والے
شرع کی چار دلیلیں بیان کرتے ہیں۔ اولاً کتاب اللہ، ثانیاً سنت رسول اللہ، ثالثاً
اجماع صحابہؓ اور رابعاً قیاس مجتہدین۔ صرف داؤد ظاہری چوتھی دلیل قیاس کے قائل
نہیں۔ باقی تمام محدثین اور فقہاء ان چار دلائل شرع کو تسلیم کرتے ہیں۔

قرآن بطور ہدایت اور بشارت

فرمایا یہ آیتیں ہیں قرآن اور کتاب مبین کی هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ
جو ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے قرآن پاک مجسم ہدایت ہے۔ زندگی کے
جس موڑ پر بھی ضرورت پڑے یہ ہدایت فراہم کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اس راستے
پہ چلو گے تو فلاح نصیب ہوگی۔ یہاں پہ ہدایت اور خوشخبری کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے جبکہ
دوسری جگہ بینات اور ہدایت کو اکٹھا ذکر ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ
الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى (البقرہ ۱۵۹) بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں بینات اور ہدایت کو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ
نے ان لوگوں کیلئے واضح کر دیا ہے ان کیلئے لعنت کی وعید سنائی گئی ہے۔ بینات اور ہدایت میں فرق
یہ ہے کہ بینہ بالکل واضح چیز کو کہتے ہیں جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور ہدایت
وہ ہے جو استاد سے سیکھنی پڑتی ہے۔ خود رو مفسر یا گمراہ فرقے اسی لیے پیدا ہوئے
ہیں کہ انہوں نے بغیر استاد سے سیکھے از خود سمجھنے کی کوشش کی۔ امام بخاریؒ نے
کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ یعنی علم سیکھنے سے
آتا ہے، خود بخود نہیں آجاتا، اس کے لیے وقت، محنت اور مال کی ضرورت ہوتی
ہے۔ سلف نے تو تحصیل علم کے لیے بڑی بڑی محنتیں کی ہیں اور اپنی عمر کا حصہ صرف
کیا ہے تب جا کر علم کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا مقولہ ہے اَلْعِلْمُ لَا
يُعْطِيْكَ بَعْضَهٗ حَتّٰى تُعْطِيَهٗ كُلَّكَ جب تک تم اپنا سارے کا سارا علم کے لیے
وقف نہ کر دو، علم تمہیں اپنا کچھ حصہ بھی نہیں دے گا۔

علم و عمل

علم کا مقصود عمل ہے۔ محض اسلامیات کر لیا مگر داڑھی صاف، اور ویسا ہی ہے تو
تو اس ڈگری کا کیا فائدہ۔ اگر علم کے مطابق اعمال کا جائزہ نہیں لیا تو یہ علم محض پروفیسری
کے لیے ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ کہنے کو تو سب کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت پہ عمل کرو، غریب پروری کرو۔ دوسروں کو مشورہ دیتے ہو مگر دولت مند ہونے

لہ بخاری ص۱۶ ج۱ (فیاض)

سے باوجود خود ایسا کیوں نہیں کرتے ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سادہ لباس پہنتے تھے۔ تم کیوں تکلف کرتے ہو؟ آنحضرت علیہ السلام معمولی مکان میں رہتے تھے۔ سادہ غذا استعمال کرتے تھے، مگر تم نے پر آسائش مکان اور پر تکلف خوراک کو کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ شادی اور غمی کی رسومات میں حضور علیہ السلام کی سیرت پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ دوسروں کو روزہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں مگر خود چھوڑ دیتے ہو؟ آخر یہ قول و فعل میں تضاد کیوں ہے؟ جب تک علم کے ساتھ عمل نہیں ہوگا، تمہارا علم تمہیں کچھ نفع نہیں دے سکتا۔ ہمیشہ اپنا محاسبہ کیا کرو کہ کیا تم میں ایمان والوں کی فکر اور عمل کا جذبہ موجود ہے؟ اگر نہیں ہے تو اپنا انجام خود سوچ لو۔

نماز اور زکوٰۃ

فرمایا قرآن پاک ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے اور ایمان والے وہ ہیں اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جو کہ نماز کو قائم رکھتے ہیں۔ نماز اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی اجتماعی عبادت ہے۔ نماز کی ادائیگی سے تعلق باللہ درست ہوتا ہے۔ جو شخص پانچ وقت خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے، سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے، آئندہ کے لیے نیکی کا عزم کرتا ہے تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست رہے گا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو نہ صرف تعلق باللہ خراب ہوگا بلکہ دنیا میں مخلوق کے ساتھ بھی تعلقات بگڑ جائیں گے۔ لہٰذا ایمان والے لوگ وہ ہیں جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ نماز کے لیے طہارت کی ضرورت ہے۔ طہارت قلبی بھی ہوگی جسم، لباس اور مکان کی طہارت بھی ہوگی۔ نماز کی وجہ سے یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ پابندی وقت کا زریں اصول بھی نماز کا ثمرہ ہے۔ قرآن کریم، نبی کی ذات، خانہ کعبہ اور نماز بڑے بڑے شعائر اللہ میں جن کی تعظیم ضروری ہے۔ لہٰذا نماز کا احترام اور اہتمام ہونا چاہیے۔

فرمایا ایمان والوں کی دوسری صفت یہ ہے وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے میں۔ مکی زندگی میں زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی مگر اس کا نصاب مقرر نہیں ہوا تھا جو کہ ۲ ہجری میں مدنی زندگی میں ہوا۔ بایں ہمہ زکوٰۃ کا حکم قرآن کی ابتدائی سورتوں میں بھی ملتا ہے جیسے سورۃ المزمل میں ہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (آیت۔ ۲۰)

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ گویا مکی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ زکوٰۃ ادا کی جاتی تھی۔

آخرت پر ایمان

فرمایا اہلِ ایمان کی تیسری صفت یہ ہے وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ توحید اور آخرت کا عقیدہ ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ آتا ہے وہاں وَالْيَوْمِ الْآخِرِ بھی آتا ہے۔ اگر کوئی شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا، بعث بعد الموت کو برحق نہیں جانتا، محاسبہ اعمال پر ایمان نہیں ہے تو اس کے سارے اعمال بیکار محض ہیں۔ ان کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ فرمایا إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے مزین کر دیے ہیں۔ ان کے بُرے اعمال بھی ان کو اچھے کر کے دکھلائے جاتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ نے تزئین اعمال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، اس لحاظ سے کہ تمام قویٰ اور خواہشات اللہ تعالیٰ ہی انسان میں پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف یہی کام شیطان کے ساتھ منسوب کیا ہے وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام - ۴۳) اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزین کر کے دکھایا۔ ان کے دلوں میں سوسہ اندازی کی کہ تم جو کچھ دھوکہ، فریب، شرک، بدعت، کفر، رسوم باطل ادا کر رہے ہو۔ بالکل ٹھیک کر رہے ہو۔ اسی میں تمہاری عزت و ناموس کا راز پنہاں ہے۔ تو فرمایا کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے فَهُمْ يَعْمَهُونَ کہ وہ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ انہیں راستہ دکھائی نہیں دیتا اور وہ عمیق گمراہی میں بھٹک رہے ہیں۔

منکرین معاد کے لیے عذاب

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ کہ ان کے لیے بہت بُرا عذاب ہوگا۔ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ اور وہ آخرت میں انتہائی نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا آخرت پر ایمان ہی نہیں ہے وہ آخرت کی تیاری کیا کریں گے اور پھر وہاں کامیاب کیسے ہوں گے؟ ان کے لیے تو وہاں سراسر نقصان ہی نقصان ہوگا۔

آگے پھر نزولِ قرآن کے متعلق فرمایا وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ
اور بیشک آپ کو خدائے حکیم اور علیم کی طرف سے قرآن کریم کا تحفہ دیا جا رہا ہے۔ یہ
قرآن ایسے پُرحکمت خداوند قدوس کی جانب سے ہے جس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے
اور وہ ہر چیز کو جاننا بھی ہے۔ قرآن پاک کی اہمیت کو اجاگر کرنا مقصود ہے کہ یہ قرآن
کوئی معمولی چیز نہیں ہے یا کسی معمولی ذات کی طرف سے نازل نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس
کو نازل کرنے والا حکیم اور علیم باری تعالیٰ ہے اور یہ ایسی کتاب ہے جس میں ہدایت اور
خوشخبری ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے
فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم
مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ
تَصْطَلُونَ (٧) فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن
فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (٨)
يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (٩) وَأَلْقِ عَصَاكَ
فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ
يُعَقِّبْ يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ
الْمُرْسَلُونَ (١٠) إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ
سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (١١) وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي
جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ فِي تِسْعِ
آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا
فَاسِقِينَ (١٢) فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا
هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (١٣) وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا
أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُفْسِدِينَ (١٤) ع

ترجمہ: ۔ جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے

تحقیق میں نے محسوس کی ہے آگ عنقریب میں لاتا ہوں تمہارے پاس آگ سے خبر یا لاتا ہوں میں تمہارے پاس شعلہ سلگا کر تاکہ تم سینک سکو ⑦ پس جب آئے اُس (آگ) کے پاس (موسیٰ علیہ السلام) تو آواز دی گئی کہ برکت دی گئی ہے اُس پہ جو آگ میں ہے۔ اور جو اس کے اردگرد ہے۔ اور پاک ہے اللہ تعالیٰ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ⑧ اے موسیٰ علیہ السلام بیشک میں وہ اللہ ہوں عزیز اور حکیم ⑨ اور ڈال دو اپنی لاٹھی کو۔ جب دیکھا اُس کو کہ وہ حرکت کر رہی ہے گویا کہ وہ سانپ ہے تو پشت پھیری (موسیٰ علیہ السلام نے) اور مڑ کر نہ دیکھا۔ (اللہ نے فرمایا) اے موسیٰ علیہ السلام! خوف نہ کھاؤ بیشک نہیں خوف کھاتے میرے پاس رسول ⑩ لیکن جس نے زیادتی کی۔ پھر تبدیل کیا اس کو نیکی سے بعد برائی کے۔ پس بیشک میں بخشش کرنے والا اور مہربان ہوں ⑪ اور داخل کرو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، نکلے گا وہ سفید بغیر کسی برائی کے۔ یہ نو نشانیوں میں فرعون اور اس کی قوم کی طرف بیشک وہ نافرمانوں کی قوم ہے ⑫ پس جب آئیں اُن کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت پیدا کرنے والی، تو کہا انہوں نے کہ سحر ہے کھلا ⑬ اور انکار کیا انہوں نے اس کا، حالانکہ یقین کیا اس کے بارے میں اُن کی جانوں نے (مگر انکار کیا) ظلم اور تکبر کی بنا پر۔ پس دیکھو کیسا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا ⑭۔

سورۃ ہذا کی ابتدائی آیات میں قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا ذکر تھا کہ

یہ خدائے حکیم وعلیم کی طرف سے پیغمبر پہ نازل کیا گیا ہے اور یہ اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ پھر ایمان والوں کی بعض صفات بھی بیان کیں کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ پھر منکرینِ آخرت کی سزا کا ذکر بھی ہوا کہ اس دنیا میں ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھایا جاتا ہے اور یہ لوگ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ اس کے بعد آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ایک گوشے کو بے نقاب کیا ہے۔ اس واقعہ میں پیغمبرِ آخر الزمان کے لیے تسلی بھی ہے اور اللہ کی قدرت کا نمونہ بھی۔ دوسری طرف اللہ نے نافرمانوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے جنہوں نے ظلم اور تکبر کی بنا پر اللہ کی طرف سے آمدہ ہدایت کو ٹھکرا کر گمراہی کو قبول کیا۔ اللہ نے انتہا اُن کا انجام بھی بیان فرمایا ہے۔

مدین سے واپسی کا سفر

ارشاد ہوتا ہے۔ اُس وقت کو دھیان میں لاؤ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِاَهْلِهٖ جب کہ کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے۔ یہ واقعہ مدین سے مصر واپس آتے ہوئے دورانِ سفر پیش آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعونیوں کے حالات قرآن پاک میں مختلف انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ کبھی آپ کا واقعہ ابتدائی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور کبھی درمیان سے۔ گذشتہ سورۃ الشعراء میں بھی آپ کا ذکر اُس وقت سے شروع ہوا تھا جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے پاس تبلیغِ حق کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اب اس مقام پر واقعہ تھوڑا پیچھے سے شروع کیا گیا ہے۔ ایک قبطی کے قتل کے بعد موسیٰ علیہ السلام مدین چلے گئے۔ وہاں دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر رہے پھر آپ نے اپنی والدہ اور بھائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو شعیب علیہ السلام نے اجازت دے دی اور آپ کی بیوی، کچھ بکریاں اور خادم بھی ہمراہ کر دیے۔ سردی کا موسم تھا۔ رات کے وقت آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر چقماق نے اپنا کام نہ کیا۔ آپ نے دور سے آگ سلگتی ہوئی دیکھی تو وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اس موقع پہ آپ نے اپنے گھر والوں سے یا شاید کوئی بچہ بھی ہو، آپ نے اُن

نے فرمایا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا میں نے دور آگ محسوس کی ہے لہٰذا تم لوگ یہیں ٹھہرو۔
سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ میں وہاں سے تمہارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں۔ ظاہر ہے
کہ راستہ صحیح طور پر معلوم نہیں تھا۔ آپ نے سوچا کہ جہاں آگ جل رہی ہے وہاں کچھ لوگ ہوں
گے جن سے راستہ بھی معلوم کیا جا سکے گا اس لیے آپ نے فرمایا کہ میں کوئی خبر لاتا ہوں اَوْ
اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ یا آگ کا کوئی شعلہ سلگا کر تمہارے پاس لاتا ہوں لَعَلَّكُمْ
تَصْطَلُوْنَ تاکہ تم اسے سینک سکو۔ ظاہر ہے کہ شدید سرد رات میں گرمی کی ضرورت
بھی محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ چقماق سے آگ نہیں پکڑتی تھی اس لیے آپ نے وہاں سے
کوئی شعلہ لا کر آگ جلانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ آگ سینکنے کی ضرورت ہر سرد علاقے میں پڑتی
ہے۔ طور کا علاقہ بھی سرد علاقہ ہے جہاں آگ کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ویسے بھی عرب
کا مقولہ ہے اَلنَّارُ فَاكِهَةُ الشِّتَآءِ فَمَنْ اَرَادَ اَكْلَ الْفَوَاكِهِ
شِتَآءً فَلْیَصْطَلِ آگ موسم سرما کا پھل ہے۔ جو کوئی یہ پھل کھانا چاہے اسے چاہیئے
کہ آگ سینک لے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ یہیں ٹھہرو،
میں کوئی راستے کی خبر لاتا ہوں یا آگ جلانے کے لیے کوئی شعلہ ہی سلگا لاتا ہوں۔

بابرکت ہوئی آگ

فَلَمَّا جَآءَهَا پس جب موسیٰ علیہ السلام اُس آگ کے پاس آئے نُوْدِیَ
اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ تو آپ کو آواز دی گئی کہ برکت دی گئی ہے اُس
کو جو اس آگ کے اندر ہے۔ وَمَنْ حَوْلَهَا اور جو اس کے ارد گرد ہے۔ مَنْ
موصولہ ہوتا ہے اور معنی یہ بنتا ہے کہ "آگ کے اندر کون ہے"؟ تاہم مفسرین کرام نے اس
جملے کی تشریح مختلف طریقوں سے بیان کی ہے۔ بعض مفسرین اس مَنْ کو زائد تصور
کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جملے کا معنی یہ ہے کہ "آگ اور اس کے ارد گرد میں برکت
دی گئی ہے" یعنی آگ اور اس کا ماحول بابرکت ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ آگ کے اندر
فرشتے تھے جن سے آگ ظاہر ہو رہی تھی اور جن سے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بابرکت تھے۔
اور بعض اس کا معنی یوں کرتے ہیں کہ "برکت دی گئی ہے اس شخص کو جو آگ کی تلاش میں

آیا ہے تو اس سے خود موسیٰ علیہ السلام کی ذات مراد ہے۔ اور وہ خطہ بھی بابرکت ہے۔
جہاں یہ آگ نظر آ رہی تھی سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب
کر کے فرمایا کہ اے موسیٰ! میں تیرا پروردگار ہوں اپنے جوتے اتار دو اِنَّکَ بِالْوَادِ
الْمُقَدَّسِ طُوًی (آیت ۱۲) کیونکہ آپ طویٰ کی مقدس وادی میں پہنچ چکے ہیں۔
یہ جوتے اتارنے کا حکم ایسا ہی ہے جیسے مسجد جیسی پاکیزہ جگہ پر جوتے اتارنے کا حکم
ہے۔ بعض اس کو حجابِ ناری یا نوری کہتے ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے
حِجَابُهُ النَّارُ اَوِ النُّوْرُ خدا تعالیٰ کا حجاب نار ہے یا نور ہے اگر اللہ تعالیٰ
اس حجاب کو ہٹا دے تو کائنات کی ساری چیزیں جل جائیں۔ اللہ کی نگاہ تو ہر چیز پر
پڑ رہی ہے۔ اگر یہ حجاب نہ ہو تو کوئی چیز بھی سلامت نہ رہے۔

عقیدہ حلول کی نفی

بہر حال مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مَنْ فِی النَّارِ سے مراد خود موسیٰ علیہ السلام
یا فرشتے یا وہ خطہ ہے جس کو اللہ نے بابرکت کہا ہے۔ اسی لیے آگے یہ بھی فرمایا
ہے وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جو
تمام کائنات کا مربی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بھی بیان کی گئی کہ کہیں کوئی شخص یہ نہ
سمجھ بیٹھے کہ خدا تعالیٰ خود اس آگ میں حلول کر گیا تھا۔ خدا تعالیٰ تو زمان و مکان اور
جہت سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس کے حلول کر جانے کا عقیدہ قطعاً باطل ہے۔ یہ عقیدہ ہنود
میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ بعض چیزوں میں خدا حلول کر جاتا ہے۔ عیسائیوں
نے بھی یہ باطل عقیدہ بنا رکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ظہور مسیح علیہ السلام کے روپ میں
ہوا یعنی ناسوت کے اندر لاہوت داخل ہو گیا۔ یہ مشرکانہ عقیدہ ہے، اور اسی سے بچنے
کے لیے مفسرین کرام نے مَنْ سے فرشتے یا موسیٰ علیہ السلام کی ذات مراد لیا ہے۔
خواجہ علی ہجویری نے اپنی کتاب "کشف المحجوب"[1] میں ذکر کیا ہے کہ صوفیا کے بارہ
فرقے ہیں۔ ان میں سے دس فرقے اہل حق میں سے اور دو گمراہ ہیں۔ یہ وہی گمراہ فرقے
ہیں جو حلولی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کسی پیغمبر، ولی یا بزرگ کی شکل میں حلول کر سکتا ہے

[1] کشف المحجوب فارسی ص۱۸۳ (فیاض)

بعض وحدت الوجود والوں کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے۔ اسمیں بھی کئی بٹے ہیں بعض اہل حق ہیں اور بعض گمراہ اور زندیق ہیں۔ بہرحال حلول عقیدہ باطل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو نظر آنے والی آگ تو آواز سننے کا ایک ذریعہ تھی۔ نہ کہ خود خدا تعالیٰ اُس میں حلول کر گیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام سے خطاب

اس ابتدائی آواز کے بعد دوسری آواز سنائی دی۔ اللہ نے فرمایا یٰمُوسٰٓی اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں عزیز اور حکیم۔ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز بے کیف تھی۔ اس کی کوئی جہت نہیں تھی بلکہ ہر زاویے سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اللہ نے حکم دیا وَاَلْقِ عَصَاكَ اور اپنی لاٹھی کو نیچے پھینک دیں۔ تعمیل حکم میں موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی پھینک دی فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ پھر جب آپ نے اُس کی طرف دیکھا تو گویا کہ وہ سانپ تھا۔ جو دوڑ رہا تھا۔ جان پتلے اور لمبے سانپ کو کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سانپ کا روپ دھار چکی تھی یہ دیکھ کر وَلّٰى مُدْبِرًا موسیٰ علیہ السلام پیٹ پھیر کر بھاگے وَّلَمْ يُعَقِّبْ اور آپ نے پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اتنے خوفزدہ ہوئے۔ اللہ نے آپ کی تشویش کو دیکھتے ہوئے فرمایا یٰمُوسٰى لَا تَخَفْ اے موسیٰ علیہ السلام! خوف نہ کھائیں۔ کیونکہ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ میرے پاس رسول خوف نہیں کھاتے اللہ کے رسول تو مقام قرب میں ہوتے ہیں اور ان میں انس ہوتا ہے وحشت نہیں ہوتی وہ ڈرتے نہیں اِلَّا مَنْ ظَلَمَ مگر جس سے کوئی لغزش ہوئی ہو ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ پھر اس نے اس کو اچھائی میں بدل لیا ہو برائی کے بعد فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تو میں اس کو معاف کرنے والا اور مہربان ہوں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے ایک لغزش ہو گئی کہ انہوں نے ایک قبطی کو قتل کر دیا۔ پھر انہوں نے اللہ سے معافی کی درخواست کی تو اللہ نے معاف بھی کر دیا۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔

انبیاء پر خوف کا ورود

انبیاء علیہم السلام پر ورود خوف کے متعلق مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ کھانا پینا، ہنسنا رونا، زندگی موت، خوف اور راحت وغیرہ انسان کے امور طبعیہ

ہیں، داخل میں اور ان کا ورود انبیاء پر بھی ہوتا ہے بعض اوقات کسی دشمن کا خوف ہوتا ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے تو ایسے موقع پر خوفزدہ ہونا حال کے منافی نہیں ہے بلکہ عین فطرت ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ خوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خالق کی جانب سے اور دوسرا مخلوق کی طرف سے۔ اگر خوف اللہ کی جانب سے ہو تو نبی کو بھی ڈرنا چاہیئے۔ لاٹھی کا سانپ بن جانا منجانب اللہ تھا لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کی خوفزدگی بالکل درست تھی۔ انہیں ڈرنا ہی چاہیئے تھا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آتا ہے کہ جب بادل چھا جاتے تو آپ خوفزدہ ہو جاتے۔ اس خوفزدگی میں کبھی اندر آتے اور کبھی باہر جاتے۔ جب تک بارش نہیں ہو جاتی تھی، آپ چین سے نہیں بیٹھتے تھے آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابر کی آمد خدا تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور میں خوف کھاتا ہوں کہ کہیں یہ ویسے ہی بادل نہ ہوں جیسے قوم عاد پر آئے تھے اور اُن کو ہلاک کر دیا تھا۔ برخلاف اس کے ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں پھینکے جانے کا وقت آیا تو آپ بالکل خوفزدہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ یہ خوف مخلوق کی طرف سے تھا۔ بہرحال اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ خوف نہ کھاؤ کیونکہ میرے ہاں اللہ کے رسُول خوف نہیں کھاتے۔

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر پہلا معجزہ یہ ظاہر ہوا کہ انہوں نے اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔ پھر اللہ نے دوسرا معجزہ اس طرح ظاہر کیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دباؤ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ یہ سفید ہو کر نکلے گا۔ اور ایسا سفید بھی نہیں ہوگا جو کسی بیماری پھلبہری وغیرہ سے سفید ہو گیا ہو بلکہ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اس میں کسی قسم کی برائی یا خرابی نہیں ہوگی، بلکہ وہ تو معجزانہ طور پر سورج کی طرح چمکتا ہوگا۔

فرمایا فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ یہ ان نو نشانیوں میں سے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اُس کی قوم کی طرف دی گئیں۔ اس کے علاوہ سات مزید نشانیاں بھی اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف

لے مسلم ص ۲۹۵ ج ۱ (فیاض)

میں موجود ہے۔ فرمایا یہ نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ کیونکہ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں، حد سے گزرنے والے۔ یعنی فرمانبرداری سے باہر نکلنے والے ہیں۔

اس مقام پر اپنے ساتھ اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی معیت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مفصل واقعات سورۃ الشعرآء، طٰہٰ اور اعراف وغیرہ میں گزر چکے ہیں۔ یہاں پر اختصار کے ساتھ یہی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ عصا اور ید بیضا کے معجزات لے کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ اور انہیں حق کی دعوت دو۔

فرعون کا انکار

ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً جب فرعون اور اس کی قوم کے پاس ہماری بصیرت افروز نشانیاں آئیں۔ بصارت آنکھ کی روشنی کو کہتے ہیں جب کہ بصیرت دل کی روشنی سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات کو بصائر سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ دلوں میں روشنی پیدا کرتی ہیں۔ جب یہ نشانیاں فرعون اور اس کی قوم کے پاس آئیں قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا جادو ہے پچھلی سورۃ میں بھی گزر چکا ہے کہ فرعونیوں نے معجزات کو جادو کہا اور پھر جادو کا مقابلہ جادو سے کرنے کی کوشش کی مگر حق کے مقابلے میں ناکام ہوئے مگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو نہ چھوڑا۔

ان نشانیوں کو جادو کہہ کر وَجَحَدُوْا بِهَا ان کا انکار کر دیا۔ اور ان کا یہ انکار زیادتی اور تکبر کی وجہ سے تھا کہنے لگے یہ شخص ہماری سلطنت چھیننا چاہتا ہے مگر ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ اس کو قید کر دیں گے یا جان سے مار ڈالیں گے۔ یہ ان کا ظلم اور تکبر بول رہا ہے۔ درمیان میں اللہ نے فرمایا کہ ان کی اندرونی حالت یہ تھی وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا انکی جانوں نے معجزات کی حقیقت کا یقین کر لیا تھا۔ وہ دل وجان سے تسلیم کرتے تھے کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ کوئی غیر معمولی چیز ہے مگر ظلم، زیادتی اور غرور و تکبر کی بنا پر معجزات کا انکار کر رہے تھے۔ اللہ نے فرمایا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ بھلا دیکھو تو!

فساد کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سال ہا سال تک فرعون اور اس کی قوم کو وعظ کیا، اُن کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرایا مگر وہ لوگ کفر، شرک اور ظلم و جبر میں مبتلا رہے۔ اللہ کے نبیوں کی بات نہ مانی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اللہ نے ساری قوم کو اپنے غضب کا نشانہ بنایا اور اُن کو پانی میں غرق کیا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ فسادیوں کا انجام کیسا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق دیا ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم ، اور کہا اُن دونوں نے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں فضیلت بخشی ہے اپنے بہت سے ایماندار بندوں پر ﴿۱۵﴾ اور وارث ہوئے سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے اور انہوں نے کہا ، اے لوگو ! سکھلائی گئی ہے ہمیں پرندوں کی گفتگو اور دی گئی ہے ہم کو (ضرورت کی) ہر چیز . بیشک البتہ یہ فضیلت ہے بہت کھلی ﴿۱۶﴾ اور اکٹھے کئے گئے سلیمان علیہ السلام کے لیے اُن کے لشکر جنوں ، انسانوں اور پرندوں میں سے . پس اُن کو تقسیم کیا جاتا تھا ﴿۱۷﴾

ربط آیات

سورۃ کی ابتداء قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت سے ہوئی . پھر موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور اُن کو فرعون کی قوم کی طرف بھیجنے کا ذکر ہوا . جب

موسیٰ علیہ السلام بعض نشانیاں لے کر پہنچے تو قوم فرعون نے اُسے جادو کہہ کر انکار کر دیا حالانکہ اُن کے دلوں میں یقین تھا کہ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ ایسی خارق عادت نشانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے نبی کے ہاتھ پر ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔ بہرحال انہوں نے ظلم و تعدی اور غرور و تکبر کی بناء پر معجزات کا انکار کیا تو اللہ نے فرمایا کہ تم نے ایسے فسادیوں کا انجام بھی تو دیکھ لیا کہ وہ کس طرح غرقاب ہوئے۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹا اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے جن کا ذکر اللہ نے مختلف سورتوں میں کیا ہے۔ تاہم اس مقام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت زیادہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام صاحب کتاب رسول تھے اور سلیمان علیہ السلام بھی صاحب صحیفہ رسول اور نبی تھے۔ اللہ نے باپ بیٹا دونوں کو خلافت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا فرمائی تھی۔ گذشتہ آیات میں فرعون کی حکومت کا ذکر بھی ہو چکا ہے مگر وہ اس قدر نافرمان لوگ تھے کہ اللہ نے اُس قوم کو فاسق قرار دیا ہے۔ اُن کے برخلاف داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام بھی دنیا میں خلیفہ تھے، اللہ نے انہیں حکومت عطا کی تھی مگر وہ اللہ کے نہایت مطیع اور شکر گزار بندے تھے۔ یہ سابقہ آیات کے ساتھ ربط بھی ہو گیا۔

انبیاء کا قطعی علم

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا اکٹھا ذکر کر کے فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا اور البتہ تحقیق ہم نے داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کو علم عطا فرمایا۔ اس علم سے مراد دنیا کا کسبی علم نہیں ہے جو سکولوں، کالجوں یا یونیورسٹیوں کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے یا جو علم انسان کو سمع و بصر جیسے حواس سے حاصل ہوتا ہے یا انسان اپنی عقل سے غور و فکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ بلکہ اس علم سے مراد وہ قطعی اور یقینی علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو وحی کے ذریعے سکھاتا ہے۔ اس علم میں نہ تو کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص اس کو سمجھ ہی نہ

سکے یا اس کا اپنا ذہن ٹیڑھا ہو اور اسے کوئی چیز ٹیڑھی نظر آئے۔ وگرنہ یہ ایسا علم ہے،
جس کے متعلق سورۃ البقرہ کی ابتدا میں اللہ نے فرمایا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (آیت ۲)
اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ بہرحال وحی الٰہی کا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے
جب کہ اول الذکر کسی علم ظنی ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام
کو احکام شریعت، اصول سیاست اور حکمرانی کا وہ قطعی علم عطا فرمایا جو اُن کے لیے اپنے
فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھا۔ سورۃ صٓ میں اللہ نے حضرت داؤد
علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا ہے يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ
(آیت ۲۶) اے داؤد (علیہ السلام) ہم نے تمہیں زمین میں خلافت عطا کی ہے۔ لہٰذا
تم عدل وانصاف کے مطابق مخلوق کی خدمت کرنا۔ آپ کے بیٹے سلیمان علیہ السلام
آپ کے بعد آپ کے جانشین ہوئے تو دونوں کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ ہم نے
انہیں وہ علم عطا فرمایا جس کی انہیں ضرورت تھی۔

علم کی ضرورت اور اہمیت

علم ایک ایسی ضروری چیز ہے جسکے بغیر انسانیت ترقی نہیں کر سکتی۔ علم کی روشنی ہی انسان کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے
علم کی کمی انسان کی تنزلی کا سبب بنتی ہے۔ انگریز نے برصغیر میں اپنے اقتدار کے دوران اسلامی علوم
کو ختم کرنے یا انہیں اپنے ڈھب پر ڈھال لینے کی بڑی کوشش کی، مگر اللہ کے نیک بندوں
نے اسلامی علوم کے جھنڈے کو ہمیشہ سربلند رکھا اور اس پر حرف نہیں آنے دیا۔ وہ جانتے
تھے کہ اگر اس یقینی علم کی جڑ اکھاڑ دی گئی اور اسکی جگہ ظنی علم کو رائج کر دیا گیا تو پھر حقیقی علم
کا ہمیشہ کے لیے جنازہ نکل جائے گا۔ چنانچہ بانیانِ دارالعلوم دیوبند نے اس خطرے کو
بھانپتے ہوئے دارالعلوم کی بنیاد رکھی جہاں سے اب تک چالیس ہزار سے زیادہ علماء پیدا
ہو چکے ہیں اور دنیا بھر میں اسلام کے پودے کی آبیاری کر رہے ہیں۔ یہ دارالعلوم تو ایک بنیاد
تھی۔ پھر اس سے آگے ہزاروں چشمے جاری ہوئے۔ ہزاروں دیگر مدارس قائم ہوئے
اور علم کی روشنی مسلم امہ کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے
اور انشاء اللہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ حکومت تو اپنے وسائل مادی تعلیم پر صرف
کر رہی ہے مگر اللہ کے نیک بندے حقیقی علم کی نشر واشاعت کے لیے محدود وسائل

کے ساتھ ہی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

بہر حال علم ترقی کا زینہ ہے۔ خاص طور پر دین کا اتنا علم نہایت ضروری ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے فرائض سے باخبر ہو سکے اور اللہ اور اُس کے بندوں کے حقوق ادا کر سکے۔ یہی علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اُس کی عبادت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ حلال و حرام اور جائز ناجائز میں امتیاز پیدا ہوتا ہے توحید اور شرک کی سمجھ آتی ہے۔ انسان ایمان، اخلاص اور نفاق کو پہچانتا ہے۔ جہاں تک ٹیکنیکل علوم و فنون کا تعلق ہے۔ وہ تو کافر، مشرک اور ملحد بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ آج امریکہ، جاپان، جرمنی، روس اور چین سب جانتے ہیں کہ ٹیکنیکل علم کوئی علم نہیں بلکہ یہ تو صنعت و حرفت ہے، جب کہ حقیقی علم وہی ہے جو وحی الٰہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعے مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو حسب ضرورت حقیقی علم عطا فرمایا۔

باپ بیٹے کی طرف سے شکریہ

اِس یقینی علم کے حصول پر وَقَالَا باپ بیٹے دونوں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ سب تعریفیں اُس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں یا اُس ذاتِ باری تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ یہاں پر تمام ایمانداروں پر فضیلت پانے کا ذکر نہیں بلکہ بہت سے اہل ایمان پر برتری حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے

اہل ایمان پر برتری حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ

نے اپنے ان دو انبیاء سے بھی زیادہ بعض دوسرے انبیاء اور رسل کو برتری عطا فرمائی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام وغیرہم۔ اللہ نے ان حضرات کو اپنے حساب سے بڑا شرف عطا کیا ہے۔ لہٰذا یہاں پر بہت سے مومنوں پر فضیلت کا ذکر ہے اور اس تناظر میں غیر مومنوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

انبیاء کی وراثت کا مسئلہ

ارشاد ہوتا ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ مولانا شیخ الہندؒ اس جملے کا ترجمہ کرتے ہیں" قائم مقام ہوا سلیمان "

داؤد علیہ السلام کا۔ گویا اس مقام پر وراثت سے مراد مالی وراثت نہیں بلکہ نیابت ہے شیعہ حضرات ایک تو اس آیت سے نبی کی وراثت کی دلیل پکڑتے ہیں۔

حالانکہ یہاں پر وراثت سے مراد محض خلافت ہے۔ دوسری آیت جس سے وراثت انبیاء کی دلیل پکڑی جاتی ہے وہ سورۃ مریم میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کی فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (آیت ۵-۶) اے پروردگار! مجھے ایسا ولی عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔ یہاں بھی کوئی بیٹا اپنے باپ کے مال کا وارث تو ہو سکتا ہے مگر ساری آل یعقوب کا وارث ایک شخص کیسے ہوگا؟ قرینہ یہی ہے کہ یہاں پر علمی وراثت مراد ہے نہ کہ مالی۔ زکریا علیہ السلام نے یہی دعا کی تھی کہ اے اللہ! مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو میرا اور پوری آل یعقوب کا علمی وارث ہو اور جو ہمارے مشن کو آگے بڑھا سکے۔

حضور علیہ السلام کے دس صحابہؓ جن میں خلفائے راشدین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ اور امہات المؤمنینؓ شامل ہیں، روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ ہم نبیوں کا گروہ کسی کو وارث نہیں بنایا کرتے مگر جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ محتاجوں کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ خود حضور علیہ السلام کے قبضہ میں خیبر یا فدک کی کچھ اراضی تھی جس سے آپ اپنی ضروریات پوری فرماتے تھے۔ اس زمین کی تولیت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے پاس تھی۔ ان دونوں حضرات میں کچھ اختلاف پیدا ہوا، تو وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، وہاں پر دوسرے اکابر صحابہؓ بھی موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات سے قسم دلا کر پوچھا کہ بتلاؤ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے کہ ہم انبیاء کا گروہ کسی کو وارث نہیں بناتے مگر جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے، تو دونوں بزرگوں نے اس حدیث کی تصدیق کی۔ چنانچہ شیعہ

حضرات کی طرف سے حضرت فاطمہؓ کے حق میں نبی علیہ السلام کی وراثت کا دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں۔ یہ درست ہے کہ جب تک حضرت فاطمہؓ کو اس حدیث کا علم نہیں تھا، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اپنے باپ کی وراثت کا مطالبہ کیا مگر جب آپ نے حضرت فاطمہ کو مذکورہ حدیث سنائی تو کہنے لگیں فَاَنْتَ اَعْلَمُ بِمَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تو پھر آپ اس چیز کو زیادہ جانتے ہیں جو آپ نے رسول خدا سے سنی ہوئی ہے اس کے بعد آپ خاموش ہو گئیں اور پھر کبھی وراثت کا مطالبہ نہیں کیا۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی صحیح حدیث میں موجود ہے اِنَّمَا الْاَنْبِیَاءُ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْھَمًا وَّلَا دِیْنَارًا یعنی اللہ کے نبی درہم یا دینار وراثت میں نہیں چھوڑا کرتے بلکہ وَرَّثُوْا عِلْمًا وہ تو اپنی وراثت میں صرف علم چھوڑ کر جاتے ہیں نبیوں کی وراثت علم دین ہوتا ہے جس نے دین کا علم حاصل کر لیا اُس نے نبی کی وراثت کو پا لیا۔

انبیاء کی وراثت کے ضمن میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ پیغمبر خود تو اپنے غیر نبی کی وراثت حاصل کرتا ہے مگر اپنے بیٹے کو مالی وراثت نہیں دیتا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے والد حضرت عبداللہ کی وراثت ملی۔ طبقات ابن سعد میں موجود ہے کہ آپ کو پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ام امین لونڈی وراثت میں ملی۔ ام امین حبشیہ تھیں مگر بڑی صاحب فضیلت خاتون تھیں۔ انہوں نے حضور علیہ السلام کو گود میں اٹھایا تھا۔ لہٰذا آپ اُن کی بڑی قدر کرتے تھے، حضور علیہ السلام نے بڑے ہو کر ان کو آزاد کر دیا تھا اور پھر ان کا نکاح حضور علیہ السلام کے متبنیٰ زیدؓ کے ساتھ ہوا جن سے اسامہؓ پیدا ہوئے حضور علیہ السلام کو باپ بیٹے دونوں سے بڑی محبت تھی۔

داؤد علیہ السلام کی جانشینی

چونکہ داؤد علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اس لیے آپ کی مالی وراثت تو سلیمان علیہ السلام کو نہیں پہنچی بلکہ آپ کی علمی اور سیاسی وراثت آپ کو پہنچی۔ قرینہ بھی موجود ہے کہ اگر اس وراثت سے جائیداد کی وراثت مراد ہوتی تو پھر یہ صرف سلیمان علیہ السلام کو ہی کیوں پہنچتی، جب کہ داؤد علیہ السلام کے انیس بیٹے تھے جن میں سے سلیمان علیہ السلام سب

سے چھوٹے تھے۔ سارے بیٹے حکومت کے خواہشمند تھے مگر اللہ نے یہ نیابت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائی۔ اگر مالی وراثت مراد ہوتی تو سارے بیٹوں کو محروم کر کے صرف ایک کو سب چھوٹے دینا کہاں کا انصاف تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کوئی دوسرا بیٹا آپ کی خلافت کا بار اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ اس وقت سلیمان علیہ السلام کی عمر بارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ داؤد علیہ السلام نے نیابت کے مسئلہ کو اس طرح حل فرمایا کہ اللہ کے ایک فرشتے نے ایک بند لفافہ لا کر حضرت داؤد علیہ السلام کو دیا اور کہا کہ آپ مجلس عام میں یہ اعلان کریں کہ آپ کے بیٹوں میں سے جو بیٹا اس لفافے میں بند سوالوں کے صحیح صحیح جواب دیگا۔ وہی میری جانشینی کا حقدار ہو گا۔ چنانچہ عمائدین سلطنت کی موجودگی میں سارے بیٹوں سے فرمایا کہ یہ امتحان کا لفافہ ہے جو شخص ان سوالات کے جوابات دے دیگا، وہی میرا جانشین ہو گا۔ لفافے میں موجود سوالات اور اُن کے صحیح جوابات یہ تھے۔

سوالات	صحیح جوابات
۱۔ سب سے قریب چیز کون سی ہے؟	موت
۲۔ سب سے بعید چیز کون سی ہے؟	انسان کے ہاتھ سے نکل جانیوالی چیز
۳۔ سب سے مانوس چیز کون سی ہے؟	جسم مع روح
۴۔ سب سے وحشتناک چیز کون سی ہے؟	جسم بغیر روح
۵۔ دو قائم چیزیں کون سی ہیں؟	ارض و سما جو قیامت تک قائم رہیں گی
۶۔ دو مختلف چیزیں کون سی ہیں؟	لیل و نہار۔ ایک جاتی اور دوسری آتی ہے
۷۔ آپس میں دو دشمن چیزیں کونسی ہیں؟	موت اور حیات
۸۔ بہترین انجام والی چیز کون سی ہے؟	بردباری بوقت غصہ
۹۔ بدترین انجام والی چیز کون سی ہے؟	غصے کی حالت میں تیزی کا استعمال

داؤد علیہ السلام نے جب بیٹوں کے سامنے یہ سوالات پیش کئے تو ان میں سے کوئی بھی ان کے جوابات نہ دے سکا۔ سب عاجز آ گئے۔ سلیمان علیہ السلام ابھی کمسن تھے

اور انہیں خلافت کی خواہش بھی نہیں تھی مگر اللہ نے انہیں بچپن ہی میں فہم و فراست سے نوازا تھا۔ انہوں نے باپ سے عرض کیا اگر اجازت ہو تو ان سوالات کے جوابات میں عرض کروں۔ اجازت ملنے پر سلیمان علیہ السلام نے سوالات کے صحیح صحیح جوابات دے دیئے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان کر دیا جسے تمام عمائدین سلطنت نے سراہا۔

داؤد علیہ السلام کی وفات

جس دن داؤد علیہ السلام کی جانشینی کا فیصلہ ہوا۔ اُس سے اگلے روز آپ کی وفات ہو گئی۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ آپ بڑے باغیرت آدمی تھے، جب بھی گھر سے باہر جاتے باہر سے تالا لگا کر جاتے تاکہ کوئی اجنبی آدمی گھر میں داخل نہ ہو سکے اُس روز بھی آپ حسب معمول دروازے کو تالا لگا کر باہر چلے گئے۔ اس دوران آپ کی اہلیہ نے کسی اجنبی آدمی کو صحن میں کھڑے دیکھا۔ بڑی حیران اور خوفزدہ ہوئیں کہ یہ شخص اندر کیسے آ گیا حالانکہ باہر تو تالا پڑا ہے۔ اتنے میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی آ گئے۔ تالا کھول کر داخل ہوئے تو اجنبی شخص کو صحن میں پایا۔ پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیسے آئے ہو تو اُس نے کہا کہ میں وہ ہوں جو بادشاہوں سے نہیں ڈرتا اور جس کے لیے کوئی حجاب نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام نے کہا پھر بخدا تم ملک الموت ہو، مرحبا بامر اللہ میں تمہیں اللہ کے حکم سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ پھر آپ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

سلیمان علیہ السلام پر فضلِ مبین

فرمایا سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ اور فرمایا، اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ اور ہمیں ہر چیز دی گئی ہے جو ہمارے حسب حال ہے۔ اس سے اُس زمانے اور موجودہ زمانے کے تمام آلات اور سامان مراد نہیں ہیں بلکہ نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ پرندوں کی بولی بھی سکھلا دی۔ فرمایا إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ یہ کھلی فضیلت

والی ذات ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ اور اکٹھے کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ پس ان کو تقسیم کیا جاتا تھا یا روکا جاتا تھا۔ یعنی ہر ہر جنس کی مخلوق الگ الگ ٹولیوں میں کھڑی ہو جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو بے مثال حکومت عطا فرمائی تھی جس کی درخواست انہوں نے خود کی تھی وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (ص۔۳۵) اے اللہ! مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جس کی مثال نہ مجھ سے پہلے ہو اور نہ بعد میں پیدا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جنات، انسانوں، اور پرندوں کے علاوہ ہوا کو بھی مسخر کر دیا۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا۔۱۲) ہم نے ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا جس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی ہوتی تھی اور شام کی منزل بھی ایک ماہ کی آپ کا تخت اور ساز و سامان ہوا اٹھائے پھرتی تھی۔ موجودہ زمانے کی محفوظ ترین سواریاں بھی کسی حادثے کے امکان سے خالی نہیں مگر سلیمان علیہ السلام کے ہاں کسی خرابی کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ وہ جہاں چاہتے ہوا کے دوش پر چلے جاتے۔ پرندوں کی اپنی اپنی بولی ہوتی ہے جسے انسان نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے مگر تم اُسے کچھ نہیں سکتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ بھی اللہ کا خاص فضل تھا کہ آپ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ اور پھر جن بھی آپ کے تابع تھے، اور آپ کے ہر حکم کی بجا آوری کرتے تھے۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ:- یہاں تک کہ جب سلیمان علیہ السلام چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا ، اے چیونٹیو! داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں کہ کہیں پامال نہ کر دے تمہیں سلیمان علیہ السلام اور اُس کا لشکر ، اور اُن کو خبر بھی نہ ہو ﴿۱۸﴾ پس مسکرا کر ہنس پڑے (سلیمان علیہ السلام) اس چیونٹی کی بات سے اور کہا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق بخش کہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت کا جو تو نے مجھ پر انعام کی ہے اور میرے والدین پر بھی ۔ اور یہ کہ میں ایسا نیک کام کروں جس کو تو پسند کرتا ہے اور داخل کر مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں ﴿۱۹﴾

ربط آیات گزشتہ آیات میں حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر ادا کیا کہ اُس نے انہیں بہت سے نیک اور ایماندار بندوں

پر فضیلت بخشی ہے۔ پھر سلیمان علیہ السلام کی جانشینی کا ذکر ہوا۔ پھر انہوں نے لوگوں کے سامنے اللہ کی عطا کردہ نعمت کا اس طرح تذکرہ کیا کہ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو سکھائی گئی ہے اور ہمیں ضرورت کی ہر چیز عطا کی گئی ہے جو کہ بڑی کھلی فضیلت ہے سلیمان علیہ السلام کے لیے اُن کے لشکر اکٹھے کیے جاتے تھے جن سے وہ مختلف مواقع پر کام لیتے تھے۔ یہ لشکر انسانوں، جنوں اور پرندوں پر مشتمل تھے جنہیں حسب ضرورت تقسیم بھی کیا جاتا تھا۔

منطق الطیر

گذشتہ آیات میں ایک لفظ منطق الطیر آیا تھا جو خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ پرندوں یا دیگر جانوروں کی گفتگو عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھ جاتے تھے۔ پرندوں کے علاوہ حشرات الارض یعنی کیڑوں مکوڑوں کی بولی بھی اللہ نے سکھا دی تھی۔ جانوروں کی بولیوں پر قدیم زمانے سے تحقیق و تالیف کا کام ہو رہا ہے۔ چنانچہ بعض علماء نے جانوروں کی بولیوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ علمِ ادب کی سب سے پرانی کتاب کلیلہ دمنہ آج بھی موجود ہے دراصل یہ کتاب قدیم زبان کی تصنیف ہے۔ وہاں سے یہ کتاب سنسکرت زبان میں منتقل ہوئی۔ پھر ایران کے کسریٰ نے برزویہ نامی ایک عالم فاضل کو بڑا مال و دولت دے کر ہندوستان بھیجا تاکہ وہ کسی طرح یہ کتاب حاصل کر سکے۔ کہتے ہیں کہ کسریٰ نے سونے کے بیس خچر لاد کر دیے تھے اور کچھ آدمی بھی ساتھ بھیجے تھے۔ بہرحال وہ شخص کئی سال تک ہندوستان میں مقیم رہا اور بالآخر کلیلہ دمنہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کتاب کو نقل کیا اور پھر واپس جا کر اسے فارسی زبان میں منتقل کیا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شخص واپس ایران پہنچا تو کسریٰ نے اُس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اُس نے اس علمی کارنامے کے صلہ میں اُسے تخت پر بٹھایا اور اُس کے سر پر تاج رکھا۔

پھر منشی عبداللہ ابن مقفع نے بنی امیہ یا بنی عباس کے دور میں اس کتاب کا عربی ترجمہ کیا۔ آج کل یہ کتاب عربی ادب کے کورس میں شامل ہے اور باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کے تراجم انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، روسی اور دیگر زبانوں

میں ہوئے ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں جانوروں کی زبان سے علم و حکمت اور نصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ یہ باتیں بندروں، گیدڑوں، کچھوؤں، شیروں اور ہاتھیوں وغیرہ سے منسوب کی گئی ہیں۔ کلیلہ اور دمنہ بعض گیدڑوں کے نام ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں امام جاحظ نے علم حیوان کے نام سے کتاب لکھی ۔ سات جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں حیوانات سے متعلق بہت سی مفید معلومات ملتی ہیں ۔ مصنف ابو حنیفہؒ کا ہم عصر تھا ۔ اور معتزلہ فکر رکھتا تھا ۔ اسی طرح چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں امام دمیریؒ نے حیات الحیوان کے نام سے کتاب لکھی جس میں جانوروں سے متعلق بہت سی معلومات جمع کردی گئی ہیں ۔

اس میں جانوروں سے متعلق حلت و حرمت کے احکام اور کسی جانور کے خواب میں نظر آنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ امام قزوینیؒ نے عجائب المخلوقات کے نام سے کتاب لکھی ہے ۔ اس میں بھی جانوروں سے متعلق مفید معلومات ہیں ۔ حضرت شیخ عطارؒ بھی ساتویں صدی ہجری کے بزرگ گزرے ہیں جو تاتاریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ۔ ان کی مشہور کتاب منطق الطیر فارسی زبان میں ہے ۔ انہوں نے پرندوں کی زبانی تصوف کی بڑی گہری باتیں ذکر کی ہیں ۔ اس کے بعد بھی حیوانات کے علم نے بڑی ترقی کی ہے ۔ خاص طور پر موجودہ زمانے میں علم الحیوانات (ZOOLOGY) میں بڑے تجربات ہوئے ہیں اور دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی انتہائی بلندیوں تک پہنچا ہے

اللہ نے اس مقام پر چیونٹیوں کا ذکر کیا ہے ۔ چیونٹیاں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور بڑی بھی ۔ چھوٹی چیونٹی (ذرہ) تو بعض خصوصیات کی بناء پر ضرب المثل بن چکی ہے ۔ ان چیونٹیوں کے بارے میں جدید دور کے سائنس دانوں نے بڑی تحقیق RESEARCH کی ہے ۔ چنانچہ جدید دور کے مصری مفسر علامہ طنطاویؒ نے جواہر القرآن میں ان کا کافی ذکر کیا ہے ۔ آپ جدید دور کے عالم تھے ۔ ۱۹۴۰ء کے قریب وفات پائی ہے انہوں نے نظام العالم والامم کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں عالم اور امتوں کے نظام میں چیونٹیوں کا ذکر کیا ہے ۔ یہ بھی کافی معلومات افزا کتاب ہے ۔

سلیمانی لشکر وادیٔ نمل سے گزرا

سلیمان علیہ السلام مع لشکر جا رہے تھے حَتّٰٓی اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ یہاں تک کہ جب وہ وادیٔ نمل میں پہنچے قَالَتْ نَمْلَةٌ تو ایک چیونٹی نے کہا یٰٓاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ اے چیونٹیو! اپنے گھروں (بلوں) میں داخل ہو جاؤ۔ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ کہیں سلیمان علیہ السلام اور اُس کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالے۔ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ایسی حالت میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہو کہ انہوں نے کتنی چیونٹیوں کو پامال کر دیا ہے۔

بعض جدید دور کے نام نہاد مفکرین نمل کو چیونٹی نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ نمل ایک قبیلہ تھا جہاں سے سلیمان علیہ السلام کا گزر ہوا تھا۔ دراصل یہ لوگ معجزات کے منکر ہیں۔ چونکہ اللہ نے چیونٹی کی آواز معجزہ کے طور پر سلیمان علیہ السلام کو سنوا دی تھی، اس لیے ایسے لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے چیونٹیوں کا کوئی قبیلہ تو مراد ہو سکتا ہے مگر انسانوں کا قبیلہ ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سلیمان علیہ السلام کو بے مثال حکومت عطا فرمائی تھی، جنات اور پرندے تحت کر دیے تھے، ہواؤں کو تسخیر کر دیا تھا، اسی طرح یہ چیونٹی کا معجزہ بھی ظاہر کر دیا کہ جس نے اپنی قوم چیونٹیوں کو اُن کی تباہی سے خبردار کیا تو سلیمان علیہ السلام فوراً اُس کی بات کو سمجھ گئے۔ پہلے صراحت بیان ہو چکی ہے کہ اللہ نے آپ کو منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولیاں بھی سکھا دی تھیں۔ تو ایسی حالت میں آپ کا چیونٹی کی بات کو سن لینا اور سمجھ لینا کون سی عجیب بات ہو جاتی ہے۔

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ کے جملے سے یہ بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ [illegible] اور جانور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے مگر آپ غیب کا علم نہیں جانتے تھے۔ غیب خاصہ خداوندی ہے۔ اور وہ اس میں جتنا چاہتا ہے کسی کو عطا کر دیتا ہے۔ کل غیب اور علم محیط کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور قرآن پاک میں غیر اللہ کے غیب دان ہونے کی واضح طور پر نفی کی گئی ہے۔ یہ تو ایک چیونٹی بھی جانتی تھی کہ صاحب صحیفہ اور صاحب شریعت رسول ہونے کے باوجود سلیمان علیہ السلام غیب دان نہیں ہیں۔ اسی لیے تو اس نے

دوسری چیونٹیوں کو خبردار کیا کہ اپنی بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان علیہ السلام اور اُن کا لشکر بے خبری میں تمہیں کچل نہ ڈالے۔ مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کا لشکر بڑا مہذب تھا، لہٰذا اُن کی طرف سے قصداً کمزور مخلوق کو روند ڈالنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ آپ کا لشکر کوئی ایسا لشکر نہیں تھا جو وحشیانہ طور پر ہر سامنے آنے والی چیز کو تباہ کر دیتا، لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ اگر چیونٹیوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو ایسا سلیمان علیہ السلام کی بے خبری کی وجہ سے ہوتا یعنی انہیں پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ جس وادی سے گزر رہے ہیں، وہاں ہزاروں لاکھوں چیونٹیوں کو لقمہ اجل بنا رہے ہیں۔

عربی زبان میں نملہ کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں جنسوں پر بولا جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو خبردار کیا تھا، وہ مذکر تھی یا مؤنث؟ مشہور محدث اور فقیہ حضرت قتادہؓ (۶۳ھ تا ۱۱۸ھ) جو تابعین میں سے ہیں، ایک مجلس میں فرمانے لگے جو جی چاہے پوچھ لو۔ اس مجلس میں امام ابوحنیفہؒ بھی موجود تھے۔ جو اس وقت ابھی بچے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ حضرت قتادہؓ سے یہ سوال کرو کہ جس چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے خبردار کیا تھا وہ نر تھی یا مادہ۔ جب یہ سوال پوچھا گیا تو حضرت قتادہؓ لاجواب ہو گئے۔ اس پر خود امام ابوحنیفہؒ نے بتایا کہ وہ چیونٹی مادہ تھی۔ اگرچہ لفظ بقرہ کی طرح لفظ نملہ بھی مذکر اور مؤنث دونوں اجناس کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں نملہ سے قبل قَالَتْ کی ضمیر مؤنث ہے، لہٰذا وہ چیونٹی مؤنث تھی۔ یہ واقعہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں امام صاحب کی کمسنی میں سوجھ بوجھ کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

جب سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی یہ بات سُنی فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا تو آپ اُس چیونٹی کی بات سے مسکرا کر ہنس پڑے۔ دل میں خیال کیا کہ یہ چیونٹی کتنی بھولی بھالی ہے، جو سمجھ رہی ہے کہ میں اس کی بات کو نہ سُن رہا ہوں اور نہ سمجھ رہا ہوں حالانکہ اللہ نے مجھے اپنے بہت سے نیک اور ایماندار بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور مجھے جانوروں کی بولیاں بھی سکھا دی ہیں۔ تبسم کا معنی مسکراہٹ ہے جو ضحک یعنی ہنسنے کا ادنیٰ درجہ ہوتا ہے، مسکراہٹ صرف ہونٹوں

مسکراہٹ ہے جب کہ ہنسنے میں دانت بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ البتہ قہقہہ زور سے ہنسنے کو
کہتے ہیں جو کہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کبھی قہقہہ
مار کر نہیں ہنسے۔ آپ کا معمول تبسم یا زیادہ سے زیادہ ضحک ہوتا تھا۔ قہقہہ
غفلت کی علامت ہے۔ اسی لیے اگر کوئی شخص نماز کے دوران قہقہہ لگا کر ہنسے
تو اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا اور نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔

چیونٹیوں کا نظام معاشرت

چیونٹی بڑی ذہین مخلوق ہے۔ اللہ نے ایک خاص حد تک اس کو علم و شعور عطا کیا
ہے۔ علم الحیوانات کے ماہرین نے بڑے بڑے تجربات کر کے اس مخلوق کے
بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔ مثلاً انسانوں کی طرح چیونٹیوں کے بھی
خاندان، قبیلے اور گروہ ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا نظام حکومت ہوتا ہے، باقاعدہ فوج
اور پولیس ہوتی ہے جو نظام سلطنت کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ چیونٹیاں
فطری طور پر خوراک کا ذخیرہ جمع رکھتی ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ فرید وجدی
"دائرۃ المعارف" میں لکھتے ہیں کہ چیونٹیوں کی مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ و جدل
کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو ابتداء میں چیونٹیوں کی قلیل تعداد
آکر دشمن کی قوت کا اندازہ لگاتی ہے اور پھر حسب ضرورت پورا لشکر بیک وقت حملہ
آور ہو جاتا ہے۔ چیونٹی اپنے دشمن کو چمٹ کر ایسا کاٹتی ہے کہ چاہے جان چلی جائے،
دشمن کو چھوڑتی نہیں۔ اس کے جسم کے پچھلے حصے میں تیزاب کی ٹینکی ہوتی ہے جو
بارش کے موسم میں خوب بھر جاتی ہے۔ جنگ کے وقت چیونٹی یہی تیزاب دشمن پر
پھینک کر اسے نقصان پہنچاتی ہے۔ طنطاوی نے "نظام العالم" میں لکھا ہے کہ
چیونٹیوں کے باقاعدہ قبرستان ہوتے ہیں جہاں یہ اپنے مردے دفن کرتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا
ہے کہ اگر کہیں کوئی چیونٹی مری پڑی ہو تو زندہ چیونٹی اس کو اٹھا کر لے جاتی ہے اور قبرستان
میں لے جا کر دفن کر دیتی ہے۔ جس طرح بعض حکومتوں کے موسم سرما اور گرما کے لیے
مختلف ہیڈ کوارٹر ہوتے ہیں۔ اسی طرح چیونٹیوں کے بھی مختلف موسموں کے لیے
مختلف علاقے متعین ہوتے ہیں اور موسم گرما میں مقررہ علاقوں میں اقامت پذیر ہوتی

ہیں۔ جس طرح انسانوں کے لیے دودھ دینے والے جانور ہوتے ہیں اسی طرح چیونٹیوں کے بھی خاص قسم کے جانور ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے غذا مہیا کی جاتی ہے اور پھر اُن کے جسم سے نکلنے والی رطوبت کو بطور دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی تجربات میں آیا ہے کہ اگر کوئی چیونٹی غلطی سے اپنے دشمن کے علاقہ میں چلی جائے اور اس کو جونہی اس بات کا علم ہوتا ہے وہ اپنی ٹانگیں اوپر کر کے سمیٹ کر لیٹ جاتی ہے۔ پھر جب اس علاقے والی چیونٹیوں کو اجنبی چیونٹی کے درآنے کی اطلاع ملتی ہے تو ان کی پولیس وغیرہ اس چیونٹی کو اٹھا کر اپنے علاقے سے باہر پھینک آتی ہے۔ اللہ نے ان کو حیرت انگیز ذہانت عطا فرمائی ہے۔

سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی بولیاں سکھلائی تھیں۔ جو آواز آپ تک پہنچ جاتی تھی آپ اس کو سمجھ لیتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ہر جانور یا پرندے کی نزدیک دور ساری آوازیں سنانے کا ذمہ نہیں لیا تھا۔ یہ جو آپ نے چیونٹی کی آواز کو سن لیا، یہ اللہ کی خاص حکمت تھی کہ اس نے اُس چیونٹی کی آواز آپ کو سنوا دی اور یہ معجزہ تھا۔ اسی لیے تو کسی نے کہا ہے ؎

لَوْ كُنْتُ أُوتِيتُ كَلَامَ الْحُكْلِ
عَلِمْتُ عِلْمَ سُلَيْمَانَ كَلَامَ النَّمْلِ

اگر مجھے بھی حکل یعنی بے زبان جانداروں کی آواز سننے کا علم دے دیا جاتا تو میں بھی سلیمان علیہ السلام کی طرح چیونٹی کی بات کو سن لوں۔ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں ذکر کیا ہے کہ ایک ہاتھی بان دریائے نیل کے کنارے اس طرح گنگنا رہا تھا ؎

زیرِ پایت گر بدانی حالِ مور
ہم چوں حالِ تست زیرِ پائے پیل

اے انسان! اگر تو جان لے کہ تیرے پاؤں کے نیچے چیونٹی کا کیا حال ہوتا ہے تو ایسا ہی ہے جیسے تو خود ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آجائے۔

چیونٹی کی دعا کی قبولیت

امام ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ سلیمان علیہ السلام

کے زمانے میں قحط پڑگیا، بارش رک گئی، لوگ بلبلا اٹھے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام عام لوگوں کے ہمراہ شہر سے باہر بارش کی دعا کے لیے گئے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک چیونٹی نے پاؤں آسمان کی طرف کرکے دعا کر رہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا خَلْقٌ مِّنْ خَلْقِكَ وَلَا غِنٰی لَنَا عَنْ سُقْیَاكَ وَاِلَّا تَسْقِنَا تُھْلِكْنَا اے اللہ! ہم بھی تیری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں۔ ہم تیری سیرابی سے مستغنی نہیں ہیں بلکہ اس کے محتاج ہیں۔ اگر تو ہمیں پانی نہیں پلائے گا تو ہم ہلاک ہو جائیں گی۔ سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی زبان سے یہ دعا سنی تو تمام لوگوں کو واپس ہونے کے لیے کہا۔ فرمایا اللہ نے اس چیونٹی کی دعا قبول کر لی ہے۔ اب ضرور بارش ہوگی۔ لہٰذا واپس چلو۔ اللہ تعالیٰ اس چیونٹی کی بدولت تمہیں بھی سیراب کر دے گا۔

وادی نمل کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ یہ شام کے علاقے میں واقع ہے۔ جب کہ دوسرے اسے طائف شہر سے دس بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر بتلاتے ہیں۔ وہاں ایک کھلا میدان ہے جس میں ایک معمولی سا مکان بھی ہے۔ طائف کے تاریخی مقامات میں وادی نمل کا یہ میدان بھی ہے۔ لوگ سیر کے لیے جاتے ہیں (راقم صاحب درس عبد الحمید سواتی نے بھی اس کی زیارت کی ہے)

سلیمان علیہ السلام کی دعا

سلیمان علیہ السلام اس چیونٹی کی بات سن کر ہنس پڑے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اس طرح شکریہ ادا کیا۔ وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ عرض کیا، اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا فرمائی حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں اور جنات کو آپ کے تابع کر دیا۔ آپ کے لیے ہوا مسخر کر دی اور جانوروں کی بولیاں بھی سکھا دیں۔ باپ پر بھی بڑے انعامات کیے کہ انہیں اپنا، صاحب کتاب رسول بنایا۔ آپ کی والدہ بھی نہایت ہی پاکباز، نیک سیرت، عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔ ان کی فضیلت کے لیے تو یہی چیز کافی ہے کہ اللہ نے ان کو داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دیا۔ آپ فرعون اور ہامان کے حالات بھی پڑھ چکے ہیں کہ وہ کس قدر مغرور اور ناشکرگزار تھے۔ جب

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام بے مثال حکومت کے باوجود کس طرح رب العزت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی کہ پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ کہ میں ایسا نیک عمل انجام دوں جسے تو پسند کرے اور تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔

اور جو آخری بات حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی اس میں ہمارے لیے درس عبرت ہے عرض کیا، پروردگار! وَاَدْخِلْنِىْ بِرَحْمَتِكَ فِىْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ اور داخل کر مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ انسان کو اچھی سوسائٹی نصیب ہو جائے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا تھا رَبِّ هَبْ لِىْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ (الشعراء ۸۳) پروردگار مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکوکاروں میں ملا دے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بھی یہی دعا منقول ہے تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ (آیت ۱۰۱) یا اللہ! مجھے اسلام کی حالت میں وفات دینا، اور مجھے نیکوکاروں کے ساتھ ملا دینا۔ یہاں پر بِرَحْمَتِكَ کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر نبی ہونے کے باوجود کس قدر متواضع اور منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں اپنے کسی عمل پر اعتماد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ ہے۔ جب اللہ کا پاک نبی اللہ کی رحمت کا طلبگار ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ہیں۔ ہمیں تو رحمت خداوندی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے لیے اس میں درس عبرت ہے۔ ہمیں بھی یہی دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ! اپنی مہربانی سے ہمارے عقیدوں کو پاک کر دے، ہمارے اعمال درست ہوں اور ہمیں اچھی سوسائٹی نصیب ہو۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ
اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا
اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾
فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ
بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ
امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا
عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ
لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾ اَلَّا
يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٦﴾ قَالَ سَنَنْظُرُ
اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ
هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ
كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَ اۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾ ع ۲ / ۱۷

ترجمہ:- اور خبر لی (سلیمان علیہ السلام نے) پرندوں کی۔ پس کہا کیا ہے کہ میں نہیں دیکھتا ہُدہُد کو۔ کیا وہ غائب ہے ہے ﴿۲۰﴾ میں اس کو سخت سزا دوں گا یا میں اُس کو ذبح کر دوں گا یا وہ لائے میرے پاس کوئی کھلی سند ﴿۲۱﴾ پس ٹھہرا تھوڑی دیر اور کہا (ہُدہُد نے) میں نے معلوم کی ہے وہ بات جو آپ کو معلوم نہیں۔ اور لایا ہوں میں آپ کے پاس ملکِ سبا سے ایک یقینی خبر ﴿۲۲﴾ میں نے پایا ہے ایک عورت کو اُن کی ملکہ۔ اور دی گئی ہے وہ ہر چیز سے۔ اور اس کا بہت بڑا تخت ہے ﴿۲۳﴾ پایا میں نے اُس کو اور اُس کی قوم کو کہ وہ سجدہ کرتے ہیں سورج کے سامنے اللہ کے سوا، اور مزین کر دیا ہے اُن کے لیے شیطان نے اُن کے اعمال کو پس روکا ہے اُن کو سیدھے راستے سے۔ پس وہ نہیں راہ پاتے ﴿۲۴﴾ کیوں نہیں سجدہ کرتے وہ اللہ کے سامنے جو نکالتا ہے پوشیدہ چیز کو آسمان اور زمین میں۔ اور جانتا ہے جس کو تم چھپاتے ہو اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو ﴿۲۵﴾ وہ اللہ ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود اُس کے سوا۔ وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے ﴿۲۶﴾ کہا (سلیمان علیہ السلام نے) ہم دیکھیں گے کہ تو سچ کہتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے ﴿۲۷﴾ لے جاؤ میرا یہ خط اور ڈال دو اس کو اُن کی طرف۔ پھر پلٹ کر ہٹ جاؤ اُن

سے اور دیکھو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں (۲۸) کہا (ملکہ نے)
اے درباریو! بیشک ڈالا گیا ہے میرے پاس ایک خط عزت
والا (۲۹) یہ سلیمان (علیہ السلام) کی طرف سے ہے اور اس میں لکھا
ہوا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۳۰) کہ نہ اکڑو میرے مقابلے
میں۔ اور آؤ میرے پاس فرمانبرداری کرتے ہوئے (۳۱)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں ایک چیونٹی کا حال بیان ہوا۔ سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات سُن کر مسکرائے اور پھر اُن انعامات کا شکریہ ادا کیا جو اللہ نے آپ پر اور آپ کے والدین پر کر رکھے تھے۔ آپ نے اللہ سے اس کے پسندیدہ نیک اعمال کرنے کی توفیق بھی طلب کی اور ایک خصوصی دُعا یہ کی کہ پروردگار! مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل رکھ۔

جانوروں اور پرندوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ لوگ بہیمۃ الانعام یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری سے، دودھ، بال اور کھالیں حاصل کرتے ہیں۔ بعض جانوروں سے باربرداری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ بعض وحشی جانوروں کو باقاعدہ سدھا کر ان سے بھی خدمت لی جاتی ہے۔ ریچھ کو تربیت دے کر اس سے کام لیا جاتا ہے۔ پرندوں میں باز اور شکرے وغیرہ سے شکار کیا جاتا ہے۔ گدھے اور خچر وغیرہ خاص باربرداری کے کام آتے ہیں۔ قدیم زمانے میں کبوتر سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ کتوں کو سدھا کر اُن سے شکار کیا جاتا ہے اور وہ چوکیداری کا کام بھی کرتے ہیں۔ غرضیکہ انسان جانوروں اور پرندوں سے قدیم زمانے سے خدمت لیتے آئے ہیں۔

ہُدہُد کی غیر حاضری

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے یہ خاص انعام عطا فرمایا تھا کہ ہوا، پرندے اور جنات آپ کے تابع کر دیے تھے جن سے وہ حسبِ ضرورت کام لیتے تھے۔ تو اسی سلسلے میں آج کے درس میں ایک پرندے ہُدہُد کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ سلیمان علیہ السلام ضرورت کے مطابق پرندوں اور جنات کی حاضری بھی لیتے تھے اور پھر

بعض امور بھی ان کے سپرد کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ اور سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی حاضری لی۔ تفقد کا معنی دیکھ بھال کرنا، حاضری لینا یا باز پرس کرنا ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام بھی اپنے ساتھیوں کی یَتَفَقَّدُ دیکھ بھال کیا کرتے تھے، پوچھ گچھ ہوتی تھی کہ کہیں لوگ غافل نہ ہو جائیں بلکہ ہر وقت مستعد رہیں۔ اسی طریقے سے سلیمان علیہ السلام نے ایک موقع پر تمام پرندوں کو جمع کیا اور ان کی حاضری لی۔ غالباً اُس وقت آپ ہدہد نامی پرندے سے کوئی کام لینا چاہتے تھے مگر وہ نظر نہ آیا۔ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ تو آپ نے کہا، کیا بات ہے کہ مجھے ہدہد نظر نہیں آرہا ہے اس پرندے کے متعلق مشہور ہے کہ اللہ نے اُس کو ایسی صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ اسے زیرِ زمین پانی نظر آجاتا ہے اور یہ اُس کی نشاندہی کر دیتا ہے، اُس موقع پر بھی سلیمان علیہ السلام مع لشکر کہیں جا رہے تھے، پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور پانی کی تلاش کے لیے ہُدہُد کی خدمات کی ضرورت تھی کہ وہ کسی جگہ زیرِ زمین پانی کی نشاندہی کرے تو جنات کے ذریعے فوراً نکلوا لیا جائے مگر ہدہد نظر نہیں آرہا تھا۔ کاملِ مبرد نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ ہُدہُد کو زمین کے نیچے تو پانی نظر آجاتا ہے مگر زمین کے اُوپر اس کے لیے لگایا گیا جال اُسے کیوں نہیں نظر آتا؟ انہوں نے جواب دیا۔ إِذَا جَاءَ الْقَدَرُ عَمِيَ الْبَصَرُ جب اس کی تقدیر آجاتی ہے تو پھر اُس کی آنکھ اندھی ہو جاتی ہے اُسے قریب پڑا جال بھی نظر نہیں آتا۔

بہرحال سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد کو نہ پا کر کہا کہ کیا بات ہے کہ مجھے ہُدہُد نظر نہیں آرہا ہے أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ کیا وہ غائب یعنی غیر حاضر ہے؟ کہنے لگے، اگر ایسی بات ہے لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا تو میں اُسے سخت سزا دوں گا، أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ یا میں اُسے ذبح ہی کر ڈالوں گا۔ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ یا اگر وہ سزا سے بچنا چاہتا ہے تو کوئی کھلی دلیل پیش کرے یعنی اپنی غیر حاضری کا کوئی معقول عذر پیش کرے۔

ہدہد ایک مشہور جانور ہے جسے عربی ، اردو اور پنجابی وغیرہ میں ہُدہُد ہی کہا جاتا ہے۔ اس کی لمبی چونچ ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ زمین کو کریدتا رہتا ہے اور وہاں سے کیڑے مکوڑے نکال نکال کر کھاتا ہے۔ خاکی رنگ کے اس پرندے کو اللہ نے پرواز کی بڑی قوت عطا کی ہے یہ بڑی تیزی سے سینکڑوں میل تک کی اڑان کر سکتا ہے مصر اور فلسطین وغیرہ کے علاقے میں سردی کے موسم میں عموماً پایا جاتا ہے۔ بعض پرندے دور دور سے اڑ کر یہاں بھی آجاتے ہیں۔ روس اور چین کے علاقے سے بعض چڑیاں سخت سردی سے بچنے کے لیے ادھر آجاتی ہیں اور لوگ ان کا شکار کر لیتے ہیں۔ اللہ نے انہیں ایسی قوتِ پرواز بخشی ہے کہ اس میں رکاوٹ پڑنے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تھک گئے تو ذرا سستا لیا اور پھر چل پڑے برخلاف اس کے موجودہ دور کے تیز رفتار ہوائی جہاز اور راکٹ وغیرہ کی اڑان بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتی اور آئے دن ان کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی امریکہ کی چیلنجر نامی خلائی شٹل پرواز کے فوراً بعد حادثہ کا شکار ہو گئی جس میں دو عورتوں سمیت سات جانیں ضائع ہوگئیں اور اس خلائی شٹل پر خرچ آنے والی کروڑوں ڈالر کی رقم ضائع ہوگئی۔

امام دمیریؒ نے حیات الحیوان میں لکھا ہے کہ ہدہد حلال جانور ہی ہے۔ البتہ فقہ حنفی میں اس کا گوشت کھانے کی ممانعت آئی ہے وجہ یہ ہے کہ یہ پرندہ دانہ دنکا یا سبزی وغیرہ تو کھاتا نہیں محض کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔ لہٰذا اس کے گوشت سے بدبو آتی ہے اور ظاہر ہے کہ بدبودار چیز کا کھانا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر روٹی ، سالن یا چاول وغیرہ بدبو دینے لگیں تو ان کا استعمال جائز نہیں رہتا۔

ملکِ سبا کے متعلق خبر

بہرحال سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی غیر حاضری کا نوٹس لیا فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ پس زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہدہد آگیا فَقَالَ اور کہا اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ میں نے ایک ایسی بات کا احاطہ کیا ہے جس کا آپ نے نہیں کیا۔ یعنی اے سلیمان علیہ السلام میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جس سے آپ بے خبر ہیں وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ اور میں آپ کے پاس ملک سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ چیونٹی کی طرح ہدہد کا عقیدہ

بھی یہ تھی کہ سلیمان علیہ السلام بے مثال سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود علم محیط نہیں رکھتے تھے کہ انہیں ہر چیز کا علم ہوتا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک سبا میں کون حکمران ہے اور وہاں کے لوگوں کا عقیدہ کیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ نے سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کو بتدریج وسیع فرمایا تھا۔ پہلے فلسطین اور شام آپ کے ماتحت تھے۔ پھر مصر بھی زیر نگیں آگیا اور آخر میں سبا بھی آپ کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

بہرحال ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ میں ملک سبا سے یہ خبر لایا ہوں اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ میں نے وہاں پر ایک عورت کو پایا ہے جو ان پر حکمرانی کرتی ہے وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور اسے ہر قسم کا ساز و سامان دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ ضرورت کی ہر چیز اُن کے پاس ہے وہ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کرتے۔ ہر چیز سے یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت تک ایجاد ہونے والی ہر چیز اُن کے پاس موجود تھی بلکہ اس زمانے کی ضروریات کے مطابق ان کے پاس فوج، خزانہ، غلہ اور تمام ضروریاتِ زندگی مہیا تھیں۔ اس کی مثال وہی ہے جو سورۃ نحل میں ہے۔ اللہ نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں، درختوں اور اونچی جگہوں میں گھر بناؤ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (آیت۔ ٦٩) پھر ہر پھل میں سے کھاؤ۔ یہاں بھی ہر پھل سے یہ مراد نہیں ہے کہ دنیا بھر کے پھلوں میں سے لا لا کر ہر ایک کو کھاؤ۔ بلکہ جو جو پھل تمہارے مناسب حال ہے اُس کو کھاؤ، پھولوں کا رس چوسو اور پھر شہد پیدا کرو۔ ہدہد نے یہ بھی خبر دی وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ کہ ملکہ سبا کے پاس بہت بڑا تخت ہے جس پر بیٹھ کر وہ امورِ سلطنت انجام دیتی ہے۔ اس تخت کا مفصل حال آگے آرہا ہے۔ تاہم مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ یہ عظیم تخت اسی ٨٠ ہاتھ لمبا، پچاس ٥٠ ہاتھ چوڑا، اور چالیس ٤٠ ہاتھ اونچا تھا جو کہ نہایت قیمتی زر و جواہرات کے ساتھ مرصع تھا۔

سورج پرست قوم

ہدہد نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید انکشاف کیا۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہ میں نے

اس ملکہ اور اس کی قوم کو سورج کے سامنے سجدہ کرتے پایا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر گویا کہ قوم سبا سورج پرست مشرک تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں شجر، حجر، چرند، پرند سب اللہ ہی کی تسبیح بیان کرتے ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۔ ۴۴) کائنات کی ہر چیز اُسی کی تقدیس بیان کرتی ہے۔ فطرتِ صحیحہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانا جائے سورج پرستار مصر میں بھی تھے اور ایران میں بھی۔ سورج کی پوجا کرنے والے برصغیر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کراچی کے مجوسی اب بھی طلوعِ شمس کے وقت سمندر کے کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور طلوع کے وقت سورج کو سجدہ اور سلام کرتے ہیں۔ اسی لیے ہماری شریعت میں سورج کے طلوع، غروب اور عین استوا کے وقت سجدہ کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ بہرحال ہدہد نے بتایا کہ جس قوم کا وہ ذکر کر رہا ہے، وہ سورج پرست ہے۔

ملکہ سبا کے متعلق مفسرین اور مؤرخین نے طرح طرح کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس کا اصل نام بلقیس تھا جو سبا پر حکومت کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کا باپ کسی سردار کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر اُس نے ایک جنیہ (جن عورت) سے شادی کی جس سے بلقیس پیدا ہوئی۔ اللہ نے جنات کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ انسانی شکل میں متشکل ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بلقیس کے باپ نے کسی ایسی ہی جن عورت سے شادی کر لی ہو۔ پھر بلقیس کی نسبت ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کو وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا اُس نے اس شخص کو راستے سے ہٹا دیا اور خود حکمران بن گئی۔ یہ سب تفسیری اور تاریخی روایات ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا واللہ اعلم۔ ایسے ہی دیگر حالات و واقعات سے قطع نظر بلقیس ایک ذہین و فطین عورت تھی۔ اس کے پاس بڑی فوج تھی، پارلیمنٹ اور مصاحب تھے جن سے وہ امورِ سلطنت میں مشورے کرتی رہتی تھی۔

ہدہد نے ایک تو قومِ سبا کی سورج پرستی کی خبر دی اور دوسری بات یہ بیان کی وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ اُس مشرک قوم کے اعمال کو شیطان

نے اُن کے لیے مزین کر رکھا ہے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے شیطان اس کی تصدیق کرتا ہے کہ تم بہت اچھا کام کرتے ہو لہٰذا وہ سورج پرستی سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچاننے کی بجائے سورج پرستی کو ہی حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ اور اس طرح شیطان نے اُن کو سیدھے راستے سے روک رکھا ہے جیسے کہا فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ وہ ہدایت نہیں پاتے۔ غلط راستے پر چل کر صحیح راستے سے محروم ہو چکے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام اس مشرک قوم کے خلاف کارروائی کریں۔

بعض پرویز قسم کے دہریے اس سارے مضمون کو پرندے کا بیان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہدہد نامی کوئی آدمی تھا جس نے یہ ساری خبر آکر سلیمان علیہ السلام کو دی تھی، حالانکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر جنات، پرندے اور ہوا سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیئے تھے اور آپ اُن سے کام بھی لیتے تھے لہٰذا پرندے کی زبانی اس قسم کی گفتگو بالکل قرین قیاس ہے اور انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے

ہدہد کی توحید پرستی

ہدہد نے قومِ سبا کے شرک کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی توحید کے بعض دلائل بھی پیش کیے۔ کہنے لگا أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قومِ سبا کے لوگ کیوں نہیں سجدہ کرتے صرف اللہ تعالیٰ کو جو آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو آسمانوں میں پوشیدہ پانی نازل کر کے اُس سے طرح طرح کی سبزیاں اُگاتا ہے۔ زمین کے نیچے سے پانی، تیل، لوہا، سیسہ، سونا، چاندی اور دیگر معدنیات نکالتا ہے۔ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ اور ہر اُس چیز کو جانتا ہے، جس کو تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ وہ قادرِ مطلق اور علیم کل ہے۔ ایسے خداوند قدوس کو چھوڑ کر قومِ سبا سورج کی پوجا کیوں کرتی ہے؟ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے کیوں سجدہ ریز نہیں ہو جاتی؟ ہدہد نے مزید کہا اللہ کی ذات وہ ہے اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر قسم کی عبادت

کے لائق صرف اور صرف وہی ذات ہے رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ اور عرشِ عظیم کا مالک بھی وہی ہے[1]۔ پھر وہ سورج کے سامنے کیوں سجدہ کرتے ہیں فَقَالَ اَحَطْتُّ سے لے کر یہاں تک سارا بیان ہدہد کا ہے۔ اُس نے ایک طرف قومِ سبا کے شرک کی نشاندہی کی تو دوسری طرف دلائل توحید بھی بیان کر دیے۔ جب اللہ کی ادنیٰ مخلوق پرندے بھی توحید خداوندی کو تسلیم کرتے ہیں تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے اُس کا تو بطریق اولیٰ فرض ہے کہ وہ توحید خداوندی کو تسلیم کرے اور ہر قسم کے کفر اور شرک سے باز آجائے۔

خط بنام ملکہ سبا

ہدہد کا یہ سارا بیان سننے کے بعد قَالَ سلیمان علیہ السلام نے کہا سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ہم ابھی دیکھتے ہیں کہ تو اپنی بات میں سچا ہے یا تو نے جھوٹ بولا ہے۔ اس سے پیشتر سلیمان علیہ السلام ہدہد کو سخت سزا دینے یا ذبح کر ڈالنے کا اعلان کر چکے تھے تا وقتیکہ وہ کوئی معقول عذر پیش نہ کرے۔ اب جبکہ اس نے عذر پیش کر دیا تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ابھی تمہاری اس خبر کی تصدیق کیے لیتے ہیں۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہدہد سے کہنے لگے۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِىْ هٰذَا میری یہ چٹھی لے جاؤ فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ اور اسے قوم سبا کے لوگوں کے سامنے ڈال دو، میرا یہ خط ان تک پہنچا دو ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ پھر ان سے پیچھے ہٹ آؤ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ اور دیکھو کہ وہ اس خط کا کیا جواب دیتے ہیں۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ہدہد فوراً خط لے کر ملکہ سبا کے محل پر پہنچا اُس وقت محل کے دروازے تو بند تھے البتہ ایک روشندان کھلا تھا جس کے راستے وہ ملکہ کی خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔ خط اُس کے سینے کے قریب رکھ دیا اور پھر اسی روشندان کے راستے باہر نکل آیا۔

جب ملکہ نیند سے بیدار ہوئی تو اُس نے اپنے قریب خط پڑا پایا۔ اس نے اپنے تمام درباریوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اُن سے اس طرح گویا ہوئی۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ کہنے لگی۔ اے بہت درباریو! میرے پاس ایک عزت والا خط ڈالا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خوبصورت سربمہر

[1] اس آیت پر قرآن کریم کا آٹھواں سجدہ تلاوت ہے (فیاض)۔

لفافے میں عمدہ طریقے سے لکھا ہوا شاہی خط تھا جس سے ملکہ نے اندازہ لگایا کہ یہ کسی معزز شخصیت کی طرف سے آیا ہے، چنانچہ اس نے اسے باعزت خط قرار دیا اور بتایا اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ یہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے موصول ہوا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اصل مضمون کے علاوہ اس خط میں سلیمان علیہ السلام نے اپنا تعارف بھی کرایا تھا اور اس کا یہ انداز تھی مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ سُلَيْمٰنَ ابْنِ دَاوٗدَ اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى یہ خط اللہ کے بندے سلیمان ابن داؤد علیہما السلام کی طرف سے ہے اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ اس قسم کے تبلیغی خطوط حضور علیہ السلام کی سیرت میں بھی ملتے ہیں جو آپ نے اطراف کے بادشاہوں اور دیگر اعلیٰ شخصیتوں کو تحریر فرمائے۔ آپ نے ہر خط کا آغاز مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ سے کیا اور آگے اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ وغیرہ لکھا یعنی اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے روم کے عظیم ہرقل کی طرف۔ اور پھر اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى کے الفاظ بھی تحریر کروائے۔ بہرحال سلیمان علیہ السلام نے ایسا ہی خط بلقیس کے نام بھیجا۔

خط کا مضمون

ملکہ سبا نے خط بھیجنے والے کا تعارف کرانے کے بعد اس کا مضمون پڑھنا شروع کیا اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہ اس خط میں لکھا ہے "شروع اللہ کے نام سے جو نہایت بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے" گویا مضمون کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے پاک نام کے ساتھ کی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس مقام پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن پاک کی ایک آیت کے طور پر آتی ہے۔ البتہ قرآن پاک کے ہر نسخہ میں ہر سورۃ کی ابتدا میں بھی پوری بسم اللہ تحریر ہے۔ فقہائے کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ہر سورۃ کی ابتدا والی بسم اللہ قرآن پاک کا حصہ ہے یا نہیں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر آنے والی بسم اللہ کے علاوہ صرف ایک دفعہ قرآن کی آیت ہے اور ہر سورۃ کی ابتدا میں لکھی جانے والی قرآن کا حصہ نہیں ہے البتہ دیگر حضرات اس مقام پر بھی اور ہر سورۃ کی ابتدا والی بسم اللہ کو بھی قرآن کا

---

[1] بخاری صفحہ ۴ ج ۱ (فیاض)

حصہ تصور کرتے ہیں۔ بہرحال خط کا مضمون یہ تھا اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ قوم سبا
کے لوگو! میرے سامنے سرکشی اختیار نہ کرو، میرے مقابلے میں نہ آؤ وَأْتُوْنِيْ
مُسْلِمِيْنَ بلکہ اطاعت گزار بن کر میرے پاس چلے آؤ۔ مطلب یہ تھا کہ کفر
و شرک کو چھوڑ کر صحیح دین اختیار کر لو۔ اب اگلی آیت میں اس خط پہ ردعمل
کا ذکر آ رہا ہے۔

قَالَتْ يَآيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ فِىْٓ اَمْرِىْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ :- (ملکہ سبا نے) کہا ، اے درباریو ! مجھے رائے دو میرے معاملے میں - میں نہیں ہوں قطعی فیصلہ کرنے والی کسی معاملے کا یہاں تک کہ تم حاضر ہو ﴿۳۲﴾ انہوں نے کہا ، ہم لوگ طاقت والے ہیں ، اور سخت لڑائی لڑنے والے ہیں - پس تم دیکھو کہ تم کیا حکم دیتی ہو ﴿۳۳﴾ اس نے کہا جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل اور وہ اسی طرح کرتے رہتے ہیں ﴿۳۴﴾ اور بیشک میں بھیجنے والی ہوں ان کی طرف کچھ ہدیہ - پھر دیکھتی ہوں کہ فرستادہ لوگ کیا جواب لے کر آتے ہیں ﴿۳۵﴾

ربط آیات — ہدہد نے سلیمان علیہ السلام کو خبر دی کہ ملک سبا کے لوگ اور خود ملکہ سورج پرست

ہیں۔ کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور اُن کے بُرے اعمال کو شیطان اُن کو مزین کر کے دکھاتا ہے لہٰذا وہ ہدایت کا راستہ اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔ نیز یہ کہ وہ لوگ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتے جو ظاہر و باطن ہر چیز کو جانتا ہے اور مخفی چیزوں کو آسمان و زمین سے نکالتا ہے، وہی معبود برحق ہے، وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ یہ خبر سن کر سلیمان علیہ السلام نے اس کی تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی ہدہد سے فرمایا کہ میرا یہ خط لے جا کر ملکہ کے سامنے ڈال دو، پھر دیکھیں گے کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ ہدہد نے وہ خط ملکہ سبا کو اُس کے خاص کمرے میں پہنچایا خط کا مضمون گذشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ اس کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا گیا تھا اور قوم سبا سے کہا گیا تھا کہ تم میرے مقابلے میں نہ آنا بلکہ اطاعت گزار بن کر میرے پاس چلے آؤ۔

ملکہ سبا کی مشورہ طلبی

جب ملکہ نے یہ خط پڑھا تو اس نے اس معاملہ میں اپنے درباریوں سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ تمام عمائدین کو دربار میں جمع کر کے کہنے لگی قَالَتْ يَاأَيُّهَا الْمَلَؤُا أَفْتُونِي فِي أَمْرِي اے سرآوردہ لوگو! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔ اس مضمون کا خط آیا ہے اب تم بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے کیونکہ مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّىٰ تَشْهَدُونِ میں اس معاملہ میں ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں جب تک کہ تم حاضر ہو کر مجھے مشورہ نہ دو۔ ملکہ صاحب اختیار تھی اور جیسا کہ آگے آرہا ہے عمائدین حکومت اس کے ہر حکم کی تعمیل پر کمربستہ تھے۔ مگر ملکہ درباریوں کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملکہ کا نظامِ حکومت استبدادی نہیں بلکہ شورائی تھا جو کہ ایک نیک فال ہے۔

ڈکٹیٹر شپ اور مغربی جمہوریت

پرانے زمانے میں ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ عام تھی۔ بادشاہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اُس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا جس کے خلاف نہ کوئی داد ہوتی نہ فریاد۔ بادشاہ کوئی بھی ملکی فیصلہ کرنے کے لیے کسی وزیر، مشیر، دانشور، عالم، فقیہہ، سائنس دان کے مشورہ کا پابند نہیں ہوتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ برسراقتدار طبقہ غریب رعایا پر ظلم و ستم کا بازار گرم رکھتا اور انہیں اپنی آزادی کیلئے سوچنے کا

موقع بھی نہ دیتا۔ آج بھی دنیا میں اس قسم کے نظام موجود ہیں جو حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک لفظ تک سننا برداشت نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ہوس ملک گیری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے مقابل آنے کا شبہ بھی پڑ جائے تو اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ روس، چین اور دیگر کمیونسٹ ممالک میں اسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ رائج ہے کبھی روس اور چین مسلمانوں کے گڑھ ہوا کرتے تھے مگر بے دین حاکموں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی، وہاں کی مسجدیں گرا دی گئیں، کتابیں ضائع کر دیں اور دینی مدرسے ویران کر دیئے۔ اب ان ممالک میں آزادی کی لہر اٹھی ہے تو حکمران طبقہ کے بھی ہوش ٹھکانے آنے لگے ہیں۔ ان کو بھی آزادی کی صبح طلوع ہوتی نظر آ رہی ہے ورنہ انہوں نے چینی ثقافتی انقلاب کے دس سال بڑی کسمپرسی میں گزارے۔ ملوکیت زدہ ملک میں اور یہ بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ سیاہ فام مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے رہے ہیں، ملوکیت کی تاریخ ہی یہ رہی ہے کہ اپنے مقابلے میں نہ باپ بیٹے کو برداشت کرتا ہے اور نہ بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کا جانی دشمن بن جاتا ہے اور ہوس اقتدار کے سوا ان کے نزدیک ہر چیز ہیچ ہوتی ہے۔

آج کل دنیا میں جمہوریت (DEMOCRACY) کا بڑا چرچا ہے مگر یہ بھی اسلامی نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یورپ کی ایجاد کردہ اس لعنت میں آدمیوں کو گنا تو جاتا ہے مگر تولا نہیں جاتا۔ یعنی ہر عالم، جاہل، ہنر مند اور مزدور ایک ہی پلڑے میں ڈال دیئے جاتے ہیں اور پھر فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہیں۔ اس نظام میں اہل اور نا اہل میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا، اور یہی اس نظام کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ یہ کثرت رائے کا نتیجہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ نے دو بالغ مردوں کے آپس میں لواطت کے فعل کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا۔ کسی زمانے میں امریکہ والوں نے کثرت رائے سے یہ قانون منظور کیا تھا کہ شراب کی کشید، فروخت اور خرید کوئی جرم نہیں۔ مغربی جمہوریت کی اسی خرابی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا

بترس از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

ایسی جمہوریت سے دور بھاگو اور کسی اچھے اور پختہ کار آدمی کے تابعدار بن جاؤ کیونکہ دو سو گدھے مل کر بھی ایک انسانی دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اسلامی شورائی نظام

ان دو مذکورہ نظاموں کے برخلاف اسلامی نظام حکومت شورائی بھی ہے اور اس میں جمہوری قدریں بھی پائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کا خلیفہ یا حاکم مستبد نہیں ہوتا، نہ وہ اپنی من مانی کرتا ہے بلکہ ہر انتظامی معاملہ میں اپنی شوریٰ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ اسلام میں اربابِ حل و عقد سے مشاورت اس قدر ضروری ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو بھی اس کا پابند بنا دیا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران - ۱۵۹) ایسا معاملہ جس کے متعلق وحی نہ آئی ہو۔ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیا کریں۔ پھر جب باہمی مشاورت سے کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ کام کر گذریں۔ فقہائے کرام اس مسئلہ میں بحث کرتے ہیں کہ اسلامی نظام حکومت میں مشورہ لینا واجب ہے یا محض مستحب جس سے مخاطبین کی دلجوئی مطلوب ہو۔ مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اس آیت کے تحت حاکم کے لیے مشورہ لینا واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ خود پیغمبر اسلام کے لیے ضروری ہے، تو دوسرے لوگ کس شمار میں ہیں البتہ کسی ایسے معاملہ میں مشورہ کی ضرورت نہیں ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں یا پیغمبر نے اپنی زبان سے حل فرما دیا ہو مثلاً شراب اور جوئے، چوری اور ڈکیتی، جھوٹ اور غیبت، زنا اور لواطت وغیرہ معاملات کے جواز یا عدم جواز کے لیے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کا فیصلہ تو خود اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے۔ لہٰذا ایسے معاملات میں اگر ساری دنیا بھی مل کر کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی، یہاں مشاورت نہیں چل سکتی۔ اسی طرح کوئی یہ چاہے کہ اس بات پر شوریٰ کرالی جائے کہ نماز پڑھنی چاہیے یا نہیں، روزہ ضروری ہے یا نہیں، حج ساقط ہو سکتا ہے یا نہیں یا زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہونی چاہیے یا نہیں۔ یہ تمام شدہ

معاملات میں اور ان پر کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی مشاورت ایسے معاملات میں ہوگی جہاں کوئی الٰہی خاموشی ہوگی یا پیغمبر کا فرمان موجود نہیں ہوگا۔ یہی اسلامی نظامِ حکومت کی اصل روح ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے کہ آپس میں مشورہ کیا کرو کہ اس میں نقصان نہیں ہوتا بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے جب بہت سے لوگ مل کر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو صحیح بات کھل کر سامنے آجاتی ہے حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جس نے مشورہ کیا۔ وہ کبھی پشیمان نہیں ہوگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود خلفائے راشدین اور اصحاب حل وعقد سے مشورہ طلب کیا کرتے تھے۔ اور فیصلہ شدہ معاملات پر عمل پیرا ہونے کا حکم ہے وہاں مشورت کی ضرورت نہیں ہے۔ مشورہ کرنے سے تو موقع محل کی نزاکت کے مطابق صحیح رجحانات کے معاملات میں مشورہ کیا جائے دوسری اقوام سے تعلقات کے قیام کے لیے آپس میں مشورہ کرو۔ اللہ نے قرآن میں اہل ایمان کی یہ تعریف فرمائی ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ۔ ۳۸) ان کے معاملات آپس میں مشاورت سے طے پاتے ہیں۔

درباریوں کا مشورہ

بہرحال ملکہ سبا نے جب اپنے عمائدین سے مشورہ طلب کیا قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ تو وہ کہنے لگے کہ ہم بڑے طاقتور ہیں۔ ہمارے پاس فوج اور پولیس ہے جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہے۔ رسد و کمک کی بھی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے پاس ماہرین حرب وضرب موجود ہیں۔ لہٰذا وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ہم سخت جنگجو لوگ ہیں۔ لڑائی میں پشت پھیر کر بھاگنے والے نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر جنگ شروع کر سکتے ہیں لیکن وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے ابھی جنگ کا فیصلہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے ہم تو تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں اور اگر آپ جنگ کی بجائے صلح صفائی کا فیصلہ کریں تو ہم پھر بھی حاضر ہیں۔ بہرحال ان لوگوں نے اپنی حیثیت کے مطابق رائے دی مگر فیصلہ ملکہ پر ہی چھوڑ دیا۔

ملکہ کے خیالات اس کی دانشمندی کو ظاہر کرتے تھے۔ کہنے لگی قَالَتْ اِنَّ

الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا جب فاتح بادشاہ کسی ملک میں
داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں۔ وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً
اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ
اور عام طور پر وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ملکہ سبا نے یہ تجربے کی بات کہی تھی جس کی ساری
دنیا شاہد ہے۔ ہزاروں سال سے جنگ و جدال کا نتیجہ یہی نکلتا آرہا ہے کہ مفتوح قوم
کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی ہے۔ ملوک اپنے مدمقابل کو کبھی برداشت نہیں کرتے
کسی پر ذرا بھی شبہ پڑ جائے تو اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ فرعون کے واقعات
سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا
تھا۔ نمرود کا بھی یہی شیوہ تھا۔ مابعد زمانے میں چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کسے یاد
نہیں۔ پھر انگریز کی باری آئی تو اس نے بھی ظلم و ستم ڈھانے میں کمی نہیں کی۔ چونکہ انگریزوں
نے برصغیر میں مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، اس لیے مسلمانوں کو وہ ہمیشہ دبا کر رکھتے
تھے۔ چنانچہ انگریز کے ابتدائی دور میں بے شمار مسلمان مارے گئے اور بہت سوں نے
قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ دہلی میں کنگ ایڈورڈ روڈ پر اکبری مسجد تھی جہاں
شاہ عبد القادرؒ نے بارہ سال تک اعتکاف بیٹھ کر سلیس بامحاورہ ترجمہ قرآن لکھا تھا۔
انگریزوں نے یہ مسجد بھی گرا دی تھی، جس کا آج نام و نشان تک باقی نہیں۔ غرضیکہ ملکہ سبا
نے اپنے تجربے کی بنا پر ان خیالات کا اظہار کیا کہ اگر سلیمان علیہ السلام ہمارا اس وقت
[illegible] ہمارے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ لہٰذا اس خطرے کو کسی بہتر
طریقے سے ٹالنا چاہیے تاکہ فوراً اعلانِ جنگ نہ کر دیا جائے۔

ملکہ کی طرف سے تحائف

چنانچہ ملکہ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمانے کے لیے یہ فیصلہ کیا
وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ میں ان کی طرف کچھ تحائف بھیجنے والی ہوں۔
فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ پس دیکھتی ہوں کہ میرے بھیجے ہوئے
لوگ کیا جواب لاتے ہیں۔ ملکہ سبا کا مقصد یہ تھا کہ اگر سلیمان علیہ السلام ملوک کی قسم
سے ہیں تو وہ تحفے تحائف لے کر خوش ہو جائیں گے اور حملہ آور نہیں ہوں گے۔

اگر وہ کوئی اچھا آدمی ہے تو پھر اس کے ساتھ اچھے طریقے سے نمٹا جائے گا۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ ملکہ نے تحفے میں پانچسو لونڈیاں، پانچسو غلام اور سونے کی پانچسو اینٹیں سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کیں۔ یہودی روایات میں چھ ہزار لونڈیوں اور خوبصورت غلاموں کا ذکر آتا ہے۔ یہ سارا مال بحری راستے سے کشتیوں میں لاد کر سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا گیا۔

دریں اثنا اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بذریعہ وحی خبر دے دی کہ ملکہ سبا ان کے لیے اس قسم کے تحائف بھیج رہی ہے۔ آپ نے اپنے دربار کے جنات کو حکم دیا کہ نو میل کی مسافت تک ایسی سڑک بنا دی جائے جس کا فرش سونے کی اینٹوں کا ہو۔ پھر سڑک کے کنارے ایسے جانور کھڑے کر دیئے گئے جن کا بول و براز سونے کی اینٹوں پر پڑتا تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے اپنے دربار کی بھی از سر نو تزئین کی۔ وہاں پر مختلف عمائدین حکومت کے لیے سونے کی بنی ہوئی کرسیاں اور صوفے سیٹ لگائے غرضیکہ انہوں نے حیرت انگیز طریقے سے شاہی دربار کو سجایا۔

مفسرین بیان کرتے ہیں۔ کہ جب ملکہ سبا کا قافلہ مذکورہ تحائف لے کر قریب پہنچا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم تو سونے کی صرف پانچسو اینٹیں لائے ہیں جبکہ یہاں تو نو میل لمبی سڑک ہی سونے کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے تحائف کو سلیمان علیہ السلام کے مقابلے میں بالکل حقیر سمجھا۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے سونے کی پانچسو اینٹیں وہیں پھینک دیں کہ اتنا معمولی سا تحفہ سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں کیسے پیش کریں گے! پھر جب وہ شاہی دربار میں پہنچے تو وہاں کی تزئین و آرائش اور دربار کے انتظامات دیکھ کر سکتے میں آ گئے کہ ہم تو تحائف کے ذریعے سلیمان علیہ السلام کو مرعوب کرنا چاہتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ بہرحال جب یہ شاہی قافلہ سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچا تو آپ نے ان کا باوقار طریقے سے باعزت استقبال کیا، ان کو بہترین جگہوں پر بٹھایا اور ان کی خاطر مدارت کی۔ اب اگلی آیات میں واقعہ کا اگلا حصہ آ رہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾

ترجمہ :- پھر جب آیا (ملکہ سبا کا قاصد) سلیمان علیہ السلام کے پاس تو آپ نے کہا ، کیا تم میری مدد کرتے ہو مال کے ساتھ پس جو اللہ نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے اُس سے جو تمہیں دیا ہے ۔ بلکہ تم لوگ اپنے تحائف کے ساتھ خوش ہو (۳۶) واپس جاؤ اُن کی طرف

پھر ہم لائیں گے ان کے مقابلے میں ایسا لشکر کہ اُن
ہیں اُس کے مقابلے کی طاقت نہیں ہو گی۔ اور ہم نکالیں
گے اُن کو اُس سے بے عزت کر کے اور وہ خوار ہوں
گے (۳۷) کہا (سلیمان علیہ السلام نے) اے دربار والو! تم میں
سے کون ہے جو لائے میرے پاس اُس کا تخت قبل
اِس کے کہ وہ آئیں میرے پاس اطاعت گزار بن کر (۳۸)
کہا ایک سرکش جن نے کہ میں لاتا ہوں اُس کو آپ کے
پاس قبل اِس کے کہ آپ کھڑے ہوں۔ اپنے مقام سے اور
میں اِس پر قوی اور امانتدار ہوں (۳۹) کہا اُس شخص نے جس
کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں لا دیتا ہوں آپ کو یہ
(تخت) قبل اِس کے کہ پلٹے آپ کی نگاہ آپ کی طرف
(پھر ایسا ہی ہوا) جب دیکھا (سلیمان علیہ السلام نے) (دیکھا ہوا وہ
تخت) اپنے پاس تو کہا کہ یہ میرے پروردگار کے فضل سے
ہے۔ وہ مجھ کو جانچنا چاہتا ہے کہ میں شکر ادا کرتا ہوں یا
ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شخص شکر کرتا ہے، وہ اپنی ذات کے
لیے کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے، پس بیشک میرا
پروردگار غنی اور عزت والا ہے (۴۰)

ربط آیات ملکہ سبا نے اپنے درباریوں سے سلیمان علیہ السلام کی طرف سے بھیجے ہوئے خط کا ذکر کیا اور ان سے
مشورہ طلب کیا کہ ہمیں اس خط کا کس طریقے سے جواب دینا چاہیے۔ درباریوں نے
کہا کہ ہمارے پاس جدید اسلحہ سے لیس بہترین فوج ہے۔ رسد و کمک کی بھی کمی نہیں
یعنی ہم خط بھیجنے والوں سے ٹکر لینے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ مگر فیصلہ تیرے
ہاتھ میں ہے۔ جو تو چاہے گی ہم تعمیل کریں گے۔ اس کے بعد ملکہ نے یہ رائے ظاہر

لہٰذا تاریخ عالم بتاتی ہے کہ جب بھی کوئی بادشاہ کسی دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے اور اس کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے لہٰذا جنگ کوئی اچھی چیز نہیں، اس سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ ملکہ نے یہ تدبیر راہ نکالی کہ میں اُن کی طرف تحائف بھیج کر معلوم کرتی ہوں کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

قافلہ سبا کی آمد اور واپسی

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ملکہ نے بہت سے گراں قیمت تحائف دے کر ایک قافلہ سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ کیا۔ تحائف میں زر و جواہرات کے علاوہ بہت سے لونڈی غلام بھی تھے جنہیں بحری راستے سے روانہ کیا گیا۔ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ جب یہ قافلہ سلیمان علیہ السلام کے ہاں پہنچا تو اس سے پہلے آپ اُن پر رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے بہت سے انتظام کر چکے تھے جنہیں دیکھ کر اہلِ قافلہ کو اپنے تحائف پر سخت ندامت ہوئی۔ تاہم وہ سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچ گئے۔ آن کے تحائف دیکھ کر آپ نے فرمایا قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ کیا تم لوگ اس مال و دولت کے ذریعے میری مدد کرنا چاہتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے اِن چیزوں کی قطعی حاجت نہیں کیونکہ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ اللہ تعالیٰ نے مجھے تم سے بہتر عطا کر رکھا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا کہ جس شاہراہ پر سے تم گزر کر آئے ہو وہ سونے کی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے جس پر میرے مویشی بول و براز کرتے ہیں۔ بھلا مجھے تمہاری اِن پانچ سو سنہری اینٹوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ تمہیں تو اللہ نے صرف دنیا کا مال دیا ہے، لیکن مجھے اس مال کے علاوہ علم، دین، شریعت اور نبوت بھی عطا فرمائی ہے، لہٰذا مجھے جو کچھ عطا کیا گیا ہے وہ تم سے بہت بہتر ہے جہاں تک فوج، لشکر اور سامان ضرب و حرب کا تعلق ہے تو میرے پاس نہ صرف انسانوں کی کثیر تعداد میں فوج ہے بلکہ جنات اور پرندوں کے لشکر بھی ہیں۔ اللہ نے تمام جانور بھی میرے تابع کر دیے ہیں۔ لہٰذا نہ تو تم مال میں مجھ سے زیادہ ہو اور نہ میدان جنگ میں میرا مقابلہ کر سکتے ہو۔ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ بلکہ تم لوگ اپنے تحائف کے ساتھ خوش ہو۔

فرمایا اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ واپس جاؤ اپنے بھیجنے والوں کی طرف ہمیں ان تحائف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ لوگ مطیع ہو کر ہمارے پاس چلے آئیں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا تو پھر ہم سبا والوں کی طرف ایسا لشکر لائیں گے جس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہم اُن پر حملہ آور ہوں گے وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَا اَذِلَّةً اور انہیں ان کے ملک سے نکال دیں گے بے عزت کر کے وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ اور وہ ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ اُن کی سلطنت بھی چھین جائیگی اور اُن کو قیدی بھی بنا لیا جائیگا۔

جب سبا کا یہ قافلہ دھمکی آمیز پیغام لے کر اپنے ملک واپس پہنچا تو ملکہ کو سارے حالات سے آگاہ کیا کہ سلیمان علیہ السلام کو تحائف کی ضرورت نہیں ہے، اللہ نے انہیں بہت کچھ دیا ہے، وہ تو صرف اطاعت چاہتے ہیں۔ ملکہ دانشمند تھی فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئی اور جنگ و جدل کی بجائے اطاعت گزاری اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ملکہ نے روانگی کی تاریخ مقرر کی اور مع اپنے درباریوں کے شام و فلسطین کے سفر پر روانہ ہو گئیں تاکہ سلیمان علیہ السلام کے پاس خود حاضر ہو کر اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلا سکیں۔

تختِ بلقیس کا حصول

اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو ظاہری اور باطنی قوتوں سے نوازا تھا سلسلہ وحی بھی جاری تھا۔ جونہی ملکہ کا قافلہ سبا سے روانہ ہوا، اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو اطلاع دے دی۔ جس طرح آپ نے پہلے قافلے والوں پر اپنی برتری کا اظہار کیا تھا، اسی طرح خود ملکہ کے سامنے بھی اس کا اظہار ضروری سمجھا اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا فرمایا اے میرے درباروالو! اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ تم میں سے کون ہے جو ملکہ بلقیس کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس پہنچیں؟ مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جان لیں کہ سلیمان علیہ السلام صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مافوق العادت قوت بھی رکھتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تختِ بلقیس کو اُس کے

اطاعت گزار ہو کر آنے سے پہلے لانا ضروری تھا کیونکہ اُس کے ایمان لے آنے کے بعد اُس کے کسی مال پر تصرف کرنا روا نہیں تھا حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمَ مِنِّیْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ جس شخص نے کلمہ پڑھ لیا، اور مسلمان ہو گیا تو اب اُس کا مال و جان میری طرف سے محفوظ ہو گیا۔ بمقابل کی حیثیت حربی کافر کی ہو تو اُس کے مال و جان میں تصرف روا ہے اسی لیے دورانِ جنگ حاصل ہونے والی کسی ایسی چیز کو مالِ غنیمت کہتے ہیں اور یہ مسلمانوں کے لیے جائز ہوتی ہے۔ ایسا مال یا تو مجاہدین میں تقسیم ہو جاتا ہے یا پھر بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے۔ البتہ جب کوئی شخص، قوم یا قبیلہ اطاعت گزار بن جاتا ہے تو پھر اُس کی مرضی کے بغیر اس کے مال و جان میں تصرف روا نہیں ہوتا۔

سرکش جن کی پیشکش

بہرحال حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اہلِ سبا کے فرمانبردار بننے سے پہلے پہلے بلقیس کا تخت کون لائے گا؟ آپ کے دربار میں انسان اور جنات سب موجود تھے۔ چنانچہ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ ایک سرکش جن کہنے لگا اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ میں وہ تخت لے آؤں گا قبل اس کے آپ اپنے مقام سے اٹھ کھڑے ہوں مطلب یہ تھا کہ میں دربار برخواست ہونے سے پہلے پہلے تختِ بلقیس کو حاضر کر دوں گا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ میں اس کام کے لیے طاقت بھی رکھتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں۔ یعنی وہ تخت بعینہٖ اصلی حالت میں پیش کر دوں گا، راستے میں اُس کی چیز میں تصرف نہیں کروں گا۔

یہاں پر جن کے لیے سرکش کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن انسانوں کی نسبت زیادہ لطیف اور زیادہ طاقتور ہے۔ اس لحاظ سے اُسے سرکش کہا گیا ہے مگر اُس وقت سارے جن سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے اور آپ کے سامنے سرکشی کرنے یا حکم عدولی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو اختیار دے رکھا تھا کہ اگر جنوں میں سے کوئی بھی آپ سے سرتابی کرے تو آپ جو چاہیں اُسے سزا دے سکتے ہیں۔ چنانچہ جن آپ کے مکمل مطیع تھے آپ کے حکم سے بڑی بڑی عمارات

تعمیر کرتے تھے، سمندر سے بڑی بڑی چیزیں نکالتے تھے اور حسبِ ضرورت دھاتوں کو ڈھالنے کا کام بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر امور بھی انجام دیتے تھے جو عام طور پر انسانوں کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تعمیری کاموں کے لیے بڑی بڑی مشینری ایجاد ہو چکی ہے مگر سلیمان علیہ السلام یہ سارا کام جنوں سے لیتے تھے۔ اُن کی اس طاقت اور زورآوری کی وجہ سے ہی اُس جن کو سرکش جن کہا گیا ہے۔ اگر اُس نے دربار برخاست ہونے سے قبل تختِ بلقیس لے آنے کی پیش کش کی۔

عالم کتاب انسان کی پیش کش

جن کی اس پیش کش کے بعد قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کہا اُس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ میں وہ تخت لے آتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے یعنی میں آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت کو حاضر کر دیتا ہوں۔

یہ شخص کون تھا؟ اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ وہ انسان ہی تھا۔ اُس کا نام آصف ابن برخیا تھا، اور وہ سلیمان علیہ السلام کا وزیر تھا۔ یہ شخص آسمانی کتابوں کا عالم تھا۔ نہایت نیک اور صاحب کرامت آدمی تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ شخص صدیقین میں سے تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آنکھ جھپکنے میں تخت کا حاضر کر دینا صوفیائے کرام کی اصطلاح کے مطابق تصرف تھا جس کا تعلق عملیات سے ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ایسے عمل کرتے ہیں جن کی وجہ سے بعض اوقات ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ عملیات کے ذریعے بیماری کو بھی سلب کیا جا سکتا ہے۔ بعض تعویز کرتے ہیں اور بعض کلام پڑھ کر پھونک مارتے ہیں جس کا فوراً اثر ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ سانپ کے کاٹے کا دم کرتے ہیں جس سے زہر کا اثر فوراً زائل ہو جاتا ہے۔ یہ مسمریزم کی طرز کی چیز ہے جس میں عامل اپنی نگاہ کو کسی خاص چیز پر مرتکز کر کے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے جس سے اُس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ معمول بے ہوش ہو جاتا ہے، پھر وہ باتیں کرنے لگتا ہے اور بعض چیزوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے تو بعض کہتے ہیں کہ یہ کوئی اس قسم کی بات تھی تاہم زیادہ تر مفسرین اسے آصف بن برخیا کی طرف منسوب

کرتے ہیں جو نیک آدمی تھا، کتب سماویہ کا علم رکھتا تھا اور اس کے پاس اسم اعظم کا علم تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک میں ایسے نام بھی ہیں کہ إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ وَإِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى جب کوئی شخص کسی ایسے نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور جب وہ کوئی چیز طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ تو بعض کہتے ہیں کہ اس عالم کتاب شخص نے اسم اعظم کے ذریعے دعا کی تو اللہ نے بلقیس کا تخت فوراً حاضر کر دیا۔ اسم اعظم کو کسی خاص اسم کے ساتھ متعین نہیں کیا گیا بلکہ احتمال تو یہی سمجھا گیا ہے کہ یہ مختلف کلمات میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی مبہم رکھا گیا ہے جیسے لیلۃ القدر اور جمعہ کے دن قبولیت دعا کا وقت مبہم رکھا گیا ہے تاکہ متلاشیان خود اس کی تلاش کریں۔ چنانچہ بعض نے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ میں بتلاتے ہیں اور بعض یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ میں بعض نے سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیت الٓمٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ پر محمول کرتے ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس شخص نے بارگاہ رب العزت میں اس طرح دعا کی یَا اِلٰهَنَا وَاِلٰهَ كُلِّ شَيْءٍ اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ائْتِنِيْ بِعَرْشِهَا اے ہمارے اور ہر چیز کے اکیلے معبود، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ مجھے بلقیس کا تخت لا دے۔

اسم اعظم کی برکت

اسم اعظم کے پڑھنے کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عقیدہ صحیح اور رزق حلال ہو اور انسان پوری دلجمعی کے ساتھ اللہ کے سامنے عاجزی اور نیازمندی کا اظہار کرتے ہوئے پڑھے تو اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوں گے۔ تو بعض نے تخت بلقیس کی آمد کو اسم اعظم کی برکت قرار دیا ہے۔ تاہم صحیح ترین بات یہی ہے کہ یہ شخص مومن اور صاحب کرامت آدمی تھا جس کی دعا سے تخت فوراً حاضر کر دیا گیا۔

معجزہ اور کرامت

اس بات پر سب متفق ہیں کہ اگر نبی کے ہاتھ پر کوئی خرق عادت بات ظاہر ہو تو وہ معجزہ کہلاتی ہے اور اگر کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے نیز جو ایسی چیز نبی کی موجودگی میں امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہو وہ نبی کے اتباع اور اس کی

برکت سے ہوگی۔ معجزہ اور کرامت انسان کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ جسے وہ انسان کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ عام طور پر معجزہ یا کرامت غیر اختیاری چیز ہوتی ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت کسی کو کوئی معجزہ یا کرامت عطا کر کے حسب ضرورت ظاہر کرنے کا اختیار دے دے تو ایسا بھی ممکن ہے۔ اسکی مثال موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں جنہیں اللہ نے عطا فرمایا اور حسب ضرورت فرعون کے سامنے ظاہر کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ بہر حال معجزہ یا کرامت اللہ کا فعل ہوتا ہے نہ کہ کسی بندے کا۔ قرآن میں تصریح موجود ہے وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (الرعد۔ ۳۸) کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی نشانی پیش کر سکے مگر اللہ کے حکم سے تمام معجزات اور کرامت اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ظاہر ہوتے ہیں کوئی نبی یا ولی جب چاہے اپنے اختیار سے ایسا نہیں کر سکتا۔

بہر حال یہ شخص صاحب کرامت تھا اور سلیمان علیہ السلام کی موجودگی میں اس کی حیثیت معجزے کی تھی۔ آپ خود بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی دعا کر سکتے تھے مگر اہل سبا کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ اگر سلیمان علیہ السلام کا ایک متبع ایسا کر سکتا ہے تو آپ کی حیثیت تو بہر حال اس سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

صاحب تفسیر مظہری اور بعض دوسرے اصحاب فرماتے ہیں کہ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں۔ مگر صحیح بات وہی ہے جو میں نے عرض کر دی کہ یہ کام آصف ابن برخیا کے ذریعے ہوا جو سلیمان علیہ السلام کا وزیر، کامل الایمان، متقی، پرہیزگار اور صاحب کرامت شخص تھا۔

صاحب تفسیر کبیر امام رازیؒ نے عقلی بات کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا سیارہ ہے جو کہ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ جب اللہ نے اتنا بڑا اور اتنا تیز رفتار نظام قائم کر رکھا ہے تو اس کے مقابلے میں یمن اور شام کا فاصلہ ہی کتنا ہے کہ اس پر حیرانگی کا اظہار کیا جائے کہ

تختِ بلقیس آنکھ جھپکنے میں کیسے پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ ایک نہایت ہی معمولی سا کام ہے جو ہو گیا۔ وہاں پر ظاہری اسباب تو نہیں تھے۔ زمین کو شق کیا گیا یا وہ تخت ہوا کے دوش پر لایا گیا، جیسے بھی ہوا یہ کرامت تھی اور فی الواقع ایسا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ جب سلیمان علیہ السلام نے تختِ بلقیس کو اپنے سامنے موجود پایا۔ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ کہنے لگے یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے کہ اللہ نے میرے ایک ساتھی کے ہاتھ پر یہ کام ظاہر کر دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس مافوق العادت کرنا اپنا کمال ظاہر کیا ہے، نہ آصف کا اور نہ کسی فرج کا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے کہ اس کی مہربانی سے ہوا پھر خود ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ مہربانی اسلیے کی ہے لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں یا ناشکر گزاری کرتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام قدم قدم پر اللہ کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی فرمایا تھا اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ (سبا۔ ۱۳) اے داؤد علیہ السلام کے گھر والو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو، مگر میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ بہرحال انبیاء کا یہ خاندان اللہ کا ہمیشہ شکر ادا کرتا تھا۔

سلیمان علیہ السلام نے یہ بھی کہا وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ جو کوئی شکر ادا کرتا ہے تو اس کا فائدہ خود اس کی ذات کو ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شکریہ ادا کیا جائے تو اللہ راضی ہوتا ہے۔ اس کا اعلان ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم۔ ۷) اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں مزید انعامات سے نوازوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو پھر میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔ ناشکری کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ہر ہر نعمت پر شکر ادا کرنا چاہیے۔

فرمایا جو شکریہ ادا کرتا ہے اس کا فائدہ اُسی کو ہوتا ہے وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ اور جس نے ناشکری کی تو میرا پروردگار تو اس شکریہ اور تعریف سے مستغنی ہے۔ اُسے کسی کی تعریف کی حاجت نہیں۔ وہ ہر حالت میں تعریفوں والا ہے اور بڑا ہی عزت والا ہے۔ اس طرح گویا سلیمان علیہ السلام نے خود اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تعریف کی اور پھر شکریہ کا فلسفہ بھی بیان کر دیا۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

ع ۱۳ ۱۸

ترجمہ:- کہا (سلیمان علیہ السلام نے) تبدیل کردو اس (بلقیس) کے لیے اُس کا تخت، تاکہ ہم دیکھیں کہ یہ سمجھتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہے جو نہیں سمجھتے ﴿۴۱﴾ پس جب وہ پہنچی (سلیمان علیہ السلام کے پاس) تو اس سے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی، گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہمیں علم دیا گیا تھا اس سے پہلے اور تھے ہم فرمانبرداری کرنے والے ﴿۴۲﴾ اور روکا تھا اُس کو اُس چیز نے کہ وہ عبادت کرتی تھی اللہ کے سوا۔ یہ اس لیے کہ وہ کفر کرنے

والے لوگوں میں سے تھی (۴۳) کہا گیا اُس (عورت) سے کہ
داخل ہو جاؤ محل میں۔ جب اُس نے دیکھا اُس کو تو گمان
کیا اس کو پانی کی موج، اور اُس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا
اُوپر اٹھا لیا۔ تو کہا (سلیمان علیہ السلام نے) کہ یہ ایک محل
ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ کہنے لگی، اے
میرے پروردگار! بیشک میں نے ظلم کیا ہے اپنی جان
پر، اور میں اسلام لائی ہوں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ کے
لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے (۴۴)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں سلیمان علیہ السلام کے شرف اور آپ کی غیر معمولی قوت کا ذکر تھا جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے کہا کہ میرے پاس ملکہ سبا کا تخت کون لائے گا۔ ایک سرکش جن نے کہا کہ میں آپ کی مجلس برخاست ہونے سے قبل تخت کو لا سکتا ہوں۔ مگر سلیمان علیہ السلام اس سے بھی جلدی کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ ایک عالم کتاب شخص نے کہا کہ میں وہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ملکہ کا تخت ملک سبا سے فوراً یروشلم پہنچ گیا۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے پروردگار کا فضل ہے وہ ہمارا امتحان لینا چاہتا ہے کہ ہم اُس کا شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکرگزاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ شکر ادا کرنے سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اسمیں خود شکرگزار کا ہی فائدہ ہوتا ہے۔ اُس کے نفس کی بہتری اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اُس کو درجہ ملتا ہے اور وہ مزید نعمت کا مستحق بن جاتا ہے۔ گویا سلیمان علیہ السلام اللہ کے نہایت ہی شکرگزار بندے تھے۔ صاحب صحیفہ نبی اور رسول تھے اور اللہ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا فرمائی تھی۔

ملکہ سبا کا پہلا امتحان

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کے لیے بنفس نفیس ملک سبا سے روانہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ اُس کے عمائدین سلطنت

لشکر اور بہت سا ساز و سامان بھی تھا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھی کہ اُس کا تخت پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اب سلیمان علیہ السلام ملکہ بلقیس کی آمد پر اُس کو بعض اُمور میں آزمانا چاہتے تھے تاکہ پتہ مل سکے کہ وہ کس صلاحیت کی مالک ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر وہ صاحبِ عقل و دانش ہوگی تو ایمان قبول کرے گی ورنہ ہدایت سے محروم رہے گی چنانچہ ملکہ کی آمد سے قبل ہی سلیمان علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو حکم دیا۔ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا کہ اِس کے لئے ملکہ کے تخت میں کچھ تغیر و تبدل کر دو تاکہ ہم اس کی عقل کا امتحان لے سکیں۔ مقصد یہ ہے نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ کہ ہم دیکھیں کہ وہ کچھ رکھتی ہے یا بے کچھ لوگوں میں سے ہے۔ اگر عقلمند ہوگی تو فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ تو اُسی کا تخت ہے جسے وہ اپنے محل میں بند کر کے آئی ہے۔

فَلَمَّا جَاءَتْ پھر جب ملکہ سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ گئی تو آپ کے درباریوں نے اُس کا بڑے اچھے طریقے سے استقبال کیا اور اُس کو بڑا اعزاز دیا۔ ملکہ نے سلیمان علیہ السلام کا دربار، آپ کے کارندے اور وہاں پر موجود ہر چیز کو بغور دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ خود ایک متمدن حکومت کی ملکہ تھی۔ اُس کے پاس بھی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتظامات دیکھ کر اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت تو بے مثال تھی جسے انہوں نے خود اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر طلب کیا تھا وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي (ص۔ ۳۵) مولا کریم مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو نصیب نہ ہو۔

ملکہ سبا کی آمد کے بعض حالات کا ذکر نہیں کیا گیا، البتہ اصل مقصد کی بات کی گئی ہے۔ چونکہ ملکہ سبا کا امتحان مطلوب تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے اُس سے دریافت کیا۔ قِيلَ أَهَكَذَا عَرْشُكِ دیکھو ہمارے پاس یہ تخت ہے، کیا تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے جس پر بیٹھ کر تم امورِ سلطنت انجام دیتی ہو قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ کہنے لگی گویا کہ یہ ہو بہو ویسا ہی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ تو وہی میرا تخت ہے جس میں سلیمان علیہ السلام نے کچھ تبدیلی کر کے میرے سامنے پیش کیا ہے۔

ملکہ کا اعتراف حقیقت

اس کے علاوہ ملکہ نے یہ اعتراف بھی کیا وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا اس بات کا علم تو ہمیں پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کے کمال کے متعلق اپنے وفد کے ذریعے سے پہلے ہی سن رکھا ہے کہ اللہ نے آپ کو بے مثال برتری عطا فرمائی ہے۔ یہ اُسی بات کا کرشمہ ہے کہ ہمارا تخت ہمارے پہنچنے سے پہلے یہاں موجود ہے حالانکہ ہم اُسے محل میں مقفل کر کے روانہ ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ ہمیں آپ کے کمالات کا علم دے دیا گیا تھا۔ وَكُنَّا مُسْلِمِينَ اور ہم تو پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے۔ ہم آپ کی صداقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ آپ عام دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں بلکہ آپ کے فضائل و کمالات منجانب اللہ ہیں۔ اسی لیے ہم نے جنگ و جدال کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے تسلیم و رضا کا پہلو اختیار کیا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملکہ بلقیس اتنی ہی سمجھدار عورت تھی اور وہ حقیقت کو پہلے ہی پا چکی تھی تو پھر اس نے وہیں پر اس کا اظہار کیوں نہ کیا اور اس نے سلیمان علیہ السلام کے پاس آ کر اسلام کیوں قبول کیا؟ اللہ نے آگے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ اس کو روک دیا تھا ایمان لانے سے اُن چیزوں نے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتی تھی إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ بیشک وہ کافر قوم کی ایک فرد تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کافر قوم کے کفریہ اور شرکیہ رسم و رواج اور طور طریقوں نے ملکہ کو ایمان لانے سے روک رکھا تھا۔ اکثر لوگ اپنی جاہلانہ رسم و رواج میں پھنس کر ہی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ اس زمانے کا حال بھی مختلف نہیں۔ پوری کی پوری قومیں محض رسم و رواج کی پابند ہو کر رہ گئی ہیں۔ کوئی اکا دکا سمجھدار آدمی ہو بھی تو وہ بھی انہی کے طور طریقوں پر چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آج بھی لوگ کسی حقیقت کو سوچنے سمجھنے کی بجائے لکیر کے فقیر بن کر ہدایت سے محروم ہیں۔ عام قوموں، فرقوں اور جماعتوں کا بھی یہی حال ہے۔

بعض آدمیوں کے بارے میں حیرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے دانشور، مدبر اور باریک بین ہونے کے باوجود کفر و شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ملکی اور خاندانی رسم و رواج ان کے مزاج میں رچ بس چکا ہوتا ہے۔ جس سے چھٹکارا ممکن نہیں

ہوتا۔ ہندوؤں میں گاندھی کوئی بیوقوف آدمی تو نہیں تھا، نہرو بین الاقوامی حیثیت کا حامل تھا
ہمارے ہاں ظفر اللہ قادیانی بڑا قابل آدمی تھا، مگر یہ سب لوگ باپ دادا کے رسم و رواج پر
ہی اڑے رہے۔ مذہبیت کی بات پر غور ہی نہیں کیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعۡبُدُ مِن دُونِ ٱللَّهِ
کا ترجمہ یہ کرتے ہیں سلیمان علیہ السلام نے روک دیا اس عورت کو اس چیز سے جس کی وہ
عبادت کرتی تھی اللہ کے سوا گویا آپ نے بلقیس پر واضح کر دیا کہ اب کفر و شرک کی بات
نہیں چلے گی اور نہ سورج کی پرستش ہوگی، جو ایسا کرے گا وہ سزا پائے گا۔ تاہم پہلے معنی زیادہ
متبادر ہیں کہ ملکہ کو غیر اللہ کی پوجا کرنے والی چیزوں نے ایمان لانے سے روک رکھا تھا۔

ملکہ کا دوسرا امتحان

ملکہ پہلے امتحان میں تو پاس ہوگئی کہ اس نے اپنے تخت کو بھی پہچان لیا۔ اور پھر اعتراف
حقیقت کر کے ایمان لے آئی۔ اب سلیمان علیہ السلام نے اسے دوسرے امتحان میں ڈالا۔
قِيلَ لَهَا ٱدۡخُلِي ٱلصَّرۡحَ اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔ فَلَمَّا رَأَتۡهُ
جب اس نے اندر داخل ہو کر دیکھا حَسِبَتۡهُ لُجَّةٗ تو اس کو پانی کی موج گمان کیا محل
کا فرش اس طرح لگایا گیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک پانی کا تالاب ہے جس میں مچھلیاں
اچھل کود رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پانی میں سے گزرتے وقت انسان اپنے کپڑے سمیٹ
لیتا ہے تاکہ بھیگنے نہ پائیں۔ چنانچہ ملکہ نے بھی ایسا ہی کیا وَكَشَفَتۡ عَن سَاقَيۡهَا
اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اوپر اٹھا لیا۔ اس امتحان میں وہ ناکام ہو چکی تھی۔ در اصل اسے پانی
میں سے نہیں گزرنا تھا بلکہ شیشے کے بنے ہوئے فرش پر سے گزرنا تھا جس کے نیچے
بہتا ہوا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ قَالَ إِنَّهُۥ صَرۡحٞ مُّمَرَّدٞ مِّن قَوَارِيرَ سلیمان علیہ السلام
نے ملکہ سے کہا کہ تمہیں غلطی لگی ہے کہ یہ ایسا محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی
محل کا فرش ہی شیشے کا بنا ہوا ہے جس کے اوپر سے گزرنا ہے۔ لہٰذا یہاں پر پنڈلیاں کھولنے
کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملکہ کو پانی پر سے گزارنے کا مقصد یہ تھا کہ
سلیمان علیہ السلام ملکہ کی پنڈلیاں دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ اس کی
پنڈلیوں پر بال بہت زیادہ ہیں۔ ملکہ کو جنیہ کی بیٹی بھی کہا گیا ہے۔ بہرحال یہ سب تفسیری

روایات میں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ملکہ کا اسلام سے آنا

جب ملکہ اس دوسرے امتحان میں ناکام ہوگئی تو آپ اپنی کم پائیگی کا احساس ہوا تو قالت کہنے لگی رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ پروردگار! بیشک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے کہ میں اب تک کفر و شرک میں مبتلا رہی ہوں۔ اور کفر و شرک کی حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک دھوکہ ہے۔ جس طرح ملکہ کو پانی کا دھوکہ ہوا اسی طرح کافروں اور مشرکوں کو دھوکہ ہوتا ہے وہ ایسی چیزوں کو معبود بنالیتے ہیں، اُن کی غائت درجہ کی تعظیم کرتے ہیں، اُن کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ جن میں کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، اور اس طرح وہ خدا تعالےٰ سے غافل ہوجاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک بنانا یا اس کے اختیار میں شریک بنانا سب دھوکہ ہے۔ بعض نادان سمجھتے ہیں کہ یہ معبود ہماری کشتی کو پار لگادیں گے۔ کوئی مریض کی شفایابی کے لیے غیر اللہ کی پوجا کرتا ہے۔ کوئی جنوں اور انسانوں سے مدد مانگتا ہے کوئی قبروں پر ماتھا رگڑتا ہے کوئی اولیاء اللہ کے نام کی دہائی دیتا ہے۔ کوئی اصنام و اشجار کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتا ہے، کوئی پانی، ہوا اور سورج کی پوجا کرتا ہے، کوئی ستاروں کو با اختیار سمجھتا ہے۔ غرضیکہ شرک کے ہزاروں راستے ہیں جو کہ سراسر دھوکہ ہے۔ ملکہ سبا نے بھی ایسا ہی دھوکہ کھایا، مگر فوراً سنبھل گئی اور اپنے آپ پر ظلم کرنے کا اعتراف کرلیا۔ اور پھر واضح طور پر اقرار کیا۔ وَاَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اب میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ پروردگار عالم پر ایمان لاچکی ہوں۔ اپنی سابقہ غلطی کا اقرار کرتی ہوں اور اعلان کرتی ہوں کہ اللہ رب العالمین کے سوا کوئی قادر مطلق ہے اور نہ نافع اور ضار۔ اُس کے سوا کوئی خالق نہیں کسی مریض کو کوئی شفا نہیں دے سکتا اور نہ کسی کی کوئی بگڑی بنا سکتا ہے۔ تمام اختیارات اللہ رب العزت کے پاس ہیں، اور میں نے اُسی کے سامنے سر نیاز خم کردیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ یہاں تک ہی بیان فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی باتیں تفسیری اور تاریخی روایات میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ملکہ کا نکاح سلیمان علیہ السلام سے ہوگیا تھا۔ بعض اس کا انکار کرتے ہیں۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو اپنے وطن واپس

لوٹا دیا تھا اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہاں جاکر نکاح کر لینا مگر اس نے عذر پیش کیا کہ میری برابری کا تو کوئی شخص نہیں ہے میں نکاح کس سے کروں۔ سلیمان علیہ السلام نے اُسے سمجھایا کہ اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم جہاں چاہو نکاح کر سکتی ہو۔ چنانچہ ملکہ کا نکاح یمن کے شہزادے تُبّعٓ سے ہوا جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے اپنی طرف سے جنّات کو مامور کر دیا کہ اُن کی خدمت کریں اور ضروریات کی اشیاء بہم پہنچائیں۔ یہ سب تفسیری اور غیر یقینی روایات ہیں۔ پکی بات وہی ہے جو اللہ نے قرآن میں بیان کر دی ہے کہ اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو بے مثال حکومت عطا فرمائی تھی اور یہ کہ ملکہ سبا نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آخر میں کفر و شرک سے بیزار ہو کر ایمان لے آئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجا قوم ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو (کہ اِن لوگوں سے کہو) عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی۔ پھر وہ ہو گئے آپس میں دو

فرقے اور جھگڑنے لگے (۴۵) کہا (صالح علیہ السلام نے) اے میری قوم کے لوگو! کیوں جلدی کرتے ہو تم برائی کے ساتھ بھلائی سے پہلے۔ کیوں نہیں تم بخشش طلب کرتے اللہ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے (۴۶) وہ کہنے لگے کہ ہم منحوس سمجھتے ہیں تجھ کو اور جو تیرے ساتھ ہیں۔ کہا (صالح علیہ السلام نے) تمہارا شگون اللہ کے پاس ہے۔ بلکہ تم فتنے میں ڈالے جاتے ہو (۴۷) اور تھے شہر میں نو شخص جو فساد کرتے تھے زمین میں اور نہیں اصلاح کرتے تھے (۴۸) کہا انہوں نے قسم کھاؤ اللہ کے نام کی کہ ہم رات کے وقت صالح علیہ السلام اور اُن کے گھر والوں کو حملہ کر کے ہلاک کر دیں گے۔ پھر کہیں گے ہم اُن کے دعویدار سے کہ ہم نہیں حاضر ہوئے اُن کے اہل کے ہلاک ہونے کے وقت، اور ہم سچے ہیں (۴۹) اور تدبیر کی انہوں نے تدبیر کرنا، اور ہم نے بھی تدبیر کی ایک تدبیر۔ اور وہ نہیں سمجھتے (۵۰) پس دیکھو کیسا ہوا انجام اُن کی تدبیر کا۔ بیشک ہم نے اُن کو ہلاک کر ڈالا اور اُن کی قوم سب کو (۵۱) پس یہ اُن کے گرے ہوئے گھر ہیں، اس وجہ سے کہ انہوں نے ظلم کیا۔ تحقیق اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں (۵۲) اور بچایا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور وہ بچتے تھے (۵۳)

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع میں اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام اور اُن پر کیے جانے والے انعامات کا ذکر کیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم، طاقت اور بے مثال سلطنت عطا فرمائی

سلیمان علیہ السلام اِن انعامات پہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کرتے تھے۔ اب آج کے درس میں اللہ نے قومِ ثمود کا حال بیان کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ عرب اور دوسری نافرمان اقوام اِن واقعات سے عبرت حاصل کریں۔

سلیمان علیہ السلام اور قومِ ثمود کے واقعات میں کسی قدر مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں اقوام کے حالات میں باہم ربط ہے۔ مثلاً سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اللہ نے اُن کے لیے جنات، پرندوں اور ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور آپ جیسے چاہتے اِن سے کام لیتے تھے۔ اِدھر صالح علیہ السلام کے واقعات میں حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ قوم کی فرمائش پہ اللہ نے چٹان میں سے ایک بہت بڑی اونٹنی نکالی۔ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر بھی ہوا تھا، وہاں بھی حیرت انگیز نشانیاں ظاہر ہوئیں۔

صالح علیہ السلام کی بعثت

انبیاء علیہم السلام کے تذکرے کے سلسلے میں پہلے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو علم عطا کیا جس سے مراد نبوت، رسالت اور وحی الٰہی ہے کہ صرف یہی یقینی علم ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹا اللہ کے نبی، خلیفہ اور حاکمِ وقت تھے۔ اب حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا البتہ تحقیق ہم نے قومِ ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ آپ بھی عظیم المرتبت صاحبِ شریعت رسول اور نبی تھے۔ آپ کا ذکر اِس سے پہلے بھی کئی سورتوں میں آچکا ہے اور آئندہ بھی آخری پارے تک آپ کا ذکرِ خیر آئے گا۔ قومِ ثمود وادی حجر میں حجر اور تبوک کے درمیان آباد تھی۔ حجر سے لے کر وادی قریٰ تک اس قوم کے ستره سو قصبات اور بستیاں آباد تھیں جن میں حجر بڑا متمدن اور مرکزی شہر تھا۔ یہ عام طور پر تاجر پیشہ لوگ تھے، صنعت و حرفت بھی کرتے تھے، اور اِن کے باغات بھی تھے جہاں یہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ صالح ابن عبید علیہ السلام بھی اسی قوم کے فرد تھے اس لیے آپ کو قوم کا بھائی کہا گیا ہے۔

بہر حال جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر قوم کی طرف بھیجا تو آپ نے سب سے

ـــــــــــــــــــــــ

لے تفسیر عزیزی ص ۲۲۴ پ ۳۰ (فیاض)

پہلے قوم کو یہی پیغام پہنچایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو، اسی
کو وحدہٗ لاشریک مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اُن لوگوں نے اپنی مختلف
حاجات کے لیے مختلف معبود بنا رکھے تھے۔ پھر جب صالح علیہ السلام نے اُن کو پیغام حق
سنایا فَاِذَا ھُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ تو وہ دو گروہ بن کر آپس میں جھگڑنے لگے
ظاہر ہے کہ ایک گروہ ایمانداروں کا بن گیا جو صالح علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اللہ کی
وحدانیت کو تسلیم کر لیا، اور دوسرا گروہ کافروں اور نافرمانوں کا تھا۔ جنہوں نے صالح علیہ السلام
کی بات کو قبول نہ کیا۔ یہ لوگ بڑے سرکش، مجرم اور گنہگار تھے۔ لہٰذا ان دونوں کا آپس
میں الجھاؤ، ایک قدرتی امر تھا۔ البتہ اہل ایمان کمزور اور تعداد میں بھی کم تھے جب کہ
نافرمان لوگ بڑے طاقتور، مغرور اور نفری میں بھی بہت زیادہ تھے۔ اس چیز کا اشارہ سورہ اعراف
میں بھی ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ
اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ (آیت ۔ ۷۵) مغرور اور سرکش لوگوں نے
اہل ایمان مگر کمزور لوگوں سے کہا کہ کیا تم صالح علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق کرتے ہو؟ انہوں
نے مثبت میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو نہیں مانتے بلکہ ہم تو انکار کرتے ہیں جب
صالح علیہ السلام اُن کو آنے والے عذاب سے ڈراتے تو وہ آگے سے دھمکیاں دینے لگتے اور کہتے
یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (الاعراف ۔ ۷۷)
اے صالح علیہ السلام، اگر تو سچا ہے تو ہم پر وہ عذاب لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔

صالح علیہ السلام کی نصیحت

اس کے جواب میں قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ
الْحَسَنَۃِ صالح علیہ السلام نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے پہلے برائی کے لیے
کیوں جلدی کرتے ہو۔ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش طلب کرنے کی بجائے اپنے اوپر
عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو۔ یہ کس قدر حماقت کی بات ہے لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ
اللّٰہَ تم اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کیوں نہیں مانگتے لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ
تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اگر اللہ کی طرف رجوع کرو گے، برائیوں سے باز آجاؤ گے تو اللہ تعالیٰ
تم پر رحم فرما کر تمہاری سابقہ کوتاہیاں معاف کر دیگا مگر تم اُلٹا عذاب کا مطالبہ کرتے

ہو کتنی عجیب اور نقصان دہ بات ہے۔ اس قسم کی الٹ دہ عی صرف قوم ثمود کا ہی حصہ نہیں تھا بلکہ دیگر نافرمانوں نے بھی ایسا ہی مطالبہ کیا۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ سے یہی مطالبہ کیا فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (الشعرآء - ۱۸۷) اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے، اور یہی بات حضور علیہ السلام کے زمانے کے مشرکوں نے بھی کی تھی۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (بنی اسرائیل - ۹۲) کہ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے اس قسم کی باتیں وہ اپنے غرور تکبر کی بنا پر کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہم اسی طرح عیش و عشرت کرتے رہیں گے۔ مگر جب کسی قوم پر عذاب آیا تو پھر اُن کی جڑ بنیاد ہی اکھاڑ کر رکھ دی گئی۔

شگون بد

اللہ کے ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کو محبت اور پیار کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ اللہ نے یہاں پر صالح علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا ہے کہ جب آپ نے نصیحت آموز باتیں کیں قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ تو وہ کہنے لگے اے صالح (علیہ السلام) ہم تجھے اور تیرے ایماندار ساتھیوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔ تمہارے منحوس قدم پڑے ہیں۔ تو ہمارے ہاں قحط پڑ گیا ہے۔ بارش رُک گئی ہے اور ہم پر طرح طرح کی مصیبتیں وارد ہو رہی ہیں۔ گھر گھر میں لڑائی شروع ہو گئی ہے، باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے اُلجھ رہا ہے۔ اسی طرح خاوند اور بیوی کے درمیان مخاصمت پیدا ہو چکی ہے، یہ سارے فتنے تمہاری نحوست کی وجہ سے برپا ہو رہے ہیں۔ جب سے تم نے ہمیں وعظ کرنا شروع کیا ہے ہمارا خانہ خراب ہو گیا۔ اس کے جواب میں قَالَ صالح علیہ السلام نے کہا طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ تمہارا شگون یا بری قسمت تو اللہ کے پاس ہے۔ اس میں کسی مخلوق کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ تکلیفیں میرے اور میرے ساتھیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری بداعمالیوں، کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے آ رہی ہیں۔

طیرۃ شگون کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ طیر کے مادہ سے ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ پرندوں کو اڑا کر شگون لیا کرتے تھے۔ مثلاً پرندے کو اڑایا۔ اگر وہ اڑ کر دائیں طرف

گیا تو نیک شگون لیتے کہ مطلوبہ کام بن جائیگا۔ اور اگر پرندہ بائیں طرف چلا جاتا تو شگون بد سمجھتے کہ ہمارا یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا، لہٰذا اس کو ترک کر دیتے۔ حدیث میں آتا ہے۔ اَلطِّیَرَۃُ مِنَ الشِّرْکِ یعنی شگون لینا شرک کی ایک قسم ہے۔ یہ بیماری آج بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں اُلو بیٹھا دیکھ لیا تو اُسے ویرانی پر محمول کر دیا۔ گھر سے نکلتے وقت اگر کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا تو بُرا شگون سمجھ لیا کہ اب کام نہیں ہوگا، واپس چلو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ سلمیؓ جب حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے تو انہوں نے عرض کیا مِنَّا یَتَطَیَّرُوْنَ یعنی جاہلیت کے زمانے میں ہم پرندوں کو اڑا کر شگون لیا کرتے تھے، یہ کیسا ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ محض وہم ہے اور اسے کسی کام میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے بلکہ اپنا کام جاری رکھو اور شگون کی بناء پر کسی کام کو ترک نہ کرو۔ جو شخص شگون کو مؤثر سمجھتا ہے وہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔

تو صالح علیہ السلام نے قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم ہماری موجودگی کو بد شگونی قرار دیتے ہو۔ حالانکہ تمہارا شگون تو اللہ کے پاس ہے۔ وہ تمہاری شرارتوں کی وجہ سے قحط سالی اور دوسری مصیبتیں لاتا ہے۔ یہ سب تمہارے شرک کی نحوست ہے جسے تم ہماری طرف منسوب کرتے ہو۔ فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ کہ تم لوگ فتنے میں ڈالے گئے ہو۔ اللہ نے تمہیں آزمائش میں ڈال رکھا ہے مگر تم ناکام ہو رہے ہو۔

شہر کے نو غنڈے

ارشاد ہوتا ہے وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ شہر حجر میں غنڈہ قسم کے نو آدمی تھے۔ دراصل رھط تین سے لے کر نو تک کے گروہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بدقماش قسم کے نو اشخاص تھے يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ جو زمین میں فساد کرتے تھے، ان کا کام یعنی مار دھاڑ، لوٹ مار، قتل و غارت اور غنڈہ گردی تھی۔ دراصل یہ نو خاندان تھے جن میں سے ہر قبیلے کا ایک ایک نمائندہ مل کر یہ گروہ بن گیا تھا اور انہوں نے غنڈہ گردی کا بازار گرم رکھا تھا۔ آج کی اصطلاح میں انہیں لستہ ب (ب ۱) کے بدمعاش کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ صرف معاشرتی طور پر بدقماش

تھے بلکہ کفر و شرک میں بھی بڑھے ہوئے تھے اور اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کے بدترین دشمن بھی یہی تھے۔ صالح علیہ السلام کا سارا وعظ ان غنڈوں کے خلاف جاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگ ان پر ایمان لے آئے تو ان کی چودھراہٹ اور غنڈہ گردی ختم ہو کر رہ جائیگی۔ پوری تاریخ عالم میں اسی طرح کے لوگ ہی نبیوں کے مخالف رہے ہیں اور آج بھی حق کے مقابلے کے لیے ایسے لوگ پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نفاذِ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ اسلامی قانون نافذ ہونے سے سب سے پہلی زد انہی پر پڑتی ہے اور ان کو اپنی بدمعاشیاں ترک کرنا پڑتی ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ یہ نو بدمعاش آدمی تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے وَلَا يُصْلِحُونَ اور اصلاح نہیں کرتے تھے یعنی فتنہ و فساد کا بیج کی کرکے زمین کو امن کا گہوارہ نہیں بننے دیتے تھے۔

صالح علیہ السلام کی ہلاکت کا منصوبہ

یہ بدقماش آدمی صالح علیہ السلام کو اپنے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے آپ کے خلاف منصوبہ بندی کی۔ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ کہنے لگے کہ اللہ کے نام کی قسم اٹھاؤ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ کہ ہم صالح علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کا رات کے وقت کام تمام کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ قتل ہو گئے تو پھر آپ کے خاندان والے آپ کے خون کا دعویٰ بھی کریں گے۔ ایسی صورت میں ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهٖ ہم آپ کے دعویدار سے کہہ دیں گے مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ کہ ہم تو آپ کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہیں تھے ہمیں کیا معلوم کہ کس نے شب خون مار کر ان کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور ساتھ یقین دہانی کے لیے یہ بھی کہیں گے وَاِنَّا لَصٰدِقُونَ ہم اپنی بات میں بالکل سچے ہیں۔

اللہ نے فرمایا وَمَكَرُوا مَكْرًا ان لوگوں نے بھی ایک تدبیر کی۔ مکر مخفی تدبیر کو کہتے ہیں یعنی ایسی چال چلنا جس کو لوگ آسانی سے سمجھ نہ پائیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح صالح علیہ السلام کو ہلاک کر دیا جائے۔ آپ رات اکثر مسجد میں گزارتے تھے اور وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ان بدمعاشوں کا خیال تھا کہ رات کو مسجد پر حملہ کر کے صالح علیہ السلام کا کام تمام کر دیا جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے

گھر پر شبخون مارنے کا پروگرام بنایا تاکہ آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو بیک وقت ختم کر دیا جائے۔

تدبیرِ خداوندی

اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے بھی ایک تدبیر کی وَمَكَرْنَا مَكْرًا اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور ہماری تدبیر ایسی تھی وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ جس کا وہ شعور نہیں رکھتے تھے یعنی ہماری منصوبہ بندی کی وہ گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے چنانچہ جب یہ لوگ رات کے وقت حملہ کرنے کے لیے نکلے تو اللہ نے انہیں راستے میں ہی ہلاک کر دیا اور یہ صالح علیہ السلام تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ ان لوگوں کی ہلاکت کے متعلق تین قسم کی تفسیری روایات ملتی ہیں ایک یہ کہ ان پر آسمان سے پتھر برسائے گئے۔ دوسری یہ کہ ان پر اوپر سے ایسی چیخ مسلط کی گئی جس سے ان کے جگر پھٹ گئے۔ اور ہلاک ہو گئے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ ان کو زمین میں دھنسا کر ہلاک کیا گیا۔ یہ نو آدمی تو اس طرح مارے گئے اور باقی نافرمانوں کے متعلق سورۃ ہود میں ہے۔ کہ اللہ نے ان سے فرمایا تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ (آیت - ۶۵) اپنے گھروں میں تین دن تک فائدہ اٹھالو۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوگا۔ چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا کہ تین دن کے بعد ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ ایک سخت کڑک اور زلزلے نے انہیں آنکھوں دیکھتے اس طرح الٹ کر رکھ دیا گویا وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے۔

فرمایا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ پھر دیکھو ان کی تدبیر کا کیا انجام ہوا۔ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ ان کی بستیاں نشانِ عبرت بن چکی تھیں فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا پس یہ ہیں ان کے گرے پڑے گھر ان کے ظلم کی وجہ سے۔ یہ لوگ بڑے صناع اور سنگتراش تھے۔ پہاڑوں کو کھود کھود کر عالیشان نقش و نگار والے مکان بناتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ آج ان کے محلات کے کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں جو لوگ وادی تبوک سے

سے گزرتے ہیں، یہ کھنڈرات آج بھی ان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ دیکھو ظلم و ستم کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

نشانِ عبرت

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ بیشک اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم اور سمجھ رکھتے ہیں۔ نصیحت کی یہی بات اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ اور دیگر نافرمان اور مغرور لوگوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ اللہ کے نبی کی مخالفت اور اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہلاکت کا منصوبہ بنانے والوں کو پہلے ہی ہلاک کر دیا اور اس قوم کے کھنڈرات پوری انسانیت کیلئے درسِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

فرمایا وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ہم نے اہل ایمان کو اس عذاب سے بچا لیا۔ حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بھی ہزاروں آدمی تھے۔ جو اللہ کی گرفت سے محفوظ رہے۔ ایک تو وہ ایمان لانے کی وجہ سے بچ گئے اور ان کی دوسری صفت یہ تھی وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ کہ وہ کفر، شرک اور معاصی سے بچتے تھے۔ حدود شرع کی حفاظت کا نام ہی تقویٰ ہے۔ انہوں نے ایمان لانے کے بعد تقویٰ کو اختیار کیا اور اس طرح عذابِ الٰہی سے بچ گئے۔ جب کہ باقی ساری قوم ہلاک کر دی گئی۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿۵۴﴾ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ﴿۵۶﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَاهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۵۷﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ﴿۵۸﴾ ع

ترجمہ:- اور لوط علیہ السلام (کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا) جب کہا انہوں نے اپنی قوم سے۔ کیا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو ﴿۵۴﴾ کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر شہوت رانی کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر۔ بلکہ تم جاہل لوگ ہو ﴿۵۵﴾ پس نہیں تھا جواب ان کی قوم کا مگر یہ کہ وہ کہتے تھے کہ نکال دو لوط علیہ السلام کے گھرانے کو اپنی بستی سے۔ بیشک یہ لوگ ستھرے بنتے ہیں ﴿۵۶﴾ پس ہم نے نجات دی اُس (لوط) کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اُس کی بیوی۔ ہم نے مقدر کر دیا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہو گی ﴿۵۷﴾ اور برسائی ہم نے اُن پر بارش۔ پس بُری ہوئی بارش اُن لوگوں کی جو ڈرائے ہوئے ہیں ﴿۵۸﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کا ذکر کیا کہ اُن کی طرف اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ پر اونٹنی کی حیرت انگیز نشانی ظاہر فرمائی مگر قوم نے اُس کا انکار کیا اور صالح علیہ السلام کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اللہ نے اُن کی تدبیر کو ناکام بنایا۔ وہ صالح علیہ السلام کو تو قتل نہ کر سکے البتہ خود ہی اللہ کے عذاب کا شکار ہو کر ہلاک ہوئے۔ اللہ نے یہ واقعہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مشرکین کی نصیحت اور عبرت کے لیے بیان کیا۔ اب اسی طرح لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کے واقعات کا ذکر ہو رہا ہے وہ لوگ بھی اُن کے وعظ و نصیحت کو برداشت نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اپنے راستے میں ایک رکاوٹ سمجھتے تھے۔ انہوں نے بھی لوط علیہ السلام کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین عذاب کا شکار ہوئے۔

قومِ لوط کی خرابیاں

یہ لوگ بحرِ میت کے اطراف میں شرق اردن کے علاقے میں آباد تھے۔ اُن کی زرعی زمینیں اور باغات تھے جو کہ بڑا زرخیز علاقہ تھا۔ تجارت بھی خوب کرتے تھے اور بڑے خوشحال لوگ تھے۔ اس قوم کے چھ بڑے بڑے شہر اور بہت سے قصبات اور دیہات تھے۔ مفسرین کرام اِن کی کل آبادی چار سے گیارہ لاکھ تک بتلاتے ہیں۔ بڑی بڑی بستیاں سدوم، عامورہ، صعودۃ اور دُوامہ وغیرہ تھیں جن میں سدوم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام اِس قوم کے فرد نہیں تھے بلکہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام علیہ السلام کے بھتیجے تھے جو سام ابن نوح کی اولاد میں سے تھے۔ بابل میں آباد تھے۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے بابل سے ہجرت کی تو آپ کی بیوی سارہؓ اور لوط علیہ السلام نے بھی آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ اللہ تعالیٰ نے دورانِ سفر ہی لوط علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی اور اپنا پیغام سنانے کے لیے اہلِ سدوم کی طرف مبعوث فرمایا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام تو مصر سے ہوتے ہوئے شام و فلسطین کے علاقے میں چلے گئے اور لوط علیہ السلام نے شرق اردن پہنچ کر تبلیغِ حق کا آغاز کر دیا۔

اِس قوم میں بھی دیگر قوموں کی طرح کفر اور شرک پایا جاتا تھا مگر ان میں ایک قبیح ترین بیماری ہم جنسی کی بھی پائی جاتی تھی۔ یہی قوم اس فعل کی موجد ہے۔ سب سے

پہلے شیطان نے اسی قوم کو اس فعل پہ آمادہ کیا۔

سورۃ عنکبوت میں ہے اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (آیت۔۲۸) تم ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جو تم سے پہلے جہان بھر میں کسی نے نہیں کی۔ یہ لوگ اس فعل شنیع میں اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اللہ نے لوط علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (العنکبوت ۲۹) کیا تم شہوت رانی کے لیے مردوں سے التفات کرتے ہو، مسافروں کا راستہ کاٹتے ہو۔ اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو؟ ہم جنسی کے علاوہ اس قوم میں دیگر اخلاقی برائیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ راستے میں بیٹھ جاتے، جہاں داؤ چلا کسی کو لوٹ لیا۔ مقامی طور پہ تجارت میں ڈنڈی مارتے تھے اور اگر کوئی تاجر مال لیکر باہر سے آجاتا تو اس کا مال ہتھیانے کی کوشش کرتے۔ اُن کا عام طور پہ طریقہ کار یہ تھا کہ کوئی چیز گھر میں دکھانے کے بہانے سے لے گئے اور پھر ہضم کر گئے۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو اس کا باقی سامان بھی لوٹ لیا۔ مجلس میں بیٹھ کر بیہودہ باتیں کرنا اور بے حجابانہ گوز مارنا اُن کا عام معمول تھا۔

لوط علیہ السلام کا وعظ

لوط علیہ السلام نے درس توحید کے بعد قوم کو لواطت کی خرابی سے آگاہ کیا اور اس فعل شنیع سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ارشاد ہوتا ہے وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اور لوط علیہ السلام کو بھی ہم نے اُن کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے آپ اس قوم کے فرد نہیں تھے، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی بابل سے ہجرت کر کے آئے تھے چونکہ آپ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے لہٰذا اس قوم کو آپ ہی کی قوم کہا گیا ہے۔ تو لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے فرمایا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ کیا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ اغلام بازی جیسے قبیح فعل کے مرتکب ہوتے ہو وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ اور تم دیکھتے بھی ہو۔ تُبْصِرُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس کام کو برا سمجھتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کرتے ہو

اور دوسرا یہ ہے کہ تم بے حیا یا نہ طور پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے دیکھتے ہوئے بھی ایسی برائی کر گیے جاتے ہو اور ذرا شرم نہیں کھاتے۔ فرمایا اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت رانی کے لیے مردوں کی طرف دوڑتے ہو؟ یہ تو بڑا ہی گندا کام ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ تم تو بڑے ہی نادان اور بے سمجھ لوگ ہو۔ اللہ نے شہوت رانی کے لیے دوسری جنس بنائی ہے مگر تم یہ کام اپنے ہم جنس مردوں سے کرتے ہو۔ سورۃ الشعراء میں گزر چکا ہے کہ آپ نے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ (آیت - ۱۶۸) میں تمہارے اس فعل سے نفرت کرتا ہوں۔ قرآن پاک میں زنا اور لواطت دونوں جرائم کو فحش کہا گیا ہے بلکہ لواطت زنا سے بھی زیادہ قبیح فعل ہے۔ یہ خلاف وضع فطری ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اتنا برا فعل ہے کہ اس کو تو سوائے بندروں کے کوئی دوسرا جانور بھی پسند نہیں کرتا۔ بندر کو اسی فعل کی وجہ سے ذلیل جانور کہا گیا ہے۔

لواطت کی قباحتیں

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ لواطت کرنے لگیں یا جانوروں کیسا تھ یہ فعل شروع کر دیں تو ارتفاقات نہ صرف بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ مثلاً نکاح کرنا ضروری ہے کہ اس کے ذریعے اللہ نے بقائے نسل کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ اگر اغلام بازی شروع کر دی جائے تو بقائے نسل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور نکاح کی وجہ سے لوگوں پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ وہ بھی برباد ہو جائیں گی۔ لہٰذا یہ فعل فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس فعل سے اخلاق بگڑتا ہے۔ اور دین بھی خراب ہوتا ہے نسل میں خرابی آتی ہے۔ ارتفاقات ختم ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے اور پھر اس کی گرفت آتی ہے۔ لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو تیس سال تک وعظ کیا۔ آپ نے اس کام میں شب و روز ایک کر دیا مگر ان لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ آپ کی بیٹیوں کے سوا کوئی بھی آپ پر ایمان نہ لایا حتیٰ کہ بیوی بھی کافرہ ہی رہی۔

قوم کا جواب

لوط علیہ السلام کی قوم آپ کا وعظ سن سن کر تنگ آگئی۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ

إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ آخر اُن کا جواب یہ تھا کہ لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ بڑے پاکباز لوگ بنے پھرتے ہیں جو ہمیں گندہ کہتے ہیں۔ کہنے لگے ان کا اس گندی بستیوں میں کیا کام۔ ان کو نکال باہر کرو کہ یہ کسی اچھی جگہ پہ چلے جائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی قومیں اپنے اپنے نبیوں کو ختم کرنا یا نکالنا چاہتی تھیں۔ مگر اللہ نے اُن کو ذلیل و خوار کر کے اس دنیا سے ہی نکال دیا۔ سورۃ قمر اور دوسری سورتوں میں یہ بھی موجود ہے کہ اگر بستی میں کوئی مہمان آجاتا تو اس کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کر ڈالتے۔ یہ ایسی خبیث قوم تھی۔ آخر کار خدا تعالیٰ کا غضب جوش میں آیا تو اللہ نے فرشتوں کو انسانی شکل میں بھیج کر قوم پر عذاب نازل کیا جس کی تفصیلات دوسری سورتوں میں موجود ہیں۔

لوط علیہ السلام کے اہل خانہ کی نجات

فرمایا پھر جب اُس قوم پہ عذاب آیا فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ تو ہم نے لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کو بچالیا۔ ماسوائے آپ کی بیوی کے قَدَّرْنَاهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ہم نے اس کے متعلق ٹھہرا رکھا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہوگی۔ جب قوم پہ عذاب کا وقت قریب آیا تو لوط علیہ السلام کو حکم ہوا فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ (ھود-۸۱) کہ اپنے اہل کو لے کر رات کے پچھلے حصہ میں بستی سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی کہ اُس پہ مصیبت آنے والی ہے وہ آکر رہے گی۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ آپ کے گھر والے آگے آگے تھے اور آپ اُن کے پیچھے چل رہے تھے۔ ایماندار اہل خانہ میں آپ کی بچیاں ہی تھیں کیونکہ بیوی تو ایمان نہیں لائی تھی اور وہ ساتھ نہیں گئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ گھر سے نکلتے وقت بیوی بھی ساتھ تھی مگر تھوڑی دور آکر پھر واپس چلی گئی اور باقی قوم کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہوگئی۔

لوط علیہ السلام اور آپ کی بیوی کا رشتہ قیامت والے دن بھی کچھ کام نہیں آئے گا کیونکہ بیوی ایمان ہی نہیں لائی۔ وہ فریاد کرے گی مگر کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ نوح علیہ السلام کی بیوی کی طرح لوط علیہ السلام کی بیوی بھی نافرمان تھی۔ اللہ نے دونوں کے متعلق فرمایا

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۔ (التحریم۔ ۱۰) یہ ہمارے نیک بندوں کے حرم میں تھیں مگر دونوں نافرمان نکلیں اور وہ دونوں بندے اللہ کے ہاں کسی کام نہ آئے اور وہ دونوں عورتیں باقی جہنمیوں کے ساتھ دوزخ میں داخل ہونگی۔ اللہ نے یہ واقعہ عبرت کے لیے بیان فرمایا ہے۔ دوسری طرف فرعون جیسے متکبر اور سرکش شخص کی بیوی مومنہ تھی۔ اس نے بڑی تکلیفوں کے ساتھ شہادت پائی تو اللہ نے اُس کے لیے جنت میں اعلیٰ ترین مقام بنایا ہے۔ اسی طرح اللہ نے حضرت مریمؑ کی مثال بیان فرمائی ہے کہ اُن کو اللہ نے کیسی پاکیزگی عطا فرمائی۔ بہرحال فرمایا کہ ہم نے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو بچا لیا سوائے اُن کی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی۔

قومِ لوط پر عذاب

فرمایا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا اور ہم نے اُن پر بارش برسائی قوم کی تباہی کا وقت آچکا تھا۔ اللہ نے ان پر بارش کے ذریعے پانی نازل نہیں کیا بلکہ اُن پر پتھر برسائے گئے۔ اور پتھر بھی ایسے مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ (الذریت۔ ۳۴) جن پر مجرموں کے نام کندہ تھے کہ یہ پتھر فلاں سردار کے سر پر پڑے گا۔ اور یہ فلاں کا کام تمام کرے گا۔ اللہ نے پتھروں پر نام لکھ کر متعلقہ افراد کو مارے۔ ایک تو یہ سزا تھی اور دوسری یہ کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (ہود۔ ۸۲) ہم نے اُس خطہ ارضی کا نچلا حصہ اوپر اور اوپر والا حصہ نیچے کر دیا یعنی زمین کو بالکل الٹ دیا کیونکہ وہ لوگ کام ہی اُلٹے کرتے تھے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے تھے۔ سورۃ الحجر میں ایک تیسری سزا کا بھی ذکر ہے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ (آیت۔ ۷۳) دن چڑھے اُن کو ایک زبردست چیخ نے پکڑ لیا اور اس طرح وہ پوری قوم تباہ ہوگئی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فعلِ لواطت کے لیے اللہ نے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ بلکہ اس کے مرتکب کو تعزیری سزا دی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ سخت ترین سزا کے قائل ہیں۔ مثلاً کسی دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اُوپر دیوار گرا دی جائے۔ یا کسی بلندی سے نیچے گرا دیا جائے۔ غرضیکہ عبرت ناک سزا ملنی چاہیئے۔ تاہم جرم کی نوعیت کے اعتبار سے قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ بہرحال فرمایا کہ ہم نے اِن پر بارش برسائی۔ بائیبل کی روایت

کے مطابق اس بارش میں آگ، گندھک اور پتھر تھے۔ یہ قہر خداوندی کی بارش تھی فسآء
مطر [illegible] یہ بہت بری بارش تھی کہ
اس میں رحمت کی بجائے عذاب الٰہی تھا جس سے ساری قوم ہلاک ہو گئی۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَاۗىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ:- آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور سلام ہے اللہ کے اُن بندوں پر جن کو اُس نے منتخب فرمایا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۵۹﴾ کون ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو، اور اُتارا ہے تمہارے لیے آسمان کی طرف سے پانی۔ پس اگائے ہیں ہم نے اس کے ساتھ باغات بارونق۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا کہ تم اِن (باغات) کے درختوں کو اگاتے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی الٰہ ہے؟ بلکہ یہ لوگ انحراف کرتے ہیں ﴿۶۰﴾ بھلا کون ہے جس نے بنایا ہے زمین کو قرارگاہ، اور بنائی ہیں اس (زمین) کے درمیان

نہریں۔ اور رکھے ہیں اس میں بوجھل پہاڑ اور بنایا ہے اس نے دو دریاؤں کے درمیان پردہ (رکاوٹ)۔ کیا کوئی الٰہ ہے اللہ کے ساتھ ؟ مگر اکثر لوگ ان میں سے سمجھ نہیں رکھتے (۶۱)

ابتدائی آیات

نصیحت اور عبرت کے لیے پہلے اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کی ہلاکت و تباہی کا ذکر کیا۔ پھر درمیان میں حضرت سلیمان اور سبا والوں کا حال بیان کیا۔ اس کے بعد قوم ثمود کی تباہی کا تذکرہ ہوا اور پھر قوم لوط کی ہلاکت کا بیان ہوا۔ یہ تمام قومیں کفر، شرک اور نافرمانی کی بدولت تباہ و برباد ہوئیں۔ اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کے بعض عقلی دلائل پیش کیے ہیں اور ساتھ ساتھ شرک کا رد کیا ہے۔

اللہ کی حمد و ثنا

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب کوئی اہم بات کرنا مطلوب ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی ہے اور پھر اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اصل بات شروع کی جاتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں کہ ان آیات میں یہی چیز سکھلائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مقام پر توحید جیسا اہم مضمون بیان کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں پچھلی آیات میں نافرمانوں کی تباہی کا حال بیان کر کے اللہ کا شکر ادا کرنے کی نصیحت کی گئی ہے کہ اچھا ہوا یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ورنہ دنیا میں مزید فتنہ و فساد کا موجب بنتے۔ اس قسم کی مثال بعض دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (آیت - ۴۵) ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ گویا ظالموں اور نافرمانوں کی بیخ کنی پر اللہ کی تعریف کرنی چاہیئے۔

انبیاء پر درود و سلام

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کی تعریف بیان کریں اور دوسری یہ کہ ہر اہم کام کی ابتداء سے پہلے وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اور سلام ہے

اللہ کے منتخب بندوں پر۔ اصطفیٰ کا معنی پسند کرنا بھی ہوتا ہے۔ گویا اللہ کے پسندیدہ بندوں پر سلامتی ہو۔ اللہ کے پسندیدہ یا منتخب شدہ بندے اس کے انبیائے کرام ہیں اور پھر اُن کے بعد اُن کے صحابہ کرام، اولیاء اللہ اور نیک اور صالح بندے ہیں۔ اُن پر بھی سلام ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی سلامتی میں رکھے۔ انسان کے لیے خدا تعالیٰ کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان دولت ایمان ہے جو کہ انبیاء کے توسل سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ دولت اللہ کے نیک بندے اگلی نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔ ایمان کے بعد احکام شرعیہ کا علم بھی خدا کے انہی بندوں کی معرفت حاصل ہوتا ہے جن پر عمل کر کے انسان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان پر سلام کہنا اور اُن کے لیے دُعا کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کے ساتھ انسان کا تعلق قائم رہے۔

نبی پر درود پڑھنے سے نبی کو کس قدر فائدہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، تاہم درود بھیجنے والے کو ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس پر دس رحمتیں نازل کرتا ہے۔ انبیائے کرام ہمارے درود و سلام کی وجہ سے درجات عالیہ تک نہیں پہنچتے بلکہ اللہ تعالیٰ خود انہیں اُن کی صلاحیت اور استعداد اور اپنی مہربانی سے درجہ کمال تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم ان پر درود و سلام بھیجیں اور اُن کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھیں۔ بہرحال اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہر اچھے کام کے آغاز سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنی چاہیے اور اس کے بعد اللہ کے منتخب اور برگزیدہ بندوں پر درود و سلام پیش کرنا چاہیے اور اس کے بعد اصل بات کرنی چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ اور شرکاء

حمد و سلام کے بعد اب تمہید کے طور پر فرمایا آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا وہ جن کو یہ لوگ اس کے ساتھ شریک بناتے ہیں آگے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقلی دلائل آ رہے ہیں اور یہاں بھی انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اپنی عقل کو بروئے کار لا کر بتاؤ کہ ایک طرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جو منبع ہدایت ہے، تمام ظاہری اور باطنی انعامات عطا کرتا ہے تمام تغیرات :

تقلبات اُس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ ہر لحاظ سے با اختیار ہے۔ اس کے برخلاف انسانوں، جنوں یا فرشتوں میں سے اُس کے شریک ہیں جو مخلوق ہیں۔ شجر اور حجر ہیں جو بے جان چیزیں ہیں اور جنہیں کچھ اختیار حاصل نہیں ورنہ وہ نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ جب ان دونوں کو تقابل کیا جائے گا تو ہر صاحب عقل اور ہر مذہب و ملت کا پیروکار یہی جواب دیگا کہ اللہ ہی بہتر ہے۔ وہ خالق ہے، ہر لحاظ سے مختار ہے وہ کمالات کا منبع ہے، وہ مانگنے والا نہیں بلکہ دینے والا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہی بہتر ہے۔ بھلا وہ کیسے بہتر ہو سکتے ہیں جو مخلوق ہیں اور لوگ اُن کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں؟

دلائلِ توحید
دلائل تخلیق
ارض و سما

آگے اللہ تعالیٰ نے بعض دلائلِ توحید بیان کیے ہیں جن میں غور و فکر کر کے انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچان سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کا ظہور ہے کہ آسمان و زمین اور ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ توحید خداوندی کے دو درجے ایسے ہیں جن میں سارے کافر اور مشرک بھی متفق ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی اُس کی ہستی خود بخود ہے، کسی کی عطا کردہ نہیں۔ اس بات کے مشرک بھی قائل ہیں کہ صرف خدا کا وجود ذاتی ہے۔ باقی ساری مخلوق کا وجود خدا تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

توحید کا دوسرا درجہ خالقیت کا ہے۔ کسی سنی یا پلیت مشرک ہندو، مجوسی، شنتو، دیت نامی، چینی، رومی سے پوچھ لیں، سب کہیں گے کہ پیدا کرنے والی ذات فقط خدا ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ آگے چل کر توحید کا تیسرا درجہ تدبیر کا آتا ہے۔ یہاں آکر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کی تدبیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ مگر نجومی اس کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مشرک کبھی شجر و حجر کی طرف، کبھی جنات اور فرشتوں کی طرف اور کبھی اولیاء اللہ کی طرف یہیں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے اور پھر چوتھا درجہ عبادت کا ہے۔ ایک سچا مومن عبادت بھی صرف اللہ کی کرتا ہے، اُسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے، اُسی سے حاجت روائی

اور مشکل کشائی جانتا ہے مگر مشرک غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ ان کے نام کی منتیں مانتے ہیں اور ان سے اپنی حاجت براری کرتے ہیں۔

الغرض صفتِ تخلیق کے ضمن میں دہریوں کی قلیل تعداد کے علاوہ ہر مذہب اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ صرف اللہ ہی کو خالق تسلیم کرتے ہیں قرآن پاک نے تو صاف کر دیا ہے اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر - ۶۲) ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ باقی سب مخلوق ہے عرش سے لے کر فرش تک اور ملائکہ سے لے کر جنات تک ہر چیز مخلوق ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ بتلاؤ ارض و سما کا خالق کون ہے؟

(۲) بارش کا نزول

پھر اللہ نے دوسری دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا بھلا یہ بتلاؤ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً تمہارے لیے آسمان کی طرف سے پانی کس نے نازل کیا یعنی بارش کون برساتا ہے۔ سماء کے لفظ میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ نزول بارش کا سبب محض بادل نہیں، بلکہ اوپر سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بارش کے بینتظے اور مقدار کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس میں کسی مخلوق کی خواہش کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کارفرما ہوتی ہے مطلب یہ کہ بارش برسانا بھی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ پھر خود ہی فرمایا کہ بارش کے نتیجے میں۔ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ اور ہم نے اس پانی کے ذریعے بارونق باغات اگائے ہیں۔ حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے ارد گرد دیوار یا جھاڑیوں کی باڑ ہو، وگرنہ عام باغ کو بستان کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر چیز کی تخلیق، بارش کا نزول اور باغات کی پیداوار ہمارا ہی کام ہے۔ ساتھ ہی وضاحت فرما دی مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے کہ باغات کے درختوں کو اگا سکو یا پھل پھول لا سکو۔ یہ سب ہماری ہی قدرت کے کرشمے ہیں۔

فرمایا جب ان میں سے کوئی بھی چیز کسی کے اختیار میں نہیں ہے تو پھر یہ بتلاؤ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے جس نے ان میں سے کوئی کام بھی کیا ہو۔ زمین و آسمان یا ان کی کسی چیز کو پیدا کیا ہو آسمانی کروں کو بنایا ہو

بارش برسائی ہو یا درخت اگائے ہوں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر خدا کے ساتھ شریک کیوں بناتے ہو؟ یعنی خدا تعالیٰ کی صفت میں دوسروں کو شریک کرتے ہو یا کبھی عبادت میں، آخر یہ کیوں؟ فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ یہ ایسے لوگ ہیں جو اتنے واضح دلائل کے باوجود حقیقت کے اعتراف سے انحراف کرتے ہیں یعنی حق بات کو دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں یعدلون کا معنی انحراف بھی ہے اور دوسروں کو برابر کرنا بھی۔ گویا یہ لوگ بڑے ظالم اور بے انصاف ہیں۔ جو اتنی واضح دلیلوں کے باوجود خدا کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان تمام دلائل پر اگر انسان اپنی عقل کے ساتھ غور کرے تو اس کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب ان میں سے کوئی چیز بھی غیر اللہ کے اختیار میں نہیں ہے تو پھر ان کو خدا تعالیٰ کا شریک کیوں بنایا جائے۔

(۳) زمین بطور قرارگاہ

فرمایا زمین کی تخلیق کے بعد اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا اس کو قرارگاہ یعنی ٹھہرنے کی جگہ کس نے بنایا؟ آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (البقرہ - ۳۶) تمہارے لیے زمین ٹھہرنے کی جگہ اور ایک وقت یعنی قیامت تک فائدہ اٹھانے کا سروسامان ہے۔ جب قیامت برپا ہوگی تو یہ پورا نظام تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد دوسرا نظام قائم ہوگا۔ اللہ نے زمین کی ساخت ہی ایسی بنائی ہے کہ انسان اس پر سہولت کے ساتھ سارے کام انجام دے سکتا ہے۔ زمین نہ تو اتنی سخت ہے کہ کھدائی نہ جا سکے اور نہ ہی اتنی نرم ہے کہ انسان اس میں دھنس جائے۔ اس زمین میں لوگ کاشتکاری کرتے ہیں، کنویں کھودتے ہیں، اس پر مکانات تعمیر کرتے ہیں اور دیگر کاروبار انجام دیتے ہیں۔

سورۃ المرسلت میں اللہ نے فرمایا ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (آیت ۲۵-۲۶) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا جو سب زندہ اور مردہ کو اپنی تحویل میں لیے رکھتی ہے۔ جب تک انسان زندہ رہتا ہے زمین کے اوپر رہ کر سارے

کام کرتا ہے اور جب مر جاتا ہے تو یہی زمین اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (آیت ۵۵) ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں (مرنے کے بعد) تمھیں واپس لوٹائیں گے اور (قیامت کو) اسی سے دوبارہ نکالیں گے۔ غرضیکہ انسان کا ماضی، حال اور مستقبل اسی زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔

لفظ قرار میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا مستقر صرف یہی زمین ہے نہ کہ دوسرے سیارے چاند، مریخ، مشتری وغیرہ موجودہ زمانے میں سائنس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ لوگ چاند تک پہنچ گئے ہیں، وہ بھی انسان کے لیے مستقر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہاں پر نہ پانی ہے، نہ خوراک اور نہ ہوا۔ ایسی حالت میں انسان وہاں پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ عارضی طور پر وہاں پہنچتے ہیں وہ ضرورت کی ہر چیز یہاں سے لے کر گئے ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق چاند پر ایک پونڈ خوراک پر کم از کم تیس ہزار پونڈ خرچ آتے ہیں اور وہاں پر پہنچنے کا لباس چار لاکھ میں تیار ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان حالات میں چاند پر رہائش رکھنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوگا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے زمین کو قرارگاہ بنایا ہے، نہ کہ کسی دوسرے سیارے کو۔

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

آسمان پر کمندیں ڈالنے کی بجائے اگر زمین کے حالات کو ہی درست کر دیا جائے تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اس وقت زمین فتنہ و فساد کا گڑھ بنی ہوئی ہے اس میں بھاری غربت اور جہالت کا دور دورہ ہے۔ دیگر سیاروں کو مسخر کرنے کی بجائے اگر یہی وسائل اس زمین کی بہتری پر صرف کیے جائیں تو اس سے انسانوں کی حالت سنور سکتی ہے، یہاں پر علم کی روشنی پھیلائی جا سکتی ہے، جہالت اور غربت کو دور کیا جا سکتا ہے اور اس طرح انسانیت کی بہتر طور پر خدمت کی جا سکتی ہے۔

(۳) دریا اور پہاڑ

اللہ نے توحید کی چوتھی دلیل یہ بیان فرمائی کہ بتاؤ تو وہ کون ہے وَجَعَلَ

خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا جس نے زمین میں نہریں چلا دی ہیں۔ اللہ نے ایسا انتظام فرما دیا ہے کہ پہاڑوں پہ بارش ہوتی ہے تو وہ دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں میدانی علاقوں کو سیراب کرتی ہے۔ پہاڑوں پہ جمنے والی برف پگھلتی ہے تو دریاؤں میں سارا سال پانی آتا رہتا ہے جس سے زمین سیراب ہوتی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے۔

وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ اور زمین پہ بوجھل پہاڑ رکھ دیئے ہیں تاکہ زمین ڈولنے نہ پائے۔ پھر ان پہاڑوں سے پانی کے علاوہ درخت، جڑی بوٹیاں، پتھر اور معدنیات حاصل ہوتی ہیں جو لوگوں کے لیے نہایت کارآمد چیزیں ہیں۔ زمین پہ پہاڑ بھی اُسی نے ٹکائے ہیں۔ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا اور دو دریاؤں یا سمندروں کے درمیان آڑ پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے میٹھا اور کڑوا پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتے۔ یہ تمام چیزیں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں اور اُس کی قدرتِ کاملہ کا شاہکار ہیں۔ تو بھلا بتلاؤ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے جو ان میں سے کوئی کام کر سکے۔ فرمایا اللہ کے علاوہ معبود تو کوئی نہیں بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ بلکہ اکثر لوگ بے علم اور بے سمجھ ہیں جو ان تمام دلائل و شواہد کے باوجود شرک کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان دلائل پر ہی غور کر لیتے تو بات ان کی سمجھ آ جاتی اور یہ اللہ کی تدبیر اور اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک نہ کرتے مگر ان لوگوں میں غور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں، یہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ :- بھلا کون ہے جو مجبور و بیکس کی دُعا کو قبول کرتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے ، اور دور کرتا ہے تکلیف کو ، اور بناتا ہے تم کو نائب زمین میں ۔ کیا کوئی الٰہ ہے اللہ کے ساتھ ۔ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو ﴿۶۲﴾ بھلا کون ہے جو راہنمائی کرتا ہے تمہاری خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ، اور کون ہے جو چلاتا ہے ہواؤں کو جو خوشخبری لانے والی ہوتی ہیں اُس کے بارانِ رحمت سے پہلے ۔ کیا کوئی الٰہ ہے اللہ کے ساتھ ؟ بلند ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اُن چیزوں سے جن کو یہ اُس کا شریک بناتے ہیں ﴿۶۳﴾ بھلا کون

ہے جو ابتداء کرتا ہے پیدائش کی، پھر وہ اس کا اعادہ کریگا

اور کون ہے جو تم کو روزی پہنچاتا ہے آسمان اور زمین

سے۔ کیا کوئی الٰہ ہے اللہ کے ساتھ؟ آپ کہہ دیجئے

کہ لاؤ دلیل اپنی اگر تم سچے ہو (۶۴)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کے نشاناتِ قدرت کے طور پر پہلے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے واقعات بیان ہوئے، پھر قوم صالح اور قوم لوط کی نافرمانیوں کا ذکر ہوا۔ پھر اللہ نے اپنی توحید اور قدرتِ تامہ کا ذکر کیا اور توحید کے دلائل بیان کیے۔ پچھلے واقعات سے لوگوں کی عبرت اور نصیحت مطلوب ہے تاکہ لوگ کفر، شرک اور معاصی سے باز آجائیں اور خدا تعالیٰ کے غضب سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں پہنچ جائیں۔ اب اس رکوع میں اللہ کی توحید کے عقلی دلائل بیان کیے جا رہے ہیں جن میں غور کرنے سے وحدانیت سمجھ میں آسکتی ہے اور انسان کفر و شرک سے بچ سکتا ہے۔

گذشتہ درس میں آسمان و زمین کی تخلیق، بارش کا نزول، باغات اور درختوں کی پیدائش کو دلائلِ توحید و قدرت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ پھر زمین کو قرار گاہ بنانے، ان میں نہریں جاری کرنے اور بوجھل پہاڑ کھڑا کرنے اور دو پانیوں کے درمیان آڑ بنا دینے کا تذکرہ تھا۔ پھر اللہ نے استفہامیہ انداز میں فرمایا کیا کوئی خدا کے ساتھ اور معبود بھی ہے جو یہ سارے کام کرتا ہو؟ ظاہر ہے کہ یقیناً خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس کے باوجود لوگ بے سمجھی میں ان روشن دلائل سے انحراف کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھنے کی بجائے کفر اور شرک کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

مجبور و بے بس کی دعا

اب آج کی آیات میں اللہ نے مزید دلائلِ توحید بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ کون ہے جو مجبور و بے بس کی دعا کو قبول کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے۔ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔ لوگوں پر مصائب و تکالیف آتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے وہ بے بس ہو

جاتے ہیں اور جب تمام ظاہری اسباب منقطع ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کے سامنے ہی فریاد کرتے ہیں کہ مولا کریم ہم نے تمام ظاہری اسباب استعمال کر لیے۔ چنانچہ ہر زور ہار گیا۔ اب معاملہ تیرے ہی سپرد ہے، تو ہی ہماری تکلیف کو رفع کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ ایسے مشکل وقت میں تمام خودساختہ معبودوں کو بھول کر صرف خدائے وحدہ لاشریک کی طرف رجوع کرتے ہو مگر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے آڑے وقت میں مجبور و بیکس کی آواز کون سنتا ہے۔ اُس وقت صرف خدائے وحدہ لاشریک کا دروازہ ہی رہ جاتا ہے جس پر دستک دی جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مصلحت ہوتی ہے تو وہ تکلیف کو رفع کر دیتا ہے ورنہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

جب تک انسان کا بس چلتا ہے وہ اسباب ظاہرہ کو آزماتا رہتا ہے مریض کے سرہانے قابل ترین ڈاکٹر کھڑے رہتے ہیں۔ پھر جب شفا کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو کہتے ہیں کہ ڈاکٹروں کو چھوڑو کسی دم جھاڑ کرنے والے کو بلاؤ۔ پھر بھی ناکامی ہوتی ہے تو خالص اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُس وقت اقرار کرتے ہیں کہ مولا کریم! تیرے بغیر اس تکلیف کو دور کرنے والا کوئی نہیں۔ مختصر یہ عام تکلیف زدہ آدمی کے علاوہ گنہگار بھی شامل ہے۔ جب وہ گندگیوں میں ڈوب جاتا ہے اور رہائی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ تو پھر اقرار کرتا ہے کہ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران ۱۳۵) اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ پھر اگر انسان اُس مالک الملک کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ گڑگڑا کر معافی کا طلبگار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی دیگر حادثہ پیش آ جاتا ہے طوفان آ جاتا ہے۔ قحط برپا ہو جاتا ہے یا کوئی دوسری تکلیف آ جاتی ہے۔ اور تمام ظاہری اسباب منقطع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسی مشکل سے اللہ کے سوا نکالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ مفسرین کرام ایک بزرگ داؤد رمانی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی بیمار کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے تو مریض نے شفایابی کی دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ بھائی! تم خود دعا کرو کیونکہ مضطر کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔ اسی طرح امام طاؤسؒ

جو تابعین میں سے ہیں۔ ایک بزرگ ابو صالحؒ کی بیمار پرسی کے لیے گئے۔ انہوں نے بھی فرمایا کہ مجبور و بیکس آدمی کی دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے لہٰذا تم خود بھی اپنے لیے صحت کی دُعا کرو۔

امر غیبی کا عجیب واقعہ

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابن عساکرؒ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ بزرگ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے محدث اور عظیم مورخ ہیں جن کی تاریخ کی کتاب اسّی جلدوں پر محیط ہے جن میں سے کچھ جلدیں طبع بھی ہوئی ہیں۔ تو انہوں نے کسی شخص کا واقعہ لکھا ہے متعلقہ شخص کا اپنا بیان ہے کہ میں خچر پر بار برداری کا کام کرتا تھا اور مسافروں کا سامان وغیرہ دمشق سے زبدانی تک کرائے پر لے جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی مسافر نے مجھ سے بار برداری کا معاملہ طے کیا۔ میں نے سامان خچر پر لادا اور معروف راستے پر چل دیا۔ مسافر کہنے لگا کہ یہ راستہ دور ہے تم اس راستے سے چلو جو نزدیک ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اس راستے سے واقف نہیں ہوں مگر مسافر نے اصرار کیا کہ وہ خود اس راستے سے واقف ہے لہٰذا انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ وہ اُس راستے سے چل دیے حتیٰ کہ ایسی خوفناک وادی میں پہنچ گئے جہاں ہر طرف انسانی جسم کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ مسافر نے اس مقام پر رکنے کے لیے کہا۔ جب خچر کو روک دیا تو مسافر کی شکل میں آنے والا ڈاکو کھل کر سامنے آگیا۔ اُس نے لنگوٹ کس لیا۔ اور چھُرا لے کر مجھے قتل کرنے کے لیے بڑھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص جان بوجھ کر مجھے اس راستے پر لایا ہے تاکہ مجھے قتل کر کے میرے خچر اور سامان پر قبضہ کر لے۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر اس نے تعاقب کیا۔ وہ تھا بھی مجھ سے طاقتور۔ لہٰذا میں اُس کے سامنے بے بس تھا۔ میں نے اُس کی منت کی کہ میرا مال لے لو مگر مجھے قتل نہ کرو مگر وہ اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ بالآخر میں نے کہا کہ موت سے پہلے مجھے دو رکعت نماز ہی پڑھ لینے دو۔ وہ مان گیا اور میں نے نماز شروع کر دی۔ اُس وقت پریشانی کا یہ عالم تھا کہ قرآن پاک کا کوئی حصہ زبان پر نہیں آرہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد صرف یہی ایک آیت میری زبان سے ادا ہوئی اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ۔ اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک تیز گھڑ سوار

ہماری طرف آرہا ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ وہ قریب پہنچا اور اپنا نیزہ اُس ڈاکو کے سینے میں پیوست کرکے اُس کو ہلاک کردیا۔ یہ کام کرنے کے بعد گھڑسوار فوراً واپس ہوا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا اور دریافت کیا کہ تم کون ہو جس نے مجھے اس مشکل وقت میں بچایا ہے، تو وہ کہنے لگا کہ میں اسی ہستی کا بھیجا ہوا ہوں جو مجبور و بیکس آدمی کی فریاد سنتا ہے اور جسے تو نے پکارا تھا۔

حضور علیہ السلام کے ناصحانہ فرمودات

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ بنی حجیم کا ایک شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا لِمَا تَدْعُ یعنی آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اَدْعُو اِلَی اللّٰہِ وَحْدَہٗ کہ میں تو اللہ وحدہٗ لاشریک کی توحید کو ماننے کی دعوت دیتا ہوں۔ اور وہ وہی ذات ہے اَلَّذِیْ اِنْ مَسَّکَ ضُرٌّ فَکَشَفَ عَنْکَ کہ اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ تمہاری تکلیف کو دُور کر دے وَاِنْ اَضْلَلْتَ بِاَرْضٍ قَفْرٍ فَدَعَوْتَہٗ اگر تم کسی بیابان میں اپنی سواری کھو بیٹھو، پھر تم اُسے پکارو تو وہ تمہاری سواری واپس کر دے۔ وَاِنْ اَصَابَکَ سَنَۃٌ فَدَعَوْتَہٗ اور اگر تم قحط میں مبتلا ہو کر اُسے پکارو تو زمین سے نباتات پودے اور فصلیں پیدا کر دے۔ لہٰذا میری دعوت یہ ہے کہ قادرِ مطلق اللہ کی طرف رجوع کرو اور اُس پر ایمان لاؤ۔

بنی حجیم کا شخص کہنے لگا حضور! مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا کسی کو گالی نہ دینا اور دوسری بات یہ کہ لَا تَزْھَدَنَّ فِی الْمَعْرُوْفِ نیکی کے کام میں پس و پیش نہ کرنا۔ اگر اور کچھ نہ ہو تو اپنے مسلمان بھائی سے ملتے وقت ہنس مکھ چہرے سے مل لیا کرو۔ ڈول کے ساتھ پانی نکالو تو اس میں سے تھوڑا سا پانی اپنے بھائی کو بھی دے دو۔ مطلب یہ کہ نیکی خواہ معمولی سی ہو اس کے کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرو۔ آنحضرت علیہ السلام نے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ تہ بند باندھو تو نصف پنڈلی تک باندھو۔ اگر نیچے کرنا مطلوب ہو تو ٹخنے سے بہرحال اُوپر رکھو کیونکہ تہ بند یا پاجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکانا تکبر کی علامت ہے

اور یاد رکھو إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيلَةَ اللہ تعالیٰ تکبر کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

ایک مسنون دعا

یہ بیان ہو چکا ہے کہ مجبور و بیکس کی دعا کو اللہ ہی سنتا اور اُس کی مشکل حل کرتا ہے اس ضمن میں حضور علیہ السلام نے یہ دعا بھی سکھائی ہے اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ اے پروردگار! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ مجھے میرے نفس کی طرف آنکھ جھپکنے کے برابر بھی نہ سونپ اور میرے تمام حالات کو درست فرما دے۔ تو ہی تکلیف کو دور کرنے والا اور مریض کو شفا بخشنے والا ہے۔ ایک ایمان دار آدمی کا حیلہ بھی اللہ کی رحمت ہے اور اس کا وسیلہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ وسیلے کے متعلق امام سیلی کے دو اشعار بھی ملاحظہ کریں ؎

مَالِیْ سِوٰی فَقْرِیْ اِلَیْكَ وَسِیْلَةٌ
فَبِالْاِفْتِقَارِ یَدِیْ اِلَیْكَ اَرْفَعُ
مَالِیْ سِوٰی قَرْعِیْ لِبَابِكَ حِیْلَةٌ
فَلَئِنْ رُدِدْتُّ فَاَیَّ بَابٍ اَقْرَعُ

میرے رب میری محتاجی کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں اس افتقار (محتاجی) کے ساتھ ہی تیرے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں میرے لیے تیرا دروازہ کھٹکھٹانے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تو نے اس کو رد کر دیا تو پھر میں کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا؟

بہرحال فرمایا کہ بھلا تبلاؤ کہ مجبور و بیکس آدمی کی دعا کو کون سنتا اور قبول کرتا ہے جب وہ پکارتا ہے، اور اُس کی تکلیف کو کون دور کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی ہے جو بے کس کی دستگیری کرتا ہے۔ پھر فرمایا، وہ کون ہے وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ جو تمہیں زمین میں پہلوں کا جانشین بناتا ہے۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اُس کی جگہ لے لیتی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اگر پہلے لوگ دنیا کے منظر سے غائب نہ ہوں تو آنے والوں

کو اُن کی نیابت کیسے حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب نظام قائم کر کے ایک کو دوسرے کا نائب بنایا ہے۔ جب یہ تمام انعامات کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو پھر ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اُس کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے مگر افسوس قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ تم بہت کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ بات بارہا مشاہدہ بھی کر چکے ہو کہ مجبور و بے کس کی فریاد رسی صرف اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کی پریشانی کو وہی دور کرتا ہے اُسی نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے۔ سورۃ یونس میں نیابت کا مقصد بھی بیان کیا ہے لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (آیت ۔۱۴) تاکہ ہم دیکھیں کہ تم اس نیابت کا حق کس طرح ادا کرتے ہو اور دنیا میں رہ کر کیسے اعمال انجام دیتے ہو؟

بعض انعامات الٰہیہ

اگلی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض انعامات یاد دلا کر اپنی وحدانیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان انعامات کا عطا کرنے والا اللہ کے سوا کون ہے؟ جب کوئی نہیں تو پھر معبود بھی اُس کے سوا کوئی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں تمہاری راہنمائی کرتا ہے۔ بعض اوقات سمندروں میں جہاز بھٹک جاتے ہیں۔ راستہ معلوم نہیں ہوتا یا جب کوئی قافلہ گھنے جنگلات یا لق و دق صحرا میں سفر کر رہا ہوتا ہے تو راستہ بھول جاتا ہے۔ بھلا ایسی مشکلات میں راہنمائی کرنے والی کون سی ذات ہے جو راستہ دکھلا کر منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ ہر مشکل وقت میں اللہ ہی راہنمائی کرتا ہے اور وہی مشکلات کو دور کرتا ہے۔

فرمایا وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ کون ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے؟ جب ایک خاص سمت سے ٹھنڈی ہوا چلے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اب بارانِ رحمت ہوگی اور انسان، حیوان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ نباتات بھی اس سے مستفید ہوں گے جاندار کو پینے کے لیے پانی میسر آئے گا اور باغات اور کھیتیاں سیراب ہو کر پھل پھول لائیں

گی، فصلیں پیدا ہوں گی، اور قحط سالی دور ہو جائے گی۔ مقصد یہ کہ خوشخبری لانے والی ہوائیں
بھی اللہ ہی چلاتا ہے۔ پھر یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر بارش رحمت ہی کا سبب ہو
بعض اوقات یہی بارش غیر مفید بھی ہو سکتی ہے۔ اسی بارش سے سیلاب آتے ہیں، سمندروں
میں طوفان اٹھتے ہیں اور اچھے بھلے لوگوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

فرمایا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے؟ ہرگز
نہیں تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ کی ذات تو بلند و برتر ہے
اُن چیزوں سے جن کو یہ خدا تعالیٰ کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ کمالِ قدرت کا مالک
صرف خدا ہے جب کہ باقی سب عاجز مخلوق ہیں۔ کسی کے اختیار میں کچھ نہیں۔ مگر
اس کے باوجود لوگ دوسروں کو شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ شرک سے بلند ہے۔

تخلیق انسانی اور اس کا اعادہ

پھر فرمایا اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ کون ہے جو تخلیق
میں پہل کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ حضرت
آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد اُن کی نسل در نسل ہر روز لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور
قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی، تو ہر چیز فنا ہو جائیگی۔
پھر اللہ تعالیٰ اُن کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور وہ محاسبہ اعمال کے لیے اللہ کے حضور
پیش ہوں گے۔ سورۃ الطارق میں ہے اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ
(آیت - ۸) جس نے انسان کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے وہ اُس کے لوٹانے پر بھی قدرت
رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس میں کبھی خلل واقع نہیں
ہوتا۔ انسان سے انسان ہی پیدا ہوتا اور ہر قسم کے حیوان، چرند پرند اور کیڑے مکوڑوں
سے ویسی ہی مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ کبھی ایک جنس سے دوسری جنس پیدا نہیں ہوتی۔
دہریوں کا نظریہ بھی باطل ہے جو کہتے ہیں کہ تمام مخلوق مادے کی تخلیق ہے۔ اور
تمام اشیاء اتفاق سے ہی خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ہر
جنس یعنی انسان، حیوان اور نباتات کو الگ الگ مادے سے پیدا فرمایا ہے۔ اسمیں
اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی قدرت کارفرما ہے۔ نہ اس میں اندھے مادے

کا کوئی تعلق ہے اور نہ یہ اتفاق کی بات ہے۔ تخلیق اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، لہٰذا اُسی کی توحید کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔

روزی رسانی

آگے اللہ نے ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ تمہیں آسمان و زمین سے روزی کون ہم پہنچاتا ہے؟ یعنی روزی کے اسباب کون مہیا کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم آتا ہے تو فضا میں بادل گھر آتے ہیں۔ پھر اللہ کی مشیت میں جہاں اور جتنی بارش مقصود ہوتی ہے وہاں برسا دی جاتی ہے اس سے سبزہ اگتا ہے پھل اور اناج پیدا ہوتا ہے جو انسانوں اور حیوانوں کی روزی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے علاوہ روزی کے جتنے بھی ذرائع ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی مہیا فرماتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ کون ہے جو تمہیں زمین اور آسمان سے روزی پہنچاتا ہے؟ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور بھی روزی رساں ہے۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے تو پھر کوئی دلیل پیش کرو۔ مگر دلیل کہاں سے آئے گی مخلوق تو ساری کی ساری عاجز ہے، وہ تو کسی کام کی قدرت نہیں رکھتے۔ لاکھ ٹکریں ماریں دلائل صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ہی ملیں گے۔ اللہ کی قدرت کاملہ ہی سمجھ میں آئے گی۔ لہٰذا اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا بہت بڑا ظلم ہے۔ اس سے بچنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھنا چاہیئے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا ۖ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) نہیں جانتا جو بھی ہے آسمانوں میں اور زمین میں غیب سوائے اللہ کے۔ اور ان کو خبر نہیں کہ کب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے ﴿۶۵﴾ بلکہ گم گیا ہے ان کا علم آخرت کے بارے میں۔ بلکہ وہ شک میں ہیں اس (آخرت) کی طرف سے۔ بلکہ یہ لوگ اس (آخرت) سے اندھے ہیں ﴿۶۶﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے مسئلہ توحید سمجھانے اور شرک کی تردید میں بعض عقلی دلائل بیان فرمائے ہیں۔ ان دلائل میں ارض و سما کی تخلیق، بارش کا نزول، باغات اور ثمار کی پیداوار، زمین کا قرارگاہ ٹھہرانا اور اس میں نہریں جاری کرنا، زمین میں بوجھل پہاڑ گاڑ دینا، دو پانیوں کے درمیان آڑ قائم کر دینا تاکہ آپس میں خلط ملط نہ ہونے پائیں، وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دلائل توحید ہی کے ضمن میں فرمایا کہ مجبور و بیکس کی فریاد رسی کرنے والا اللہ کے سوا کون ہے؟ اسی نے تم کو پہلے لوگوں کا نائب بنایا خشکی اور تری میں وہی راہ دکھاتا ہے۔ باران رحمت سے پہلے وہی خوشخبری لانے والی ہواؤں کو چلاتا ہے، بھلا اس کے سوا کوئی اور الٰہ ہے؟ وہی مخلوق کو ابتدا میں پیدا

کرنے والا اور دوبارہ لوٹانے والا ہے۔ اُسی نے زمین و آسمان سے روزی کے اسباب مہیا فرمائے۔ غرضیکہ ان تمام امور کو انجام دینے والا صرف اللہ ہے تو پھر معبودِ برحق بھی وہی ہے اگر اُس کے علاوہ بھی کوئی معبود ہے تو اس کے لیے دلیل پیش کرو۔ دلائل تو سارے کے سارے اللہ کی وحدانیت کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا اُس کے شریک ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اسی لیے تو اللہ نے ان دلائل سے قبل فرما دیا آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ (آیت۔ ۵۹) کیا خدا تعالیٰ کی ذات بہتر ہے یا وہ جن کو یہ شریک بناتے ہیں؟

علم محیط خاصہ خداوندی ہے

منجملہ اُن خصوصیات کے جو معبودِ برحق میں پائی جاتی ہیں ایک یہ بھی ہے جو اللہ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ تمام چیزوں کا کلی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ الوہیت کی ایک خصوصیت خالق ہونا ہے۔ الٰہ بھی وہی ہوگا جو ہر چیز کا خالق ہے۔ سورۃ یونس میں فرمایا قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (آیت۔ ۳۴) اے پیغمبر! آپ ان سے پوچھیں کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جس نے سب سے پہلے پیدا کیا اور پھر وہ اُس کا اعادہ کرے گا۔ فرمایا آپ یہ بھی کہہ دیں کہ اللہ ہی اولاً پیدا کرنے والا ہے اور وہی اس کو لوٹائے گا۔ اس طرح سورۃ فاطر میں فرمایا۔ اللہ کے انعامات کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کیے هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (آیت۔ ۳) کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے روزی پہنچاتا ہے؟ صفتِ خلق کے علاوہ قادرِ مطلق ہونا بھی الوہیت کی صفت ہے۔ ہر چیز پر قدرت رکھنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (البقرہ۔ ۲۰) ہر چیز پر صرف اللہ ہی قدرت رکھتا ہے۔ پھر علیم کل ہونا یعنی ذرے ذرے کا علم ہونا بھی اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲۸۲) ہر چیز کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا (النساء۔ ۱۲۶) اللہ تعالیٰ ہی ہر

چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ قدرت کے لحاظ سے احاطہ ہو یا علم کے لحاظ سے یہ بہرحال اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ غیر مرئی ہے یعنی وہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی اس کی صفات میں سے ہے۔ نافع اور ضار ہونا مختارِ کل ہونا، علیمِ کل ہونا، خالق ہونا، یہ سب الوہیت کی صفات مختصہ ہیں۔ اسی طرح علم محیط بھی الوہیت کی صفات میں سے ہے۔ جس ذات میں یہ صفات نہ پائی جائیں وہ کیسے الٰہ ہو سکتا ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے شرح بخاری میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کے یہ نیک بندے جب کشتی پر سوار تھے اس کے کنارے پر ایک چڑیا آکر بیٹھ گئی۔ اس نے سمندر میں چونچ مار کر ایک آدھ قطرہ پانی کا لیا تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا یَامُوسیٰ

مَا عِلْمِیْ وَعِلْمُکَ فِیْ جَنْبِ عِلْمِ اللّٰہِ اِلَّا کَمِثْلِ ھٰذَا الْعُصْفُوْرِ

یعنی اے موسیٰ علیہ السلام! میرے اور تیرے علم کی مثال اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے اس چڑیا نے سمندر سے پانی حاصل کر لیا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک شخص موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا روئے زمین پر آپ سے زیادہ علم والا بھی کوئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا، نہیں۔ بس اسی میں آپ کی آزمائش آگئی، کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کو اللہ کی طرف کیوں نہیں لوٹایا اور خود ہی سب سے بڑے عالم بن بیٹھے۔ انہیں چاہئے تھا کہ کہتے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ فی الواقع اس وقت اللہ کے دین اور شریعت کو سب سے زیادہ جاننے والے موسیٰ علیہ السلام ہی تھے لیکن پھر بھی اُن کی گرفت ہو گئی اِذْ لَمْ یَرُدَّ الْعِلْمَ اِلَی اللّٰہِ کہ انہوں نے علم کی بات کو اللہ کی طرف کیوں نہ لوٹایا۔ بہرحال اسی سلسلے میں آپ کو لمبا چوڑا سفر اختیار کرنا پڑا اور پھر خضر علیہ السلام نے اپنے اور اُن کے علم کی مثال بھی بیان کی کہ کل مخلوق کے مقابلے میں اللہ کے علم کی نسبت قطرے اور لاکھوں مربع میل پر محیط سمندر جتنی بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ کا علم ازل سے لے کر ابد تک ذرے ذرے پر محیط ہے اور یہ الوہیت کی صفتِ خاصہ جو کسی دوسری ہستی میں نہیں پائی جاتی۔

نبی اور علمِ غیب

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام پوری بنی نوعِ انسان میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اُن کو وحی کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے۔ انبیاء کے عقل و حواس اور اعضاء و جوارح بھی بڑے کامل درجے کے ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو معصوم بناتا ہے۔ وہ ابتدا سے ہی اللہ کی حفاظت میں ہوتے ہیں اور اُن سے گناہ نہیں سرزد ہونے دیا جاتا۔ اگر کوئی معمولی سی لغزش ہو جائے تو فوراً تنبیہ کر دی جاتی ہے۔ کسی نبی کو کسی غلطی پہ ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ان تمام نزکارستے کے باوجود لَا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ اِلَّا مَا عَلَّمَهُمُ اللّٰہُ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے سوائے اس کے جو اللہ نے انھیں سکھا دیا ہے۔ غیب کا جاننا اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ مجھے اوّلین اور آخرین کا علم دیا گیا ہے۔ بلا شبہ آپ تمام انبیاء اور ساری مخلوق سے زیادہ علم رکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کو عالم الغیب کہنا درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو دین اور شریعت کا علم مکمل طور پہ دیتا ہے۔ کائنات کی بعض چیزوں کے متعلق بھی بہت کچھ علم دیتا ہے مگر ذرے ذرے کا علم نہیں کہ اللہ نے اُس کی نفی فرمائی ہے اللہ کا فرمان ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (الانعام۔۵۹) غیب کی چابیاں خدا تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اس کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔ سورۂ لقمان میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اور وہ یہ ہیں کہ (۱) قیامت کب برپا ہوگی (۲) بارش کب اور کتنی ہوگی (۳) ماں کے پیٹ میں کیا ہے۔ (۴) انسان کل کیا کرے گا (۵) کس کی موت کہاں واقع ہوگی۔

البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو غیب کی بعض باتوں پہ اطلاع کر دیتا ہے۔ مگر کسی ایسے شخص پہ عالم الغیب ہونے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں اشتباہ واقع ہوتا ہے اور اشتباہ میں کسی کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔

دیکھ لیجئے اللہ نے اپنے پیغمبر سے شعر و شاعری کی صریح الفاظ میں نفی کی ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ (یٰس۔۶۹) ہم نے اپنے نبی

کو شعر کا علم نہیں سکھایا اور نہ وہ اس کی شایانِ شان ہے شعر و شاعری کا شعبہ بڑا وسیع ہے مگر نبوت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح کہانت اور سحر کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں دیا۔ ہاں حلال و حرام، جائز و ناجائز اور اصلاح سے متعلق تمام باتیں آپ کو بتلا دی گئی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ کوئی ایسی چیز نہیں جو تمہیں جنت سے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے مگر میں نے تمہیں بتلا دی ہے۔ لیکن جہاں تک دنیا کے علوم کا تعلق ہے تو یہ سارے نبی کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ مثلاً دنیاوی فنون از قسم ریاضی، جغرافیہ، سائنس، جہازرانی وغیرہ اگر آپ نہیں جانتے تو یہ کوئی نبوت کے منافی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے نبی نے مبرمضر علم سے پناہ مانگی ہے۔

علم غیب خاصہ خداوندی ہے

آج کی پہلی آیت میں اللہ نے علم محیط کی صفت کو ہی بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ مخلوق سے علم غیب کی نفی سے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ اللہ نے حضور کی زبان سے کہلوایا وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (ہود - ۳۱) میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں آپ نے یہ بھی فرمایا وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ (الاعراف - ۱۸۸) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو فائدے کی بہت سی چیزیں اکٹھی کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ اگر اللہ کے نبی کو غیب کا علم ہوتا تو آپ اپنے ستر بہترین حفاظ اور قاریوں کو منافقین کے ساتھ نہ بھیجتے جنہیں بئر معونہ کے مقام پر دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے حج کا احرام باندھا یعنی اس وقت آپ نے عمرہ کی نیت نہیں کی اور ساتھ قربانی کے جانور بھی لیے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی آپ کے

اتباع میں حج کا احترام باندھا مکہ معظمہ پہنچ کر خیال آیا کہ مشرکین حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے تو آپ نے مشرکین کے خلاف کرنے کے لیے صحابہ کو حکم دیا کہ جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے وہ حج کے احرام کو عمرہ میں بدل دیں اور عمرہ کر کے حلال ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا اگر میرے دل میں پہلے وہ بات آجاتی جو بعد میں آئی ہے، تو میں قربانی کے جانور مدینے سے نہ لاتا۔ اور جو طواف وسعی کی ہے اس کو عمرہ میں تبدیل کر دیتا۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں لَوْ اِنِّیْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ اَسُقِ الْهَدْیَ وَجَعَلْتُهَا عُمْرَةً۔ یہ واقعہ بھی حضور علیہ السلام سے علم غیب کی نفی کرتا ہے۔ غرضیکہ تین سو سے زیادہ نصوص ہیں جن میں علم غیب مطلق کی نفی کی گئی ہے علم غیب کا اطلاق صرف خدا تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال وجواب کریں گے۔ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟ تو عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ پروردگار تو پاک ہے۔ بھلا میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ایسی بات کروں جس کا مجھے حق نہیں پہنچتا۔ اگر میں نے ایسی کوئی بات کی ہے تو تو اُسے جانتا ہے۔ تو میرے دل کی بات کو جانتا ہے مگر میں تیرے جی کی بات کو نہیں جانتا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (المآئدة - ۱۱۶) تمام غیبوں کا جاننے والا صرف تو ہی ہے۔

غیب کیا ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ انبیاء کے لیے علم غیب کا ثبوت قرآن میں موجود ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران - ۱۷۹) اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پر مطلع نہیں کرتا مگر اپنے منتخب نبیوں میں جس کو چاہے مطلع کر دیتا ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نبی کو چاہے غیب کی بات پر مطلع کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اطلاع علی الغیب کے بعد وہ غیب تو نہ رہا غیب کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ اس کا علم بغیر کسی واسطے یا اطلاع کے ہو۔ نبی کو اللہ

نے وحی کے ذریعے کوئی باخبر کر دی تو وہ غیب نہ رہا۔ اسی طرح کشف کے ذریعے اولیاء کو کوئی بات سمجھا دی یا عقلی طور پر کوئی چیز فہم میں ڈال دی تو اس کو غیب نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اس کو اضافی طور پر غیب کہہ سکتے ہیں جیسے خدا تعالیٰ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ (الحشر - ۲۲) ہے یعنی وہ غیب اور حاضر چیز کو جاننے والا ہے مگر یہ غیب مخلوق کی نسبت سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز مخفی نہیں۔ اس کا اپنا فرمان ہے:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (یونس - ۶۱) تیرے پروردگار سے تو زمین و آسمان کی ذرہ برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ بہرحال علم غیب وہ ہوگا جو بغیر کسی کے بتلانے یا حواس ظاہرہ و باطنہ کو استعمال کرنے کے حاصل ہوگا۔ اور اس کا اطلاق صرف اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کوئی بات بتلا دیتا ہے تو پھر غیب نہیں رہتا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص کسی جگہ ایک وقوعہ مشاہدہ کر کے آتا ہے تو وہ آکر دوسرے شخص کو بتلا دیتا ہے اب دوسرے شخص نے وہ خود تو نہیں دیکھا اور نہ ہی بغیر بتلانے کے علم ہوا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے شخص کو علم غیب ہے بلکہ وہ تو اطلاع کرنے سے ہوا ہے اور اطلاع علی الغیب غیب نہیں ہوتا

وقوع قیامت کا وقت

بہرحال ذرے ذرے کا علم تو فقط خدا تعالیٰ کو ہے۔ مخلوق کو تو اتنا بھی علم نہیں وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ عین وقوع قیامت کا علم اللہ نے اپنے ساتھ مختص رکھا ہے۔ قرآن میں تصریح موجود ہے۔ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ (الاعراف - ۱۸۷) اس نے اپنے سوا اس کا وقت کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بلکہ آخرت کے معاملہ میں ان کا علم گر گیا ہے۔ ادرك ادّارك کا معنی سمجھنا، پانا یا اکٹھا ہونا ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا حَتّٰى إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا (الاعراف - ۳۸) جب سارے مجرم جہنم میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ تاہم اس مقام پر جملے کا معنی بعض مفسرین فرماتے ہیں "ان کا علم گر گیا ہے یا ساقط ہو گیا" یعنی کافروں اور مشرکوں کے خیالات

مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ قیامت آئیگی اور کوئی کہتا ہے نہ بالکل نہیں آئے گی
گویا اس معاملہ میں اُن کا علم ساقط ہو گیا ہے اور وہ یقینی طور پر کچھ نہیں جانتے۔

امام زمخشریؒ ذٰلِکَ کا معنی کامل ہونا کہتے ہیں۔ اس طرح جملے کا معنی یہ بنتا
ہے کہ آخرت کے بارے میں اُن کا علم کامل ہو چکا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ تمام
اسباب اُن کے پاس آ چکے ہیں جن کے ساتھ قیامت کا علم ہو سکتا ہے مگر پھر
بھی یہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔ وہ ہر چیز کو اپنے سامنے پیدا
ہوتے دیکھتے ہیں۔ انسان اور جانور پیدا ہوتے ہیں۔ ہر موسم میں نباتات اُگتے ہوئے
دیکھتے ہیں۔ پھر ہر فصل کے موقع پر ان کا اعادہ ہوتے بھی دیکھتے ہیں۔ یہ اس بات
کے شواہد ہیں کہ وقوعِ قیامت بعید نہیں ہے اگر کسی چیز کی تخلیق پہلی دفعہ ممکن ہے تو
پھر دوبارہ بھی ممکن ہے۔ اس میں تردد کی کون سی بات ہے۔ سورۃ یونس میں ہے
اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (آیت - ۴) وہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے
اور وہی دوبارہ لوٹائے گا۔ فرمایا اس کے باوجود جاہل لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ بَلْ
هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بلکہ وہ تو شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سورۃ النبأ
میں وضاحت موجود ہے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ
(آیت ۱، ۲) یہ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ بہت بڑی خبر یعنی قیامت
کے بارے میں الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (آیت ۳) جس کے
متعلق وہ اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آئے گی اور کوئی انکار کرتا ہے۔ یہ لوگ
قیامت کے وقوع کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

دل کے اندھے

فرمایا۔ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ بلکہ یہ لوگ آخرت کے بارے
میں اندھے ہیں۔ عمون کا معنی ظاہری آنکھوں کا اندھا پن نہیں بلکہ ان لوگوں کے دل
اندھے ہیں جن میں صحیح بات نہیں سماتی۔ سورۃ الحج میں ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى
الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ
(آیت - ۴۶) ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہیں

قومِ نوح کے متعلق بھی فرمایا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (اعراف - ۶۴)
وہ ساری کی ساری قوم ہی اندھی تھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے۔
شَرُّ الْعَمَى عَمَى الْقَلْبِ بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے۔ ظاہری آنکھوں سے محروم بعض لوگ تو بڑے اچھے اچھے کام بھی کر جاتے ہیں بعض لوگوں کے علمی کاموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ان لوگوں نے علم کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ تو ظاہری نقص ہے کہ انسان آنکھوں سے محروم ہے مگر اصل اندھا تو وہ ہے جس کا دل اندھا ہے یعنی اس میں کفر شرک اور بدعقیدگی بھری ہوئی ہے۔ ایمان کا تصور موجود نہیں ہے اور وہ ہدایت کی بات کو سمجھنے سے عاری ہیں۔ بہرحال منکرین قیامت کے متعلق فرمایا کہ ان کے پاس علم کے تمام اسباب پہنچ چکے ہیں مگر اس کے باوجود یہ لوگ شک و تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ گویا ان کے دل اندھے ہیں جس کی وجہ سے قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا
لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾
وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا
يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ
بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ
عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾
وَمَا مِنْ غَاۗىِٕبَةٍ فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾

ترجمہ:- اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، کیا جب ہم ہو جائیں گے مٹی اور ہمارے آباؤ اجداد بھی تو کیا ہم نکالے جائیں گے (زمین سے)؟ ﴿۶۷﴾ البتہ وعدہ کیا گیا ہے اس چیز کا ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد سے اس سے پہلے نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی ﴿۶۸﴾ (اے پیغمبر!) آپ

کہ دیکھئے چلو زمین میں پس دیکھو کیسا ہوا انجام مجرموں کا (۶۹) (اے پیغمبر!) اور نہ غم کھائیں آپ ان پر اور نہ ہوں آپ تنگی میں اُس چیز سے جو یہ پوشیدہ تدبیریں کرتے ہیں (۷۰) اور کہتے ہیں کہ کب ہو گا یہ وعدہ (قیامت کا) اگر تم سچے ہو (۷۱) آپ کہہ دیجئے کچھ بعید نہیں کہ قریب ہوں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جن کے لیے تم جلدی مچاتے ہو (۷۲) اور بیشک تیرا پروردگار البتہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر مگر اکثر ان میں سے شکر ادا نہیں کرتے (۷۳) اور بیشک تیرا پروردگار جانتا ہے جو چھپاتے ہیں ان کے سینے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (۷۴) اور نہیں ہے کوئی چیز غائب آسمانوں اور زمین میں مگر وہ ایک کھلی کتاب میں درج ہے (۷۵)

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے عقلی دلائل بیان فرمائے اور شرک کا رد کیا۔ پھر نافرمان لوگوں کے متعلق فرمایا کہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے آخرت کے بارے میں اُن کا علم ساقط ہو گیا ہے وہ کوئی صحیح بات نہیں کر سکتے بلکہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے دل اندھے ہیں۔ اب آج کے درس میں قیامت کا ذکر ہے۔ مکی سورتوں کے اہم ترین مضامین میں توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت کے علاوہ وقوعِ قیامت بھی ایک اہم مضمون ہے۔ کافر لوگ جہاں باقی بنیادی عقائد کا انکار کرتے تھے وہاں وقوعِ قیامت اور محاسبہ اعمال کے بھی منکر تھے۔ بعض تو کلیتاً انکار کرتے تھے اور بعض شک و تردد میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس اہم مسئلہ کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے مگر یہ بات اُن کی ناقص سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان آیات میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔

بعث بعد الموت کا انکار

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے

کفر کا شیوہ اختیار کیا یعنی توحید و رسالت اور وحی الٰہی کے منکرین نے یہ بھی کہا
ءَ اِذَا كُنَّا تُرَابًا وَّ اٰبَآؤُنَا کیا جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد مٹی ہو جائیں گے
یعنی ٹنوں مٹی کے نیچے دفن ہو کر مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جائیں گے۔ سورۃ السجدۃ میں
ہے ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (آیت ۱۰) جب ہم مٹی میں گم ہو جائیں
گے یعنی ہمارے جسمانی اعضاء مٹی میں رَل مِل جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ پیدا کیے جائیں
گے۔ یہاں بھی فرمایا کہ جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد مر کر مٹی میں مل جائیں گے،
اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ تو کیا ہم اس زمین سے دوبارہ برآمد کیے جائیں گے۔ ظاہر ہے
کہ معاد کا مسئلہ تو اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ہے معاد کا خوف ہی انسان کو
احکامِ الٰہی کی پابندی پر مجبور کرتا ہے۔ مگر جب یہ مسئلہ کفار مکہ کے سامنے بیان کیا جاتا
تو وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص مرنے کے سینکڑوں
ہزاروں سال بعد دوبارہ زندہ کیا جائے حالانکہ اس وقت تک تو اس کے جسم کا ذرہ
ذرہ خاک میں مل کر خاک ہو چکا ہو گا۔ سورۃ سبا میں اس مضمون کو اس طرح بیان
کیا ہے کہ کافر لوگ آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے تھے کہ کیا ہم تمہیں اُس شخص کے
متعلق بتائیں جو کہتا ہے اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِیْ
خَلْقٍ جَدِیْدٍ (آیت ۷) جب تمہارے اجسام ذرہ ذرہ ہو جائیں تو تمہیں دوبارہ
پیدا کیا جائیگا۔ پھر خود ہی کہنے لگے لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ
قَبْلُ اس بات کا وعدہ ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ اس سے پہلے بھی کیا گیا
کہ مرنے کے بعد سب کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ مطلب یہ کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام اور
شرائع الٰہیہ والے لوگ بھی یہی کہتے رہے ہیں مگر ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی، لہٰذا
ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

معاد سے انکار کا تذکرہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مختلف انداز سے
آیا ہے۔ مثلاً سورۃ النّٰزعٰت میں ہے ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (آیت ۱۱)
کیا جب ہماری ہڈیاں بھربھری ہو جائیں گی اور ان میں مادہ حیات باقی نہیں رہے گا۔

تو پھر بھی ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا (آیت ۵۰) تم بھربھری ہڈیوں کی بات کرتے ہو اگر پتھر اور لوہے جیسی سخت مخلوق بھی بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ پھر بھی تمہیں زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرے گا اور تم سے حساب کتاب لے گا۔

بہرحال کافر لوگ کہتے تھے کہ بعث بعد الموت کی کچھ حقیقت نہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، جو ہم آباؤ اجداد سے سنتے آئے ہیں مگر آج تک کسی کو دوبارہ زندہ ہوتے نہیں دیکھا۔ اساطیر اسطورہ کی جمع ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا انگریزی تلفظ سٹوری STORY ہے وہ معاد کے مسئلہ کو پرانے زمانے کی سٹوریوں سے تعبیر کرتے تھے۔ اس باطل خیال کا جواب اللہ نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ عام طور پر یہ مسئلہ نباتات کی روئیدگی کی مثال سے سمجھایا گیا ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف سے بارش نازل کرتا ہے جس سے زمین سیراب ہوتی ہے تو اس میں روئیدگی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس میں طرح طرح کے پودے، درخت، جڑی بوٹیاں اور اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے ذرات منتشر ہو کر مٹی میں مل جاتے ہیں، مگر جب پھر موسم کے مطابق بارش ہوتی ہے، تو وہی چیزیں دوبارہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کا تم روزمرہ مشاہدہ بھی کرتے ہو مگر انسانوں کے دوبارہ پیدا ہو جانے پر یقین نہیں کرتے۔ سورۃ القیمۃ میں فرمایا کہ جس خداوند قدوس نے انسان کو قطرۂ آب سے اور پھر گوشت کے لوتھڑے سے مکمل انسان بنایا، پھر نر کر مونث کے جوڑے بنائے اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (آیت ۴۰) کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ قیامت کے دن مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دے؟ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (یٰس ۸۱) کیوں نہیں وہ بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ فرمایا

يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسٓ ۔ ۷۹) انہیں دوبارہ بھی وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی دفعہ پیدا کیا۔ جب پہلی پیدائش کو مانتے ہو تو پھر دوبارہ تخلیق کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یہ تو بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ جب آغاز سے واقف ہو تو انجام بھی دیکھ لو گے۔

مجرمین کا انجام

فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔ وہ مجرم جو طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے، حق کو مٹانا چاہتے تھے، باطل کی سرپرستی کرتے تھے، کفر و شرک کے شعائر کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، ایمان اور توحید والوں کے دشمن تھے، اللہ کے نبیوں کی مخالفت کرتے تھے اور عام لوگوں پر مظالم ڈھاتے تھے۔ اُن کے انجام کی کہانیاں آثار قدیمہ کے کھنڈرات میں پڑھ لو۔ اُن کی اُجڑی ہوئی بستیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہاں کبھی ظالم و سرکش لوگ آباد تھے جن کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ دنیا میں کوئی قوم جس قدر زیادہ سرکش تھی اُس کو سزا بھی اُسی قدر زیادہ ملی۔ سورۃ ابراہیم میں فرمایا وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ (آیت ۔ ۴۵) تم اُن لوگوں کی رہائش گاہوں میں اقامت پذیر ہو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیے اور یہ بات تمہارے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا دیکھ لو ہم نے انہیں صفحۂ ہستی سے ناپید کر کے اُن کی جگہ تمہیں آباد کیا۔ تمہیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ اگر تم نے بھی انہی لوگوں کا وطیرہ اختیار کیا تو پھر تمہارا انجام بھی اُن سے مختلف نہیں ہوگا۔

حضور علیہ السلام کیلئے تسلی

پھر اللہ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ آپ ان لوگوں پر غم نہ کھائیں۔ ان کی حالت کو دیکھ کر افسردہ نہ ہوں وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ اور نہ ہی آپ ان کی خفیہ تدبیروں سے تنگی محسوس کریں۔ اِن کے مکر و فریب سے دل برداشتہ نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ان سے خود ہی نپٹ لے گا اور ان کو سزا دے گا۔ یہ اپنی سازشوں میں نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئے ہیں اور نہ اب ہوں گے۔ اور جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ - ٦٧) اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اور آپ کے مشن کو کامیاب بنائے گا۔ اور اس کو دنیا میں پھیلائے گا۔ پچھلی سورۃ الشعراء میں بھی گزر چکا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (آیت ۳) آپ نے رنجیدہ خاطر نہ ہوں کہ اپنا گلا ہی گھونٹ دیں اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہیں۔ ان کی حرکتوں کی باز پرس خود اللہ تعالیٰ ان سے کرے گا۔

قیامت کا انتظار

فرمایا، ان لوگوں کا حال تو یہ ہے وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ کہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا۔ محض دھمکیاں دیتے ہو، اگر قیامت کا یقین ہے تو جلدی سے برپا کیوں نہیں کر دیتے وہ لوگ تکبر، غرور اور تعصب کی بنا پر ایسی بات کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ اس کا جواب یہ دیں عَسٰى اَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ شاید کچھ بعید نہیں کہ قیامت تمہاری پشت کے پیچھے پہنچ چکی ہو بعض وہ چیزیں جن کے متعلق تم جلدی کرتے ہو۔ مقصد یہ کہ تم قیامت کو مذاق سمجھتے ہو مگر عین ممکن ہے کہ یہ تمہارے بالکل قریب پہنچ چکی ہو اور تم پر اچانک وارد ہو جائے۔ کفار و مشرکین عموماً دو چیزوں کے متعلق جلدی مچاتے تھے یعنی قیامت کیوں برپا نہیں کر دیتے یا ہم پر عذاب کیوں نہیں نازل کر دیتے؟ مکے والے بھی کہتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال ۳۲) اے اللہ! اگر اللہ کے نبی کے فرمودات برحق ہیں تو پھر ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا یا کوئی دوسرا دردناک عذاب بھیج دے۔ چنانچہ پیغمبر کو مکے سے نکلے ابھی ڈیڑھ سال

ہی گزرا تھا کہ اللہ نے مشرکوں پر بدر کے میدان میں عذاب بھیج دیا اور اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا۔ ہلاکت و بربادی بھی قیامت ہی کا حصہ ہے جو کہ اپنے وقت پر آئے گی مگر اس کا نمونہ دنیا میں بھی آسکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیٰمَتُہٗ جو مر گیا اس کی قیامت تو برپا ہو گئی۔ اُس کا حساب کتاب تو قبر میں ہی شروع ہو گیا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جن چیزوں کے آنے میں تم جلدی کرتے ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارے بالکل قریب پہنچ چکی ہوں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو اور پھر وہ اچانک تم پر وارد ہو جائیں۔ یہاں پر رَدِفَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ رَدِفَ اُس شخص کو کہتے ہیں جو سواری پر پیچھے بیٹھتا ہے۔ اس میں کنایہ یہ ہے کہ قیامت تم سے اتنی قریب ہے جتنا سواری پر پیچھے بیٹھنے والا آگے بیٹھنے والے کے قریب ہوتا ہے فرمایا یہ لوگ تو اپنی نادانی کی وجہ سے قیامت کے جلدی آنے کی خواہش رکھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ تیرا پروردگار تو لوگوں پر بڑا فضل کرتا ہے۔ وہ مہلت دیتا رہتا ہے اور جلدی گرفت نہیں کرتا۔ اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ مگر ان میں سے لوگوں کی اکثریت خدا تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتی، بلکہ غرور و تکبر میں مبتلا رہتے ہیں۔ مہلت دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گرفت میں نہیں لے گا بلکہ حقیقت یہ ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (البروج۔ ۱۲) تیرے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ جب وہ گرفت کرتا ہے تو پھر عذاب دیئے بغیر چھوڑتا نہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرمایا وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ تیرا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اس چیز کو جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں۔ آپ اپنا کام مستعدی سے کرتے جائیں اور ان کی طرف سے زیادہ غم نہ کھائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاق، عقیدے اور مخفی تدابیر کو جانتا ہے

وہ خود ان سے نپٹ لے گا۔

لوح محفوظ

آگے ارشاد ہوتا ہے وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ارض وسما کی کوئی غائب چیز نہیں ہے مگر وہ ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔ ہر چیز کا ریکارڈ اللہ کے پاس لوح محفوظ میں درج ہے اور کوئی ظاہر یا پوشیدہ چیز اس سے باہر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظاہر اور باطن تو مخلوق کے اعتبار سے ہے ورنہ خالق کے نزدیک تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (یونس۔۶۱) تیرے پروردگار سے تو کوئی ذرہ برابر چیز بھی مخفی نہیں ہے خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں مگر وہ ایک کھلی کتاب یعنی لوح محفوظ میں درج ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر ہر وقت شاہد ہے وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (البروج۔۹) اُس کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہیں وہ ہر چیز پر نگران ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم تفصیلی کا نمونہ ہے کہ ابتداء سے لے کر انتہا تک ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔ اس کے علاوہ اللہ نے ہر چیز کے ریکارڈ کے لیے فرشتوں کو بھی مقرر کر رکھا ہے۔ انسان کی نگرانی کرنے والے کراماً کاتبین اُس کے اعمال کا ذرہ ذرہ درج کر رہے ہیں۔ خود انسان کی روح اور نسمہ میں بھی اعمال کا اندراج ہوتا ہے، جب وقت آئے گا تو سب ظاہر ہو جائیں گے۔ یہ آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ زیادہ متفکر نہ ہوں، ان کی مخفی تدبیروں سے خوف نہ کھائیں اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے، وہ خود ہی ان کی تدابیر کو ناکام بنا دے گا۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٧٦﴾ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿٧٩﴾ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٨٠﴾ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨١﴾ وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾ ع ۱۶

ترجمہ :- بیشک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل پر اکثر وہ باتیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں (۷۶) اور بیشک یہ (قرآن) البتہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے (۷۷) بیشک تیرا پروردگار فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان اپنے حکم سے ۔ اور وہ غالب اور سب کچھ جاننے والا ہے (۷۸) پس آپ بھروسہ رکھیں اللہ پر ۔ بیشک آپ کھلے حق پر ہیں (۷۹) تحقیق آپ نہیں سُنا سکتے مردوں کو

اور نہیں سُنا سکتے بہروں کو پکار جب کہ وہ پشت پھیر کر جا رہے ہوں ﴿۸۰﴾ اور نہیں آپ راہ دکھلا سکتے اندھوں کو اُن کی گمراہی سے۔ آپ تو سناتے ہیں اُس کو جو یقین رکھتا ہے ہماری آیتوں پر، اور وہ فرمانبرداری کرنے والے ہیں ﴿۸۱﴾ اور جب واقع ہو جائیگی بات ان پر تو نکالیں گے ہم ان کے لیے جانور زمین سے کہ وہ کلام کرے گا ان سے۔ اس لیے کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے ﴿۸۲﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں قیامت کا ذکر تھا اور منکرین معاد کا رد کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور اُس کی قدرت تامہ کا ذکر تھا۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ تمام باتیں اُس کے علم میں ہیں اور وہ مجرمین کو ضرور سزا دیگا۔ نیز فرمایا کہ ارض و سماء کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہے بلکہ اللہ کے علم میں محفوظ ہے۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت اور پیغمبر کی نبوت و رسالت کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن کریم کی حقانیت

پہلے قرآن پاک کی حقانیت و صداقت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ بیشک یہ قرآن کریم بنی اسرائیل کی بہت سی وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی وہ برحق کتاب ہے۔ جو وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوئی اور یہ بنی اسرائیل کی طرف سے سابقہ کتب سماویہ میں کیے گئے تغیر و تبدل کا پردہ چاک کرتی ہے۔ ان لوگوں نے تورات اور دیگر صحائف میں عقیدے اور عصمت انبیاء سے متعلق بہت سی غلط باتیں شامل کر دی تھیں۔ مثلاً تخلیق آدم کے متعلق یہ لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد پچھتایا (العیاذ باللہ) یہ سخت کفریہ کلمہ ہے۔ تورات کے پہلے باب میں یہ بھی لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے

ارض وسما کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر ساتویں دن آرام کیا گویا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو بناتے بناتے تھک گیا تھا (العیاذ باللہ) مگر قرآن نے اس مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دیا کہ ہم نے ارض و سما اور ان کے درمیان چیزوں کو چھ دن کے وقفے میں پیدا کیا وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ (قٓ - ۳۸) مگر ہمیں کوئی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوئی۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام کی ابنیت اور الوہیت کا جو عقیدہ انہوں نے گھڑ رکھا ہے، قرآن نے اس کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ مثلاً اللہ نے فرمایا اِنۡ هُوَ اِلَّا عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَيۡهِ (الزخرف - ۵۹) یعنی مسیح علیہ السلام تو ہمارے بندے تھے جن پر ہم نے انعامات کیے، وہ خود الٰہ نہیں تھے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بچپن میں اعلان کر دیا۔ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ (مریم - ۳۰) میں تو اللہ کا بندہ ہوں (الٰہ نہیں) اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور نبی بنایا ہے۔ غرضیکہ قرآن پاک بنی اسرائیل کی غلط باتوں کی واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ اور بیشک یہ قرآن البتہ مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ اس کے ذریعے انسان کے عقیدے، احکام اور ہر چیز میں راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور پھر جب انسان اس ہدایت پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بن جاتا ہے۔

فرمایا بنی اسرائیل جن باتوں میں اختلاف اور جھگڑا کرتے ہیں اِنَّ رَبَّكَ يَقۡضِىۡ بَيۡنَهُمۡ بِحُكۡمِهٖ بیشک آپ کا پروردگار اپنے حکم سے ان کی باتوں میں فیصلہ کرے گا۔ بنی اسرائیل کے متنازعہ امور میں اللہ تعالیٰ نے علمی فیصلہ تو انبیاء بھیج کر اور قرآن نازل کر کے کر دیا ہے اور حق و باطل کو واضح کر دیا ہے۔ البتہ ان کے درمیان عملی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ یہ فیصلہ قیامت کے دن قطعی طور پر ہو جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ ان کو ان کے عقائد اور اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دے گا۔ فرمایا وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ وہ کمالِ قدرت کا مالک ہے۔ کافروں کی ساری سازشیں اور اہل کتاب کا تعصب عناد اس کے علم میں ہے۔

تسلی کا مضمون

دوسری طرف اللہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ آپ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ بیشک آپ کھلے حق پر ہیں۔ لہٰذا آپ اپنا کام جاری رکھیں اور ان نافرمانوں کی طرف سے دل برداشتہ نہ ہوں کہ یہ لوگ ایمان قبول کیوں نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى کہ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ اور نہ ہی آپ کسی بہرے کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جب کہ وہ پشت پھیر کر چلے ہوں۔

اس مقام پر کافروں کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بہروں سے مراد بھی وہ کفار و مشرکین ہیں جو حق بات کو سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے، تو جس طرح مُردے اور بہرے آدمی کو کوئی بات نہیں سُنائی جاسکتی اسی طرح ان کفار و مشرکین پر بھی توحید اور ایمان کی بات اثر انداز نہیں ہوتی۔ ان مکذبین کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور ان کے دل کے کان بہرہ ہیں، لہٰذا ان پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ان کے ظاہری کان موجود ہیں اور وہ آپ کی آواز سُنتے بھی ہیں مگر جو نصیحت آپ کرنا چاہتے ہیں وہ اُن پر کارگر نہیں ہوتی، گویا کہ وہ سُنتے ہی نہیں۔ لہٰذا اللہ نے فرمایا کہ آپ اِن کے متعلق زیادہ فکر مند نہ ہوں۔

سماع موتیٰ
(۱) حضور نبی کریم

سماعِ موتیٰ یعنی مُردوں کے سننے کا مسئلہ بحث طلب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے ہے اور دوسرا عام فوت شدگان سے۔ اول الذکر مسئلہ متفق علیہ ہے، جب کہ ثانی الذکر اختلافی ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص حضور علیہ السلام کی قبر مبارک پر جا کر قریب سے صلوٰۃ و سلام پڑھے تو اُسے آپ سُنتے ہیں یا نہیں؟ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ جو آدمی حضور علیہ السلام کی قبر پر جا کر درود و سلام عرض کرے آپ[1] اسے از خود سُنتے ہیں اور اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اس بارے میں صحیح حدیث بھی موجود ہے مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهٗ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ نَائِيًا

[1] مشکوٰۃ ص۸۷ (فیاض)

أُبْلِغْتُهُ یعنی جو شخص میری قبر کے قریب درود و سلام پڑھتا ہے میں اس کو بنفس نفیس سُنتا ہوں اور جو شخص دور سے مجھ پر درود پڑھے، وہ مجھے فرشتوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ اس روایت کے سارے راوی صحیح ہیں اور بڑے امام ابن قیمؒ، امام ابن کثیرؒ اور ملا علی قاریؒ نے بھی صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے بڑے بڑے محدث بھی اس کو صحیح روایت تسلیم کرتے ہیں۔ غیر مقلدین میں سے مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ جو شاہ اسحاقؒ کے شاگرد تھے مگر اہل حدیث مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اُن کے فتویٰ میں بھی اس حدیث سے اتفاق کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ اتفاقی ہے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے کے بعض مولویوں نے اس مسئلہ کو بھی اختلافی بنا لیا ہے۔

عام فوت شدگان

البتہ عام فوت شدگان کے سماع کا مسئلہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے اختلافی چلا آرہا ہے اور بقول مولانا گنگوہیؒ جن مسائل میں صحابہؓ کا اختلاف ہے آج ہم اُن کو طے نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہمیں محتاط راستہ ہی اختیار کرنا چاہیئے۔

اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ میں بھی دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سماع موتیٰ کے قائل نہیں ہیں جب کہ حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ مُردے سُنتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دونوں باتیں منقول ہیں حضرت ابُوہریرہؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے جس کو امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِیْهِ ...... لا جو مسلمان کسی مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا تو وہ اس کو قبر میں بھی پہچانتا ہے۔ اور جب آنے والا سلام کرتا ہے تو قبر والا اسکو سُنتا ہے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے اور اسی قسم کی روایت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔

بدر کے مقتول کفار کی لاشیں جب کنوئیں میں ڈال دی گئیں۔ تو حضور علیہ السلام نے اُس کنوئیں پر کھڑے ہو کر اُن جہنم واصلوں کو خطاب کیا تھا کہ اے فلاں! اور

اے فلاں! اللہ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا، ہم نے تو اس کو برحق پایا، تم بتلاؤ کہ اللہ نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اس کو تم نے بھی برحق پایا یا نہیں؟ اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضرت! آپ ان مُردوں سے کلام کرتے ہیں، تو آپ نے فرمایا مَآ اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُجِيْبُوْنَ یعنی یہ مردے تم سے زیادہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دے سکتے۔ حضرت عائشہؓ کے انکار سماع موتٰی سے متعلق حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ان کا موقف اس معاملہ میں یہ ہے کہ اللہ نے مقتولین بدر کو معجزے کے طور پر زندہ کیا تھا تاکہ وہ حضور علیہ السلام کی بات کو سُن سکیں اور انہیں مزید حسرت ہو، تاہم عام مُردے نہیں سنتے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس مسئلہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ میں مُردوں کو اپنی بات سُنا سکتا ہوں تو یہ تو نص قرآنی کے خلاف ہے۔ جہاں تک مُردوں میں بنفسہ سننے کی طاقت کا تعلق ہے تو امام بخاریؒ نے باب ہی یہ باندھا ہے اَلْمَيِّتُ يَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالٍ یعنی جب مردہ کو دفن کر کے واپس لوٹتے ہیں تو مردہ اُن کے پاؤں کی آہٹ کو سنتا ہے۔ مولانا نانوتویؒ نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے قبرستان جا کر جو دعائیں پڑھنے کی تعلیم دی ہے اُس میں مُردوں سے خطاب پایا جاتا ہے۔ جیسے یہ دُعا ہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اے مسلمانوں کی قوم تم پر سلامتی ہو اور ہم بھی ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں معاف فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ اگر مردے اس دُعا کو سُنتے نہیں تو پھر ان کو خطاب کر کے سلام کہنے کا کیا فائدہ اُن کے لیے خالی دُعا ہی کافی تھی، حضور علیہ السلام نے سلام کہنے کا حکم کیوں دیا؟ اس سے معلوم ہوا کہ مردے بنفس نفیس سلام کو سنتے ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بہت سی صحیح احادیث سے سماع موتیٰ کا ذکر ملتا ہے جن سے انکار ناانصافی ہوگی۔ البتہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی مولانا اشرف علی تھانویؒ اور امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ عدم سماع سے سماع نافع مراد ہے یعنی مردے سنتے تو ہیں مگر اُس سے فائدہ نہیں

لہ مسلم صفحہ ۳۸۷ ج ۲ و نسائی صفحہ ۲۹۱ ج ۱ (فیاض)

اٹھا سکتے۔ بیمطلق سماع مراد نہیں ہے ورنہ بہت سی صحیح احادیث کا انکار لازم آئیگا جو ناانصافی کی بات ہوگی۔

مولانا حسین علیؒ واں بھچراں والے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے علم حدیث کے شاگرد اور موسیٰ زئی والے خواجہ عثمانؒ کے مرید تھے۔ آپ اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ نے "تحریرات حدیث" کے نام سے علم حدیث کی شرح میں کتاب بھی لکھی ہے جس میں تحریر کیا ہے کہ جو لوگ قبروں کی زیارت کے لیے جاتے ہیں، مُردے اُن کے سلام و دُعا کو سُنتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جمعہ کا دن اور طلوع آفتاب سے قبل کا وقت زیادہ موزوں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "اقتضائے الصراط المستقیم" میں لکھا ہے کہ قرآن اور سلام کا سُننا مُردوں کے حق میں برحق ہے یعنی وہ یہ دونوں چیزیں سُنتے ہیں۔ غرضیکہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ مُردے سُنتے ہیں۔ البتہ احناف میں بھی بعض عدم سماع کے قائل ہیں۔

استعانت عن الموتٰی

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سماعِ موتٰی کو تسلیم کرنے والا آدمی کافر یا مشرک نہیں ہو جاتا جیسا کہ بعض لوگ اس قسم کا فتویٰ بھی دے دیتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی شخص سماع کے ساتھ یہ عقیدہ بھی رکھے کہ مُردے حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں تو ایسا شخص یقیناً مشرک ہوگا جو غیر اللہ سے استعانت کا قائل ہے سورۂ فاطر میں موجود ہے اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (آیت ۱۴) اگر تم اُن کو پکارو بھی تو وہ سنتے نہیں۔ اور اگر سُن بھی لیں تو وہ جواب نہیں دے سکتے۔ خود حضور علیہ السلام جن کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ وہ قریب سے سُنتے ہیں، اُن کے بارے میں بھی فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کے بعد آپ سے بھی صرف شفاعت کی درخواست کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین پر قائم رکھے اور ہمارا خاتمہ بالخیر ہو۔ امداد تو آپ سے بھی مانگنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ اولیاء اللہ یا دوسر

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِىَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِىْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَىْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

ترجمہ:۔ اور جس دن ہم اکٹھا کریں گے ہر امت میں سے ایک فوج اُن لوگوں میں سے جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو۔ پس وہ جدا جدا کیے جائیں گے ﴿۸۳﴾ یہاں تک کہ جب وہ آئیں گے تو فرمائے گا (اللہ تعالیٰ) کیا جھٹلایا تھا تم نے میری آیتوں کو اور تم نے نہیں احاطہ کیا تھا اُن کے ساتھ علم سے۔ بتلاؤ تم کیا عمل کرتے تھے ﴿۸۴﴾ اور پڑ جائے گی

کی نشانیوں کا ذکر ہے ، جن میں سورج کا مغرب سے طلوع ، دجال کا خروج ، مسیح علیہ السلام کا نزول ، زمین میں خسف کا واقع ہونا ، آگ کا نکلنا اور دابۃ الارض کا خروج شامل ہیں ۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب قسم کا جانور ہوگا ۔ جو لوگوں سے بات چیت کریگا ۔ اور واضح طور پر بتلائے گا ۔ کہ فلاں سچا مومن ہے اور فلاں منافق یا کافر ہے ۔

شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ قیامت سے پہلے مکے کا صفا پہاڑ پھٹے گا ۔ جس سے مذکورہ جانور برآمد ہوگا اور وہ لوگوں سے ٹھیک ٹھیک باتیں کریگا ۔ مگر اس نشانی کو دیکھ کر کسی کا ایمان لانا معتبر نہیں ہوگا ۔ ایمان کا فائدہ اُس وقت تک ہے ۔ جب تک یہ چیز ظاہر نہیں ہوتی ۔ بہرحال فرمایا کہ جب بات واقع ہو جائے گی تو ہم زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو اِن سے کلام کرے گا ۔ یہ اس وجہ سے اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں لاتے تھے مگر اب مجبور ہو کر ایمان لانا مفید نہیں ہوگا ۔

بات اُن پر اس وجہ سے کہ انہوں نے ظلم کیا ۔ پس وہ نہیں
گفتگو کر سکیں گے (۸۵) کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ بیشک ہم
نے بنایا ہے رات کو تاکہ یہ سکون پکڑیں اس میں ۔ اور
دن کو دیکھنے کے لیے ۔ بیشک اس میں نشانیاں ہیں اُن
لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (۸۶) اور جس دن پھونکا
جائے گا صور میں ۔ پس گھبرا جائے گا وہ جو آسمانوں میں
ہے اور جو زمین میں ہے ، مگر جس کے بارے میں اللہ
چاہے گا ۔ اور سب آئیں گے اُس کے پاس عاجز ہو کر (۸۷)
اور دیکھے گا تو پہاڑوں کو ، گمان کرے گا اُن کو جمے ہوئے
حالانکہ وہ چلیں گے مثل بادلوں کے چلنے کے ۔ یہ اللہ کی
کاریگری ہے جس نے مستحکم بنایا ہے ہر چیز کو ۔ بیشک
وہ ضرور خبر رکھتا ہے اُن کاموں کی جو تم کرتے ہو (۸۸)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات ، مسئلہ توحید اور جزائے عمل کا ذکر کیا گیا ہے
اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ عنادی اور ضدی لوگوں کے ایمان قبول
کرنے کی توقع نہ رکھیں ۔ یہ تو ان چیزوں پر اُس وقت ایمان لائیں گے ۔ جب
قربِ قیامت میں دابۃ الارض کا ظہور ہوگا ۔ اُس وقت منکرین مجبوراً ایمان لائیں گے
مگر ایسا ایمان کچھ مفید نہیں ہوگا اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کا ذکر
کیا ہے اور ساتھ ساتھ کفر و شرک کرنے والوں کا شکوہ کیا ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی میں
غور و فکر کر کے ایمان کو قبول نہیں کرتے ۔ دلائل توحید اور قیامت کی کیفیت کا بھی
اجمالاً ذکر کر دیا گیا ہے ۔

میدان حشر میں گروہ بندی

ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ
بِاٰيٰتِنَا اور جس دن ہم اکٹھا کریں گے ہر امت میں سے ایک فوج یعنی گروہ ان

اور اگلے دن کی مصروفیات کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے رات کی وضع ہی ایسی بنائی ہے کہ تمام انسان اور تمام دوسرے جاندار رات کے وقت سکون پکڑتے ہیں۔

فرمایا وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اور ہم نے دن کو دیکھنے والا بنایا۔ رات کی تاریکی کو ختم کر کے دن کی روشنی کا انتظام کیا تاکہ لوگ اس روشنی میں دیکھ کر اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں۔ جب وہ دن بھر کام کاج کر کے تھک جاتے ہیں تو پھر رات آ جاتی ہے اور یہ نظام اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ شب و روز کا یہ تغیر و تبدل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ اگر انسان صرف ایک اسی نشانی میں غور و فکر کرے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اتنے بڑے نظام کو چلانے والا فقط خدا تعالیٰ ہے۔ وہ نبیوں کی رسالت کو سمجھ سکتا ہے اور یہ بھی جان سکتا ہے۔ کہ نیند موت کی ساتھی ہے۔ جس طرح انسان ہر روز نیند سے بیدار ہوتا ہے، اسی طرح مرنے کے بعد قیامت والے دن پھر اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور اس طرح وہ بعث بعد الموت پر بھی ایمان لا سکتا ہے۔

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ اہلِ ایمان تو شب و روز کی ادلا بدلی سے ہی خدا تعالیٰ کی توحید کو سمجھ جاتے ہیں۔ اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور کفر و شرک سے باز رہتے ہیں

نیند سے پھر بیدار ہو جانا بعث بعد الموت کا ایک نمونہ ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے بعض دعائیں بھی سکھائی ہیں۔ انسان جب شب باشی کے لیے بستر پر جائے تو اسے یوں کہنا چاہیئے اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰ[1] اے اللہ! میں تیرے ہی نام پر مرتا ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوتا ہوں۔ پھر جب کوئی شخص سو کر اٹھتا ہے تو کہنا چاہیئے[2] اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے موت طاری کرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشی، اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر

۱ بخاری ص ۹۳۴ ج ۲ ۲ مسند احمد ص ۱۵۴ ج ۵ و بخاری ص ۱۱ ج ۲ (فیاض)

مکذبین سے عتاب

جب یہ گروہ بندی مکمل ہو جائیگی تو ہر جماعت کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائیگا حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡ بیان تک کہ جب جھٹلانے والوں کی جماعت اللہ کی بارگاہ میں آئیگی قَالَ اَکَذَّبۡتُمۡ بِاٰیٰتِیۡ تو اللہ تعالیٰ اُن سے سوال کریگا۔ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا؟ وَلَمۡ تُحِیۡطُوۡا بِہَا عِلۡمًا اور تم نے ان آیات کے علم کا احاطہ نہیں کیا تھا۔ تم نے میری آیتوں کو دیکھنے، سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کے بغیر اُن کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ تم نے نہ تو میرے بھیجے ہوئے انبیاء کی بات سنی نہ اُن کی لائی ہوئی شرائع میں غور و فکر کیا اور نہ آسمانی کتابوں کی طرف توجہ کی۔ بھلا بتلاؤ تو اَمَّا ذَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ تم دُنیا میں کیا کچھ کرتے رہے۔

اُس وقت اُن سے کچھ جواب نہیں بن آئیگا وَوَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡہِمۡ بِمَا ظَلَمُوۡا اور اُن پر بات واقع ہو جائیگی یعنی ان کا جرم ثابت ہو جائے گا اور ان کے ظلم کی وجہ سے اُن کی گرفت ہو جائے گی۔ انہوں نے زندگی بھر توحید کا انکار کیا۔ اللہ کے نبیوں اور کُتب سماویہ کی تکذیب کی، کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا ہے، قیامت اور جزائے اعمال کا مذاق اُڑایا۔ یہ سب ظلم تھا جس کی وجہ سے وہ پکڑے گئے فَہُمۡ لَا یَنۡطِقُوۡنَ لہٰذا آج وہ بول بھی نہیں سکیں گے یعنی عاید شدہ فردِ جرم پر کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے۔ بعض مواقع پر تو واقعی لب کشائی بھی ممکن نہ ہوگی اور بعض مواقع ایسے بھی آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بلوائے گا۔ وہ زبان سے بات کریں گے اور کبھی اللہ تعالیٰ اُن کی زبان کو بند کر کے اُن کے اعضاء و جوارح سے گواہی لیں گے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے والوں کا شکوہ کیا ہے کہ دیکھو! یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں دیکھ کر ان میں ذرا بھر بھی غور و فکر نہیں کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھ سکیں۔

شب و روز بطور دلیل

ارشاد ہوتا ہے اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِیَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو اس لیے بنایا ہے کہ یہ اُس میں آرام کر سکیں۔ دن بھر کام کاج کر کے جب لوگ تھک جاتے ہیں اور ان کی قوتیں تحلیل ہو جاتی ہیں تو رات آجاتی ہے جس کے دوران وہ آرام کر کے اپنی قوتیں بحال کرتے ہیں۔

جاتا ہے۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ایک قسم کی موت طاری کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا وَاَذِنَ لِیْ بِذِکْرِہٖ اور اپنا ذکر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ بعض آدمی نیند کی حالت میں ہی موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ جن کو دوبارہ لوٹنے اور ذکر الٰہی کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔

نفخِ صور

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ اور جس دن پھونکا جائے گا صور میں۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے سلسلے میں نفخ صور کئی مرتبہ ہوگا۔ پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو ساری مخلوق مر جائے گی۔ پھر دوسری مرتبہ پھونکا جائے گا تو جی اٹھے گی۔ پھر تیسری دفعہ صور پھونکنے پر لوگ گھبرا جائیں گے۔ چوتھی دفعہ پھر بیہوش ہو جائیں گے اور پانچویں دفعہ صور پھونکنے پر پھر ہوش میں آ جائیں گے۔ اس طرح گویا بار بار صور پھونکا جائیگا۔ تاہم جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ صور صرف دو دفعہ پھونکا جائیگا پہلا صور تمام چیزوں کو فنا کر دے گا۔ اسی صور پر ہر چیز پر گھبراہٹ اور بے ہوشی طاری ہو جائیگی حتیٰ کہ روحیں بھی بے ہوش ہو جائیں گی۔ اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائیگا۔ تو لوگ محاسبہ اعمال کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان دو صوروں کے درمیان کچھ وقفہ ہوگا۔

بعض کہتے ہیں کہ جب اسرافیل علیہ السلام صور پھونکے گا تو ملائکہ مقربین کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جائیں گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام پر خود موت طاری کرے گا۔ اور پھر صرف خدا تعالیٰ کی ذات باقی رہ جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کا اعلان ہوگا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (المؤمن - ۱۶) آج بادشاہی کس کی ہے۔ پھر خود ہی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج حکومت صرف ایک اللہ کی ہے جو قہار بھی ہے۔

نیرسیت کا عالم

فرمایا جس دن صور پھونکا جائے گا فَفَزِعَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ تو گھبرا اٹھیں گے وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ سوائے اس کے جسے اللہ چاہے یعنی اللہ تعالیٰ

اپنی مشیت کے مطابق جسے چاہے گا۔ اس گھبراہٹ سے مستثنیٰ کر دے گا اور اس پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، مذکورہ گھبراہٹ کے عالم میں میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عرش کا پایا پکڑ کر کھڑے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آچکے ہیں یا اُن پر بیہوشی طاری ہی نہیں ہوئی کیونکہ یہ بیہوشی اُن پر دُنیا میں طاری ہو چکی ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے دیدار کی درخواست کی تو اللہ نے فرمایا، تو نہیں دیکھ سکتا۔ پھر جب اللہ نے اپنی تجلی طور پر ڈالی وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا (الاعراف۔ ۱۴۳) تو موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کو بیہوشی سے مامون رکھیگا۔ بہر حال فرمایا کہ زمین و آسمان کی ہر چیز پر گھبراہٹ طاری ہوگی۔ سوائے اُس کے جسے اللہ چاہے وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ اور سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہو کر آئیں گے۔

مفسرین کرام اس مقام پر یہ اشکال پیدا کرتے ہیں کہ یہاں پر سب کا ذلت کے ساتھ آنے کا ذکر ہے جب کہ اللہ کے مقربین کا باعزت طور پر اللہ کے حضور پیش ہونے کا ذکر بھی آتا ہے۔ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (مریم۔ ۸۵) اُس دن ہم خاص متقین بندوں کو وفد کی صورت میں عزت و احترام کے ساتھ لائینگے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ذلت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ذلت تو معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے جس میں عام لوگ مبتلا ہوں گے اور ذلیل ہو کر خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور دوسری ذلت عبودیت کی ہوتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام اور دیگر مقربین کا خاصہ ہے۔ تو اللہ کے نیک بندے عبودیت کی ذلت کے ساتھ پیش ہوں گے۔

نظامِ کائنات کی تبدیلی

فرمایا جس دن صور پھونکا جائے گا وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ تو پہاڑوں پر نگاہ ڈالے گا تو انہیں جامد گمان کرے گا حالانکہ وہ بادلوں کی چال چلتے ہوں گے۔ جس طرح بادل فضا میں تیرتے ہوتے ہیں۔ اسی

طرح پہاڑ بھی تیرتے ہوں گے۔ اُن کی پختگی اور بوجھل پن ختم ہو جائے گا۔ اور وہ تنکوں کی طرح اُڑتے ہوں گے۔ سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (آیت - ۱۰۵) یہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں تو آپ اُن سے کہہ دیں کہ ہزاروں میل پر پھیلے ہوئے ان پہاڑوں کو میرا پروردگار ذرہ ذرہ کر دیگا اور گرد و غبار بنا کر اڑا دیگا۔ سورۃ القارعۃ میں فرمایا وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ (آیت - ۵) اُس دن پہاڑ دُھنی ہوئی اون کی طرح اُڑتے پھیریں گے۔ سورۃ الواقعہ میں بھی آتا ہے کہ جب قیامت واقع ہوگی وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ﴿٦﴾ تو پہاڑوں کو بکھیر دیا جائے گا اور وہ باریک ذرات کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ یہ اللہ تعالیٰ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ پر مضبوط اور مستحکم بنایا ہے۔ جب تک کائنات کا موجودہ نظام قائم ہے۔ یہ چیزیں اسی طرح قائم رہیں گی۔ پھر جب قیامت کا بگل بجے گا تو کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر قائم نہیں رہے گی۔ بلکہ سارا نظام ہی تبدیل کر دیا جائے گا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ سب ختم ہو جائیں گے اور ایک نیا نظام قائم ہوگا اور نئے احکام نافذ ہوں گے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اُس دن کی تیاری کریں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کریں، کفر و شرک اور معصیت سے کنارہ کش ہو جائیں۔ فرمایا یاد رکھو! إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ اللہ تعالیٰ باخبر ہے اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ وہ تمہاری نیکی اور بدی، طہارت اور نجاست، عقیدے کی پختگی اور بد اعتقادی، خوش عملی اور بدعملی ہر چیز سے واقف ہے اور پھر اسی کے مطابق سزا یا جزا کا فیصلہ کرے گا۔ یہ اُس دن واقع ہوگا جب صور پھونکا جائے گا۔ اور سب لوگوں کو میدانِ حشر میں اکٹھا کیا جائے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ ۗ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِىْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىْءٍ ۖ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ :۔ جو شخص نیکی لے کر آیا، پس اُس کے لیے اُس سے بہتر بدلہ ہو گا۔ اور وہ اُس دن کی گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے (۸۹) اور جو شخص برائی لے کر آیا، پس وہ اوندھے منہ ڈالے جائیں گے (دوزخ کی) آگ میں (اور اُن سے کہا جائے گا) کہ تم کو نہیں بدلہ دیا جاتا مگر وہ جو کچھ تم کرتے تھے (۹۰) بیشک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اِس شہر کے پروردگار کی جس نے اس شہر کو حرمت

والا بنایا ہے۔ اور اسی کے لیے ہے ہر چیز۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ہو جاؤں میں فرمانبرداروں میں سے (۹۱) (اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے) کہ میں پڑھ کر سناؤں قرآن پس جو شخص ہدایت پاتا ہے، پس وہ ہدایت پاتا ہے اپنے نفس (کے بھلے) کے لیے۔ اور جو گمراہ ہوتا ہے، پس آپ کہہ دیجئے، میں تو ڈر سنانے والوں میں ہوں (۹۲) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں عنقریب تم کو دکھائے گا وہ اپنی نشانیاں، پس تم ان کو پہچان لو گے۔ اور نہیں ہے تمہارا پروردگار غافل اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو (۹۳)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے کافروں اور مشرکوں کا رد کیا۔ پھر توحید کے دلائل بیان کئے۔ اللہ کی صفات کا ذکر ہوا، انسانوں کو نصیحت کی باتیں سمجھائی گئیں اور پھر جزائے عمل کی منزل کا ذکر ہوا۔ آج تو لوگ اکڑ دکھاتے ہیں اور انبیاء کی بات کو تسلیم نہیں کرتے مگر جس دن صور پھونکا جائے گا تو سب گھبرا جائیں گے سوائے اُن لوگوں کے جنہیں اللہ محفوظ رکھے گا۔ اس دن پہاڑ بادلوں کی طرح اڑیں گے اور پھر جزائے عمل کی منزل آئے گی۔

نیکی کا بدلہ

اب اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا جو شخص نیکی لے کر آیا اُس کے لیے اُس نیکی سے بہتر بدلہ ہوگا کیونکہ اللہ کے ہاں ہر نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (الانعام۔ ۱۶۱) اور خلوصِ نیت اور اعمال کے اعتبار سے اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ۔ ۲۶۱) اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے مزید بڑھا دیتا ہے کیونکہ وہ بڑی وسعت والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ تاہم شرط یہ ہے کہ نیکی ایسی ہو جو اللہ کے

ہاں مقبول ہو۔ اگر نیکی نامقبول ہے تو اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (الانبیاء۔ ۹۴) جس شخص نے کوئی نیک عمل کیا بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو اس کی محنت کی ناقدری نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی نیکی مقبول ہوگی۔ بہرحال مقبول نیکی کا کم از کم بدلہ دس گنا ہے۔ البتہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ کے دین کی اقامت اور اشاعت کے لیے جہاد کرتا ہے۔ وہ اگر خدا کی راہ میں ایک درہم خرچ کرتا ہے تو اس کا بدلہ سات سو درہم یا اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ تاہم عام نیکی کا بدلہ دس گنا ہے۔ اور اگر کوئی برائی کرتا ہے تو اس کا بدلہ ایک سے زیادہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (الانعام۔ ۱۶۰) یعنی جو کوئی برائی لے کر آئیگا تو اس کا بدلہ اس برائی کے برابر ہوگا۔

البتہ نیکی کے بدلے کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ نہ تو اس میں کمی ہوگی اور نہ وہ ختم ہوگا۔ بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا۔ انسان کا عمل تو بہرحال ایک محدود وقت میں انجام پاتا ہے مگر اس کا اجر ہمیشہ ملتا رہے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا قبل از نماز فجر دو سنتیں دنیا و فیہا سے بہتر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں تو کبھی نہ کبھی ختم ہونے والی ہیں۔ مگر ان دو سنتوں کا اجر ہمیشہ ملتا رہے گا۔ اسی بنا پر فرائض سے پہلے فجر کی دو سنتوں کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ان کو بروقت ادا کرنا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام دوران سفر بھی ان سنتوں کا اہتمام کرتے تھے۔

بہتر بدلہ

فرمایا جو شخص نیکی یا بھلائی لے کر آیا اس کے لیے اس نیکی سے بہتر بدلہ ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہتر بدلہ کیا ہے اور کیسے ہے؟ نیکی سے بعض مفسرین کلمہ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مراد لیتے ہیں اور بعض اسے مطلق اطاعت پر محمول کرتے ہیں لہٰذا نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، خیرات اور دیگر عبادات نیکی میں شمار ہوتی ہیں اور جو بدلہ ان کا ملے گا وہ جنت کی آسائشیں ہوں گی، جن میں عمدہ کھانے، فروٹ، شہد،

دودھ، شرابِ طہور، پہننے کے لیے ریشم و کمخواب کا عمدہ لباس، رہنے کے لیے بہترین کوٹھیاں اور بالاخانے، پاکیزہ بیویاں، حوریں، اور غلمان وغیرہ شامل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان اور اطاعت کی نسبت یہ چیزیں کیسے بہتر ہو سکتی ہیں کیونکہ ایمان اور اطاعت تو ان مادی چیزوں سے بلند ہیں۔ اس کے جواب میں مفسرِ قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ نیکی اور اطاعت بندے کا فعل ہے جب کہ انعامات دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ تو بدلے میں یہ انعامات بایں اعتبار بہتر ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو کہ بندے کے فعل کے مقابلہ میں ہر صورت بہتر ہے۔

دہشت سے امان

فرمایا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ اور یہ نیکی والے لوگ قیامت والے دن گھبراہٹ سے مامون ہوں گے۔ یعنی اس دن انہیں کوئی دہشت نہیں ہوگی اور یہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں گے۔ گذشتہ درس میں بھی گزر چکا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان میں رہنے والے سب گھبرا جائیں مگر وہ بچ جائیں گے جنہیں اللہ چاہے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب یا تکلیف کی گھبراہٹ اہل ایمان پر نہیں ہوگی۔ البتہ قیامت کے دن کی گھبراہٹ بہرحال سب پر ہوگی۔ احادیث میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دہشت سے بھی محفوظ رکھیگا جیسے فرمایا لَيْسَ عَلٰى اَهْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْشَةٌ یعنی کلمہ توحید پر ایمان رکھنے والوں پر کوئی دہشت نہیں ہوگی۔ جب وہ قبروں سے نکلیں گے تو انہیں کسی حد تک سکون حاصل ہوگا۔ اگرچہ قیامت کی دہشت عام ہوگی۔

برائی کا بدلہ

فرمایا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ اور جو شخص برائی لے کر آیا یعنی جن کے نامہ اعمال میں برائیاں ہی برائیاں ہوں گی فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ اُن کو اوندھے منہ دوزخ کی آگ میں گرا دیا جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا حضور! ہم اپنی زبانوں سے بھی بعض ایسی باتیں کر جاتے ہیں، کیا ان پر بھی ہم سے مؤاخذہ ہوگا؟ حضور علیہ السلام

نے فرمایا هَلْ يَكُبُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ گرانے والی ان کے منہ سے کاٹی ہوئی باتیں ہی تو ہوتی ہیں۔ لوگ اکثر زبان درازی کرتے ہیں اور زبان کو جائز ناجائز چلاتے رہتے ہیں جو ان کے لیے جہنم کا باعث بن جاتی ہیں۔

فرمایا اِن لوگوں سے کہا جائیگا هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کیا تمھیں تمھارے اعمال ہی کا بدلہ نہیں دیا جاتا، تم پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی، بلکہ جو کچھ دنیا میں کر کے آئے ہو آج اُسی کا بھگتان کرو۔ یہ تو عام مقولہ ہے "جو کرتا ہے وہ بھرتا ہے"۔

رب کعبہ کی عبادت

اس کے بعد پیغمبر علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ یہ اعلان فرما دیں اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا کہ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جس نے اس کو عزت و حرمت والا بنایا ہے۔ اس شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محترم بنایا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران-۹۶) یہ وہ شہر مکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانے کے لیے سب سے پہلا گھر تعمیر کیا گیا۔ یہ بڑا بابرکت مقام ہے اور جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت ہے۔ دراصل شہر کی آبادی تو بعد میں ہوئی۔ البتہ یہ محترم گھر پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔ یہ گھر یعنی عبادت خانہ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔ پھر حوادثاتِ زمانہ کی وجہ سے اس کی عمارت گر گئی

مگر اللہ کے نبی وہاں آکر طواف اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے کرائی۔ اُس وقت بھی وہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ آپ نے حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو وہاں ٹھہرایا، تو آہستہ آہستہ شہر مکہ آباد ہو گیا۔ حرم کی حدود شہر مکہ سے کئی کئی میل باہر ہیں جس کے خاص احکام ہیں۔ اِن حدود کے اندر نہ تو خود رو گھاس کاٹی جا سکتی ہے نہ درخت

بکاٹے جا سکتے ہیں، نہ شکار کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ لڑائی جھگڑا روا ہے کیونکہ یہ حرمت والا خطہ ہے۔

اس گھر کے مالک نے ہی قریش خاندان کو پورے عرب میں عزت بخشی۔ قریش اپنے آپ کو خاندانی طور پر بڑا سمجھتے تھے۔ یعنی ان میں قومیت کی خرابی پیدا ہو گئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی یہی حکم دیا فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (سورۃ قریش - ۳) کہ تم بھی اسی گھر کے رب کی عبادت کرو۔ اور کفر، شرک اور معصیت سے بچ جاؤ۔

شہر مکہ کی عظمت

شہر مکہ محبانِ الٰہی کی بستی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس امن والے شہر کی قسم کھائی ہے وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (التین - ۳) اللہ نے اس شہر میں بڑی کشش رکھی ہے۔ فتح مکہ کے دن حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ کہ یہ شہر ہمیشہ کے لیے مرکزِ اسلام رہیگا۔ اب کسی غیر مسلم کو اس پر تسلط حاصل نہیں ہوگا جب تک اس شہر میں واقع بیت اللہ شریف موجود ہے۔ دنیا قائم ہے۔ قربِ قیامت میں حبشہ کا پست قد اور موٹی پنڈلیوں والا شخص اس کو گرا دیگا۔ اس کے بعد جلدی ہی قیامت برپا ہو جائے گی۔ اللہ نے اس خطہ میں وہ خیر و برکات رکھی ہیں جو کسی دوسرے خطے میں نہیں ہیں۔

فرمایا، مجھے اس شہر کے پروردگار کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ہر چیز اُسی پروردگار کی ملک ہے۔ ہر چیز کا خالق، مالک اور متصرف وہی ہے۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اور مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اُس کے فرمانبرداروں میں ہو جاؤں۔ اپنے آپ کو مکمل اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دوں کیونکہ اسلام کا معنی ہی اطاعت اور فرمانبرداری ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ میں احکامِ الٰہی کی ظاہراً و باطناً تعمیل کرنے والا بن جاؤں۔

تلاوت قرآن کا حکم

فرمایا، اس کے علاوہ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ کہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کروں یعنی لوگوں کو پڑھ کر سناؤں۔ تلاوتِ قرآن

ے بخاری ص ۲۱۶، ۲۱۷ / ۱۲ (فیاض)

دو مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ تلاوت سے اجر و ثواب حاصل کیا جائے جس شخص کا ایمان اور عقیدہ درست ہے اُسے ایک ایک حرف کی تلاوت پر دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور اس تلاوت کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس کو سمجھا جائے اس کے مطابق عقیدہ اور ایمان بنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ یہ دوسرا مقصد پہلے پر فوقیت رکھتا ہے۔ بہر حال فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناؤں تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو ایمان کی دعوت پہنچے۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ یہ قرآن میری طرف اس لیے وحی کیا گیا ہے لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ (آیت-۱۹) تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور اُن لوگوں کو ڈراؤں جن تک یہ پہنچے۔ میں سب کو خبردار کر دوں کہ قرآن کی دعوت قبول کر کے عذاب الٰہی سے بچ جاؤ، کفر، شرک، اور معصیت سے باز آجاؤ، خدا تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کا راستہ اختیار کر لو۔ قرآن کی تلاوت کا یہ مقصد ہے۔

ہدایت اور گمراہی

قرآن سنانے کے بعد باقی رہا ہدایت کا مسئلہ تو یہ ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ ہدایت قبول کرتا ہے یا نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ جو کوئی ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نفس کے لیے کرتا ہے۔ ہدایت کا فائدہ خود اُسی کی ذات کو ہوگا۔ تمہارے ہدایت قبول کرنے سے اللہ تعالیٰ کو تو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ تمہارا ہی فائدہ ہے کہ خدا کے کامل بندے بن کر اس کے انعامات کے مستحق بن جاؤ گے۔

وَمَنۡ ضَلَّ اور جو شخص گمراہ رہا۔ اُس نے ایمان اور توحید کو قبول نہ کیا۔ بلکہ کفر اور شرک میں ہی مبتلا رہا، معصیت کا ارتکاب کرتا رہا۔ تو یہ اُس کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اللہ نے فرمایا فَقُلۡ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ میں تو ڈر سنانے والوں میں سے ہوں۔ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے، اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہاری ذمہ داری ہے اگر ہدایت کو قبول نہیں کرو گے تو تمہاری گمراہی تم پر پڑے گی اور اس کا نقصان خود تم ہی کو ہوگا۔

اللہ کی حمد و ثنا

سورۃ کی ابتدا بھی قرآنِ کریم کی حقانیت سے ہوئی تھی اور اس کے آخر میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اور اب آخری آیت میں فرمایا وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ آپ کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے نبوت عطا فرمائی شریعت اور احکامِ دین عطا فرمائے، تمام ظاہری اور باطنی انعامات سے نوازا۔ جس نے قرآن جیسی عظیم کتاب عطا کی، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وہ عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دیگا۔ فَتَعْرِفُوْنَهَا پھر تم ان کو پہچان بھی لوگے۔ نبی آخر الزمان کی بعثت اور شق القمر کی نشانیاں تو تم نے دیکھ لیں اب عنقریب مسیح علیہ السلام کا نزول اور دجال کا خروج بھی دیکھ لوگے۔ لہٰذا اب بھی وقت ہے ایمان لے آؤ۔ اور اگر اپنی ضد پر اڑے رہوگے وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ تو اللہ تعالیٰ تمہاری کارکردگی سے غافل نہیں ہے تمہارا ہر عمل اس کی نگاہ میں ہے اور اسی کے مطابق تمہیں بدلہ دیگا۔

سُوْرَۃ

القصص

مُکمل

درس اوّل ۱ آیت ۱ تا ۶

سُورَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانٌ وَثَمَانُونَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سُورۃ القصص مکی ہے اس کی اٹھاسی آیات اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾

ترجمہ:۔ طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ یہ آیتیں ہیں کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی ﴿۲﴾ ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو حال موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا حق کے ساتھ اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۳﴾ بیشک فرعون چڑھ گیا تھا زمین میں اور اُس نے کر دیا تھا۔ زمین کے رہنے والوں کو مختلف

گروہوں میں۔ کمزور رکھتا تھا ایک گروہ کو ان میں سے۔ ذبح کرتا تھا اُن کے بیٹوں کو، اور زندہ رہنے دیتا تھا اُن کی عورتوں کو۔ بیشک تھا وہ فسادیوں میں سے ④ اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں اُن لوگوں پر جن کو کمزور خیال کیا جاتا ہے زمین میں، اور بنا دیں ہم اُن کو پیشوا، اور بنا دیں ہم اُن کو وارث ⑤ اور پختہ کر دیں ہم اُن کو زمین میں، اور دکھائیں ہم فرعون اور ہامان کو اور اُن کے لشکروں کو اُن (کمزوروں کے ہاتھوں) سے وہ چیز جس سے وہ ڈرتے ہیں ⑥

نام اور زمانہ

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ القصص ہے۔ قصص قصہ کی جمع ہے جس کا معنیٰ واقعہ یا کہانی ہوتا ہے۔ چونکہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام قارون اور بعض دیگر اقوام کے واقعات مذکور ہیں۔ اس لیے اس کا نام سورۃ القصص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی واقعات کی نسبت سے اس سورۃ کا دوسرا نام سورۃ موسیٰ بھی بیان کیا جاتا ہے تاہم زیادہ مشہور نام سورۃ القصص ہی ہے۔

گذشتہ سورۃ الشعراء اور سورۃ النمل کی طرح یہ سورۃ بھی مکی زندگی کے آخری حصے میں نازل ہوئی۔ اس کی بعض آیات دورانِ ہجرت جحفہ کے مقام پر نازل ہوئیں۔ جن میں آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت سے پہلے مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی۔

اس سورۃ مبارکہ کی اٹھاسی ۸۸ آیات اور نو ۹ رکوع ہیں اور یہ ۱۴۵۲ کلمات اور ۵۸۰۱ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات مختلف سورتوں میں مختلف پہلوؤں سے بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ کہف میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے سفر کا واقعہ بیان ہوا تھا۔ پھر سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برگزیدگی کا خاص طور پر

ذکر فرمایا ہے کہ میں نے تم کو پسند کر لیا ہے اور رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔
آگے سورۃ الشعراء میں موسیٰ علیہ السلام کا تبلیغی پہلو نمایاں ہے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام کس طرح فرعون اور قومِ فرعون کو پہنچایا۔ اور اب اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر پیدائش سے لے کر بچپن کے حالات اور آپ کی تربیت کا ذکر ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی بنیادی عقائد کا ذکر ہے توحید کے عقلی، نقلی اور مشاہداتی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ رسالت کا ذکر بھی آگیا ہے اور خاص طور پر معاد کا تذکرہ ہے۔ مکی زندگی کا آخری زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑے مصائب و آلام کا زمانہ تھا، ہجرت کا حکم نازل ہونے والا تھا، مسلمان قریشِ مکہ کے مظالم کا شکار رہتے ہوئے تھے تو ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان کر کے اہلِ ایمان کو تسلی دی ہے کہ آپ دل برداشتہ نہ ہو۔ یہ تکالیف صرف آپ ہی کو نہیں پہنچیں بلکہ آپ سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکار بھی اسی قسم کے مصائب کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ اس سورۃ میں حضور علیہ السلام کی کامیابی اور روشن مستقبل کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے جس طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے متکبر، مغرور اور ڈکٹیٹر دشمن کو ذلیل و خوار کیا اسی طرح آپ کے دشمن بھی ناکام ہوں گے اور کامیابی آپ ہی کے حصے میں آئے گی۔

حروفِ مقطعات

اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء بھی حروفِ مقطعات طٰسٓمٓ[۲] سے ہوئی ہے۔ بعض[۱] فرماتے ہیں کہ یہ حروف اس سورۃ کا نام ہے اور بعض[۲] فرماتے ہیں کہ ان میں سے ہر حرف کا اشارہ خدا تعالیٰ کے کسی اسم پاک کی طرف ہے، جیسے ط سے طبیب، س سے سمیع اور م سے مجید۔ بعض دوسرے[۳] مفسرین فرماتے ہیں کہ ط سے مراد طہارت ہے جس میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کی طہارت آتی ہے۔ باطنی طور پر نفس اور قلب کی طہارت ہے کہ انسان کا عقیدہ، عمل اور اخلاق پاک ہو اور ظاہری طہارت میں جسم، لباس اور خوراک کی طہارت مطلوب ہے۔ طہارت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے اسی لیے اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ[۴] کہا گیا ہے یعنی طہارت نصف ایمان ہے۔

۱؎ مظہری صفحہ ۵۴ ۲؎ مظہری صفحہ ۵۴ ۳؎ روح البیان صفحہ ۳۸۰ ۴؎ صفحہ ۱۱۸ مسلم (فیاض)

بعض مفسرینؒ کرام فرماتے ہیں کہ حٰس سے مراد وہ اسرارِ الٰہی ہیں جن کا تعلق بندوں کو مکلف بنانے سے ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ م کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی منت اور اس سے احسان کی طرف ہے۔ منت عربی زبان میں احسان ہی کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بالعموم اور اہل ایمان پر بالخصوص بے شمار احسانات فرمائے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ دہلوی کشفی طور پر تبلاتے ہیں کہ ان حروف کا اشارہ انبیاء علیہم السلام کی حرکت فوقانی کی طرف ہے گویا یہ انبیاء علیہم السلام کے عالمِ بالا کی طرف اُن کے مراتب و منازل ہے۔ اس تخلیط زدہ جہان میں پاک ہدایت کے تعین کا بیان ہے۔ البتہ امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ان حروف کے متعلق بہتر طریقہ یہ ہے اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ یعنی ان حروف سے حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور جو بھی اس کی مراد ہے، ہمارا اُس پر ایمان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔

توضیح البیان

ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ آیات کی توضیح و تشریح کبھی تو خود اللہ کے کلام میں ہوتی ہے کسی ایک جگہ اجمال ہے تو دوسری جگہ تفصیل مل جاتی ہے۔ اور کبھی اُن کی وضاحت نبی کی زبان سے ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی معاملہ پھر بھی واضح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے معاملات کی وضاحت امت کے اہل علم کے ذریعے کرا دیتا ہے۔ امت میں سے قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان کی وضاحت قابل قبول ہوتی ہے۔ اُن کے بعد تابعین عظام ہیں اور پھر آئمہ مجتہدین ہیں جو استنباط کے ذریعے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیات ہیں جن کے ذریعے حق واضح ہو جاتا ہے اور کوئی چیز حل طلب نہیں رہتی۔

فرعون کے مظالم

آگے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی حق پرستی اور فرعون کے مظالم کی داستان بیان کی ہے تاکہ حضور نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ جان لیں کہ دنیا میں حق و باطل کا ہمیشہ سے ٹکراؤ رہا ہے اور ہمیشہ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہوا ہے۔ جابر و ظالم لوگ ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ

---

۱ روح البیان صفحہ ۳۹ ۲ الفوز الکبیر صفحہ ۱۱ ۳ جلالین صفحہ ۳۱ (فیاض)

مُوسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ ہم آپ کو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا حال ٹھیک ٹھیک بتلاتے ہیں۔ اور ان واقعات سے عبرت وہ لوگ حاصل کریں گے۔ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ جو اللہ، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، اس کے ملائکہ اور معاد پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جان لیں گے تمام تر مصائب و آلام کے باوجود آخری فتح انہی کی ہوگی۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ بیشک فرعون چڑھ گیا تھا زمین میں یعنی وہ غرور و تکبر کی وجہ سے اللہ کی زمین پر خود خدا بن بیٹھا تھا وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا اور اس نے اہل زمین یعنی اپنی رعایا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے اپنی قبطی قوم کو تو ہر طرح کی مراعات دے رکھی تھیں مگر دوسری قوم کے متعلق فرمایا يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ کہ اس گروہ کو کمزور بنا رکھا تھا اُن پر ظلم و ستم ڈھاتا تھا۔ ان سے بیگار لی جاتی اور نہایت ہی اہانت آمیز سلوک کیا جاتا۔ اس کے ظلم و ستم کا ایک نمونہ یہ تھا يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ کہ وہ اسرائیلوں کے بچوں کو ذبح کر ڈالتا تھا۔ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اور اُن کی بچیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا تاکہ انہیں لونڈیاں بنا کر اُن سے خدمت لی جا سکے۔

مفسرین[۱] کرام بچوں کے قتل کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک آگ شام و فلسطین کی طرف سے آئی ہے جو مصریوں کے گھروں کو جلا رہی ہے۔ اس نے کاہنوں اور ساحروں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے ملک کے زوال کا باعث وہ بچہ ہوگا جس کا تعلق شام و فلسطین سے ہوگا ظاہر ہے کہ شام و فلسطین سے تعلق اسرائیلیوں کا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں وارد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت وہ گنتی کے افراد تھے مگر اب ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اپنی سلطنت کو زوال سے بچانے کے لیے فرعون نے یہ تدبیر اختیار کی کہ اسرائیلی گھر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو اس کے والدین کے سامنے ذبح کروا ڈالتا۔ مفسرین[۲] بیان کرتے ہیں کہ اس طرح فرعون نے کم و بیش نوّے ہزار نوزائیدہ بچے قتل کروائے جو کہ پورے

---

۱ طبری ج ۲۰ ص ۲۷ و در منثور ج ۵ ص ۱۱۹ و روح المعانی ج ۲۰ ص ۴۳ ۲ کبیر ج ۲۴ ص ۲۲۵ (ریاض)

انسانیت کے لیے بہت بڑا ظلم تھا۔ فرمایا اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ بے شک وہ فرعون فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ فساد کا معنی خرابی ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ فرعون ظلم و ستم کرنے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتا تھا اور وہ کمزور طبقے کو ظلم کا تختۂ مشق بنائے رکھتا تھا۔

طبقاتی کشمکش

اس آیت کریمہ میں اللہ نے دو طبقات کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک مراعات یافتہ اور دوسرا بے کس و مظلوم تھا۔ یہ طبقاتی کشمکش آج بھی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ ایک طبقے کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور دوسرے کو اس کے حق سے بھی محروم کر دینا فرعونی پالیسی کا حصہ ہے۔ جب انگریز برصغیر پر قابض ہو گیا تو اس نے بھی لوگوں کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ اپنے وفاداروں کو عزت و احترام سے رکھتا تھا۔ ان کو بڑے بڑے خطابات، عہدے اور انعام و اکرام دیے جاتے جبکہ وفاداری میں مشکوک لوگوں کو ان کے حق سے محروم کر کے انہیں کمزور تر کر دیا تاکہ وہ کسی وقت بھی ان کی سلطنت کے لیے خطرے کا باعث نہ بن سکیں۔ کسانوں اور مزدوروں کو غریب سے غریب تر کر دیا۔ جب کہ آسودہ حال مگر حکومت کے وفاداروں کو مزید جاگیریں دے کر کمزور طبقے پر حاوی کر دیا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی یہ پالیسی پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

کمزور طبقے پر احسان

فرعون کی پالیسی تو یہ تھی کہ اسرائیلیوں کو کمزور سے کمزور تر بنا دیا جائے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم احسان کریں ان لوگوں پر جن کو زمین میں کمزور خیال کیا جاتا تھا۔ اللہ کی منشا یہ تھی کہ وہ اسرائیلیوں کو ذلت کی زندگی سے نکال کر عزت کی کرسی پر بٹھائے۔ فرمایا ہمارا پروگرام یہ بھی تھا وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ کہ ہم ان کمزوروں کو غلامی سے نکال کر سردار بنا دیں اور پھر انہیں زمین میں وارث بنا دیں یعنی سلطنت بھی انہی کو عطا کر دیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے اسرائیلیوں کو پہلے شام و فلسطین کا وارث بنایا اور پھر

مصر کی سلطنت بھی عطا کی۔ اللہ نے اُن کمزوروں کو بلندی تو عطا کی مگر بڑی آزمائشوں سے بعد۔ سورۃ اعراف اور سورۃ یونس میں اللہ نے اِن آزمائشوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے کہ فرعون کے ظلم وجور سے تنگ آئے ہوئے اسرائیلیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ آپ کی مدین سے واپسی سے قبل بھی ہم ظلم وستم کا شکار ہوتے رہے ہیں اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہماری تکالیف میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ آپ نے اُن کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا پروردگار عنقریب تمہارے دشمن کو ہلاک کر کے زمین کی خلافت تمہارے سپرد کرے گا۔ لہٰذا فی الحال تم اللہ کی استعانت چاہو اور صبر سے کام لو۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۚ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف - ۱۲۸) زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ اور بہتر انجام متقیوں کا ہی ہوگا۔

اللہ نے فرمایا ہمارا منشا یہ تھا وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ کہ ہم ان کمزوروں کو ہی زمین میں پختہ کر دیں۔ مغروروں کو ہٹا کر ایمان والوں کے قدم جما دیں اور انہیں شام و فلسطین اور مصر کی سلطنت عطا کر دیں۔ اللہ نے عام ایمانداروں سے بھی یہی وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا۔ جیسے پہلے لوگوں کو عطا کی۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (نور - ۵۵) اور جس دین کو اُن کے لیے پسند فرمایا ہے اُس دین کو ان کے لیے مستحکم کر دیگا۔ وہی کامیاب ہوں گے۔

استحکام کے لیے تعمیر کی ضرورت

کسی مشن کو استحکام اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب قوم کا ہر ہر فرد، ہر شہر اور ہر بستی کا ایک ایک باشندہ اُس مشن سے واقف ہو۔ اگر کسی مشن کا بعض کو پتہ ہو اور بعض کو علم ہی نہ ہو تو اِس میں استحکام اور پختگی کیسے آئے گی؟ اسلام بھی دنیا میں اسی لیے پختہ نہیں ہے کہ صرف دو فیصدی لوگ اس سے واقف ہیں۔ باقیوں کو اسلام کے متعلق علم ہی نہیں۔ جب تک اسلام کا پیغام سو فیصدی لوگوں

تک نہیں پہنچتی، اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور اس کام کے لیے وسیع پیمانے پر تشہیر کی ضرورت ہے۔ آج دنیا میں دیکھ لیں عریانی، فحاشی، اور کھیل تماشے کی تشہیر ہو رہی ہے۔ ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات، رسائل سب اسی کام میں لگے ہوئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ دُنیا کے گوشے گوشے میں انہی چیزوں کو استحکام حاصل ہو رہا ہے۔ فلموں اور ڈراموں کی تشہیر ہو رہی ہے۔ تو بچے بچے کی زبان پہ وہی ڈائیلاگ ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ کھاد اور بیج کی بھی بڑی تشہیر کر رہے ہیں، لہٰذا زمینداروں کی غالب اکثریت اسی طرف متوجہ ہو چکی ہے اسی طرح اگر دینِ اسلام کا استحکام منظور ہے تو اس کی نشر و اشاعت کے لیے پورے ذرائع ابلاغ کو کام میں لانا ہو گا۔ تاکہ یہ پیغام ایک ایک فرد تک بار بار پہنچے اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو سکے۔ جب برائی کی تشہیر سے بُرائی پھیل سکتی ہے تو پھر نیکی کی تشہیر سے نیکی کیوں عام نہیں ہو سکتی۔ کار پردازانِ ملک و ملت کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے

فرعون اور ہامان کی سرزنش

اللہ نے فرمایا کہ ہم کمزوروں کے قدم زمین میں مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَجُنُوْدَھُمَا مِنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ فرعون، ہامان اور اُن کے لشکروں کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے، ظاہر ہے کہ فرعونیوں کو اپنی سلطنت کے زوال کا خطرہ تھا اور اسی سے بچنے کے لیے انہوں نے نوّے ہزار نوزائیدہ بچے قتل کروا دیے، مگر اللہ نے فرمایا کہ جس چیز سے وہ ڈرتے تھے ہم وہی کچھ کر کے دکھائیں گے یعنی اُن کی سلطنت کو زوال آکر رہیگا، اور یہ کام بھی اس قوم کے ایک فرد کے ذریعے جس کو انہوں نے غلام بنا رکھا تھا اور اُن پہ طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے۔ اللہ نے اسی قوم کے ایک فرد کی خود فرعون کے گھر میں پرورش کرائی اور پھر اُسی کے ذریعے فرعون کی سلطنت کو ختم کیا۔ یہاں پر فرعون کے ساتھ ہامان کا بھی ذکر ہے جو کہ اس کا وزیر تھا۔ ہامان کا ذکر پہلی دفعہ آرہا ہے البتہ اگلی سورتوں میں بھی آئے گا۔ اس کے علاوہ قارون

کا ذکر بھی آسے گا جو سرمایہ داروں کا پیشوا تھا۔ بہرحال اللہ نے ان تمام طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں دینِ حق کی کامیابی کی پیشین گوئی فرمادی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۗ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۗ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۗ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰

ترجمہ:- اور وحی بھیجی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف کہ اس (بچے) کو دودھ پلاتی رہو۔ پھر جب تم خوف کھاؤ اس پر تو ڈال دو اس کو دریا میں، اور نہ خوف کھاؤ اور نہ غمگین ہو۔ بیشک ہم لوٹا دیں گے اس کو تمہاری طرف، اور بنانے والے ہیں ہم اس کو رسولوں میں سے ⑦ پس اٹھایا اُس (بچے) کو فرعون کے گھر والوں نے تاکہ ہو جائے وہ اُن کے لیے دشمن اور غم کا باعث۔ بیشک فرعون، ہامان اور اُن دونوں کے لشکر خطاکار

تھے ⑧ اور کہا فرعون کی بیوی نے کہ یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے اور تیرے لیے۔ اُسے مت قتل کرو۔ شاید کہ یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور وہ کچھ خبر نہیں رکھتے تھے ⑨ اور ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خالی (بے قرار) قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دیتی اُس کو اگر ہم نہ باندھتے اُس کے دل کو، تاکہ ہو وہ ایمان والوں میں سے ⑩

ربطِ آیات

اس سورۃ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں قرآنِ پاک کی حقانیت و صداقت کے ذکر کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا۔ امام احمدؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت معدی کربؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے عرض کیا کہ مجھے سورۃ طٰسٓمٓ سناؤ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سورۃ اُس شخص سے سنو جس نے اسے براہِ راست حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سُن کر یاد کیا ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت خباب بن ارتؓ کا پتہ بتایا۔ جب وہاں پہنچے تو انہوں نے یہ ساری سورۃ سنادی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے طٰسٓمٓ سورتیں حضور علیہ السلام کے دہن مبارک سے سُن کر سیکھی تھیں مگر اس سورۃ سے متعلق انہوں نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ درحقیقت اس سورۃ میں اہلِ ایمان کے لیے تسلی کا مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے ظلم وستم میں پسے ہوئے بنی اسرائیل کو کس طرح نجات دی اور فرعون اور اس کے حواریوں کو غرق کیا۔

سورۃ کی ابتدائی آیات میں فرعون کی پالیسی کا اجمالاً ذکر تھا کہ وہ بڑا مغرور اور سرکش تھا۔ اس نے عوام کو مختلف طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بعض کی عزت افزائی کرتا تھا، اور بعض کو ذلیل وخوار کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ تھا کہ کمزوروں اور بے کسوں کو قعرِ مذلت سے نکال کر اُن کو پیشوائی عطا کی جائے، اور فرعون اور اُس کے حواری ہامان وغیرہ کو وہی چیز دکھائے جس سے وہ ڈرتے تھے۔ وہ اسی چیز سے خوف کھاتے تھے کہ ان کی سلطنت ضائع نہ ہو جائے مگر اللہ نے اُن کی جڑ بنیاد ہی سے اکھاڑ کر رکھ دی۔

موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی

موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مختلف حصوں کا ذکر مختلف سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ الشعرآء میں زیادہ تر نبوت کے بعد کے حالات تھے جبکہ اس سورۃ میں روئے سخن قبل از نبوت حالات کی طرف زیادہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف کہ اس بچے کو دودھ پلاتی رہیں۔ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ پھر جب تجھے کوئی خطرہ ہو فرعونیوں کی طرف سے تو اس بچے کو دریا میں ڈال دیں وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اور نہ خوف کھانا اور نہ غم کرنا اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے۔ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اور ہم اس کو رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔ گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے ہر نوزائیدہ بچے کو محض اس لیے قتل کروا دیتا تھا مبادا کہ یہی بچہ میری سلطنت کے زوال کا باعث نہ بن جائے جب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو آپ کی والدہ کو فکر ہوئی کہ اگر فرعون کے گماشتوں کو بچے کی پیدائش کا علم ہو گیا تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ لہٰذا وہ بچے کو بچانے کے لیے تدبیریں سوچنے لگی۔ اسی پریشانی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی کے ذریعے یہ تدبیر بتائی کہ اس بچے کو فوری طور پر اپنے آپ سے جدا نہ کرنا بلکہ اسے اپنے پاس رکھ کر اس کی پرورش کرتی رہو اور جب بچے کی جان پر زیادہ خطرہ محسوس کرو تو کوئی دوسری تدبیر کرنے کی بجائے اسے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا اس کی زندگی کے محافظ ہم خود ہیں۔ تم اس کے متعلق فکر مند نہ ہونا۔ ہم خود بچے کو تمہیں واپس لوٹا دیں گے اور یہ تمہاری ہی تحویل میں پرورش پائیگا۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ ہم اس کے سر پر نبوت و رسالت کا تاج بھی رکھیں گے۔

ام موسیٰ کی طرف وحی پر اشکال

اس آیت کریمہ میں موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی بھیجنے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک عورت تھیں اور عورت نبیہ نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِىٓ اِلَيْهِمْ (الانبیآء - ۷) ہم نے آپ

سے پہلے جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے ہیں وہ سب مرد تھے اور ہم نے ان کی طرف وحی نازل کی۔ اب سوال یہ ہے کہ ام موسیٰ کی طرف کس حیثیت سے وحی بھیجی گئی۔

تمام مفسرینؒ اس بات پر متفق ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی یا رسول نہیں تھیں۔ البتہ بعض عورتوں کو اللہ نے صدیقیت کے درجے پر فائز کیا ہے۔ ان میں حضرت مریمؑ، حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ، فرعون کی بیوی آسیہؒ اور بعض دیگر نیک خواتین شامل ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی زیادہ سے زیادہ انہی خواتین میں شامل کیا جا سکتا ہے، تاہم وہ نبیہ نہیں تھیں۔ ان کے نام میں اختلاف ہے بعضؒ نے محیانہ، بعض نے یارہ اور بعضؒ نے لوخابذ لکھا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دراصل وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی نبوت و رسالت ہے اور یہ انبیاء اور رسل کے ساتھ مخصوص ہے، کسی غیر نبی پر یہ وحی نہیں آتی۔ البتہ وحی کی دوسری قسم الہامی وحی ہے جو نبیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔

اس وحی کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کی طبیعت اور مزاج میں کوئی بات ڈال دے جیسے شہد کی مکھیوں کے متعلق فرمایا وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (النحل - ۶۸) تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کی طرف وحی بھیجی یعنی ان کی طبیعت اور مزاج میں یہ بات ڈال دی کہ وہ پھلوں اور پھولوں کا رس چوس کر اس سے شہد تیار کریں۔

وحی الہام کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی کو خواب میں بتلا دے۔ ہو سکتا ہے کہ ام موسیٰ کو مذکورہ بات خواب کے ذریعے بتا دی گئی ہو یا اُن کے مزاج میں یہ بات ڈال دی گئی ہو۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو انسانی شکل میں بھیج کر بھی کوئی بات سمجھا دیتا ہے۔ صحیح حدیث میں تین آدمیوں کی آزمائش کا ذکر آتا ہے۔ ان میں سے ایک برص والا، دوسرا اندھا اور تیسرا گنجا تھا۔ اللہ نے اُن کی آزمائش انسانی شکل میں فرشتے کے ذریعے کرائی۔ مگر اُن میں سے صرف

---

۱ قرطبی ص ۲۵۰ ج ۱۳ ۔ ۲ روح المعانی ص ۲۴۵ ج ۲۰، مظہری ص ۱۳۳ ج ۷، معالم التنزیل ص ۱۲۶ ج ۳ ۔ ۳ معالم التنزیل ص ۱۲۶ ج ۳، روح المعانی ص ۴۵ ج ۲۰ (فیاض)

ایک کامیاب ہو سکا جب کہ دو ناکام ہو گئے۔ مسلم شریف میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ کوئی شخص سفر پر جا رہا تھا۔ اللہ نے ایک فرشتے کو انسانی شکل میں بھیجا جس نے اس شخص سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا ایک شخص کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ فرشتے نے پوچھا کیا اس شخص نے تم پر کوئی احسان کیا یا تمہارا اس کے ساتھ کوئی مفاد وابستہ ہے۔ اس شخص نے بتایا کہ نہ تو اس شخص نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی دنیاوی غرض ہے۔ میں تو اسے نیک آدمی سمجھ کر محض اللہ کی رضا کی خاطر اس کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ اس پر فرشتے نے کہا کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔ وہ خداوند کریم جس کی محبت اور رضا کے لیے تم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، تو میں تم کو خوشخبری سناتا ہوں کہ جس طرح تم اللہ کے اس نیک بندے سے محبت کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ بہر حال مفسرین کرام[۱] اس بات پر متفق ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی یا تو طبیعت کے ذریعے تھی۔ یا اللہ نے انسانی شکل میں کوئی فرشتہ بھیج کر بات سمجھا دی یا پھر خواب کے ذریعے مطلع کر دیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی دریا بُردگی

وحی[۲] یہی تھی کہ بچے کو دودھ پلاتی رہو اور اگر کوئی زیادہ خطرہ محسوس کرو تو اسے دریا میں بہا دینا غم نہ کرنا۔ ہم بچے کو دوبارہ تیری طرف لوٹا دیں گے اور اسے رسول بنائیں گے۔ تفسیری[۳] روایات میں آتا ہے کہ آپ کی والدہ نے تین ماہ تک موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں رکھ کر دودھ پلایا۔ جب فرعون کے گماشتوں کی گھر گھر تلاشی کا خطرہ بڑھ گیا تو آپ نے وحی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کو دریا برد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بائیبل کی روایت کے مطابق آپ نے سرکنڈے کی ٹوکری بنائی اور اس میں رال لگا کر اس کے سوراخ بند کر دیے تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ بعض روایات میں صندوق کا ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

یہ صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کے سامنے پہنچا۔ بائیبل کی روایت یہ ہے

---

[۱] روح المعانی ص $\frac{۴۵}{۲۰}$ [۲] در منثور ص $\frac{۱۲۰}{۵}$ [۳] مظہری ص $\frac{۱۳۲}{۷}$ (ریاض)

کہ فرعون کی بیٹی اپنی سہیلیوں سمیت وہاں موجود تھی جنہوں نے بہتے ہوئے صندوق کو نکلوایا۔ تاہم قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ بچے کو فرعون کی بیوی کی وساطت سے اٹھایا گیا۔ یہاں یہ الفاظ یہ ہیں فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ پس اٹھا لیا اس بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کے گھر والوں نے لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا تاکہ ہو جائے یہ بچہ اُن کے لیے دشمن اور غم کا باعث۔ ان الفاظ سے بھی کچھ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچہ انہوں نے دشمن سمجھ کر تو نہیں اٹھایا، بلکہ جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اُن کا خیال یہ تھا کہ شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اُسے بیٹا بنا لیں۔ دراصل لِيَكُوْنَ کا لام، لام علت نہیں بلکہ لام عاقبت ہے اور مطلب یہ ہے نتیجے کے طور پر یہ بچہ فرعون کا دشمن اور اس کے لیے باعثِ غم بنا۔ اس کی مثال عربی محاورے میں بھی ملتی ہے جیسے کہتے ہیں لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ یعنی بچے جنو موت کے لیے اور عمارات تعمیر کرو بربادی کے لیے۔ حقیقت یہ ہے نہ تو لوگ بچے مرنے کے لیے جنتے ہیں اور نہ ہی عمارتیں منہدم ہونے کے لیے بناتے ہیں۔ البتہ جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی بچہ پیدا ہوگا اُسے ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور جو بھی عمارت تعمیر ہوگی وہ بہرحال ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ تو یہاں بھی مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بہتے ہوئے بچے کو اٹھا تو لیا مگر بالآخر وہ اُن کا دشمن ثابت ہوا اور اُن کے لیے غم کا باعث بنا۔

ایسی ہی مثال قرآن پاک میں بھی ملتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں اللہ کا فرمان ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (آیت ۱۷۹) ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا۔ یہاں بھی یہ ظاہری مفہوم مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں کی کثیر تعداد جہنم میں جائے گی۔ فرمایا:

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ بیشک فرعون، اس کا وزیر ہامان اور اُن دونوں کے لشکر خطا کار تھے۔ اُن کی پالیسی ہی غلط تھی۔ اور بچے کو اٹھا لینے میں بھی انہوں نے غلطی کی۔ وہ اس سے مفاد وابستہ کیے بیٹھے تھے، مگر اللہ نے اُسی کو اُن کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

ڈالے بھی فرعون اور اُس کے حواری بخت گنہگار اور مجرم تھے۔ اللہ نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں

فرعون کے محل میں جب صندوق کو کھولا گیا تو اس سے بڑا پیارا بچہ برآمد ہوا وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ جسے دیکھ کر فرعون کی بیوی پکار اٹھی قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ اے فرعون! یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے جواب میں فرعون نے کہا کہ یہ بچہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو تو ہو میری تو ہرگز نہیں۔ فرعون کے دل میں یہی بات آئی کہ کسی اسرائیلی نے اس بچے کو قتل سے بچانے کے لیے دریا میں بہا دیا ہے لہٰذا اُسے قتل کر دینا چاہیے۔ مگر بیوی نے سفارش کی۔ لَا تَقْتُلُوْهُ اسے قتل نہ کرو، یہ تو بڑا پیارا بچہ ہے۔ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا شاید کہ یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ مگر اللہ نے فرمایا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ وہ حقیقت حال کو نہیں جانتے تھے کہ آگے چل کر ان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ابن عبید ابن ریان سلیم الفطرت اور ایماندار خاتون تھی بعض کہتے ہیں کہ اس کا تعلق اسرائیلی خاندان سے تھا مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ بھی فرعون کے خاندان سے تھی۔ اس نے بھی فرعون کے بڑے مظالم برداشت کیے تو اللہ نے اسے صدیقہ کا درجہ دیا۔ بہر حال اُس نے موسیٰ علیہ السلام کی من موہنی شکل و صورت دیکھی تو اُس کے دل میں محبت بھر آئی۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (آیت۔ ۳۹) اے موسیٰ! میں نے تم پر اپنی محبت ڈال دی جو دیکھتا تھا فریفتہ ہو جاتا تھا اور اس لیے کہ تم میری آنکھوں کے سامنے پرورش پاؤ۔ غرضیکہ فرعون کی بیوی نے بچے کو قتل نہ کرنے کی سفارش کی۔

ام موسیٰ کی بیقراری

بچے کو دریا میں بہا دینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی کیفیت یہ ہوئی۔ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا اس کا دل صبر سے فارغ ہو گیا یعنی بیقرار

[1] ابو السعود ص ۲۹ ج ۴ [2] مظہری ص ۱۴۶ ج ۷ و روح المعانی ص ۴۷ ج ۲۰ (فیاض)

ہو گیا۔ یہ انسانی مزاج اور ماں کی ممتا کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے بیٹے
کو دریا کی لہروں کے سپرد کیا مگر دل بے قرار ہو گیا کہ نامعلوم بچے کے ساتھ کیا معاملہ پیش
آنے والا ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے الہام ہو چکا تھا کہ خوف اور غم نہ کرو، ہم بچے
کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے، مگر دلِ بے قرار کو قرار کہاں آتا۔ اُن کی حالت یہ ہو چکی تھی
اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ قریب تھا کہ وہ راز کو فاش کر دیتی مگر اللہ نے
فرمایا لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا اگر ہم اُس کے دل کو مضبوط نہ کرتے
یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی کہ اُس نے ام موسیٰ کے دل کو قرار بخشا۔ ورنہ
سارا معاملہ ہی اُلٹ پلٹ ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید کے بغیر کوئی بھی انسان
بذاتہٖ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے اہل ایمان ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں[1] یَا مُقَلِّبَ
الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل
کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ[2] صَرِّفْ قَلْبِيْ اِلٰى طَاعَتِكَ میرے دل کو
اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ بہرحال فرمایا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے
دل کو مضبوط کیا۔ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تاکہ وہ ایمان والوں میں سے
ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے راز کو فاش نہ کیا اور اس طرح موسیٰ علیہ السلام کی پرورش
فرعون کے گھر میں ہوئی اور وہ تیس سال تک وہاں رہے۔ اس کے بعد کے
واقعات آ رہے ہیں۔

---

[1] ترمذی ص۵۰۷ [2] حصن حصین ص۲۰۳ (فیاض)

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١١﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ﴿١٢﴾ فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ ع

ترجمہ:- اور کہا اُس (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ) نے آپ کی بہن سے کہ اس کا سراغ لگاؤ۔ پس وہ دیکھتی رہی آپ کو دور سے اور اُن کو خبر نہیں تھی ﴿۱۱﴾ اور ہم نے ممنوع قرار دے دیا اس (موسیٰ علیہ السلام) پر دودھ پلانے والیوں کو اس سے پہلے۔ پس (آپ کی بہن) بولی کیا میں بتلاؤں تم کو ایسے گھر والے جو اس کی کفالت کریں تمہارے لیے، اور وہ اس کے لیے خیر خواہ ہونگے ﴿۱۲﴾ پس ہم نے لوٹا دیا اُس کو اُس کی والدہ کے پاس تاکہ ٹھنڈی رہے اُس کی آنکھ اور وہ غمگین نہ ہو۔ اور تاکہ وہ جان لے کہ بیشک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر لوگ اُن میں سے نہیں جانتے ﴿۱۳﴾

ربط آیات

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب آپ کی والدہ نے خطرہ محسوس کیا کہ فرعون کے آدمی اس کو پکڑ کر ذبح کر ڈالیں گے تو الہامی ہدایات کے مطابق اُس نے بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا۔ یہ صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کے قریب

سے گزرا تو فرعون کے گھر والوں نے اُسے نکلوا لیا محل میں لا کر جب صندوق کھولا گیا تو اُس سے خوبصورت بچہ برآمد ہوا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ نام بھی اسی مناسبت سے ہے کہ آپ پانی سے برآمد ہوئے مُو کا معنی پانی اور سیٰ لکڑی کو کہتے ہیں گویا لکڑی کے صندوق سے برآمد شدہ۔

موسیٰ علیہ السلام کے لیے سراغ رسانی

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اگرچہ الہامی احکام کے تحت آپ کو دریا میں بہا دینے کی تدبیر کی تھی مگر فطری طور پر وہ بچے کی جدائی سے بے قرار ہو چکی تھی اور وہ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ فَقَالَتْ لِأُخْتِهٖ قُصِّيْهِ پس کہا اُس نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن یعنی اپنی بیٹی سے کہ بچے کا سراغ لگاؤ۔ قُصِّیْ کا معنی ہوتا ہے پیچھے پیچھے یعنی نقشِ قدم پر جانا۔ اس کی مثال سورۃ الکہف میں ملتی ہے جب موسیٰ علیہ السلام اور یوشع بن نون اپنے ہدف سے آگے نکل گئے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (آیت ۶۴) تو وہ اپنے قدموں کے نشانات پر واپس آ گئے۔

یہ موسیٰ علیہ السلام کی بڑی بہن مریم تھی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت اچھی خاصی سوجھ بوجھ رکھتی تھی اور فرعون کے محل میں پہلے سے آنا جانا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے والد بھی فرعون کے قریبی کارندوں میں شامل تھے۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اُن کی بڑی بہن سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے جاؤ اور سراغ لگاؤ کہ یہ صندوق کہاں پہنچتا ہے اور پھر کیا معاملہ پیش آتا ہے فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ موسیٰ علیہ السلام کی بہن آپ کی طرف دور سے دیکھتی رہی۔ اجنبی بن کر تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس لڑکی کا اس صندوق کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔

جنب کا معنی پہلو بھی ہوتا ہے اور دوری بھی۔ جنابت بھی اسی مادے سے ہے کہ انسان طہارت سے دُور ہو جاتا ہے جس سے فرشتوں کو نفرت ہوتی ہے جنب کے یہ معانی عربی ادب میں بھی ملتے ہیں جیسے کسی نے کہا ہے۔

---

[۱] مظہری ص۱۴۵ ج۷ و روح المعانی ص۵۰ ج۲۰ (فیاض)

؎ اَتَیْتُ حُرَیْثاً زَائِراً عَنْ جَنَابَۃٍ
وَکَانَ حُرَیْثاً عَنْ عَطَائِیْ جَاحِدٌ

میں حریث کے پاس دور سے پہنچا مگر وہ اتنا ذلیل ثابت ہوا کہ اس نے مجھے کچھ عطیہ نہ دیا

؎ فَلَا تَحْرِمَنِّیْ نَائِلاً عَنْ جَنَابَۃٍ
فَاِنِّیْ امْرُءٌ وَسْطَ الْقِبَابِ غَرِیْبٌ

مجھے دوری کی وجہ سے محروم نہ رکھنا کیونکہ میں ان خیموں کے درمیان ایک اجنبی آدمی ہوں ۔

بہر حال فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن آپ کو دور سے دیکھتی رہی وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ مگر فرعون اور اُس کے کارندوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کہ اس لڑکی کا اس صندوق والے بچے کے ساتھ واقعی کوئی تعلق ہے ۔

جب بچے کو صندوق سے نکالا گیا تو فرعون کا ذہن فوراً اس طرف گیا کہ ہوسکتا ہے یہ وہی بچہ ہو جس کی مجھے تلاش ہے لہٰذا اسے قتل کر دینا چاہیے مگر اُس کی بیوی نے کہا کہ اُسے قتل نہ کرو ۔ یہ بڑا پیارا بچہ ہے ۔ ہوسکتا ہے یہ ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں ۔ اُدھر اللہ کی بھی تدبیر تھی ۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ احسان جتلایا ۔ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ (طٰہٰ - ۳۹) میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی ۔ جو بھی شکل وصورت دیکھتا گرویدہ ہو جاتا ۔ اگرچہ فرعون کی حس اُسے قتل پر آمادہ کر رہی تھی مگر بچے کی خوبصورتی دیکھ کر اور بیوی کی سفارش سے اُس کا دل بھی نرم ہوگیا اور اُس نے نہ صرف قتل کا ارادہ ترک کر دیا بلکہ بچے کی پرورش کا ذمہ بھی اٹھا لیا ۔

موسیٰ علیہ السلام کی رضاعت

اب بچے کی رضاعت کا مسئلہ درپیش تھا کہ اس کو دودھ کون پلائے ۔ شاہی حکم پر بہت سی دودھ پلانے والی عورتوں کو آزمایا گیا مگر اللہ کا حکم تھا ۔ وَحَرَّمْنَا عَلَیْہِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ ہم نے اس سے پہلے ہی بچے

پر دودھ پلانے والیوں کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ لہٰذا بچہ کسی بھی دائی کا دودھ پینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس حرمنا سے شرعی حرام مراد نہیں ہے بلکہ موسیٰ علیہ السلام پر کسی غیر عورت کی رضاعت تکوینی طور پر حرام کر دی گئی۔ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کار فرما تھی۔

اب شہر بھر میں مشہور ہو گیا کہ فرعون ایک بچے کی پرورش کرنا چاہتا ہے مگر وہ بچہ کسی عورت کا دودھ پینے کے لیے تیار نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن جو اس موقعہ کی تدرش میں تھی فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ کہنے لگی، کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کے متعلق نہ بتاؤں جو اس بچے کی تمہارے لیے کفالت کریں وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ اور وہ لوگ اس کے لیے خیر خواہ بھی ہوں گے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر فرعون کے وزیر ہامان کو شک گزرا کہ اس لڑکی کو پتہ ہوگا کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ اسی لیے تو وہ اس کے ساتھ خیر خواہی جتلا رہی ہے۔ مگر لڑکی بڑی سمجھدار تھی، فوراً بولی کہ لَهٗ سے مراد بچے کی خیر خواہی نہیں، بلکہ خود فرعون کی خیر خواہی ہے جو اس کی اچھے طریقے سے پرورش کرنا چاہتا ہے وہ لوگ فرعون کے حق میں بڑے خیر خواہ ہیں۔ اس پر ہامان نے اپنی بات پر زور نہ دیا۔ حالانکہ اس سے بچے کی خیر خواہی مطلوب تھی۔

فرعون نے اس لڑکی کی بات کو تسلیم کر لیا اور حکم دیا کہ جس عورت کا پتہ دیتی ہو اُسے حاضر کرو۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو فوراً بلا لیا گیا۔ جب اُس نے بچے کو اپنی چھاتی سے لگایا تو اس نے فوراً دودھ پینا شروع کر دیا۔ فرعون کے گھر والوں نے اس کو غنیمت جانا اور اس لڑکی کی کارگزاری پر خوش ہوئے کہ اس نے ایک پاکیزہ گھر کی نشاندہی کی ہے جس کا دودھ بچہ پینے لگا ہے۔ غرضیکہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی خدمات بطور دائی ایک دینار یومیہ کی اجرت پر حاصل کر لی گئیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے دوسرے بچے بھی ہیں جن کی دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے۔ لہٰذا میں تمہارے بچے کو محل میں رہ کر دودھ نہیں پلا سکتی بلکہ اسے اپنے گھر لے جا کر پرورش

لہ کشاف ص۲۹۶ ج۳ و کبیر ص۲۳۱ ج۲۴ و مدارک ص۲۲۸ ج۳ (فیاض)

کروں گی۔ فرعون نے یہ شرط بھی منظور کر لی اور کہا کہ بچے کو لے جاؤ مگر کبھی کبھی یہاں لا کر ملوا جایا کرو۔ ہم تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور معاوضہ اجرت کے علاوہ انعام و اکرام بھی دیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کی ماں سے پاس واپسی

اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کی طرف لوٹا دیا۔ اللہ نے یہی بات ذکر کیا فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ ہم نے اس کو اس کی والدہ کے پاس لوٹا دیا كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور وہ غمگین بھی نہ ہو۔ فرمایا اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتا تھا وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ تاکہ وہ جان لے کہ بیشک اللہ کا وعدہ ——————

برحق ہے۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ فکر نہ کرو۔ اسے پانی میں ڈال دو۔ ہم اسے تمہارے پاس لوٹا دیں گے۔ سو اللہ نے وہ وعدہ پورا کر دیا اور اس شان کے ساتھ لوٹایا کہ وہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلا کر فرعون سے اجرت بھی وصول کر رہی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص اپنی تیار کردہ کسی چیز میں خیر کی توقع رکھتا ہے۔ اس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی ہے جس طرح وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت وصول کرتی تھی۔ اسی طرح یہ شخص اپنی مصنوعات کی قیمت تو وصول کریگا ہی مگر ساتھ ساتھ ثواب بھی حاصل ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تیر تیار کرنے کی وجہ سے تین آدمی بخشے جائیں گے۔ ایک آدمی اس تیر کو تیار کرنے والا ہے۔ جس نے اس نیت سے تیر بنایا کہ اس سے دشمن خدا ہلاک ہو تو اسے تیر کی قیمت کے علاوہ اللہ کی طرف سے ثواب بھی حاصل ہوگا دوسرا خوش قسمت شخص وہ ہے جو تیر انداز کو اس نیت کے ساتھ تیر پکڑاتا ہے کہ اس سے دشمن ہلاک ہو۔ تو وہ بھی بخشا گیا۔ اور تیسرا شخص خود تیر انداز ہے۔ جو اللہ کی رضا کی خاطر دشمن کی صفوں میں تیر پھینکتا ہے وہ بھی بخشا جائے گا۔

تدبیر خداوندی

فرمایا اللہ تعالیٰ تو اپنی تدبیر کے ذریعے اپنا وعدہ پورا کر دیتا ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے کہ تدبیر خداوندی کس

طرح کام کرتی ہے۔ تمام تقلبات اور تصرفات اللہ کے قبضے میں ہیں۔ لہٰذا وہ ہر کام کر گزرنے پر قادر ہے۔ ایسے میں دشمن کی تدبیر کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس کا تو اعلان ہے وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ (انفال۔ ۳۰) لوگ بھی تدبیریں کرتے ہیں اور اللہ بھی تدبیر کرتا ہے۔ مگر اللہ ہی بہتر تدبیر کنندہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ (یوسف۔ ۲۱) وہ اپنے معاملے اور حکم میں غالب ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر اکثر لوگ بے علم ہیں۔ جو ان چیزوں کو نہیں سمجھتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰىٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ:۔ اور جب پہنچے (موسیٰ علیہ السلام) اپنی قوت پر اور سنبھل گئے۔ تو دی ہم نے اُن کو حکمت اور سمجھ۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں نیکی کرنے والوں کو (۱۴) اور وہ داخل ہوئے شہر میں غفلت کے وقت وہاں کے رہنے والوں سے۔ پس پایا اُس میں دو شخصوں کو کہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے تھا اور ایک آپ کے دشمنوں میں سے۔ پس مدد چاہی اُس نے جو اُن کے ساتھیوں میں سے تھا اُس کے خلاف جو اُن کے دشمنوں

میں سے تھا۔ پس مُکہ رسید کیا اُس کو موسیٰ علیہ السلام نے
پھر اس کا کام تمام کر دیا، اور پھر کہنے لگے کہ یہ تو شیطان
کا کام ہے۔ بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا کھلا ⑮
کہا (موسیٰ) نے، اے میرے پروردگار! بیشک میں نے
زیادتی کی ہے اپنی جان پر، پس بخش دے مجھے، پس اللہ
نے اُسے بخش دیا۔ بیشک وہ بخشش کرنے والا اور نہایت
مہربان ہے ⑯ کہا (موسیٰ) نے، اے پروردگار! اس وجہ
سے کہ تو نے مجھ پر انعام فرمایا ہے پس ہرگز نہ ہوں گا
میں پشت پناہ مجرموں کا ⑰

ربطِ آیات

اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قبل از نبوت زندگی کے حالات بیان فرمائے ہیں اور آپ پر کیے گئے بعض انعامات کا ذکر کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہی نامساعد حالات میں ہوئی جب کہ فرعون اسرائیلیوں کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کروا دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی فرمائی کہ فرعون کے دشمن موسیٰ علیہ السلام کی اُسی کے گھر میں شاہانہ طریقے پر پرورش فرمائی۔ پہلے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی برآمدگی کے بعد آپ کی رضاعت کا واقعہ بیان کیا ہے کہ کس طرح موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے آپ کو پہچانا اور پھر رضاعت کے لیے اپنی ماں کا پتہ بتایا۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف اپنی والدہ کے پاس واپس لوٹا دیا گیا بلکہ اُسے دودھ پلانے کی اُجرت اور دیگر انعام و اکرام بھی ملتے رہے۔ اُس مقام پر اللہ نے فرمایا ہے وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر دودھ پلانے والیوں کو حرام قرار دے دیا جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کسی غیر عورت کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا کہ یہاں پر حرام سے مراد شرعی حرام نہیں بلکہ محض ممنوع مراد ہے۔ اور اسی کی مثالیں قرآن میں دوسری جگہوں پر بھی موجود ہیں۔ جیسے سورۃ الانبیاء میں فرمایا ہے

وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (آیت ۹۵)

جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں ہم نے اس کو ممنوع کر دیا ہے کہ وہ پلٹ کر نہیں آسکتے

امام قشیری نے لکھا ہے کہ ایک سوئے ہوئے درویش کو دیکھ کر ایک بزرگ نے کہا ہے

عَجَباً لِلْمُحِبِّ كَيْفَ يَنَامُ
كُلُّ نَوْمٍ عَلَى الْمُحِبِّ حَرَامٌ

تعجب کی بات ہے کہ ایک درویش سو رہا ہے کیونکہ ایسے لوگوں پر تو ہر قسم کی نیند ممنوع ہے۔ اللہ والے تو باطن میں ہر وقت بیدار رہتے ہیں۔ ان پر تو کسی وقت بھی نیند طاری نہیں ہوتی۔ سعدی نے بھی اس قسم کی بات کی ہے ؎

مَتَىٰ يَرْجِعُ نَوْمِي وَقَرَارِي
وَإِنَّ عَلَى الْعَاشِقِ هٰذَانِ حَرَمَانِ

اے میرے دوست! میری نیند اور میرا قرار کب واپس لوٹ کر آئیگا کیونکہ عاشق مجب لوگوں پر تو یہ دونوں چیزیں حرام (ممنوع) ہوتی ہیں۔ یہاں بھی حرام سے مراد شرعی حرام نہیں بلکہ ممنوع مراد ہے۔

بچپن سے جوانی تک

بہرحال موسیٰ علیہ السلام کی رضاعت کا زمانہ گزر گیا۔ جب آپ اپنی والدہ کی پرورش سے فارغ ہوئے تو شاہی محل میں شہزادوں کی طرح رہنے لگے۔ وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ جب آپ قوت یعنی جوانی کو پہنچ گئے اور اچھی طرح سنبھل گئے۔ یہ آپ کا عالمِ شباب تھا جو تیس ۳۰ سے تینتیس ۳۳ سال کی عمر کا زمانہ ہوتا ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق بھی آتا ہے کہ وہ ہمیشہ عمر کے اسی زمانہ میں رہیں گے اور کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اس عمر کو پہنچے تو اللہ نے فرمایا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا تو ہم نے اُن کو حکمت یعنی دانائی اور علم یعنی سمجھ عطا کی۔ موسیٰ علیہ السلام پر جوانی کا عالم تھا، قد کاٹھ بھی لمبا اور جسم بھی چوڑا چکلا، بدن تنا ہوا یعنی موٹاپے کا شائبہ تک

نہیں تھا حضور علیہ السلام نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میری ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو انہیں میں نے آیادِ قبیلہ ازدِ شنوءة کے نوجوانوں کی طرح دراز قد اور چھریرے جسم کا حامل پایا۔

بہرحال فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام عالمِ شباب کو پہنچے تو ہم نے انہیں دانائی اور سمجھ عطا فرمائی۔ تیس سال کی عمر میں اللہ نے یہ دو چیزیں ہی عطا کیں جب کہ نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی جب آپ مدین سے واپس مصر کی طرف آ رہے تھے۔ اس قسم کے انعام کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ملتا ہے۔ اللہ نے فرمایا وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (الانبیاء)۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے ہی یعنی اوائل عمر سے ہی کمال درجے کی سمجھ عطا فرمائی۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کو خوب پہچانتے تھے اور آپ کو توحید خداوندی پر پورا پورا عقیدہ تھا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ نے حکمت اور سمجھ عطا فرمائی وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ فرمایا ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل

موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں رہتے ہوئے وہاں کے ہر حسن و قبح کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور آپ کی حکمت و سمجھ کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ہر بری چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ظلم و ستم کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتے تھے بلکہ اسے روکنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا کہ موسیٰ علیہ السلام ایسے وقت میں شہر میں داخل ہوئے جب وہاں کے باشندے غفلت کی حالت میں تھے یعنی جب لوگ کاروبار سے فارغ ہو کر عام طور پر آرام کرتے ہیں۔ یہ وقت دوپہر کا بھی ہو سکتا ہے، رات کا بھی یا علی الصبح کا بھی جب لوگ ابھی نیند سے بیدار نہیں ہوتے۔ تو ایسے وقت میں آپ شہر میں داخل ہوئے۔ یہ کون سا شہر تھا؟ کہتے ہیں کہ اس شہر کا نام منوف یا منفت تھی جو فرعون کے دارالحکومت سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ فرعون کا خصوصی علاقہ تھا جسے عین شمس کا نام دیا گیا ہے۔

۱ قرطبی صـ ۲۵۹/۱۳ و ابو سعود صـ ۱۲۸/۴ (فیاض)

وہاں قبطیوں کے علاوہ اسرائیلیوں کی بستیاں بھی تھیں اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بھی
یہیں رہتی تھیں لہٰذا آپ گاہے بگاہے وہاں بھی چلے جاتے تھے۔ اس علاقے
میں فرعونیوں نے اسرائیلیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ تمام مشقت کے
کام اُن سے لیتے تھے اور ان کی حیثیت غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ موسیٰ علیہ السلام
یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور حتی الامکان مظلوموں کی مدد بھی کرتے۔

تو جب آپ اس شہر میں داخل ہوئے فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ
يَقْتَتِلَانِ تو آپ نے وہاں دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے پایا هَـٰذَا
مِنْ شِيعَتِهِ ان میں سے ایک آدمی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں
میں سے یعنی اسرائیلی خاندان سے تھا۔ وَهَـٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ اور دوسرا
شخص دشمن گروہ یعنی قبطی خاندان سے تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص فرعون کا کارندہ تھا
یعنی اس کے باورچی خانے کا نگران تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گزرے
فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ
عَدُوِّهِ تو مدد طلب کی موسیٰ علیہ السلام سے اس شخص نے جو ان کی پارٹی سے تھا
اُس کے خلاف جو ان کی دشمن جماعت سے تھا۔ استغاثہ کا معنی فریاد کرنا یا مدد
طلب کرنا ہوتا ہے۔ اسرائیلی مظلوم تھا تو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کی
موسیٰ علیہ السلام نے بھی دیکھا کہ قبطی واقعی اسرائیلی پر زیادتی کر رہا تھا۔ لہٰذا آپ نے آگے
بڑھ کر مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑانا چاہا مگر مؤخر الذکر اس کے لیے تیار نہ تھا۔
وہ موسیٰ علیہ السلام سے لڑ گیا فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ تو آپ نے اس کو ایک گھونسہ رسید کیا۔
اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ قبطی کو جان سے مارنا نہیں تھا مگر اس کو وہ ضرب ایسی
کاری لگی فَقَضَىٰ عَلَيْهِ کہ قبطی کا کام تمام ہو گیا یعنی وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

شیطانی عمل

چونکہ یہ حادثہ موسیٰ علیہ السلام کی نیت اور ارادے کے بالکل خلاف پیش
آگیا تھا، لہٰذا آپ نے فوراً کہہ دیا قَالَ هَـٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کہ یہ تو شیطان
کے کام سے ہے۔ اس کو شیطانی عمل اس لیے کہا کہ شیطان اپنے کام پر بڑا خوش

ہوتا ہے جس کے ذریعے فتنہ و فساد برپا ہونے کی امید ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز کی حالت میں اگر کسی شخص کو کوئی زخم آجائے، نکسیر پھوٹ جائے یا عورت کو حیض آنے لگے تو یہ شیطانی فعل ہوتا ہے کہ اس سے شیطان بڑا خوش ہوتا ہے کہ کسی کی نماز میں خلل واقع ہوا۔ موسیٰ اور یوشع علیہ السلام کے سفر کے واقعہ میں بھی آتا ہے کہ جب وہ دونوں اپنی منزل سے آگے نکل گئے اور پھر موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع علیہ السلام کہنے لگے کہ میں مچھلی والا واقعہ تو بھول ہی گیا وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ (الکہف - ۶۳) اور مجھے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔ چونکہ یہاں بھی اللہ کے نیک بندوں کو سفر کی زائد مشقت برداشت کرنا پڑی جس سے شیطان خوش ہوا، لہٰذا اُسے بھی شیطانی عمل کہا گیا ہے۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ اور فرمایا اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ بے شک شیطان انسان کا صریح دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے۔ انسان کو اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

لغزش کی معافی

اگرچہ قبطی کا قتل قتلِ عمد نہیں بلکہ قتلِ خطا تھا مگر موسیٰ علیہ السلام اس پر بھی سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ "بیان القرآن" میں لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو ان کی خصوصی تربیت مطلوب ہوتی ہے، لہٰذا وہ ان کی معمولی لغزشوں پر بھی سخت گرفت کر لیتا ہے۔ دیکھ لیں حضرت یونس علیہ السلام سے ذرا سی لغزش ہوئی تھی تو اللہ نے انہیں کس قدر ابتلاء میں ڈالا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس غیر ارادی قتل پر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ کہنے لگے، پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ مجھ سے یہ لغزش واقع ہو گئی ہے۔ فَاغْفِرْ لِیْ لہٰذا مجھے معاف کر دے۔ اگرچہ یہ گناہ نہیں تھا مگر ایک جان تو چلی گئی تھی۔ لہٰذا آپ نے سخت ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی فَغَفَرَ لَهٗ تو اللہ نے آپ کو معاف کر دیا۔ جو لوگ اس عمل کو گناہ کہتے

ہیں۔ وہ درست نہیں ہیں کیونکہ گناہ تو نیت اور ارادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ارادے کے بغیر تو خطا ہو سکتی ہے یا نسیان ہو سکتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ایک خطا ہوئی تھی کہ وہ اللہ کے حکم کے برخلاف شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا بیٹھے مگر فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ - ۱۱۵) اللہ نے فرمایا کہ وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں عزم و استقلال نہ پایا۔

بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی کی کیونکہ وہ بڑی شخصیت تھے اور ایسے لوگوں کی ابتداء سے ہی بہترین تربیت مقصود ہوتی ہے انبیاء نبوت سے پہلے بھی ایمان والے اور ولی کامل کے درجے میں ہوتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے قطب باطنی کے درجے میں ہوتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اس فعل کی معافی بھی دے دی۔ اس قسم کی معافی کا علم دیگر نیک لوگوں کی طرح بذریعہ الہام یا بذریعہ خواب ہو سکتا ہے۔ یا پھر نبوت ملنے کے بعد بذریعہ وحی بھی ہو سکتا ہے۔ تو اللہ نے معاف کر دیا اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ بے شک وہ بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

مجرموں کی پشت پناہی

اس قتلِ خطا پر اللہ تعالیٰ سے معافی ملنے پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کا عجیب طریقے سے شکریہ ادا کیا۔ پہلے اپنے آپ پر ہونے والے انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر کیا قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ کہنے لگے میرے پروردگار! جس طرح تو نے مجھ پر انعام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتنے ہی انعامات کیے تھے۔ پہلے دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا۔ پھر اپنی طرف سے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دی جو دیکھتا گرویدہ ہو جاتا۔ اور اسی وجہ سے آپ کی جان بچ گئی۔ آپ کو حکمت اور سمجھ عطا فرمائی۔ نبوت سے سرفراز فرمایا، عظیم المرتبت کتاب دی، اپنے کلام سے مشرف فرمایا۔ پھر خلافت بھی عطا فرمائی۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (آیت - ۱۱۴)

ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں پر احسان فرمایا۔ اُن کو ظالم قوم سے نجات دی۔ اُن کی مدد کر کے انہیں غالب بنایا، کتاب دی اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی ان انعامات کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کو شکریہ اس طرح ادا کیا فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ کہ میں کبھی مجرموں کا پشت پناہ نہیں ہوں گا یعنی آئندہ کبھی کسی مجرم کی حمایت نہیں کروں گا۔

یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حمایت تو اسرائیلی آدمی کی کی تھی۔ جو قبطی کے ظلم کا نشانہ بن رہا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ مجرم تو نہیں تھا بلکہ مظلوم تھا مگر یہاں پر وہ مجرموں کی اعانت سے دست کش ہو رہے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان مجرموں سے مراد اسرائیلی نہیں بلکہ قبطی ہیں جو اسرائیلیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ جو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے ان میں بھی قبطی ہی مجرم تھا جو اسرائیلی پر زیادتی کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اسرائیلی کا بھی کوئی قصور ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کو بھی مجرمین کی فہرست میں داخل کر سکتے ہیں۔ تاہم فرعونی تو سارے کے سارے مجرم تھے جنہوں نے اسرائیلیوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! تو نے مجھ پر اس قدر انعامات کیے ہیں تو میں ان کا شکریہ اسی طریقے سے ادا کر سکتا ہوں کہ آئندہ کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کروں گا۔

اس آیت سے یہ قانون نکلتا ہے کہ اہلِ ایمان اور نیک لوگوں کا فرض ہے کہ وہ کبھی کسی مجرم کی پشت پناہی نہ کریں۔ ایسا کرنے سے پورے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا اُس پر اللہ کی لعنت ہو جو کسی مجرم کو پناہ دیتا ہے۔ مجرم کو تو سزا ملنی چاہیئے۔ جو شخص اس کی سزا میں حائل ہوتا ہے وہ ملعون ہے۔ چنانچہ سلف صالحین نے کبھی کسی مجرم کا ساتھ نہیں دیا۔ ائمہ کرام اور اولیاء اللہ ظالم حکمرانوں کو نصیحت تو کرتے تھے مگر ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ظلم میں حصے دار نہیں بنے۔ امام ابوحنیفہ نے موت کھانا منظور کیے۔ جیل گئے، زخمی

ہوئے مگر سرکاری ملازمت محض اس لیے قبول نہیں کی کہ حکمران صحیح نہیں تھے۔ آپ نے وقت کے کمانڈر انچیف کو نصیحت کی کہ ظلم نہ کرو، ورنہ ماخوذ ہو گے تو اُس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی طرح امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے بھی کسی ظالم حکمران کی پشت پناہی نہیں کی۔ انہیں بڑی بڑی تکلیفیں دی گئیں مگر انہوں نے کبھی ناحق کا ساتھ نہیں دیا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے کہ انبیاء کے مشن میں رفع التظالم من بین الناس بھی شامل ہے یعنی اُن کا فرض ہے کہ لوگوں سے ظلم کو ہٹائیں۔[1] جب اُن کے مشن میں یہ چیز داخل ہے تو پھر وہ ظالم کی پشت پناہی کیسے کر سکتے ہیں؟ آج ہماری سوسائٹی میں ظالم کی پشت پناہی رچ بس چکی ہے جس کی وجہ سے ہم طرح طرح کے مصائب کا شکار ہیں۔ معاشرہ میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہے۔ کسی کی عزت، مال اور جان محفوظ نہیں۔ گھر گھر میں ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ شاہراہوں پر لوٹ مار مچی ہوئی ہے قتل و غارت عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان غنڈوں، بدمعاشوں اور چوروں کے پشت پناہ بڑے بڑے جاگیردار ہیں۔ انہوں نے کرائے کے قاتل پال رکھے ہیں جو واردات کرنے کے بعد اُن کی پناہ میں آ کر گرفت سے بچ جاتے ہیں۔ پولیس کی طرف سے مجرموں کی پشت پناہی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پورے معاشرے میں بے سکونی کی کیفیت ہے۔ جب تک معاشرے سے مجرم کی پشت پناہی ختم نہیں ہو گی لوگ آرام کی نیند نہیں سو سکیں گے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں پر آہنی ہاتھ ڈالے اور مجرموں سے پہلے ان کے حمائتیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۱/۱۶۰ (فیاض)

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِىٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِىْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا ۢ بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۡ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع

ترجمہ:- پھر صبح کی موسیٰ علیہ السلام نے اُسی شہر میں، وہ ڈرتے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ اچانک وہی شخص جس نے گذشتہ روز آپ سے مدد طلب کی تھی، پھر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے کہا کہ بیشک تم کھلے گمراہ آدمی ہو ﴿۱۸﴾ پھر جب ارادہ کیا موسیٰ علیہ السلام نے کہ ہاتھ ڈالیں اُس شخص پر جو اُن دونوں کا دشمن تھا، تو اُس شخص نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تو ارادہ کرتا

ہے کہ مجھے قتل کر ڈالے جیساکہ تو نے ایک جان کو کل قتل کیا تھا تو نہیں چاہتا مگر یہ کہ تو زبردست ہو زمین میں ، اور تو نہیں چاہتا کہ تو اصلاح کرنے والوں میں ہو (۱۹) (اس دوران میں) آیا شخص شہر کے دوسرے کنارے سے دوڑتا ہوا ، اور کہنے لگا ، اے موسیٰ ! بیشک فرعون کے سرآوردہ لوگ مشورہ کر رہے ہیں تیرے بارے میں تاکہ تجھ کو قتل کر ڈالیں ، پس آپ نکل جائیں یہاں سے ۔ بیشک میں آپ کے لیے البتہ خیرخواہی کرنے والا ہوں (۲۰) پھر نکلے (موسیٰ ؑ) وہاں سے خوف کھاتے ہوئے اور انہوں نے (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کیا ، اے میرے پروردگار ! بچالے مجھے ظالم قوم سے (۲۱)

ربط آیات

جب موسیٰ علیہ السلام عالم شباب کو پہنچے تو اللہ نے انہیں حکمت اور سمجھ عطا فرمائی. آپ بری باتوں پر تنقید اور مظلوموں کی مدد کرتے تھے. اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ آپ دارالحکومت سے بارہ میل کے فاصلہ پر واقع شہر منف میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جب لوگ آرام کر رہے تھے ۔ آپ نے دیکھا کہ ایک قبطی اور اسرائیلی آپس میں جھگڑ رہے ہیں. حسب معمول قبطی آدمی اسرائیلی پر زیادتی کر رہا تھا. لہٰذا اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام سے مدد کی درخواست کی ۔ آپ نے اُسے چھڑانے کی کوشش کی مگر قبطی ایسا کرنے کے لیے تیار نہ تھا ۔ اس پر آپ نے قبطی کو ایک گھونسہ رسید کیا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور ہلاک ہوگیا. موسیٰ علیہ السلام کو بڑا افسوس ہوا کہ ان کی ایک معمولی سی بلاارادہ لغزش سے ایک جان چلی گئی ۔ آپ نے اس کوتاہی پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور کہا کہ تو نے مجھ پر بڑے انعامات کیے ہیں اور دیگر سہولتیں مہیا کی ہیں ۔ لہٰذا میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کسی مجرم کی حمایت نہیں کروں گا ۔

لڑائی کا دوسرا واقعہ

قتل کا پہلا واقعہ تو دب گیا ۔ بائبل کی روایت کے مطابق لاش کو ریت میں دبا دیا

گیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی شہر میں رات گزار کر صبح کی یعنی اگلا دن آ پہنچا۔ مقتول سرکاری کارندہ تھا، دن بھر اس کی تلاش ہوتی رہی کہ وہ کہاں چلا گیا۔ اسرائیلی آدمی کو بھی فکر تھی کہ اگر قتل کا راز افشا ہو گیا تو مصیبت آ جائیگی۔ اُدھر موسیٰ علیہ السلام کی حالت بھی یہ تھی خَائِفًا وہ بھی خوفزدہ تھے کہ کوئی مصیبت نہ آ جائے يَتَرَقَّبُ آپ منتظر تھے کہ دیکھیں کل والے واقعہ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ اسی کشمکش و پیچ میں تھے فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ کہ اچانک وہی شخص جس کی گذشتہ روز آپ نے مدد کی تھی، پھر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ آج وہ کسی دوسرے شخص سے الجھ رہا تھا۔ اسرائیلی عام طور پر بڑے مظلوم و مقہور تھے مگر موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ اس اسرائیلی کے مزاج میں بھی کچھ خلل تھا جو ہر ایک سے الجھتا پھرتا تھا اس کی وجہ سے ابھی کل ہی ایک آدمی قتل ہو چکا تھا اور یہ آج پھر ویسا ہی کام کر رہا تھا اس پر موسیٰ علیہ السلام کو اس اسرائیلی پر غصہ آ گیا کہ اس کا تو کام ہی لڑنا جھگڑنا ہے قَالَ لَهُ مُوسَى موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے کہا إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ تم تو کھلے گمراہ ہو جو ہر ایک سے جھگڑتے ہو گویا آپ نے اسی اسرائیلی کو سخت ڈانٹ پلائی کہ تم خواہ مخواہ لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرتے ہو اسرائیلی کو سخت سست کہنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام آج پھر اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا جب آپ نے ارادہ کیا کہ اُس شخص پر ہاتھ ڈالیں جو دونوں یعنی آپ کا اور اسرائیلی کا دشمن تھا۔ گویا آج آپ پھر قبطی کو ظلم سے ہٹانا چاہتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اگرچہ فرعون کے محل میں پرورش پائی تھی مگر تھے تو آپ اسرائیلی خاندان سے اور اسی لیے اپنی والدہ سے ملنے کے لیے گاہے بگاہے ان کے پاس بھی آتے تھے۔ لہٰذا فطری طور پر اُن کی ہمدردیاں مظلوم اسرائیلیوں کے ساتھ تھیں چنانچہ انہوں نے اسرائیلی آدمی کو قبطی کے ظلم سے بچانا چاہا۔

اُدھر اسرائیلی سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے مجھے ڈانٹ پلائی ہے اور اب یہ میری

طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ روز روز کی لڑائی کا مجھے بھی کچھ مزہ دکھیں۔ وہ شخص آپ کی قوت کا اندازہ تو کر ہی چکا تھا کہ کل ایک ہی مکے سے قبطی ہلاک ہو گیا۔ لہٰذا اسے جان کی فکر پڑ گئی اور قَالَ کہنے لگا۔ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اے موسیٰ کیا تو مجھے بھی ویسے ہی قتل کرنا چاہتا ہے جیسے کل ایک شخص کو جان سے مار ڈالا اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ اور تو زمین میں اصلاح کنندہ نہیں بننا چاہتا۔ اب راز فاش ہو چکا تھا وہ قبطی سمجھ گیا کہ جس قتل کا سراغ نہیں مل رہا ہے وہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ شخص جا کر سرکاری کارندوں کو بتا دے گا کہ کل والا قتل میں نے کیا تھا۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ عربی کا ذکا خون تو جائز ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ قبطی بھی مباح الدم تھا۔ اگرچہ یہ قتل خطا کے طور پر ہوا تھا۔ تاہم اگر یہ قتل عمد بھی ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام پر کچھ گناہ نہیں تھا مگر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے لہٰذا انہوں نے اس فعل کو گناہ سے تعبیر کیا۔ چنانچہ سورۃ الشعراء میں موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تو فرعون کے پاس جا کر تبلیغ کرو تو آپ نے ایک عذر پیش کیا تھا وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (آیت ۱۴) قبطیوں کا مجھ پر ایک گناہ بھی ہے کہ میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا۔ اب اگر میں ان کے پاس تبلیغ کے لیے جاؤں گا تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل ہی نہ کر دیں۔ کیونکہ وہ تو بہر حال یہی سمجھیں گے کہ میں نے ان کا آدمی عمداً قتل کیا تھا حالانکہ میرا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا بلکہ مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑانا مقصود تھا۔

فرعون کے پاس مخبری

بہر حال قبطی جان گیا کہ کل والا قتل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہوا ہے۔ وہ فوراً فرعون کے دربار میں پہنچا اور اسے حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ فرعون پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کی بعض باتوں سے ناراض تھا۔ کیونکہ آپ ہر برے کام پر تنقید کرتے تھے

ے بیان القرآن صفحہ ۱۰۵/۸ (فیاض)

اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ اب فرعون کو یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارا دشمن ہے۔ کہیں یہ وہی نہ ہو جس کی پیشین گوئی نجومیوں نے کی تھی کہ وہ ہماری سلطنت کو تہس نہس کر دے گا۔ چنانچہ تمام امراء، وزراء اور مشیران حکومت کو اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا۔ سارے عمائدین جمع ہوئے اور بالآخر یہی طے پایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فوراً گرفتار کر لیا جائے کیونکہ یہ شخص ہماری سلطنت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

فرعون کے حواریوں کا یہ اجلاس ابھی جاری تھا اور اُدھر وَجَاۤءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى شہر کی دوسری طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ اور کہنے لگا اے موسیٰ علیہ السلام! فرعون کے درباری تیرے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجھے یہی نصیحت کرتا ہوں فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ آپ یہاں سے نکل جائیں بیشک میں آپ کے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

یہ شخص کون تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی منصوبے سے آگاہ کیا؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ شخص وہی مردِ مومن تھا جس کے نام پر قرآن پاک کی سورۃ مومن ہے۔ سورۃ مومن میں آتا ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ (آیت - ۲۸) یہ شخص فرعون کے خاندان کا فرد تھا۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا مگر اس وقت تک ایمان کو چھپا رہا تھا یہ شخص ابتداء سے ہی موسیٰ علیہ السلام کا خیر خواہ تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ کا آغاز کیا تھا تو اس وقت بھی اس مومن شخص نے قبطیوں کو موسیٰ علیہ السلام سے ساتھ زیادتی کرنے سے منع کیا تھا۔ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ (آیت - ۲۸) کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟

موسیٰ علیہ السلام کا خروج

جب مردِ مومن نے آکر یہ اطلاع دی فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ

۱۔ کشاف صفحہ ۳۹۹ ج ۳، و مدارک صفحہ ۲۳۰ ج ۳ (فیاض)

تو موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکل کھڑے ہوئے خوف کھاتے ہوئے راہ دیکھتے تھے کہ اب کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ آپ کو تشویش تھی کہ میں بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا فرعونی کارندے میرا تعاقب کر کے پکڑ لیں گے۔ لہٰذا وہ مڑ مڑ کر پیچھے بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے بارگاہِ رب العزت میں دعا بھی کی قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ کہنے لگے اے میرے پروردگار! مجھے ظالم قوم سے نجات دے دے۔ مجھے ان کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا۔ چنانچہ عام اہلِ ایمان کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ بھی اس طرح دعا کیا کریں رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (یونس ۸۵، ۸۶) اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم قوم کی آزمائش میں نہ ڈال، اور اپنی رحمت سے کافروں کی قوم سے نجات دینا۔ آج دنیا کی ظالم قومیں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑ رہی ہیں، لہٰذا دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ان کے پنجۂ استبداد سے محفوظ رکھے۔

موسیٰ علیہ السلام یہ دعا کر کے اس شہر سے نکل پڑے۔ آگے جس منزل پر پہنچے اس کا حال آگے بیان ہو رہا ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٽ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٽ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ:- اور جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ کی مدین کی طرف تو انہوں نے کہا، اُمید ہے کہ میرا پروردگار میری راہنمائی فرمائے گا سیدھے راستے کی ﴿۲۲﴾ اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو پانی انہوں نے وہاں ایک جماعت لوگوں کی جو پانی پلاتے تھے۔ اور پایا اُن کے درے دو عورتوں کو جو اپنے جانوروں کو روک رہی تھیں۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کیا حال ہے تمہارا۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم نہیں پلاتیں پانی یہاں تک کہ یہ چرواہے لوٹ

جائیں۔ اور ہمارا باپ عمر رسیدہ بوڑھا آدمی ہے (۲۳) پس پانی پلایا اُن دونوں کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے۔ پھر پلٹے سائے کی طرف اور کہا، اے میرے پروردگار! بیشک میں، تو جو بھی نازل فرمائے میری طرف بہتری سے، محتاج ہوں (۲۴) پس ان دو عورتوں میں سے ایک حیا کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی۔ کہنے لگی، بیشک میرا باپ آپ کو بلاتا ہے تاکہ آپ کو بدلہ دے اُس کا کہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی پلایا۔ پھر جب آئے موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس اور بیان کیا اُن پر حال، تو انہوں نے کہا کہ خوف مت کھاؤ، تو بچ گیا ہے ظالموں کی قوم سے (۲۵)

ربطِ آیات

جب موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی آدمی قتل ہوگیا اور قتل کا الزام بھی آپ پر لگا تو فرعون کے درباریوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس شخص کو سزائے موت دینی چاہیئے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔ اسی اثنا میں موسیٰ علیہ السلام کے ایک خیر خواہ نے آپ کو اطلاع دے دی کہ فرعون نے آپ کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیدیا ہے لہٰذا آپ بلا تاخیر یہاں سے نکل جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً وہاں سے چل دیے، آپ کو پریشانی بھی لاحق تھی کہ پتہ نہیں اب کیا صورتِ حال پیش آئے گی اور اسی ضمن میں آپ پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتے تھے۔ اندریں حالات آپ نے یہ دُعا بھی کی، پروردگار! نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ مجھے ظالم قوم سے بچالے۔ اللہ نے آپ کی یہ دُعا قبول فرمائی اور آپ کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو مدین کی طرف جاتا تھا اور جہاں آپ کو امان حاصل ہو سکتی تھی۔ اُس زمانے میں فرعون کی عملداری سے باہر قریب ترین علاقہ مدین کا ہی تھا، لہٰذا آپ اُسی طرف چل دیے۔

مدین کا سفر

ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین

کی طرف توجہ یعنی رخ کیا تو راہِ مدین کی اس کشمکش کے درمیان قَالَ آپ کی زبان سے یہ نکلا عَسٰی رَبِّیٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ امید ہے میرا پروردگار سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔ آپ منزل کے راستے سے واقف نہیں تھے، ویسے بھی پریشانی لاحق تھی تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے راستے کی دعا بھی کی۔ اس شہر سے مدین آٹھ دس دن کی مسافت پر تھا۔ آپ بے سروسامانی کی حالت میں چل دیئے، نہ کوئی توشہ، نہ دیگر زادِ سفر، آپ اللہ کے بھروسے پر تن تنہا چلتے گئے۔ راستے بھر شکم پروری کے لیے درختوں اور جھاڑیوں کے پتوں اور گھاس پھونس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آپ اسی حالت میں دس دن کے سفر کے بعد مدین پہنچ گئے۔

دورانِ سفر کے تفصیلی حالات کا ذکر قرآن پاک نے نہیں کیا۔ البتہ وہاں پہنچ جانے کے بعد کے حالات کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ جب آپ مدین کے پانی یعنی کنوئیں پر پہنچے۔ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ تو آپ نے وہاں پر لوگوں کی ایک جماعت کو پایا جو جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔

مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے چل کر خلیج عقبہ کے کنارے مدین پہنچے یہاں پر آنے کا خیال اللہ نے آپ کے دل میں اس لیے ڈالا کہ آپ کو اس مقام کے ساتھ کچھ مناسبت بھی تھی۔ مدین کی بستی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کے نام پر موسوم تھی۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ لہٰذا ادھر آنے میں آپ کے لیے اللہ نے ایک خاص کشش پیدا کر دی تھی۔ اب مدین کی بستی تو وہاں موجود نہیں البتہ اس کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے سیاح اب بھی جاتے ہیں وہاں کے مقامی لوگ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے تاریخی مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دو کنوئیں بھی دکھاتے ہیں جو اب ویران ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کنوئیں سے موسیٰ علیہ السلام نے پانی نکال کر شعیب علیہ السلام کی بچیوں کو پلایا تھا۔ اس زمانے کے لوگ پانی کی ضروریات اسی کنوئیں سے پوری کرتے تھے۔

---

[1] قرطبی ص ۲۶۹ ج ۱۳ وفیاض،

شعیب علیہ السلام کی بکریوں کی سیرابی

بہر حال موسیٰ علیہ السلام دس دن کے سفر کے بعد تھکے ماندے مدین کے کنوئیں
پر پہنچے۔ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ
امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ اُن لوگوں کے علاوہ آپ نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے جانوروں
کو پانی پر جانے سے روک رہی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو شروع سے ہی کمزوروں کے حامی
اور ظالموں کے دشمن تھے۔ یہ ماجرا دیکھ کر وہ رہ نہ سکے اور اُن دو عورتوں کی طرف
متوجہ ہوئے قَالَ مَا خَطْبُكُمَا کہنے لگے تم دونوں کا کیا حال ہے یعنی
کیا وجہ ہے کہ تم اپنی بکریوں کو پانی کی طرف جانے سے روک رہی ہو جب کہ
انہیں بھی پانی کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا قَالَتَا
لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ دونوں نے کہا کہ ہم اپنے جانوروں کو اُس
وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو سیراب کر کے
چلے نہ جائیں۔ ہم اپنے جانوروں کو اس لیے روک رہی ہیں کہ یہ چرواہے فارغ ہو کر
چلے جائیں تو بچا کھچا پانی ہم بھی اپنی بکریوں کو پلا لیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وَاَبُوْنَا
شَيْخٌ كَبِيْرٌ اور ہمارا باپ بوڑھا اور عمر رسیدہ آدمی ہے۔ وہ اس قابل نہیں
کہ مشقت کا کام کر سکے لہٰذا بامر مجبوری جانوروں کی دیکھ بھال ہمیں کرنا پڑتی ہے۔
یہ سُن کر موسیٰ علیہ السلام کا دل بھر آیا۔ اگرچہ وہ خود طویل سفر کر کے تھکے ہارے پہنچے
تھے مگر انہوں نے لڑکیوں کی مدد کرنا ضروری سمجھا فَسَقٰى لَهُمَا چنانچہ آپ نے
اُن کے جانوروں کو پانی نکال کر پلایا۔ چونکہ آپ کو عنقریب نبوت ملنے والی تھی
اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو مختلف آزمائشوں میں ڈال رہا تھا۔ سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ
کا ارشاد ہے وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (طٰہٰ ۴۰) ہم نے تمہیں مختلف طریقوں سے آزمایا
مصر سے مدین تک کا طویل سفر بھی آپ کی آزمائش تھی۔ اس سے پہلے پیدائش
کے وقت بھی آپ کی آزمائش ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی آپ کو بار بار آزمائش
میں ڈالا گیا اور آپ ہر بار سرخرو ہوئے۔ آپ کی اس غریب الوطنی کے باوجود آپ
کے دل میں شفقت کا جذبہ بیدار ہوا اور آپ نے اُن عورتوں کے جانوروں کو پانی پلا

انبیاء کے جذبات ایسے ہی پاکیزہ ہوتے ہیں۔ وہ خود بھوکے پیاسے رہ کر بھی دوسروں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اُن کی نیت اور عزائم نیک ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ غریب الوطنی میں بھی مستحقین کی مدد کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کام کیا۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے[۱] کہ اُس علاقے کے چرواہے جب اپنے جانوروں کو پانی پلا لیتے تھے تو کنوئیں پر بھاری پتھر رکھ جاتے تھے تاکہ کوئی دوسرا شخص پانی نہ نکال سکے۔ وہ پتھر دس آدمی بھی مل کر بمشکل ہلاتے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام نے تن تنہا اس پتھر کو سرکا کر پانی کا ایک ڈول نکالا اور بکریوں کو پلایا۔

مرد و زن کے ہیے دائرہ ہائے کار

اس آیت کریمہ سے لڑکیوں کی مجبوری کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ مخصوص حالات کی بناء پر بکریوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مشقت کے تمام کام مردوں کی ذمہ داری ہے نہ کہ عورتوں کی۔ کھیتی باڑی، تجارتی سفر، کان کنی، حیوانات کی پرورش وغیرہ مردوں کے ذمے ہیں۔ اللہ نے مردوں اور عورتوں کے لیے مختلف دائرہ ہائے کار متعین فرمائے ہیں۔ باہر کا کام مردوں کے ذمے ہے۔ جب کہ گھر کی چار دیواری کے اندر بچوں کی دیکھ بھال اور امورِ خانہ داری عورتوں پر عاید ہوتے ہیں۔ آج مغربی تہذیب کے شیدائی محض پراپیگنڈا کے زور پر مرد و زن کو شانہ بشانہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دونوں اصناف کے حقوق و فرائض مختلف ہیں اور ان کا اختلاط معاشرے میں بے راہ روی کا باعث بن رہا ہے اس حد تک تو درست ہے کہ بحیثیت انسان ہونے اور مکلف ہونے کے مرد و زن برابر ہیں مگر صنف کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ ایک صنف نازک ہے اور دوسری مشاق۔ برابری کا تصور خلافِ فطرت ہے۔ ہر صنف کے الگ الگ حقوق اور جدا جدا فرائض ہیں۔ جو لوگ عورتوں کو معاشرے کے ہر میدان میں کھینچ لانا چاہتے ہیں، وہ حقوق و فرائض سے تجاوز کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسمبلیوں کی نشست، کارخانوں اور دفتروں کی ملازمت، پولیس اور فوج میں بھرتی، کھیلوں کے میدان میں آمد، صنفِ نازک کے لیے ہرگز روا نہیں۔ البتہ جہاں عورت کی حیاداری کو ملحوظ خاطر

[۱] ابن کثیر ص ۳۸۳ ج ۳ (فیاض)

رکھتے ہوئے اس کے لیے کام کرنا ممکن ہو، وہاں وہ اپنا فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ مثلاً اپنے زیر اہتمام سکول و کالج میں تعلیم دے سکتی ہے۔ ایسے اداروں میں جہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط نہ ہو، وہاں جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں مرد و زن مل کر کام کریں گے وہاں لازماً خرابی پیدا ہوگی۔ لہٰذا اس معاملہ میں امریکہ، روس اور یورپ کی اندھی تقلید کی بجائے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق عریانی اور فحاشی سے بچ کر بہتر طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام کا آرام کرنا

جب موسیٰ علیہ السلام ہمدردانہ جذبے کے تحت دو عورتوں کی بکریوں کو پانی پلا چکے ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ پھر آپ سائے کی طرف پلٹے۔ قریب ہی کوئی درخت تھا، اُس کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس سے لڑکیوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی مسافر آدمی ہے جس کی یہاں کوئی جان پہچان نہیں۔ لہٰذا تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے سائے میں بیٹھ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسافروں کا گھر بار تو ہوتا نہیں، وہ ذرا سستانے کے لیے سائے کا ہی رُخ کرتے ہیں۔ کسی ایسے ہی مسافر نے کہا تھا

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا شئے غریب الوطنی ہوتی ہے

دنیا کے مسافر کی طرح آخرت کا مسافر بھی غریب الوطن ہوتا ہے جو قبر میں تنہا پڑا رہتا ہے۔ کسی شاعر نے اس سے یہ تصور باندھا ہے

دن کو نور برستا ہے مری تربت پر
اور رات کو چادرِ مہتاب تنی ہوتی ہے

بہرحال موسیٰ علیہ السلام چھاؤں میں آکر بیٹھ گئے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے[1] کہ جب وہ شام و فلسطین گئے تو وہاں سے مدین دو دن کی مسافت پر تھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں جانے کے لیے میں نے سواری کو تیز چلایا۔ جب وہاں پہنچا تو میں نے وہاں کے اُن تاریخی مقامات کے متعلق دریافت کیا۔ چنانچہ مجھے وہ کنواں دکھایا گیا جہاں سے موسیٰ علیہ السلام نے پانی نکالا تھا اور وہ درخت بھی جس کے نیچے آپ نے آرام فرمایا تھا۔ کہتے ہیں کہ میرے اونٹ نے اُس درخت کے کچھ پتے

[1] ابن کثیر ص ۳۸۴/۳۲۰ و طبری ص ۵۸ ج ۲۰ (فیاض)

بھی کھلانے مگر وہ اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھے لہٰذا پھینک دیے۔ کہتے ہیں کہ میں نے وہاں موسیٰ علیہ السلام کے لیے دُعا کی اور واپس آگیا۔ اس واقعہ کو امام طبریؒ اور امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

سایے میں بیٹھ کر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت پر غور کیا اور پھر یہ دُعا بھی کی۔ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ کہنے لگے، اے میرے پروردگار! تو میری بہتری کے لیے جو کچھ بھی اُتارے میں اُس کا محتاج ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے فضل کی بھیک مانگی۔ ذرا غور فرمائیں کہ آپ اللہ کے مقرب بندے ہیں مگر اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس سے بہتری کے طلبگار ہیں۔ آپ نے مشکل کشائی اور حاجت روائی کا دعویٰ نہیں بلکہ اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہے۔ اللہ کی ساری مخلوق اُس کی محتاج ہے، خواہ وہ فرشتے ہوں، جنات ہوں، انسان ہوں، پیغمبر ہوں یا ولی ہوں، اس کی رحمت کے بغیر کسی کو جائے پناہ نہیں۔ اللہ کا فرمان ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (فاطر۔ ۱۵) لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور وہ غنی اور تعریفوں والا ہے۔ ہر جاندار کھانے، پینے، چلنے پھرنے، صحت، آرام حتیٰ کہ سانس لینے تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الرحمٰن۔ ۲۹) آسمان و زمین کی ساری مخلوق اُسی کے در کی سوالی ہے۔ باشعور مخلوق زبانِ قال سے مانگ رہی ہے جب کہ بے شعور اشیا زبانِ حال سے اپنی حاجت طلب کرتی ہیں۔ مانگنے والے سب ہیں مگر دینے والا صرف خدا تعالیٰ ہے۔ یہ تو انسانوں کی بدبختی ہے جو مخلوق میں سے بعض کو حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے سوا کسی کے کچھ اختیار میں نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی لیے کہا تھا کہ تو ہی مجھ پر مہربانی کرے۔ میں اس کے لیے محتاج ہوں۔

شرم و حیا کی پیکر

موسیٰ علیہ السلام کو سائے میں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ کہ اُن دو لڑکیوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی۔ اس ایک لفظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے شرم و حیا کے مسئلہ کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ حیا تو مردوں کے لیے بھی ضروری ہے مگر یہ چیز اللہ نے عورت کی فطرت میں ڈال دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا حَیَآءَ لَہٗ جس میں حیا نہیں اُس میں ایمان بھی نہیں۔ بہرحال وہ لڑکی شرم و حیا کا پیکر بن کر باپردہ، جھکی نظروں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی۔ بعض فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے بات کرتے وقت اُس نے اپنے منہ پہ آستین کا پلو رکھ لیا تھا۔

شرم و حیا تو عورت کا زیور ہے مگر آج دنیا میں دیکھ لیں کہ اس کو کس طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات اور رسائل میں عورتوں کی نیم عریاں تصویریں کس قدر بے حیائی کا ثبوت ہے۔ مغربیت اور الحاد نے لوگوں کو کس بے راہ روی پہ ڈال دیا ہے۔ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے نئے نئے ڈیزائنوں کی نمائش اور میک اپ کے نئے نئے طریقے لوگوں کو کس طرف لے جا رہے ہیں۔ تمام ذرائع ابلاغ عریانی اور فحاشی کی تشہیر میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی اور سٹیج پہ نسوانی گانوں کی بھرمار ہے۔ ہم اسے ترقی کا زینہ سمجھ رہے ہیں حالانکہ اس پہ خدا کی لعنت برس رہی ہے۔ معاشرے میں بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق بگڑتے ہیں اور نسلیں خراب ہوتی ہیں۔ پہلے یہ فحاشی صرف سنیما گھروں میں حاصل ہوتی تھی۔ اب ٹی وی اور وی سی آر کے ذریعے ہر گھر اس کا اڈا بن چکا ہے۔ ہم مغرب والوں کی کتنی بھی نقالی کر لیں۔ ان کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اُن سے یہ تباہ کن عریانی اور فحاشی ہی لے سکتے ہیں ورنہ جس ٹیکنالوجی کی ہمیں ضرورت ہے۔ وہ ہرگز دینے پہ تیار نہیں۔ الحاد کے اس بہ

تیار مال دیں گے۔ اپنے آدمی بطور مشیر بھیجیں گے۔ مگر مطلوبہ ٹیکنالوجی دینے کے لیے تیار نہیں کہ کہیں یہ بھی ہمارے ہم پلہ نہ بن جائیں امریکہ کے ساتھ طویل ترین دوستی کے باوجود وہ آپ کو ایٹمی ٹیکنالوجی دینے کے لیے تیار نہیں۔ فرانس نے کس قدر آمادگی ظاہر کی تھی مگر اُس کو بھی روک دیا گیا ہے۔ تمام بڑی طاقتیں مسلمانوں کی ازلی دشمن ہیں اور وہ انہیں کبھی پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ ہمیشہ اپنا دست نگر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب بھی کوئی چیز حاصل کی اللہ کے بھروسے پر اپنی ذہانت سے غیر اقوام کے بھروسے پر کبھی کچھ نہیں ملے گا۔ یہ تو انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن کو اختیار کرنا اور پھر اُس پر فخر کرنا تو لعنت ہے۔ ہمارا تمدن تو قرآن پاک اور اسوۂ حسنہ کی تعلیمات میں مضمر ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے اپنی وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ مجھے رات کے وقت دفن کرنا تاکہ میری میت پر بھی کسی غیر مرد کی نگاہ نہ پڑے۔ مگر آج ہم جس طرف جارہے ہیں وہ تباہ کن ہے۔

شعیب علیہ السلام کی طرف سے دعوت

بہر حال ان میں سے ایک لڑکی شرم و حیا کا پیکر بن کر آئی۔ قَالَتْ اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ بے شک میرا باپ تجھے بلاتا ہے۔ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا تاکہ وہ آپکو بدلہ دے اُس چیز کا جو آپنے ہمارے جانوروں کو پانی پلایا ہے۔

مفسرین کرامؒ بیان کرتے ہیں کہ جب لڑکیاں بکریوں کو پانی پلا کر واپس اپنے گھر گئیں تو اُن کے باپ نے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے آگئیں؟ انہوں نے بتایا کہ وہاں کنوئیں پر ایک مسافر آگیا تھا جس نے ہمدردی کے طور پر ہماری بکریوں کو پانی نکال کر پلایا، اور اب وہ وہاں سائے میں آرام کر رہا ہے۔ باپ نے کہا کہ تم نے اُسے بلا لیا ہوتا تاکہ ہم اس کو کھانا کھلاتے۔ وہ مسافر پتہ نہیں کب سے بھوکا پیاسا ہے، اور کیسا ہے؟ بہرحال اس لڑکی نے اپنے باپ کی طرف سے دعوت دی کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے، کیونکہ اُس کا اپنی طرف سے دعوت پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اور ادب کا تقاضا بھی یہی تھا کہ بڑوں کو مقدم رکھا جائے

[1] کشاف ۴۰۲/۳ (فیاض)

لہٰذا اُس نے ہی کہا کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام لڑکی کے کہنے پر چل پڑے فَلَمَّا جَآءَهٗ پھر جب وہ اُس کے پاس پہنچے وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ اور اُس کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا کہ اس طرح میرے ہاتھوں سے قتل ہو گیا ہے اور فرعونی حکومت مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا میں ادھر بھاگ آیا ہوں۔ آپ کی سرگزشت سن کر اُس بزرگ نے کہا قَالَ لَا تَخَفْ خوف نہ کھاؤ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ تم ظالم قوم کی دست برد سے بچ نکلے ہو۔ اس علاقے میں فرعون کی عملداری نہیں ہے۔ نہ اُس کے کارندے یہاں آتے ہیں۔ لہٰذا تم بے فکر ہو جاؤ۔ اللہ نے تمہیں اُن کے ظلم سے بچا لیا ہے۔

مفسرین کرام[1] بیان کرتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو کھانا پیش کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ میں اُس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جو نیکی کے کام پر بدلہ نہیں لیا کرتے۔ تو اُس بزرگ نے کہا کہ ہماری عادت بھی یہ ہے کہ ہم مسافروں کو ضرور کھانا کھلاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے بہت سے واقعات زبان زدعام ہیں۔ خود حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَنْ لَّمْ يُكْرِمْ ضَيْفَهٗ فَلَيْسَ مِنَّا جو شخص مہمان کی عزت نہیں کرتا وہ ہماری جماعت سے نہیں ہے۔ واقف کار کی عزت تو کی ہی جاتی ہے ناواقف کی مہمان نوازی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جاننے پہچانے مہمان کی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ آپ کے صحابہ کرامؓ آپ کے حکم کے مطابق یَحْفَظُوْنَ الْغَرِیْبَ مسافر کی حفاظت کرتے تھے اور اس کو بھوکا پیاسا نہیں چھوڑتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں بلانے والے بزرگ کون ہیں؟ اس کے متعلق[2] اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے جلیل القدر نبی شعیب علیہ السلام ہیں اور بعض دوسرے احباب کہتے ہیں کہ آپ شعیب علیہ السلام نہیں کیونکہ ان کے زمانے اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں چار سو سال کی مسافت ہے

۱ ابوالسعود ج ۱۵/۲۶ ۲ ابن کثیر ص ۳۸۳/۳ (فیاض)

اور فرماتے ہیں کہ آپ شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ تاہم زیادہ مشہور یہی ہے کہ آپ شعیب علیہ السلام ہی ہیں۔ اللہ نے آپ کا نام قرآن میں نہیں بتلایا۔ بائیبل میں راویل یا رعوایل کا ذکر آتا ہے۔ کہیں یثرون نام ذکر کیا گیا ہے اور کہیں حوباب بھی آتا ہے۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ آپ اللہ کے نیک سیرت انسان تھے۔

قَالَتۡ اِحۡدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ اِنَّ خَيۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِىُّ الۡاَمِيۡنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّىۡۤ اُرِيۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ اِحۡدَى ابۡنَتَىَّ هٰتَيۡنِ عَلٰۤى اَنۡ تَاۡجُرَنِىۡ ثَمٰنِىَ حِجَجٍ‌ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِكَ‌ۚ وَمَاۤ اُرِيۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَيۡكَ‌ؕ سَتَجِدُنِىۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكَ‌ؕ اَيَّمَا الۡاَجَلَيۡنِ قَضَيۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَىَّ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ ﴿۲۸﴾ ع

ترجمہ:- کہا اُن دونوں عورتوں میں سے ایک نے، اے میرے باپ! آپ اس شخص کو ملازم رکھ لیں، بیشک ملازمت کے لیے بہتر آدمی وہ ہے جو طاقتور اور ایماندار ہو (۲۶) کہا (شعیب علیہ السلام) نے بیشک میں چاہتا ہوں کہ نکاح کردوں تیرے ساتھ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا، اس شرط پر کہ تم میری ملازمت کرو آٹھ سال تک۔ پس اگر تم پورے کر دو دس سال تو یہ تمھاری طرف سے ہوگا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں مشقت ڈالوں تجھ پر۔ عنقریب تم پاؤ گے مجھے اگر اللہ نے چاہا، نیکی والوں میں سے (۲۷) کہا (موسیٰ نے) یہ (معاہدہ) میرے اور آپ کے درمیان طے پایا۔ دونوں مدتوں میں سے جونسی مدت میں پوری کروں، مجھ پر کوئی تعدی نہیں

ہوگی۔ اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے (۲۸)

ربطِ آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بہت سی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اور اس کے بعد کے واقعات تو سورۃ الشعراء میں بیان ہوئے ہیں۔ البتہ ابتدائی زندگی کے بیشتر واقعات بیان اس سورۃ میں مذکور ہیں۔ ان واقعات کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی ان سے نصیحت حاصل کریں۔ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، آپ کی پرورش، پھر آپ کے ہاتھوں ایک قبطی کا قتل، فرعونیوں کا موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا مشورہ، پھر ایک مومن آدمی کا موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کرنا اور آپ کا مصر سے نکل کر مدین جانا، وہاں دو عورتوں کی بکریوں کو پانی پلانا اور پھر لڑکیوں کے باپ کا آپ کو اپنے گھر طلب کرنا، یہ سب واقعات بیان ہو چکے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے حالات سن کر لڑکیوں کے باپ (شعیب علیہ السلام) نے آپ کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو، اب تم قوم فرعون کی عملداری سے نکل آئے ہو، اللہ تعالیٰ ان ظالموں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

ملازمت کے لیے سفارش

شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر بلایا اور ان سے ساری داستان سنی اور تسلی دی۔ اس کے بعد جب آپ کو کھانا کھلایا گیا، پھر ان خواتین میں سے ایک نے اپنے باپ سے اس طرح بات کی قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا ان میں سے ایک کہنے لگی يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اے اباجی! اس شخص کو اپنا نوکر رکھ لیں۔ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں، بینائی بھی جاتی رہی ہے۔ کام کاج نہیں کر سکتے لہٰذا بکریوں کی دیکھ بھال کے لیے اس شخص کو اپنے ہاں اجیر رکھ لیں تو بڑا اچھا ہوگا۔

اس عورت کا نام یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم تفاسیر میں اس کا نام صفورا بیان کیا گیا ہے جب کہ چھوٹی بہن کا نام شرفا تھا۔ تو صفورا نے سفارش کی کہ یہ شخص غریب الوطن ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے حادثات پیش آئے ہیں جن کی وجہ سے خوفزدہ ہے۔ تو آپ اس کو یہاں تنخواہ پر نوکر رکھ لیں، اس کی مصروفیت کا سامان پیدا ہو جائے گا اور ہمیں سہولت حاصل ہو جائے گی۔

شرائطِ ملازمت

آگے اس خاتون نے ایک بڑا عمدہ جملہ کہا اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ

الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ اے باپ! آپ انہیں نوکر رکھ لیجئے طاقتور اور امانتدار ہونا چاہیئے ملازمت کے لیے ایسا ہی آدمی بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ شخص ان صفات کا حامل ہے تو لڑکی نے بتایا کہ جب اس شخص نے بڑا وزنی پتھر کنوئیں کے منہ سے ہٹایا تو میں سمجھ گئی کہ اکیلا پیاسا ہونے کے باوجود یہ شخص دس آدمیوں پر بھاری ہے۔ اور امانت اس طرح ثابت ہوا کہ جب میں اسے کنوئیں سے بلا کر گھر لا رہی تھی تو اس کے آگے آگے چل رہی تھی۔ اتفاق ہوا کہ تیز ہوا سے میرے جسم کا کپڑا اڑا تو اس نے کہا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو اور جہاں راستہ تبدیل کرنا ہو مجھے آواز دے دینا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملازمت کی شرائط میں یہ چیز ضروری ہے کہ امیدوار کی قوت یعنی صلاحیت کا جائزہ لیا جائے اور دوسرا یہ کہ وہ دیانتدار بھی ہو۔

صحت ایک بنیادی حق

کام کاج کرنے کے لیے صحت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر ملازم کی صحت اچھی نہیں ہوگی تو وہ اپنے فرائض بطریق احسن انجام نہیں دے سکے گا۔ آج کل اقوام متحدہ (U.N.O) والے انسانوں کے بنیادی حقوق کی بحالی کے دعویدار بنے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ حقوق تو چودہ سو سال پہلے اللہ کے قرآن اور نبی کے فرمان نے واضح کر دیے تھے ابن آدم کے بنیادی حقوق خوراک، پانی، لباس اور مکان ہیں۔ اس کے علاوہ فرائض کی ادائیگی کی خاطر تعلیم بھی فرض عین ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ ہر مرد و زن مسلمان پر علم کا حصول فرض ہے۔ اسی طرح انسان کی صحت بھی ان حقوق میں شامل ہے کہ اس کے بغیر نہ عبادت ہو سکتی ہے اور نہ روزگار۔ کے سلسلے میں مؤثر طور پر یہ انجام دیے جا سکتے ہیں

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مزدور یا کسان کو ہر روز کام پر لگاؤ تو درمیان میں وقفہ بھی دو تاکہ وہ آرام کر سکے مسلسل بارہ بارہ گھنٹے مزدور سے کام لینا زیادتی ہے۔ اُسے مہذب سوسائٹی میں جانے کا موقع ملنا چاہیئے تعلیم حاصل کرنے کا وقت ملنا چاہیئے۔ عبادت کے لیے وقفہ چاہیئے۔ یہ سب چیزیں انسان کی بنیادی

حقوق بھی شامل ہیں اگر وہ آخرت کی فکر نہیں کرے گا تو ہمیشہ کے لیے گھاٹے میں پڑ جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں روم اور ایران والے اپنے غلاموں اور لونڈیوں سے کولہو کے بیل کی طرح کام لیتے تھے اور انہیں ایک بھی معمولی سہولت فراہم نہ کرتے تھے۔ یہ تو ظلم کی بات ہے۔ لہٰذا یہ زمیندار، دکاندار، کارخانے دار کا فرض ہے کہ وہ مزدوروں سے کام لیتا ہے تو ان کے حقوق کا بھی خیال کرے۔

مزدور کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ امانتدار ہو۔ اگر اس میں یہ صفت پائی جاتی ہے تو وہ اپنے کام میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ وقت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ مالک کے مال میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس بددیانت ملازم کام چور ہوگا، مالک کی چوری کرے گا، وقت ضائع کرے گا، اور حیلے بہانے سے کام سے جی چرائے گا۔ یہ دو شرطیں ضروری ہیں۔ جن کی عدم موجودگی میں دنیا میں فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ مالک شاکی ہے کہ مزدور کام نہیں کرتے اور مزدور نالاں ہیں کہ مالک معاوضہ پورا نہیں دیتا۔ آج ہر کارخانے، ہر دفتر اور دکان پر مالک اور نوکر کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فریقین نقصان اٹھاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی مجموعی پیداوار بھی متاثر ہو رہی ہے۔ بہرحال صلاحیت اور دیانت مزدور کی ضروری شرائط ہیں۔

دوسری طرف مالک پر بعض ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر بھی شعیب علیہ السلام کے بیان میں آیا ہے۔ کہ میں تم پر مشقت نہیں ڈالوں گا اور یہ کہ تو مجھے نیکی والوں میں پائے گا۔ اور تیسری ذمہ داری خود حضور علیہ السلام نے واضح کر دی کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔ حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جب کسی مزدور سے مشقت کا کام لو تو اس میں خود بھی اس کا ہاتھ بٹاؤ، اس کو ایسا کام نہ دو جو اس کی قوت اور صلاحیت سے زیادہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص جب کسی شخص کو کام پر لگاتے تو گھر والوں کو تاکید کرتے کہ مزدور کی مزدوری بروقت اور پوری پوری ادا کرنا۔ غرضیکہ مالک بھی نیکی والا ہونا چاہیے۔ جو غریبوں کا استحصال نہ کرے بلکہ ان کے جائز حقوق ادا کرے۔ اسی لیے شعیب علیہ السلام

نے موسیٰ علیہ السلام کو بتلا دیا کہ میں تجھ پر ناجائز مشقت نہیں ڈالوں گا۔ اور تم مجھے نیک والوں میں پاؤ گے۔

تین صاحب فراست ہستیاں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ تین ہستیاں بڑی ہی صاحب فراست ہوئی ہیں۔ ایک شعیب علیہ السلام کی بیٹی صفورا ہے جس نے اپنی ذہانت سے جان لیا کہ موسیٰ علیہ السلام طاقتور اور امانت دار ہیں۔ دوسری ہستی حضرت یوسف علیہ السلام کا خریدار ہے جس نے گھر والوں کو کہا کہ اس غلام کو اچھے طریقے سے رکھنا عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَـتَّخِذَهٗ وَلَدًا ‌(یوسف - ۲۱) شاید کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں اور پھر یوسف علیہ السلام اس امید پر پورے اترے انہوں نے اپنی صلاحیت کی بنا پر مملکت کا سارا کاروبار سنبھال لیا۔ خریدار کا تمام تجارتی کاروبار یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا۔ آپ نے تمام نظم و نسق اس ذہانت سے چلایا کہ آمدنی میں تین گنا اضافہ ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ تیسری صاحب فراست ہستی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر کے بہت بڑی فراست کا ثبوت دیا۔ بعد میں اس انتخاب نے ثابت کر دیا کہ آپ امت کے حق میں بہترین آدمی تھے۔

شعیب علیہ السلام کے حالات

صاحب تفسیر مظہری اور بعض دیگر مفسرینؒ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور اکثر گریہ کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی۔ اللہ نے فرمایا شعیب! روتے کیوں ہو؟ کیا جنت کا شوق ہے یا جہنم کا خوف ہے؟ تو آپ نے عرض کیا، پروردگار! شَوْقًا اِلٰى لِقَآئِكَ تیری ملاقات کے شوق میں روتا رہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے وحی نازل فرما کر آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی هَنِيْئًا لَّكَ لِقَآئِیْ يَا شُعَيْبُ یعنی اے شعیب! تمہیں میری ملاقات مبارک ہو، وہ یقیناً تمہیں نصیب ہوگی۔ اسی واسطے میں نے تیری خدمت کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو بھیج دیا ہے۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ میں نے اپنے کلیم کو تیری خدمت پر مامور کر دیا ہے۔ بعض کہتے ہیں

ؔ کشاف ص ۴۰۴ ج ۳ و کبیر ص ۲۴۲ ج ۲۴ و مدارک ص ۲۳۳ ج ۳ و معالم التنزیل ص ۱۳۱ ج ۳ و خازن ص ۱۳۱ ج ۵ والسراج المنیر ص ۹۵ ج ۳ (فیاض)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح اللہ نے شعیب علیہ السلام کی بینائی بھی لوٹا دی تھی۔

اسبابِ ظاہرہ سے استفادہ

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ظاہری اسباب یعنی مزدوری اور جائز اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔ بوقت ضرورت موسیٰ علیہ السلام کا ملازمت اختیار کرنا بالکل درست تھا۔ البتہ بعض حالتوں میں ترک اسباب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں ہے جب کہ برداشت کا مادہ بھی موجود ہو۔ مثلاً پرانے زمانے کے بعض علما اسباب کو اختیار نہیں کرتے تھے کہ ان کے حصول علم میں کمی نہ آ جائے۔ ایسی حالت میں وہ دست سوال بھی دراز نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ کے بھروسے پر اشتغال علم میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاری، عبدالرزاق ابن ہمام اور ابن جریر طبری کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جنہوں نے حصول علم کے لیے طویل سفر کیے مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آج تو دینی مدارس میں طالبعلموں کے لیے خاطر خواہ انتظامات ہو گئے ہیں اور انہیں لباس، خوراک، رہائش اور دوسری ضروریات زندگی دستیاب ہیں مگر سلف صالحین اگر کسی شریف آدمی کی سرپرستی بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ امام ابن جریر گھر سے نکلے تو والد نے چھوٹے چھوٹے دو صد ۲۰۰ کلچے تیار کر کے ساتھ دے دیے۔ چنانچہ آپ نے دو سو دن تک انہی کلچوں پر گزارہ کیا اور کسی سے کھانے کا سوال نہ کیا۔ امام ابو حنیفہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ زیادہ وقت تحصیل علم میں صرف کرتے تھے اور کچھ وقت [illegible] کے علاقے میں محلی فروخت کرتے تھے، اور اس طرح اپنے ضروری اخراجات پورے کرتے تھے۔ بہر حال ظاہری اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔ اور اگر ایسا کرنا حصول علم یا جہاد میں شرکت کے منافی ہو تو اسباب کا ترک کرنا بھی روا ہے بشرطیکہ برداشت کا مادہ موجود ہو۔ اور اس سلسلے میں مزدوری یا ملازمت کرنا بھی بالکل جائز ہے۔

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے سفر کے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسافری کی حالت میں بوقت ضرورت کھانا طلب کرنا بھی جائز ہے

اللہ کے برگزیدہ بندے جب اُس بستی میں پہنچے تو انہیں بھوک لگ رہی تھی۔ انہوں نے بستی والوں سے کھانا طلب کیا مگر انہوں نے مہمان نوازی سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود خضر علیہ السلام نے اس بستی میں ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دیا اور اس پر اُجرت بھی نہیں لی تھی۔ مطلب یہ کہ بوقت ضرورت کھانا طلب کرنا جائز ہے۔

[illegible] پیشکش

جب شعیب علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے واقف ہوئے اور ان کی نیکی نے متاثر کیا کہ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ تو کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ تمہارا نکاح کر دوں مگر شرط یہ ہے کہ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ تم آٹھ سال تک ہماری ملازمت کرو یعنی بکریوں کی دیکھ بھال کرو۔ یہ بات تو نکاح کے لیے ضروری ہے۔ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ اور اگر آپ آٹھ کی بجائے دس سال پورے کر دیں تو یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اور پانچویں بات یہ کہ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ تم مجھے نیکوں میں سے پاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کروں گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام کے تحت ملازمت کے دس سال پورے کیے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں[1] کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی اس قسم کے حالات پیش آئے۔ آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پورے آٹھ سال کے بعد آپ کا تسلط مکہ پر جما دیا۔ ایک سال کی شرائط کو ساتھ دی گئی کہ اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال [illegible] بیت اللہ شریف میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی۔ پھر آپ نے دسویں سال حجۃ الوداع ادا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ آپ کے ہمراہ تھے اور اس طرح دس سال کے عرصے میں اعلاء ہو[...]

[1] موضح القرآن ص ۵۱۹ (فیاض)

مکمل غلبہ اور مشرکین کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

حق خدمت بطور حق مہر

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دس سال تک بکریاں چرانا ان کی طرف سے حق مہر تصور ہوگا یا نہیں۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر وہ بکریاں موسیٰ علیہ السلام کی ہونے والی بیوی کی تھیں تو پھر تو دس سال کی مزدوری حق مہر میں شمار ہو سکتی ہے کیونکہ حق مہر بیوی کا حق ہوتا ہے۔ اور اگر بکریاں اس کے والد کی تھیں تو یہ حق مہر نہیں بن سکتا۔ اس سلسلہ میں فقہائے احناف کا مسلک یہ ہے کہ بیوی کے والد کی مزدوری حق مہر نہیں بن سکتا کیونکہ حق مہر نکاح کا لازمی جزو ہے اگرچہ بوقت نکاح اس کا تقرر ضروری نہیں مگر ہے لازم جو بعد میں بھی بطور مہر مثل (خاندان کی عورتوں کے عام مہر کی مقدار کے برابر) ادا کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان بھی ہے۔ سورۃ النساء میں اللہ نے محرمات نکاح کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ان محرمات کے علاوہ تم باقی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (آیت ۲۴) بشرطیکہ تم نکاح کے لیے اپنا مال خرچ کرو یعنی حق مہر ادا کرو۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ حق مہر میں چونکہ مال کا ذکر ہے اس لیے حق مہر کی مقدار کم از کم دس درہم تو ہونی چاہیے کہ جس مقدار کی چوری پر قطع ید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف دیگر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر وہ حق مہر درست ہے جس پر فریقین راضی ہو جائیں خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔ تاہم امام ابو حنیفہ کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے۔

البتہ امام بیضاوی[1] لکھتے ہیں کہ وہ بکریاں اس لڑکی کی تھیں جس سے نکاح ہوا، حق مہر یہ مزدوری درست ہے لیکن عام طور پر ایسا خیال نہیں کیا جاتا بلکہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ بکریاں تو اس کے والد کی ملکیت تھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دس سال کی اجرت کا حساب لگا کر اگر وہ اس کی اجرت اپنی بیٹی کو ادا کر دیں تو حق مہر ادا ہو جائے گا ورنہ باپ کی بکریاں چرانا بیٹی کا حق مہر نہیں بنتا۔ البتہ متعلقہ عورت کی ذاتی مزدوری کرنا حق مہر میں شمار ہوگا۔ فقہائے کرام یہی فرماتے ہیں۔

---

[1] بیضاوی ص ۱۹۳ (فیاض)

ایسی صورت میں مرد کے ذمے کوئی معیوب کام مثلاً کپڑے دھونا، کھانا پکانا، بچہ یہ جھاڑو وغیرہ دینا نہیں لگانا چاہیے۔ کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ البتہ گھر سے باہر والے کام مثلاً کھیتی باڑی کرنا، ریوڑ چرانا، تجارت کرنا وغیرہ امور سونپے جا سکتے ہیں۔ مفسرین کرام یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ممکن ہے شعیب علیہ السلام کی شریعت میں حقِ خدمت بطور حقِ مہر شمار ہوتا ہو۔ لہٰذا دس سال کی مزدوری حق مہر میں شمار ہو گئی۔

بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ کسی معینہ وقت کے لیے مزدوری کرنے کو حقِ مہر شمار کیا جا سکتا ہے جب کہ بعض دوسرے اصحاب کا خیال ہے کہ حقِ خدمت بطور حقِ مہر شمار نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ حقِ مہر کے لیے مال ضروری ہے جو بوقتِ نکاح یا بعد میں بیوی کو ادا کیا جائے اور مزدوری چونکہ نقد مال نہیں ہے جو قابلِ انتقال ہو، لہٰذا اسے حقِ مہر کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کسی نکاح کی شرائط میں سے اگر کوئی شرط غیر مناسب ہو جیسے وٹہ سٹہ کی شادی، تو ایسی صورت میں ایسی شرط تو باطل ہو گی مگر نکاح ہو جائے گا، گویا باطل شرط سے نکاح فاسد نہیں ہوتا۔

تکمیلِ معاہدہ

جب شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کے نکاح کے لیے اپنی طرف سے شرائط پیش کر دیں کہ تم میری آٹھ یا دس سال تک خدمت کرو، میں تم پر کوئی مشقت نہیں ڈالوں گا، اور تم مجھے ان شاء اللہ صالحین میں سے پاؤ گے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ یہ بات میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ طے ہو گیا اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ میں آٹھ یا دس سال کی جو بھی مدت پوری کروں مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے یہ معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ اور جو بات کرتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نگہبان ہے۔ ہم اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے معاملہ طے کرتے ہیں وہی ہمارا حامی و ناصر ہو گا۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ
جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ
نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ
لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ
الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ
یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ
فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ
یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾
اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ
سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ
بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا
قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ
نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ
اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ۫
اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ
بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ

اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ:- پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے پوری کی مدت اور
لے کر چلے اپنے اہل کو تو انھوں نے دیکھی طور کے کنارے
پہ آگ کو۔ اور کہا اپنے گھر والوں سے کہ تم ٹھہر جاؤ۔ میں
نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں لاؤں تمھارے پاس وہاں سے
کوئی خبر یا کوئی انگارہ سلگا کر تاکہ تم آگ سینک سکو ﴿۲۹﴾
پس جب پہنچے وہاں موسیٰ علیہ السلام تو آواز دی گئی وادی
کی دائیں طرف مبارک خطے میں اُس درخت سے کہ موسیٰ! بیشک
میں اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار ﴿۳۰﴾ اور یہ کہ تم ڈال دو
اپنے ہاتھ سے اپنی لاٹھی۔ اور جب دیکھا اُس کو تو وہ حرکت
کر رہی تھی۔ گویا کہ وہ سانپ ہے۔ پشت پھیری (موسیٰ علیہ السلام)
نے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ فرمایا اللہ نے، اے موسیٰ!
آگے آؤ اور خوف نہ کھاؤ۔ بیشک تم امن والوں میں سے
ہو ﴿۳۱﴾ ڈالو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں۔ نکلے گا وہ سفید
ہو کر بغیر کسی تکلیف کے۔ اور ملاؤ اپنی طرف اپنے بازو
کو خوف سے۔ پس یہ دو سندیں ہیں تمھارے پروردگار کی
طرف سے فرعون اور اُس کے سرداروں کے سامنے۔ بیشک
وہ نافرمان لوگ ہیں ﴿۳۲﴾ عرض کیا (موسیٰ علیہ السلام نے) اے
میرے پروردگار! بیشک میں نے قتل کیا ہے اُن میں سے
ایک جان کو، اور میں خوف کھاتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے قتل
نہ کر ڈالیں ﴿۳۳﴾ اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زبان میں زیادہ

فصیح ہے۔ پس اس کو بھیج دے میرے ساتھ بطور معاون جو میری تصدیق کرے۔ میں خوف کھاتا ہوں کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے (۳۴) فرمایا (اللہ تعالیٰ نے)، ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی کے ساتھ، اور بنائیں گے ہم تم دونوں کے لیے غلبہ۔ پس نہ پہنچیں گے (دشمن) تم دونوں کی طرف۔ ہماری نشانیاں لے کر، تم اور تمہارے پیروکار غالب رہیں گے (۳۵)

ربط آیات

یہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب آپ شعیب علیہ السلام کے گھر پہنچے تو آپ کو اطمینان حاصل ہوا کہ فرعونیوں کے مظالم سے بچ گئے ہیں۔ شعیب علیہ السلام کی دو بیٹیوں میں سے ایک نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو نوکر رکھ لیا جائے۔ یہ شخص بڑا طاقتور اور امانتدار ہے۔ شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو پیشکش کی کہ میں دونوں میں سے ایک بیٹی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں گا بشرطیکہ تم کم از کم آٹھ سال میرے ہاں نوکری کرو۔ اور اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہو گا اور میری طرف سے کوئی سختی نہیں ہو گی۔ البتہ میں تمہارے ساتھ انشاء اللہ اچھا سلوک کروں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پیشکش قبول کر لی اور آپ وہیں رہنے لگے۔ بکریاں چراتے اور دوسرا ضروری کام انجام دیتے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو وہاں رہتے ہوئے آٹھ اور پھر دس سال بھی گزر گئے اور اُن کی ملازمت کی اضافی مدت بھی پوری ہو گئی۔ شعیب علیہ السلام نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی مراجعت از مدین

اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے فَلَمَّا قَضٰى مُوسَى الْاَجَلَ جب موسیٰ علیہ السلام مقررہ مدت پوری کر چکے۔ مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں کہ دو مدتوں میں سے لمبی مدت دس سال پوری کی تھی۔ بعض روایات[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خسر سے ذکر کیا کہ وہ اپنی والدہ اور بھائی کو ملنے

---

[1] السراج المنیر ص ۹۵ ج ۳ و زاد المسیر ص ۲۱۶ ج ۶ [2] روح البیان ص ۳۹۶ ج ۶ (فیاض)

کے تبرک سے خواہشمند ہیں۔ اگر اجازت ہو تو وہ اس مقصد کے لیے مصر کا سفر اختیار کریں۔ خسر نے نہ صرف آپ کو اجازت دے دی بلکہ آپ کی بیوی کو بھی ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ واقعات کے تعلق میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب مدت پوری ہو گئی وَسَارَ بِاَهْلِهٖ تو موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام نے چلتے وقت کچھ بھیڑ بکریاں اور کچھ دوسرا مال بھی بیٹی کو ساتھ دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خادم اور بعض چیزوں کا ذکر بھی آتا ہے۔

میاں بیوی کی یکجا رہائش

اس واقعہ سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو اپنے ساتھ کسی دور دراز جگہ یعنی دوسرے شہر یا ملک میں بھی لے جانا چاہے تو وہ لے جا سکتا ہے۔ لڑکی کے والدین کو اس میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہماری شریعت کا بھی یہی قانون ہے۔ بعض لوگ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بیٹی کو خاوند کے ہمراہ بھیجنے پر طلاق لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ نکاح کے وقت اس قسم کی شرط لگانا کہ ہم بیٹی کو کسی دوسرے شہر یا ملک میں نہیں جانے دیں گے۔ درست نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ نکاح کی شرائط میں سے صرف جائز شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے جو شریعت کے مطابق ہوں۔ کسی خلاف شرع شرط کی پابندی لازمی نہیں۔ مثال کے طور پر شرعی شرائط میں بیوی کو آرام و سکون سے رکھنا، اس کے نان و نفقہ کا بندوبست کرنا، طلاق ہو تو حسب طریق دینا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا وغیرہ شامل ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ شرط لگائے کہ سفر کے دوران بیوی اپنے خاوند کے ہمراہ نہیں جائے گی۔ تو یہ ناجائز ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ حالات کا کیسا ہی تقاضا ہو خاوند دوسری شادی نہیں کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی شرائط باطل ہیں اور شریعت انہیں تسلیم نہیں کرتی۔ نہ ان کی تعمیل ضروری ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال، خادم اور بھیڑ بکریوں کے ہمراہ اپنے سفر پہ

لہ تفسیر جمل ص ۳۴۶ ج ۳ (فیاض)

کے ساتھ مس کریں اور اُسے فیض حاصل ہو۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام اُس پاک خطے میں پہنچے تو وہاں سے آواز آئی اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اے موسیٰ! میں تمام جہانوں کا پروردگار اللہ ہوں۔

دو معجزات

موسیٰ علیہ السلام اس مقام پر گئے تو کوئی خبر معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے تھے مگر وہاں کچھ اور ہی معاملہ پیش آگیا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ابتدائی تعارف کرانے کے بعد فرمایا وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (آیت ۔۱۳) میں نے تجھے رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے، پس سنو جو کچھ آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ اور اب تمہیں میرا پیغام ہے کہ فرعون کے پاس جانا ہوگا۔ اور اس سے دو باتیں کرنی ہوں گی۔ ایک یہ کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے ہمارے ساتھ بھیج دے جیسا کہ سورۃ الشعرآء میں موجود ہے اس مقام پر فرمایا وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ کہ موسیٰ علیہ السلام! اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دو۔ یہ معجزے کا اظہار ہو رہا ہے پہلے اپنی ربوبیت کا تعارف کرایا، پھر معجزے کا اظہار کیا۔ حسب الحکم موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینک دی فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ پھر جب اُس کو دیکھا تو وہ حرکت کر رہی تھی كَاَنَّهَا جَآنٌّ گویا کہ وہ سانپ ہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، مگر اللہ نے فرمایا يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اے موسیٰ! آگے آؤ اور ڈرو نہیں۔ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ بے شک تم امن والوں میں سے ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔

مفسرین[1] بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ لاٹھی حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے روانگی کے وقت دی تھی کہ راستے میں تمہارے کام آئے گی اس سے بکریوں کو ہانک لیا کرنا اور درختوں سے پتے جھاڑ کر ان کی خوراک کا بندوبست کر لیا کرنا۔ بعض[2] کہتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام کی یہ لاٹھی اصل میں آدم علیہ السلام کی تھی جو آپ تک منزل بمنزل انبیاء کی وساطت سے پہنچی، اور پھر آپ نے وہ

[1] السراج المنیر صفحہ ۹۵ جلد ۳ [2] ابو سعود صفحہ ۱۳۳ جلد ۵ وخازن صفحہ ۱۲۱ جلد ۵ (فیاض)

موسیٰ علیہ السلام کو دیدی۔ یہ تفسیری روایات میں آتا ہے، کوئی یقینی بات نہیں ہے۔
بہرحال ایک معجزہ تو یہ ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی نے سانپ کا روپ دھار
لیا۔ اور اللہ نے دوسرا حکم یہ دیا اُسْلُكْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ اپنا ہاتھ اپنے
گریبان میں ڈالو تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ یہ نکلے گا بالکل سفید بغیر کسی
تکلیف یا بیماری کے۔ مطلب یہ کہ سفیدی کسی بیماری از قسم برص کی وجہ سے نہیں ہو
گی بلکہ تمہارا ہاتھ معجزانہ طور پر سورج کی طرح چمکدار اور نورانی ہو جائے گا۔

فرعون کے پاس جانے کا حکم

موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ابھی تک خوف تھا۔ لاٹھی کا سانپ بن جانا ان
کے لیے بڑا ہی عجیب معاملہ تھا۔ نیز وہ فرعون کے پاس جانے سے بھی خوفزدہ تھے
اسی طرح ہاتھ کی سفیدی بھی ان کے لیے خوف کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ ان حالات
میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ
جب آپ ان چیزوں کا خوف محسوس کریں تو اپنے بازو اپنے جسم کے ساتھ
ملا لیں اور انہیں کھلا نہ چھوڑیں، آپ کی خوفزدگی فوراً دور ہو کر دل میں تقویت پیدا
ہو جائے گی۔ فرمایا فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
وَمَلَئِهِ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنے رب کی یہ دو نشانیاں
(عصا اور ید بیضا) لے کر فرعون کے پاس جاؤ۔ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ
بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
إِنَّهُ طَغَىٰ (آیت۔ ۲۴) فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ بڑا سرکش ہو چکا ہے۔ ویسے
تو ساری قوم ہی متکبر تھی مگر فرعون سب سے بڑھا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کون سے
الٰہ کی بات کرتا ہے، میرے سوا اور کون الٰہ ہے میری سلطنت میں نہریں چلتی ہیں
ڈیم بنے ہوئے ہیں، فصلیں بافراط ہیں، ہر چیز کی فراوانی ہے جس کو چاہوں زندہ
رکھوں اور جس کو چاہوں ختم کر دوں، سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ میرے سوا یہ
کس خدا سے ہمیں ڈراتے ہیں؟

موسیٰ علیہ السلام کا عذر

فرعون کی طرف جانے کا حکم پا کر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں اس

راستے میں آنے والی بعض مشکلات کا ذکر کیا۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ
نَفْسًا کہنے لگے پروردگار! میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا اور پھر گرفتار
ہونے کے خوف سے بھاگ کر مدین چلا گیا تھا۔ اگر اب پھر میں فرعون کے پاس
جاؤں گا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ تو مجھے خطرہ ہے کہ وہ مجھے قتل
کر دیں گے۔ میں نے اس شخص کو ارادتاً تو قتل نہیں کیا تھا بلکہ محض ایک مظلوم کی
مدد کے لیے آگے بڑھا تھا مگر ایک گھونسے میں ہی اُس شخص کا کام تمام ہو گیا۔ اب
فرعونی مجھے چھوڑیں گے نہیں۔

ہارون علیہ السلام کی شراکت

اور دوسری بات موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کے انداز میں کی کہ اگر مجھے
ضروری فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جانا ہے تو پھر وَاَخِیْ هٰرُوْنُ
هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا تو پھر میرا بھائی ہارون زبان کے لحاظ سے مجھ سے
زیادہ فصیح ہے۔ میری زبان میں تو قدرے لکنت ہے مگر وہ اپنا مافی الضمیر بہتر
طریقے سے بیان کر سکتے ہیں فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً پس اسے میرے ساتھ معاون
کے طور پر بھیج دے۔ یُّصَدِّقُنِیْٓ جو میری تصدیق کرے کہ واقعی ہم اللہ کے
پیغمبر ہیں اور تمہیں صراطِ مستقیم کی دعوت دینے کے لیے مامور من اللہ ہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں
اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ (آیت ۳۲)
ہارون علیہ السلام کو میرے نبوت کے کام میں شریک کر دے۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ
یُّكَذِّبُوْنِ میں خوف کھاتا ہوں کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔ اللہ نے آپ کی
یہ ساری دعا قبول فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت بھی دور ہو گئی۔ ہارون علیہ السلام
کو نبوت عطا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بطور معاون بھیج دیا۔ یہاں بھی ارشاد
ہوتا ہے قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ اللہ نے فرمایا ہم تمہارے
بھائی کے ساتھ تمہارے بازو کو مضبوط کریں گے۔ یعنی اسے بھی رسول بنا کر تمہاری
تائید کے لیے بھیجیں گے۔ ویسے دنیا کا عام دستور بھی یہی ہے کہ کسی کے بھائی
اس کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ بھائیوں سے انسان کو بڑی توقعات وابستہ ہوتی
ہیں اور وہ دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ کا بڑا احسان تھا کہ اس نے

موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کر اُن کے ہمراہ بھیجا۔

تسلی و حوصلہ

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی بھی دی وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا ہم تم دونوں بھائیوں کو غلبہ عطا کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا کہ فرعون اور اُس کے حواری اور دیگر مخالفین تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ خدا تعالیٰ ایسا انتظام فرما دے گا کہ فرعونی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہ اللہ کی خاص مہربانی اور اس کا فضل تھا کہ حکمرانوں سمیت ساری مستبد قوم کے سامنے یہ دو آدمی دھڑے کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے مگر کسی کو اُن کے خلاف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر فرعون اور اس کے حواریوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کے ارد گرد کافروں، یہودیوں اور منافقوں کا حصار تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کے دل میں خیال آیا کہ حضور علیہ السلام اکیلے ہیں میں کیوں نہ اُن کی حفاظت کے لیے پہرہ دوں۔ چنانچہ آپ ہتھیار پہن کر آپ کے پاس حاضر ہوئے اور دُعا عرض کیا۔ اُدھر سورۃ المائدہ میں اللہ کا پیغام آگیا يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ..... وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (آیت۔ ۶۷) اے اللہ کے رسول! آپ اپنا تبلیغی مشن جاری رکھیں، اللہ تعالیٰ دشمنوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔ نزول آیت کے بعد حضور علیہ السلام گھر سے باہر تشریف لائے اور حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ تم پہرہ ہٹا دو۔ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا خود ذمہ اٹھا لیا ہے چنانچہ آپ واپس اپنے گھر چلے گئے۔ یاد رہے کہ ایسا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے عام مبلغین اس زمرہ میں نہیں آتے۔

فرعون سے حفاظت کی ضمانت

اللہ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام چالیس سال سے زیادہ عرصہ فرعونیوں کے درمیان رہ کر حقِ تبلیغ ادا کرتے رہے مگر اللہ نے اُن کی

جانوں کی حفاظت فرمائی۔ درمیان میں بڑی بڑی تکالیف بھی آئیں حتیٰ کہ ایک موقعہ پر اسرائیلیوں نے شکایت پیش کی کہ اے موسیٰ! تمھاری مدین سے واپسی کے بعد بھی ہماری تکلیفوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہم پہلے بھی فرعون کے ظلم کا شکار تھے اور اب بھی ہم پر مصیبتیں ہی نازل ہو رہی ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو تسلی دیتے ہوئے کہا اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف۔ ۱۲۸) اللہ سے مدد طلب کرو، اور صبر کرو۔ بیشک ساری زمین کا مالک اللہ ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے، اور بہتر انجام متقیوں کا ہی ہوگا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ یہی شکایت حضرت ارتؓ نے حضور علیہ السلام سے بھی کی تھی۔ عرض کیا، کفار بڑی تکلیفیں پہنچا رہے ہیں آپ نے فرمایا، صبر کرو، تم ابھی سے گھبرا گئے ہو، پہلی امتوں کے لوگوں کے سروں پر آرے رکھ کر ان کو دو ٹکڑے کر دیا گیا اور انہوں نے برداشت کیا مگر تم کافروں کی سختی سے ابھی سے گھبرا گئے ہو۔ بالآخر اللہ تعالیٰ تمہیں ہی غالب بنائے گا۔ بعض آزمائشیں از قسم مال کا ضیاع، افرادی قوت میں کمی، اور فصلوں کا نقصان وغیرہ ضرور آئیں گی مگر کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے جو آخر دم تک صراطِ مستقیم پر قائم رہتا ہے۔

بہرحال اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا بِآيَاتِنَا ہماری یہ دو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جاؤ أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب ہوں گے پھر جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، کامیابی اہلِ ایمان کے حصے میں ہی آئی۔ اور فرعون اور اس کے سارے حواری بحرِ قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِـَٔايَـٰتِنَا بَيِّنَـٰتٍ قَالُوا۟ مَا هَـٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَـٰذَا فِىٓ ءَابَآئِنَا ٱلْأَوَّلِينَ ﴿٣٦﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّىٓ أَعْلَمُ بِمَن جَآءَ بِٱلْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِۦ وَمَن تَكُونُ لَهُۥ عَـٰقِبَةُ ٱلدَّارِ ۖ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٣٧﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَـٰهٍ غَيْرِى فَأَوْقِدْ لِى يَـٰهَـٰمَـٰنُ عَلَى ٱلطِّينِ فَٱجْعَل لِّى صَرْحًا لَّعَلِّىٓ أَطَّلِعُ إِلَىٰٓ إِلَـٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّى لَأَظُنُّهُۥ مِنَ ٱلْكَـٰذِبِينَ ﴿٣٨﴾ وَٱسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ﴿٣٩﴾ فَأَخَذْنَـٰهُ وَجُنُودَهُۥ فَنَبَذْنَـٰهُمْ فِى ٱلْيَمِّ ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَـٰقِبَةُ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٤٠﴾ وَجَعَلْنَـٰهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِ ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ لَا يُنصَرُونَ ﴿٤١﴾ وَأَتْبَعْنَـٰهُمْ فِى هَـٰذِهِ ٱلدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ هُم مِّنَ ٱلْمَقْبُوحِينَ ﴿٤٢﴾ ع

ترجمہ:۔ پس جب آئے اُن کے پاس موسیٰ علیہ السلام ہماری نشانیاں لے کر تو کہا انہوں نے کہ نہیں ہے یہ مگر جادو گھڑا ہوا۔ اور

نہیں سُنا ہم نے ایسا اپنے پہلے آباؤ اجداد سے (۳۶) اور کہا
موسیٰ علیہ السلام نے میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو جو ہدایت
لے کر آیا ہے اُس کی طرف سے اور وہ کہ جس کے لیے
اچھا انجام ہے آخرت میں ۔ بیشک نہیں فلاح پا سکتے ظالم
لوگ (۳۷) اور کہا فرعون نے اے درباریو! میں نہیں جانتا تمہارے
لیے کوئی الٰہ اپنے سوا ۔ پس آگ جلاؤ میرے لیے اے ہامان!
مٹی کے گارے پر (یعنی اینٹوں کے بھٹے میں تیار کرا دو)
اور بنا دو میرے لیے ایک محل تاکہ میں جھانک کر دیکھوں
موسیٰ (علیہ السلام) کے الٰہ کو اور میں گمان کرتا ہوں اس کے
بارے میں کہ وہ جھوٹا ہے (۳۸) اور تکبر کیا فرعون اور اس کے
لشکر نے زمین میں ناحق اور گمان کیا انہوں نے کہ وہ ہماری
طرف نہیں لوٹائے جائیں گے (۳۹) پھر پکڑا ہم نے اس کو
اور اس کے لشکر کو اور پھینک دیا اُن کو سمندر میں پس
دیکھو کیسا ہوا انجام ظالموں کا (۴۰) اور بنایا ہم نے اُن کو ایسے
پیشوا کہ وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن
اُن کی مدد نہیں کی جائے گی (۴۱) اور ہم نے پیچھے لگائی ہے
ان کے اس دنیا میں لعنت اور قیامت والے دن وہ برائی
والوں میں سے ہوں گے (۴۲)

رحمتِ ہدایت

موسیٰ علیہ السلام مع اپنی اہلیہ اور ساز و سامان مدین سے مصر جا رہے تھے کہ راستے
میں کوہِ طور کی مقدس وادی سے گزر ہوا۔ اُس مقام پہ اللہ نے ان سے کلام کیا اور نبوت و
رسالت عطا فرمائی اور ساتھ دو عظیم معجزات عصا اور یدِ بیضا بھی عنایت کیے۔ موسیٰ علیہ السلام
کو تبلیغِ حق کا حکم ہوا۔ انہوں نے اس راستے میں حائل مشکلات کا ذکر کیا تو اللہ نے

یقین دلایا کہ فکر نہ کرو، بالآخر تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ نے آپ کے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا اور فریضۂ نبوت میں آپ کا ممد و معاون بنایا۔ موسیٰ علیہ السلام حکمِ خداوندی کے مطابق مصر پہنچے اور آگے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو منتظر پایا۔ پھر وہ دونوں فرعون کے دربار میں پہنچے تاکہ اللہ کا پیغام پہنچا سکیں۔

موسیٰ علیہ السلام فرعونی دربار میں

فرعون کے دربار میں جانے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات پر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کا ذکر کیا ہے جیسے سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الشعراء میں ہے اور بعض مقامات مثلاً یہاں اکیلے موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِـَٔايَٰتِنَا بَيِّنَٰتٍ جب موسیٰ علیہ السلام ہماری واضح نشانیاں لے کر فرعون کے دربار میں پہنچے۔ یہ نشانیاں وہی دو عظیم معجزات عصا اور ید بیضا تھیں۔ معجزہ کہتے ہی ایسی چیز کو ہیں جس سے عام مخلوق عاجز آجائے اور اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ خود نبوت اور نبی کا کلام اور پیغام بھی ایک واضح چیز ہوتی ہے۔ تو بینات میں معجزات اور نبی کی طرف سے پیغام دونوں چیزیں شامل ہیں۔ تو جب یہ چیزیں لے کر موسیٰ علیہ السلام فرعونی دربار میں پہنچے، معجزات پیش کیے اور اللہ کا پیغام سنایا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا قَالُوا مَا هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى کہنے لگے یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے۔ فرعون کے درباریوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور اس طرح انہوں نے معجزات کو جادو سے تعبیر کر کے انکار کر دیا۔ یہاں پر قَالُوا جمع کا صیغہ اسی لیے لایا گیا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں سب نے ان نشانیوں کا انکار کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، وحی الٰہی کی باتیں سناتا ہے اور ہماری طرف مبعوث ہونے کی بات کرتا ہے مگر وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِىٓ ءَابَآئِنَا ٱلْأَوَّلِينَ ہم نے ایسی باتیں اپنے آباؤ اجداد سے پہلے تو کبھی سنی نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ ساری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ وہی سب کو پیدا کرنے والا، اٹھانے والا اور فنا کرنے والا ہے۔ اور پھر قیامت والے دن وہی دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب لے گا اور جزائے عمل کا فیصلہ کرے گا۔

فرعون اور اس کے حواری کہنے لگے ہم نے تو ایسی باتیں پہلے کبھی نہیں سنیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی حق گوئی

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِهِ میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اور کسی ذاتی غرض کے لیے تو نہیں آئے بلکہ اللہ کے حکم سے اُس کا پیغام لے کر آئے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ کہ آخرت میں اچھا گھر کس کا ہے، مگر اتنی بات یقینی ہے إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے، وہ ہمیشہ نامراد رہیں گے۔ ظلم میں سر فہرست کفر اور شرک ہے، اس کے بعد دیگر مظالم از قسم لڑائی، جھگڑا، حق تلفی، قتل ناحق وغیرہ آتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں پروردگار عالم کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہوں، اور اس کا فیصلہ یہی ہے کہ اس ہدایت کو قبول کرنیوالوں کا انجام بخیر ہوگا اور ظلم و زیادتی کے مرتکبین ناکام ہو جائیں گے۔

اونچے مینار کی تعمیر

فرعون پر اس تبلیغ کا چنداں اثر نہ ہوا۔ کہنے لگا کہ مصر کی سلطنت میں مطلق العنان اور بااختیار حاکم تو میں ہوں، میں سیاہ و سفید کا مالک ہوں، ملک زرخیز ہے جس میں نہریں چل رہی ہیں۔ ڈیم بنے ہوئے ہیں، ہر طرح کی آسودہ حالی ہے، مگر یہ موسیٰ علیہ السلام کسی اور الٰہ کا پتہ بتا رہا ہے۔ پھر اپنے درباریوں کی طرف متوجہ ہوا۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي کہنے لگا۔ اے میرے سردارو! میں تو تمہارے لیے اپنے سوا کسی کو معبود نہیں جانتا۔ یہ موسیٰ کس الٰہ کی بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اوپر آسمانوں میں ہے۔ اور سب اُسی کے اختیار میں ہے۔ پھر کہنے لگا۔ اچھا میں موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ اس کی صورت یہ ہے فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ اے ہامان اینٹوں کا ایک بھٹہ لگا اور اس میں پختہ اینٹیں تیار کراؤ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مصر جیسے متمدن ملک میں پکی عمارات کا

عام رواج تھا اور اینٹیں پکانے کے لیے بھٹے بھی موجود ہوں گے۔ تو یہ چونکہ اہم کام تھا۔ اس لیے وزیر سے کہنے لگا کہ پہلے اینٹیں تیار کرواؤ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا پھر میرے لیے ایک اونچا محل یعنی مینار تعمیر کراؤ لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى تاکہ میں اس کے اوپر سے جھانک کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھ سکوں کہ وہ کیا ہے۔ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ اور میں گمان کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔

مفسرین کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ فرعون کے مذکورہ حکم کے مطابق کوئی محل یا مینار تیار بھی ہوا تھا یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فرعون نے یہ حکم دفع الوقتی کے لیے ازراہ تمسخر دیا تھا تاکہ درباری موسیٰ علیہ السلام کی بات سے متاثر نہ ہو جائیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ کسی صحیح روایت میں اس محل کی تیاری کا ذکر نہیں ملتا، صرف تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ ہامان نے پچاس ہزار کاریگر اور مزدور محل کی تیاری کے کام پر لگائے اور مینار کی شکل کا محل تیار ہو گیا۔ بعضؒ کہتے ہیں کہ فرعون اس مینار نما محل کے اوپر چڑھا مگر وہ آسمان تک کہاں پہنچ سکتا تھا، اسے کچھ نظر نہ آیا تو شرمسار بھی ہوا۔ اور تعصب و عناد کی بنا پر خدا تعالیٰ کا انکار بھی کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ فرعون کو اس کے اوپر چڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب محل تیار ہو گیا تو اللہ نے فرشتے کو بھیج کر اس کو گرا دیا۔ اس کے تین ٹکڑے ہوئے۔ ایک فرعون کے لشکر پر گرا جس سے بڑی تباہی پھیلی، دوسرا حصہ پانی میں گرا اور تیسرا حصہ ویسے ہی منتشر ہو گیا۔ اور فرعون اپنی اس سکیم میں بھی ناکام رہا۔

فرعونیوں کا تکبر

فرعون کے انکار، تعصب، ضد اور انکار کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر اور غرور کیا۔ اقتدار کے نشے میں توحید کا انکار کیا اور خود الوہیت کا دعویدار بنا۔ نبی کی بات کو ٹھکرایا۔ سورۃ النمل میں موجود ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (آیت۔ ۱۴) کہ فرعونی ظلم و زیادتی کی وجہ سے احکام الٰہی اور معجزات کا انکار کرتے تھے حالانکہ ان کے دل اسکی

تصدیق کرتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں۔ جب فرعون نے انکار کر دیا۔ تو اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے مطابق اُس کے حواریوں اور دیگر رعایا نے بھی انکار کر دیا۔ جیسا حاکم ہوتا ہے۔ ویسے ہی اُس کے کارندے اور عام لوگ ہوتے ہیں، وہی وضع قطع اور وہی رسم و رواج سب اپناتے ہیں۔ لہٰذا اہل ایمان کے سوا ساری قوم نے انکار کر دیا محض تکبر کی وجہ سے۔ اور دوسری بات انہوں نے یہ کی۔ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ کہنے لگے کہ ہم گمان کرتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔ گویا انہوں نے معاد اور جزائے عمل کا بھی انکار کر دیا۔ کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام ہمیں خواہ مخواہ آنے والے اُن دیکھے دن کے خوف میں مبتلا کر رہا ہے، کہتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ اللہ کے حضور پیشی ہوگی، محاسبہ اعمال ہوگا اور جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ہمیں تو ان باتوں پر یقین نہیں آتا، ہم نہیں خیال کرتے کہ مرنے کے بعد پھر خدا تعالیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

انجام کار

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے فرمایا فَاَخَذْنٰہُ وَجُنُوْدَہٗ ہم نے پکڑ لیا فرعون اور اس کے لشکر کو۔ اُن کی گرفت کا وقت آگیا فَنَبَذْنٰھُمْ فِی الْیَمِّ اور اُن سب کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہاں تفصیل نہیں ہے دوسری سورتوں میں موجود ہے کہ میلے کے دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکل گئے۔ سمندر کے کنارے پہنچے تو اللہ نے اُن کے لیے بارہ راستے بنائے جن سے وہ گزر گئے۔ تعاقب میں فرعون اور اس کا لشکر بھی انہی راستوں سے سمندر میں داخل ہوا۔ مگر اللہ نے طرفین کے پانیوں کو ملا دیا۔ اور اس طرح وہ سب کے سب بحر قلزم میں غرق ہو گئے۔ تو فرمایا ہم نے اُن پر گرفت کی اور اُن کو پانی میں ڈبو دیا۔ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیْنَ پس دیکھو ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے غرور کو کس طرح خاک میں ملا دیا۔

نیز فرمایا وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ اور ہم نے

اُن کو ایسا پیشوا (لیڈر) بنایا جو آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں یعنی لوگوں کو گمراہ کر کے دوزخ کا ایندھن بناتے ہیں۔ پیشوا ہدایت کے بھی ہوتے ہیں اور گمراہی کے بھی۔ اللہ نے فرعونیوں کو گمراہی کفر اور دعوت الی النار کا لیڈر بنایا۔ دوسرے مقام پر عام مشرکین کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ مشرک عورتوں سے نکاح بھی نہ کرو۔ کیونکہ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ (البقرہ - ۲۲۱) کیونکہ وہ تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت اور اپنی مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرو اور دوزخ کے عذاب سے بچ جاؤ۔

شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ انسانوں کے اس دنیا میں کیے جانے والے کام آگے چل کر اُن کے لیے جزائے عمل میں تبدیل ہو جائیں گے۔ بعض لوگوں کے اعمال انہیں سانپ، بچھوؤں اور درندوں کی شکل میں کاٹیں گے اور بعض چیزیں آگ کی شکل میں تبدیل ہو کر گنہگاروں پر مسلط ہوں گی۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ، باغات، پھلوں، پھولوں اور حور و قصور میں تبدیل ہو جائیں گے ترمذی شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی بندۂ مومن اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے اور زبان سے ایک دفعہ سبحان اللہ کہتا ہے جس میں اس کی محبت، عقیدت، تعظیم اور اخلاص شامل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے غرضیکہ کفر و شرک والے لوگ بظاہر تو کفریہ اور شرکیہ رسوم کی دعوت دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔

قیامت والے دن مایوسی

فرمایا کہ دنیا کے اندر تو ہم اِن لوگوں کو دوزخ کی طرف دعوت کا امام بنائیں گے وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنْصَرُونَ اور قیامت والے دن اِن کی کوئی مدد نہیں کی جائیگی۔ نہ اِن کا لشکر کام آئے گا اور نہ مال و دولت، تابع اور متبوع سب جہنم رسید ہوں گے۔ نہ کوئی سفارش کام آئیگی اور نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔ فرمایا اس دنیا میں یہ حال بھی ہوگا وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا

لَعْنَۃً اس دُنیا میں ہم نے اُن کے پیچھے لعنت لگا دی ہے۔ شرائع الٰہیہ کے تمام پیرو کار اور نیک لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہیں لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ فرعونیوں، کافروں اور مشرکوں پر لوگ لعنت بھیجتے ہیں۔ فرعون نے توحید کا انکار کیا معاد کی تکذیب کی۔ رسولوں کی بات نہ مانی تو ہمیشہ کے لیے مع اپنے متبعین کے لعنتی ٹھہرا۔ اُن کے لیے یہی تحفہ ہے وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ھُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ یہ لوگ قیامت والے دن برائی اور قباحت والوں میں سے ہوں گے۔ اِن کی شکلیں تبدیل اور حال بُرا ہو گا، گویا کہ ہر قسم کی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔ اللہ نے دنیا اور آخرت کی دونوں سزاؤں کا ذکر کر دیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ :۔ اور البتہ تحقیق دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بعد اس کے کہ ہم نے ہلاک کیا پہلی قوموں کو ۔ یہ بصیرت کی چیزیں ہیں لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ہے ، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۴۳﴾ اور نہیں تھے آپ مغربی جانب جب کہ ہم نے فیصلہ کیا تھا موسیٰ علیہ السلام کی طرف معاملے کا ، اور نہیں تھے آپ دیکھنے والوں میں ﴿۴۴﴾ لیکن ہم نے اٹھایا کئی قوموں کو پس دراز ہو گئی اُن پر زندگی ۔ اور نہیں تھے آپ

ٹھہرنے والے مدین والوں کے درمیان کہ پڑھتے آپ اُن پر ہماری آیتیں، لیکن ہم ہیں بھیجنے والے رسولوں کو ﴿۴۵﴾ اور نہیں تھے آپ طور کے کنارے پر جب کہ ہم نے آواز دی تھی۔ لیکن یہ مہربانی ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ ڈرائے تو اُن لوگوں کو کہ نہیں آیا اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے، تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۴۶﴾

ربطِ آیات

گذشتہ رکوعات میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے بچپن سے لے کر کچھ حالات بیان کیے ہیں اور اُن پر آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ ایک قبطی کے قتل کے بعد آپ مدین تشریف لے گئے۔ دس سال کے بعد واپس آ رہے تھے کہ راستے میں کوہِ طور پر اللہ نے آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور عصا اور یدِ بیضا جیسی عظیم نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے حواریوں کے پاس تبلیغ کے لیے بھیجا۔ وہ سب مغرور لوگ تھے، نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ اللہ نے اُن سب سرکشوں کو بحرِ قلزم کی موجوں میں غرق کر دیا۔ فرمایا یہ لوگ کفر، شرک اور ظلم و زیادتی کے پیشوا تھے۔ دیکھو اِن کا کیسا عبرت ناک انجام ہوا۔ دنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی گئی۔ اور آخرت میں تو عذاب کے طور پر اُن کی شکلیں ہی تبدیل ہو جائیں گی اور پھر یہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا کندۂ ناتراش بن جائیں گے۔

تورات کا نزول

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت دو اقوام کی طرف تھی۔ ایک تو فرعون کی قبطی قوم تھی اور دوسری آپ کی اپنی قوم بنی اسرائیل تھی۔ اس مقام پر اللہ نے اپنی عظیم الشان کتاب تورات کے نزول کا ذکر کیا ہے جو آپ کی قوم بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لیے عطا کی گئی۔ بنی اسرائیل جب بحرِ قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا پہنچے تو وہ فرعون کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ پہلے تو ہم غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور فرعونی قانون کے اسیر تھے، اب ہم آزاد ہیں لہٰذا ہمارے لیے کوئی قانون ہونا چاہیے جس

پر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں عمل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو حکم ہوا کہ چالیس دن تک کوہِ طور پر اعتکاف میں بیٹھو تو تمہیں کتاب تورات عطا کی جائے گی۔ تورات کا معنی ہی قانون یعنی لاء (LAW) ہوتا ہے۔

اسی کتاب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا فرمائی جس کا ذکر قرآن پاک کی بہت سی سورتوں میں آتا ہے۔ آسمانی کتب میں سب سے زیادہ فوقیت اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم کو حاصل ہے۔ دوسرے نمبر پر تورات، تیسرے پر انجیل اور چوتھے پر زبور ہے۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے صحیفے بھی ہیں جو اللہ نے مختلف انبیاء علیہم السلام پر مختلف زمانوں میں نازل فرمائے۔ اس وقت دنیا میں جو مجموعہ بائیبل موجود ہے، اس میں کل انتالیس کتابیں جمع کر دی گئی ہیں، اور اس کے ابتدائی پانچ بڑے ابواب تورات پر مشتمل ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بعد اس کے کہ ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کیا۔ قرون، قرن کی جمع ہے جس کا معنی جماعت، قوم، گروہ، سنگت یا ایک دور کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلی اقوام میں سے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور مدین والوں کو اللہ نے ہلاک کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ تو فرمایا کہ ہم نے بہت سی جماعتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی۔

تورات کی خصوصیات

بصیرت

کتابِ تورات کی حیثیت کو اللہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ اس میں لوگوں کے لیے بصیرت کی چیزیں ہیں۔ سورۃ الاعراف میں قرآن پاک کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بصارت ظاہری آنکھ سے دیکھنے کو کہتے ہیں، جب کہ بصیرت سے مراد دل کی روشنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں جو روشنی، نور، فہم اور فراست پیدا کر دیتا ہے۔ وہی بصیرت کہلاتی ہے۔ اور جس فرد یا قوم میں یہ چیز نہ پائی جاتی ہو، وہ ظاہری آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھی ہے۔ اسی لیے اللہ نے پوری قوم نوح کو داسی لیے اہلِ ایمان کے اِنَّهُمْ

كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (الاعراف-٦٤) اندھی قوم تھے۔ انہوں نے دل کی آنکھوں سے اللہ کے جلیل القدر نبی نوح علیہ السلام کو نہ پہچانا، اس لیے ناکام ہوئے۔ اللہ نے سورۃ الحج میں مزید وضاحت فرمائی ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (آیت-٤٦) ایسے لوگوں کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے سینوں میں پڑے ہوئے دل بینائی سے محروم ہوتے ہیں۔ تو فرمایا تورات میں بصیرت کی باتیں ہیں جن کو دل کی آنکھوں کے ساتھ دیکھ کر ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

(٢)
ہدایت

فرمایا تورات کی دوسری خصوصیت وَهُدًى یعنی ہدایت ہے۔ جب انسان میں فہم و فراست پیدا ہو جائے عقل و شعور آجائے حق و باطل کی پہچان ہونے لگے تو پھر اس کو ہدایت میسر آتی ہے جس کے مطابق وہ عمل کرتا ہے۔ قرآن پاک بھی اہل ایمان کے لیے بصیرت اور ہدایت ہے منافق آدمی فہم و فراست سے محروم ہوتا ہے، لہٰذا وہ دین کی سمجھ سے بھی عاری ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے[1] مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے، اسے دین میں فہم و فراست فقاہت اور سمجھ عطا کرتا ہے، مگر منافق اس سے محروم رہتے ہیں۔ کفار و مشرکین کے دلوں پر بھی کفر و شرک کے اندھیرے چھائے رہتے ہیں، بدعتی لوگ بھی ہدایت کی روشنی سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں پر بھی حجاب پڑے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں ہدایت میسر نہیں آتی۔ ہدایت تو جب ملے گی جب عقیدہ، عمل اور اخلاق درست ہو گا

(٣)
رحمت

تورات کی تیسری خصوصیت فرمایا وَرَحْمَةً خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ جب انسان کے دل میں صحیح سمجھ اور فہم پیدا ہو جائے اور وہ صحیح راستے پر گامزن ہو جائے، اپنا عقیدہ، اخلاق اور عمل درست کر لے تو وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی قربت اور اس کی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اس کی مہربانیاں اور نوازشیں شامل حال ہو جاتی ہیں۔ فرمایا تورات میں تین چیزیں یعنی بصیرت، ہدایت اور رحمت ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

---

[1] بخاری صفحہ ١٦ (فیاض)

حضور اور موسیٰ میں مماثلت

قرآن پاک اور تورات کے مضامین اگلی آیات میں بھی آ رہے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ
نے حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت و نبوت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام
اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام
کو عظیم دشمنوں کا سامنا تھا، اسی طرح حضور علیہ السلام کے جانی دشمن بھی موجود تھے۔ جس طرح
موسیٰ علیہ السلام پر کڑی آزمائشیں آئیں اسی طرح حضور علیہ السلام پر بھی آئیں۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام
کو ایک عظیم کتاب عطا فرمائی تو حضور سرور کائنات کو بھی عظیم الشان کتاب دی۔
دونوں امتوں کے حالات بھی تھوڑے بہت ملتے جلتے ہیں۔ تو یہاں پر اللہ نے
حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی حقانیت کو بیان فرمایا ہے اور وہ اس طرح کہ تم
نے موسیٰ علیہ السلام کے جو واقعات بیان کیے ہیں اور آپ نے انہیں آگے امت کو سنایا
ہے، یہ بالکل سو فیصد صحیح ہیں جن میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ آپ نے نہ تو کتاب
پڑھی ہے اور نہ کسی اور ذریعے سے آپ کو ان واقعات کا علم ہوا ہے، تو ان کو ہو بہو
امت کے سامنے بیان کر دینا ہی آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے یہ سارے واقعات آپ کو بذریعہ وحی بتلا دیے۔

مسئلہ حاضر و ناظر اور علم غیب

اگلی آیات اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کی صداقت
اور وحی الٰہی کی حقانیت کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ان آیات سے آنحضرت علیہ السلام
کے حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہونے کی صراحتاً نفی ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا
كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ آپ
اس وقت مغربی جانب تو نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے معاملے کا
فیصلہ کیا۔ اس مغربی جانب سے صحرائے سینا کا وہ پہاڑ مراد ہے جہاں سلسلہ کوہ طور
بھی ہے اور جہاں پر موسیٰ علیہ السلام کو احکام شریعت عطا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ حجاز
سے مغربی جانب ہے، اسی لیے فرمایا کہ آپ اس وقت مغربی جانب تو نہیں تھے
جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے معاملے کا فیصلہ کیا تھا۔ وَمَا كُنْتَ مِنَ
الشّٰهِدِيْنَ اور آپ وہاں موسیٰ علیہ السلام کے حالات کو دیکھنے والوں میں بھی شامل

نہیں تھے۔ جو یہ واقعات دیکھ کر بیان کیے ہوں۔ گویا آپ کے حاضر ناظر ہونے کی شدت کے ساتھ نفی کی گئی ہے۔ آگے سورۃ کے آخر میں بھی آرہا ہے کہ ہم نے ہی رحمت سے یہ کتاب آپ کی طرف نازل فرمائی ہے جس میں یہ سارے واقعات آئے ہیں ورنہ آپ کو ان کا کیا علم تھا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج لوگوں نے بلاوجہ حاضر ناظر اور علمِ غیب کا عقیدہ گھڑ لیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ میں شامل ہیں اور ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہیں۔ صفتِ خلق، تدبیر، اختیار یہ سب صفاتِ مختصہ میں۔ امام شاہ ولی اللہ اپنی کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی صفاتِ مختصہ کی غیروں سے نفی کرنا واجب ہے مثلاً قدرتِ تامہ، تخلیق، علمِ غیب ہے۔ نہ تو کسی کو پیدا کرنے کی قدرت ہے اور نہ ہی کوئی غیب جانتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع کر دیتا ہے تو نبی کو علم ہو جاتا ہے۔ غیب تو وہ ہے جو بغیر کسی واسطے کے خود بخود ہو اور یہ خاصہ خداوندی ہے۔ انبیاء یا اولیاء سے علمِ غیب کی نفی اُن کی قطعاً توہین نہیں ہے۔

بہرحال فرمایا کہ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت عطا فرمایا تو آپ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ مگر ہم نے بہت سی قوموں کو پیدا کیا، پھر ان پر زندگی دراز ہو گئی۔ وہ سرکشی، ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوئے تو اللہ نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ گزشتہ آیات میں فرعون اور اس کی قوم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ آپ مدین والوں میں بھی مقیم نہیں تھے تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے۔ مدین کے واقعات بھی موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہم نے ہی آپ کو بتلائے ہیں۔ آپ کوئی عالم الغیب تو نہیں ہیں۔ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ بلکہ ہم رسولوں کو بھیجنے والے ہیں۔ ہم اُن پر وحی نازل کر کے سابقہ واقعات سے آگاہ کرتے ہیں، آئندہ حالات سے مطلع کرتے ہیں اور پھر انہیں ایک لائحہ عمل عطا کر کے تبلیغ کا حکم دیتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک یہودی نے تخلیق کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے قدرے توقف کے بعد سوال کا جواب دیا اور یہودی چلا گیا تو حضور نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جب یہودی نے مجھ سے یہ سوال کیا تو مجھے جواب معلوم نہیں تھا۔ اللہ نے فوراً جبرائیل کو نازل فرما کر سوال کا جواب بھیج دیا جو یہودی کے علم کے مطابق بھی درست تھا لہٰذا وہ شخص مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس سے بھی آپ کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہوتی ہے۔

آگے فرمایا وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا اور آپ طور کے کنارے پر بھی نہیں تھے جب ہم نے آواز دی تھی کہ اے موسیٰ! آپ اس وادیٔ مقدس میں اپنے جوتے اتار دیں۔ میں نے تجھے نبوت و رسالت کے لیے منتخب کیا ہے اب تم میرا پیغام فرعون اور اس کے سرداروں کو جا کر پہنچاؤ۔ فرمایا وَلَٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ یہ تو تیرے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے جو تمہیں ان حالات سے مطلع کر رہا ہے۔ وگرنہ تم تو وہاں حاضر و ناظر نہیں تھے۔

قومی اور بین الاقوامی نبی

فرمایا یہ رحمت ہے تیرے پروردگار کی طرف سے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ تاکہ آپ ڈرائیں ان لوگوں کو جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پوری دنیا میں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا بلکہ اس سے اہلِ عرب مراد ہیں کہ ان میں حضرت اسماعیل کے بعد طویل عرصہ تک کوئی نبی نہیں آیا اور پھر اللہ نے آخر میں حضور خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ عرب بھی ابتداء میں صحیح دینِ ابراہیمی پر تھے مگر حضور علیہ السلام سے تقریباً پانچ سو سال پہلے قصی ابن کلاب کے زمانے میں یہاں شرک کی ابتداء ہوئی۔ لوگوں کی غالب اکثریت مشرک ہو گئی اور اس دوران حضور علیہ السلام سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔

یہاں پر قَوْمًا کا لفظ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ آپ کی پہلی حیثیت تو قومی نبی کی ہے کہ آپ سرزمینِ عرب میں عربوں میں مبعوث ہوئے اور تبلیغ کی ابتداء بھی یہیں سے ہوئی مگر اللہ نے آپ کی زبان سے یہ بھی کہلوایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۵

ترجمہ:- اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ پہنچتی اُن کو کبھی مصیبت اُن کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں نہیں بھیجا تو نے ہماری طرف رسول۔ پس ہم پیروی کرتے تیری آیتوں کی، اور ہوتے ہم ایمان والوں میں سے (۴۷) پھر جب آیا اُن کے پاس ہماری طرف سے حق تو کہا انہوں نے کہ کیوں نہیں دی گئی اس نبی کو مثل اُس کے جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ کیا نہیں کفر کیا انہوں نے اُس چیز کے

ساتھ جو دی گئی موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے۔ انہوں نے کہا
کہ دو جادوگر آپس میں موافق ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم سب
کا انکار کرنے والے ہیں (۴۸) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے۔ پس
لاؤ کوئی کتاب اللہ کی طرف سے جو زیادہ راہ بتلانے والی ہو
ان دونوں (کتابوں) سے کہ میں بھی اس کی پیروی کروں۔ اگر
تم سچے ہو (۴۹) پس اگر یہ نہ جواب دے سکیں آپ کی بات
کا۔ تو آپ یقین جانیں کہ بیشک یہ لوگ پیروی کرتے ہیں اپنی
خواہشات کی بغیر اللہ کی ہدایت کے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں
راہ دکھاتا ہے بے انصاف قوم کو (۵۰)

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کرنے کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا ذکر ہوا۔ اللہ نے واضح طور پر فرمایا کہ اے نبی علیہ السلام! جب موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت عطا ہو رہی تھی تو آپ تو وہاں موجود نہیں تھے۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی تھی تو آپ نے تو وہ آواز نہیں سنی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے واقعات ہم نے اپنی خاص مہربانی سے بذریعہ وحی آپ کو بتلائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی نبی اور رسول بنایا ہے اور آپ کو ایک عظیم المرتبت کتاب بھی عطا فرمائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ اس کتاب کے ذریعے اُن لوگوں کو خبردار کر دیں اور ڈرا دیں جن کے پاس پہلے کوئی منذر نہیں آیا۔ یہ اشارہ خاص طور پر مشرکین عرب کی طرف ہے جن میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک نہ کوئی نبی آیا اور نہ کوئی کتاب نازل ہوئی۔ اس سرزمین پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے اور پھر حضور خاتم النبیین تک درمیان میں کوئی نبی نہیں آیا۔

[illegible]

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مکے اور عرب کے مشرکین کا خاص طور پر شکوہ کیا ہے

اور اس ضمون میں نزول قرآن کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ مُّصِيۡبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ اور اگر ایسا نہ ہوتا اور ان لوگوں کو ان کے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے کبھی مصیبت پہنچتی۔ فَيَقُوۡلُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ تو یہ لوگ کہہ اٹھتے۔ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے وَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اور ہم بھی ایمان لانے والوں میں ہوتے۔ ابتداء میں بیان ہو چکا ہے کہ تقریباً دو ہزار سے اہل عرب میں کوئی نبی آیا اور نہ کتاب۔ تو اللہ نے اس عذر کو رفع کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ اگر ہم نبی آخر الزمان کو بھی عربوں میں مبعوث نہ کرتے اور پھر ان پر کوئی مصیبت آجاتی تو فوراً کہہ دیتے کہ ہمارے پاس تو کوئی رسول ہی نہیں آیا جو ہمیں صراط مستقیم کی تعلیم دیتا اور ہم عذاب الٰہی سے بچ جاتے۔ اب اللہ نے گویا اپنا آخری نبی اور آخری کتاب نازل کر کے مشرکین عرب کا منہ بند کر دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں اسی قسم کا خطاب اہل کتاب سے بھی کیا گیا ہے کہ کل قیامت والے دن یہ نہ کہنا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ (آیت۔۹) کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں۔ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ (آیت ۱۹) دیکھو تمہارے پاس بشیر اور نذیر آچکا ہے۔ اب تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں رہا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ملک اور قوم میں اپنے انبیاء مبعوث فرما کر لوگوں کو حق و باطل سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ اعتراض کرتے کہ ہمیں سزا کیسی دی جا رہی ہے جب کہ ہمیں بتلانے والا کوئی رسول تو آیا ہی نہیں۔ دوسری جگہ یہ بھی آتا ہے کہ ہم تو اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر ہی چلتے رہے۔ ہمیں کوئی سمجھانے والا ہی نہیں آیا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اپنا آخری رسول اور کتاب بھیج کر یہ تمام اعتراضات رفع کر دیے ہیں۔

بہانہ از گناہ

پہلے تو وہ رسول کے نہ آنے کا عذر پیش کرتے تھے فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آگیا۔ یعنی اللہ کا آخری نبی بھی مبعوث ہو گیا اور اللہ نے اپنی آخری کتاب بھی نازل فرما دی۔

قَالُوا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی تو کہنے لگے ہمیں ویسی ہی چیز کیوں نہیں دی گئی جیسی موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ یہ دوسرا اعتراض کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا جیسے عظیم معجزات عطا کیے گئے تھے، ویسے معجزات نبی آخر الزمان کو کیوں نہیں دیے گئے؟ اور موسیٰ علیہ السلام کو تو پوری تورات تختیوں پر لکھی ہوئی یک وقت دی گئی تھی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل ہو رہا ہے؟ مطلب یہ کہ جب اللہ کی طرف سے حق آگیا تو انہوں نے پھر بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا انکار ہی کیا۔

اللہ نے فرمایا کہ مشرکین عرب اب تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں اور ویسی ہی چیز کو تسلیم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ذرا ان سے یہ پوچھو کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اَوَلَمْ یَکْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ کیا وہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی چیز کا انکار نہیں کر چکے؟ جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰھَرَا تو کہنے لگے کہ یہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے موافق بن گئے ہیں ان دونوں کا مشن ایک ہی ہے، ہم ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں وَقَالُوْٓا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوْنَ ہم سب کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ نے کوئی نبی نہیں بھیجا، یہ جھوٹ بولتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں[1] کہ مشرکین مکہ نے پہلے تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا تذکرہ کیا کہ اگر ایسے ہی معجزات حضور علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے تو ہم تسلیم کر لیتے پھر جب یہودیوں سے تبادلۂ خیال کیا تو پتہ چلا کہ تورات کی باتیں تو ہمارے خلاف پڑتی ہیں۔ مثلاً تورات میں بت پرستی کو لغو اور بے حقیقت قرار دیا گیا ہے نیز یہ کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح حرام ہے۔ تورات میں نبی آخر الزمان کی بعض نشانیاں بھی ملتی ہیں جو آپ پر صادق آتی ہیں۔ تو پھر کہنے لگے ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔ نہ تورات کو مانتے ہیں اور نہ قرآن کو ہم تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ دونوں

[1] موضح القرآن صفحہ ۴۶۹ (فیاض)

بات کا جواب نہ دے سکیں یعنی چیلنج قبول نہ کریں۔ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ تو آپ یقین جانئے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام کو چھوڑ کر خواہشات نفسانی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ خواہشات کی پیروی دراصل شیطان کا اتباع ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرہ - ۱۶۸) شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے جو کوئی شیطان کے نقش قدم پر چلے گا وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ حظیرۃ القدس کا ممبر بن سکتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہے اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (آیت - ۴۳) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو ہی معبود بنا لیا ہے۔ وہ اسی طرح خواہشات کی پیروی کرتا ہے جس طرح معبود برحق کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ غرضیکہ خواہش نفسانی بدترین معبود ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ اور یہی گمراہی کا سبب ہے۔ خواہشات میں انفرادی، اجتماعی، قومی، ملکی ہر قسم کی خواہشات شامل ہیں۔

ظالموں کی محرومی

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا اور وہ ہمیشہ اس سے محروم رہتے ہیں صراط مستقیم انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن میں حقیقت کو پانے کی طلب ہوتی ہے۔ جو لوگ کفر، شرک اور بدعت پر اڑے رہتے ہیں۔ وہ ہدایت یافتہ نہیں بن سکتے۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن پاک کا فیصلہ یہ ہے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء - ۱۱۵) کہ یہ لوگ جس طرف جانا چاہتے ہیں یعنی گمراہی کی دلدل میں پھنسنا چاہتے ہم ادھر ہی کی توفیق دے دیتے ہیں۔ ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ جو کہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ غرضیکہ ظلم کی موجودگی میں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥١﴾ الَّذِينَ
آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾
وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿٥٣﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ
أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٥٤﴾ وَإِذَا سَمِعُوا
اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ﴿٥٥﴾
إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي
مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ہم نے ملا دیا ہے اِن لوگوں کیلئے (نصیحت کی) بات کو تاکہ یہ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۱﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں ﴿۵۲﴾ اور جب پڑھ کر سنایا جاتا ہے اُن کو تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر۔ بیشک یہ حق ہے ہمارے پروردگار کی طرف سے۔ تحقیق تھے ہم اِس سے پہلے فرمانبرداری کرنے والے ﴿۵۳﴾ یہی لوگ ہیں جو دیے جائیں گے بدلہ دوہرا

اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا۔ اور ہٹاتے ہیں وہ بھلائی
کے ساتھ برائی کو۔ اور جو کچھ ہم نے اُن کو روزی دی ہے
اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۵۴﴾ اور جب سنتے ہیں وہ کسی
بیہودہ بات کو تو اُس سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور کہتے ہیں
کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے
اعمال ۔ سلام ہو تم پر ۔ ہم نہیں چاہتے جہالت والوں کے ساتھ ﴿۵۵﴾
(اے پیغمبر!) بیشک آپ نہیں راہِ راست پر رکھ سکتے جس کو آپ
چاہیں مگر اللہ تعالیٰ راہِ راست پر لاتا ہے جس کو چاہتا ہے ،
اور وہ بہتر جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو ﴿۵۶﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا شکوہ بیان کیا تھا کہ وہ ایمان کی بات قبول کرنے کی بجائے ہدایت کی بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر موسیٰ علیہ السلام جیسے معجزات کیوں نہیں لایا اور کبھی کہتے ہیں کہ آپ پر پورا قرآن یکبارگی کیوں نہیں نازل ہوا ۔ اللہ نے جواب فرمایا کہ ضدی اور عنادی لوگ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں ۔ اب تو یہ موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں مگر جب خود کلیم اللہ معجزات اور تورات لے کر آئے تھے تو کیا اُس وقت انہوں نے تسلیم کیا تھا ؟ نہیں بلکہ ان بدبختوں نے اسوقت بھی اُن کو جھٹلا دیا تھا ۔ آپ کے معجزات کو جادو سے تعبیر کیا اور آپ کو جادوگر کہا گیا ۔ ان کو تو انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیئے ۔ اصل بات یہ ہے کہ ہدایت اُس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو اس کی طلب کرتا ہے اور جو خواہش کی پیروی کرتا ہے وہ محروم رہتا ہے ۔ جب تک ظالم اپنے ظلم سے باز نہ آجائیں ، وہ ہدایت کو نہیں پا سکتے ۔

ہدایت کا تسلسل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانی ہدایت کے تسلسل کو اس طرح واضح کیا ہے ۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ اور البتہ تحقیق ہم نے ملا دیا ہے ہدایت کی بات کو ان لوگوں کے لیے ۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگوں کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ

جس طرح پہلے لوگوں کے پاس اُن کے لئے ہدایت کا سامان پہنچتے رہے ہیں۔
اسی طرح آخری امت کے لوگوں کے پاس بھی بار آخر نبی کتاب ہدایت لے کر آیا
ہے۔ نبی آخر الزمان سابقہ تمام انبیاء اور کتب سماویہ کی تصدیق کرتا ہے جس کا مطلب
یہ ہے کہ اللہ نے سابقہ اور موجودہ ہدایت کی باتوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔ مفسرین کرام
فرماتے ہیں کہ وَصَّلْنَا کا اطلاق قرآنی آیات پر بھی کیا جا سکتا ہے یعنی ہم نے قرآن پاک
کی آیات کو یکے بعد دیگرے نازل فرما کر ان کو آپس میں مربوط کر دیا ہے۔ اللہ نے
تورات کی طرح قرآن کو یکبارگی نازل نہیں کیا بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا
کر کے نازل فرمایا ہے۔ اور اس کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ
لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۰۶)
ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔ اور ہم
نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ سورۃ النحل میں یہ حکمت بھی بیان فرمائی ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ
(آیت ۔ ۴۴) اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں پر واضح کر دیں
جو کچھ ان کی طرف اترا ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ مطلب یہ کہ قرآن پاک کے
بتدریج نزول میں خاص حکمت ہے جس طرح طلباء کو تھوڑا تھوڑا سبق دیا جاتا ہے
کہ انہیں اچھی طرح ضبط ہو جائے۔ اسی طرح قرآن پاک کو بھی تھوڑا تھوڑا کر کے
نازل کیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ اس کے احکام اچھی طرح سیکھ سکیں، ان پر عمل کر سکیں اور اگر
کسی حکم میں کوئی اشکال ہو تو اُس کی وضاحت کر دی جائے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَكُلَّ
شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل ۔ ۱۲) ہم نے ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ
بیان کر دیا ہے۔ غرضیکہ فرمایا کہ ہم قرآن کی آیتوں کو یکے بعد دیگرے نازل کر کے
جوڑتے چلے گئے ہیں تاکہ لوگ ان کو ضبط کریں، ان میں غور و فکر کریں لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ وہ ان سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اہل کتاب کا ایمان

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن اہلِ کتاب کی تعریف بیان فرمائی ہے جو بھی

لہ مظہری صـ۲۳ ج۷ (فیاض)

کتابوں پر ایمان رکھتے تھے، پھر جب قرآن نازل ہوا تو اس کو بھی قبول کیا۔
ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِهٖ وہ لوگ
جن کو ہم نے کتاب دی تھی اس (قرآن) سے پہلے۔ قرآن سے پہلے مشہور کتب
سماویہ توراۃ اور انجیل تھیں جن کے ماننے والے یہودی اور نصرانی کہلاتے ہیں۔
هُمۡ بِهٖ یُؤۡمِنُوۡنَ وہ اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی
اکثریت تو اپنی ضد اور عناد پر ہی اڑی رہی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا۔ وَاَنَّ
اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ (المآئدہ۔ ۵۹) ان کی اکثریت تو نافرمانوں کی تھی، تاہم
ان میں بعض نبی آخر الزمان اور قرآن پاک پر ایمان لے آئے۔ مدینہ کے بہت کم یہودی
تھے جو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان قبول
کیا وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپ کے دو بھتیجوں میں سے ایک ایمان لایا جو
صاحبِ علم تھا۔ تمیم داری کا ذکر ملتا ہے۔ وہ پہلے عیسائی تھے، پھر مسلمان ہوئے۔
بیرونِ عرب حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے حضرت عثمانؓ اور حضرت جعفرؓ کی دعوت
پر ایمان قبول کیا جب یہ لوگ مکے سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے۔ نجاشی کے علاوہ
کچھ اور لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہوئی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
حاضر ہو کر ایمان قبول کیا۔ اگرچہ نجاشی خود حضور علیہ السلام کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا، حبشہ
کے جن نصرانیوں نے ایمان قبول کیا، تاریخی روایات میں ان کی تعداد بیس کے
لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ تاہم سورۃ المائدہ میں ان کی رقیق القلبی کی تعریف بیان
کی گئی ہے وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَى الرَّسُوۡلِ تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ
تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَـقِّ (آیت ۸۳) جب
انہوں نے اس چیز کو سنا جو رسول کی طرف نازل کی گئی ہے تو آپ نے دیکھا کہ ان کی
آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس وجہ سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا اور ان کے دلوں
میں ایمان راسخ ہو گیا۔ جب ابوجہل وغیرہ کو حبشہ کے ان لوگوں کے آنے کی خبر ہوئی
تو کہنے لگے کہ یہ کتنے بدقسمت لوگ ہیں جو ابھی تحقیق کرنے کے لیے آئے ہیں۔

[1] مظہری صفحہ ۱۷۳ (فیاض)

کہ یہاں واقعی کوئی نبی آیا بھی ہے یا نہیں۔ مگر ایمان قبول کر کے جاتے ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ اُن لوگوں نے یہی جواب دیا تھا جو آگے اسی درس میں آرہا ہے یعنی ہم جاہلوں سے اُلجھتے نہیں، تمھارے کام تمھارے لیے ہیں اور ہمارے کام ہمارے لیے ہیں۔ تم جہالت پر قائم رہو۔ ہم تو ایمان لاتے ہیں۔

دوہرے اجر کے مستحقین

فرمایا وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ اور جب پڑھ کر سنایا جاتا ہے اُن لوگوں کو جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ قَالُوا آمَنَّا بِهِ وہ کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا کیونکہ یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ہم تو اس سے پہلے ہی فرمانبردار تھے یعنی ہمارا اس کتاب پر بھی ایمان ہے اور جس نبی پر یہ کلام اترا ہے ہم اس کی رسالت کی بھی گواہی دیتے ہیں۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا کہ اُن کو دوہرا اجر دیا جائے گا۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا۔ پہلے وہ سابقہ دین پر ایمان رکھتے تھے۔ مگر جب اللہ کا آخری نبی آگیا تو اُس کو تسلیم کیا اور اُس پر نازل ہونے والی کتاب کو مانا جس کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انہوں نے صبر و استقامت کا دامن نہ چھوڑا اور اللہ کے سچے دین پر جمے رہے۔ یہ لوگ دوہرے اجر کے مستحق ٹھہرے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے[1] کہ جس شخص کے پاس لونڈی تھی، اُس نے اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا، پھر آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا حالانکہ وہ بحیثیت لونڈی بھی اس سے استفادہ کر سکتا تھا تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ دوسرا وہ شخص بھی دوہرے اجر کا مستحق ہے جو کسی کا غلام ہے، آقا کی خدمت بھی کرتا ہے اور خدا کی عبادت بھی اچھے طریقے سے کرتا ہے، اس میں کمی نہیں آنے دیتا۔ فرمایا تیسرا شخص وہ ہے کہ پہلے نبی اور پہلی کتاب پر ایمان رکھتا تھا جب اللہ کا آخری نبی آیا، اور اس کی آخری کتاب آئی، تو وہ اُن پر بھی ایمان لایا۔ یہ بھی دوہرے اجر کا مستحق ہے۔

[1] مظہری صفحہ ۱۶۴ ج ۷ (فیاض)

شیخ ابن عربیؒ بات اس طرح سمجھتے ہیں کہ اہل کتاب کو دوہرا اجر اس وجہ سے ملے گا کہ پہلے وہ اپنے نبی اور اپنی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر جب حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو وہ آپ پر اور قرآن پر بھی ایمان لائے۔ چونکہ حضور علیہ السلام تمام سابقہ انبیاء کے مصدق ہیں۔ لہٰذا آپ کے ضمن میں بھی اپنے نبی پر ایمان لانا ثابت ہوا۔ آخری امت کے لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تمام نبیوں پر ایمان لائیں کیونکہ ایک نبی کا انکار بھی کفر کے مترادف ہے۔ بہرحال اہلِ کتاب کا اپنے نبی پر دو مرتبہ ایمان لانا ثابت ہوا۔ لہٰذا انہیں دوہرے اجر کی بشارت دی گئی ہے۔

برائی کے بدلے بھلائی

ان لوگوں کی ایک اور صفت یہ بیان کی گئی ہے وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور ہٹاتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو۔ مطلب یہ کہ ایسے لوگ برائی کا جواب برائی سے دینے کی بجائے بھلائی سے دیتے ہیں۔ کسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا بلاشبہ دوسرے کو متاثر کرتا ہے اور اس کے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی چیز ایمان قبول کرنے کی بنیاد بھی بنتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا تھا اتبع السیئۃ الحسنۃ اگر کوئی برائی کا کام ہو جائے تو اسکے بعد نیکی کرو۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ برائی کے بعد نیکی کرو گے تو برائی مٹ جائیگی۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی موجود ہے إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (آیت - ۱۱۴) بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ تو یہاں بھی اللہ نے برائی کے بدلے نیکی اختیار کرنیکی تعریف فرمائی ہے فرمایا جو لوگ دوہرے اجر کے مستحق بنتے ہیں اُن کی ایک صفت یہ بھی ہے

انفاق فی سبیل اللہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ اور جو کچھ ہم نے اُن کو حلال روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ حکم صرف اہل کتاب کیلیے ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام اہلِ ایمان کے لیے انفاق فی سبیل اللہ جزوِ ایمان ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے فرائض کو پورا کیا جائیگا۔ پھر واجبات اور مستحبات وغیرہ۔ ان اخراجات

لہ مظہری صفحہ ۱۷۵ ج ۷ (فیاض)

میں زکوٰۃ کو اولین حیثیت حاصل ہے کیونکہ اللہ نے ہر صاحبِ نصاب پر فرض
قرار دی ہے۔ اس کے بعد صدقۂ فطر ہے، قربانی ہے۔ جن لوگوں کے حقوق واجبہ
حقوق واجبہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے حقوق ادا کرنا ہے اور عمومی طور پر خرچ
کرو مسافروں، یتیموں، مسکینوں اور ناداروں کی خبر گیری کرنا جن کی یہ مدات قرآن پاک
اور احادیث نبوی میں مذکور ہیں۔ پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کن مواقع پر خرچ کرنا درست اور کون
سی جگہ حرام ہے۔ ظاہر ہے کہ لہو لعب، کھیل کود، اسراف و تبذیر، رسم و رواج اور
شو بازی کے لیے خرچ کرنا کچھ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ الٹا وبال ہوگا۔ گویا جائز مقامات
پر خرچ کرنے سے دین اور دنیا دونوں بہتر ہوئے۔ یہاں جس خرچ کی تعریف
بیان کی گئی ہے وہ جائز اور ضروریہ کے اخراجات ہیں۔

لغویات سے اعراض

دوسرے اجر والوں کی اللہ نے یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے وَإِذَا سَمِعُوا
اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ جب وہ کسی بیہودہ بات کو سنتے ہیں تو اس سے پہلوتہی
کر دیتے ہیں وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ اور یوں
کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں
ہم تمہاری لغویات میں حصہ نہیں لیتے، تم اپنا کام کرتے رہو، ہم اپنا نیکی کا کام انجام
دیتے رہیں گے۔ یہ لوگ یوں کہہ کر فضولیات سے بچ نکلتے ہیں سَلَامٌ عَلَيْكُمْ
تم پر سلامتی ہو لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ہم جاہلوں کی خواہش نہیں رکھتے یعنی
نہ ہم ان کو منہ لگاتے ہیں اور نہ ان سے الجھتے ہیں۔ سلام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک
ملاقات کا کہ دو مومن آپس میں ملتے وقت السلام علیکم کہتے ہیں اور دوسرا
سلام متارکت کہلاتا ہے جس سے علیحدگی مراد ہوتی ہے کہ ہمارا آپس میں نباہ نہیں
ہو سکتا۔ نیک اور بد اکٹھے نہیں چل سکتے۔ لہٰذا ہم تم سے علیحدگی اختیار کرتے
ہیں۔ جب تم کسی کی بات کو سننے، سمجھنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر
ہمارا اور تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔

ہدایت بدستِ خدا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو تسلی دی ہے۔ حضور علیہ السلام

کی یہ خواہش تھی کہ ساری مخلوق ہدایت حاصل کرے کہ خدا کے غضب سے بچ جائے مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ بات آپ کے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ جسے آپ چاہیں اُسے راہ راست پہ نہیں لا سکتے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ مگر اللہ جسے راہ راست پہ لاتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ یہ اختیار اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور وہی بہتر جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو۔ اُسے علم ہے کہ ہدایت حاصل کرنے کی استعداد کون رکھتا ہے اور کون اس سے محروم ہے۔

صحیح احادیث[1] میں حضور علیہ السلام کے چچا ابو طالب کا واقعہ مذکور ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی شدید ترین خواہش کے باوجود اس نے ایمان قبول نہ کیا۔ ابو طالب کے آخری لمحات میں حضور علیہ السلام اُس کے سرہانے موجود تھے۔ آپ نے آخری کوشش کی اور کہا یا عم قُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ لَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اے میرے چچا لا الہ الا اللہ کہہ دے میں قیامت کے دن تیرے حق میں گواہی دوں گا۔ مگر اس نے یہ دعوت قبول نہ کی بلکہ انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی مرنا چاہتا ہوں۔ حضور علیہ السلام کو زیادہ صدمہ ہوا کیونکہ ابو طالب نے زندگی بھر آپ کا ساتھ دیا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کو کفالت میں لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دس سال بعد تک نبوت کے اظہار میں آپ کا ساتھ بھی دیتا رہا۔ حتیٰ کہ شعب ابی طالب میں آپ کے خاندان کے ہمراہ تین سال تک نظر بند بھی رہا مگر خود کفر اور شرک پر ہی رہا۔ ایمان قبول نہیں کیا۔

مشرک کے لیے دعا

جب ابو طالب نے ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا تو حضور علیہ السلام نے مایوسی کے عالم میں فرمایا کہ میں تیرے لیے اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ کہ تیرے لیے بخشش کی دعا ہی کروں۔ جب تک کہ مجھے روک نہ دیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ

[1] بخاری صفحہ ۱۵۹ درمنثور صفحہ ۱۵۹ / ۲۰ (فیاض)

كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (التوبہ-۱۱۳) نہ تو یہ نبی کی شان ہے اور نہ کسی دوسرے مومن کی کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دُعا کریں اگرچہ وہ ان کے قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں، بعد اس کے کہ اُن پر واضح ہو گیا کہ یہ لوگ جہنم والے ہیں مطلب یہ کہ اگر کسی کا باپ، بیٹا، بھائی، بیوی، چچا، بھتیجا کوئی بھی ہو اگر اس کا خاتمہ کفر شرک پر ہوا ہے تو اُس کے لیے بخشش کی دُعا کرنا حرام ہے۔ ہاں! اُس کی زندگی میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو ہدایت نصیب فرما دے اور اگر وہ نہیں مانتا تو پھر نبی کی دُعا بھی مقبول نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب راہ راست پر لانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو پھر کوئی ولی، بزرگ یا پیر کیا کر سکتا ہے؛ آج تو لوگ کہتے ہیں کہ پیر کا دامن پکڑ لیا تو بیڑا پار ہو جائے گا، مگر نہ عقیدہ درست ہے، نہ اخلاق اور نہ اعمال تو بیڑا کیسے پار ہو گا؟ مرشدانِ برحق کا کام سیدھا راستہ بتانا ہے، لوگوں کی تربیت کرنا ہے۔ حق و باطل سے روشناس کرانا ہے۔ مگر منزلِ مقصود تک پہنچانا اللہ کا کام ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِىْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَىْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

ترجمہ:- اور کہا (اُن کفار و مشرکین نے) اگر ہم تابعداری کریں ہدایت کی آپ کے ساتھ تو اُچک لیے جائیں گے ہم اپنی سرزمین سے (فرمایا) کیا ہم نے نہیں جگہ دی اِن کو حرم میں بحالتِ امن ۔ کھینچ کر لائے جاتے ہیں اس کی طرف پھل ہر قسم کے ، یہ روزی ہے ہماری طرف سے ، لیکن اکثر ان میں سے سمجھ نہیں رکھتے ﴿۵۷﴾ اور بہت سی ہلاک کیں ہم نے بستیاں کہ وہ اِترا گئی تھیں اپنی معیشت میں ۔ پس یہ اُن کے

ٹھکانے ہیں [illegible] ان کے بعد مگر بہت کم ، اور ہم ہی وارث ہیں ﴿۵۸﴾ اور نہیں تیرا پروردگار ہلاک کرنے والا بستیوں کو یہاں تک کہ بھیج دے اُن کی مرکزی بستیوں میں رسُول جو پڑھتے ہیں ان پر ہماری آیتیں اور ہم نہیں ہلاک کرتے بستیوں کو مگر اس حال میں کہ اُن کے رہنے والے ظالم ہوتے ہیں ﴿۵۹﴾ اور جو چیز دی گئی ہے تم کو یہ سامان ہے ۔ دنیا کی زندگی کا اور اُس کی زینت ہے ۔ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے ؟ ﴿۶۰﴾

ربط آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا شکوہ بیان کیا تھا کہ وہ ہدایت کی عدم قبولیت کے لیے طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہیں ۔ اور ساتھ اہل ایمان کو تسلی بھی دی کہ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے لیے اللہ کے ہاں دوہرا اجر ہے ۔ اب آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے محروم رہنے والوں کے ایک حیلے بہانے کا ذکر کیا اور اُس کا جواب بھی دیا ہے ۔

مشرکین مکہ کا عذر لنگ

ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا تو ہم اُچک لیے جائیں گے اپنی سرزمین سے ۔ یعنی اگر ہم نے ایمان قبول کر لیا تو ہمیں مخالفین سے اپنی جانوں اور مال کا خطرہ ہے ، وہ ہمیں مار ڈالیں گے ۔ یہ قبولِ حق سے انکار کا محض ایک بہانہ تھا ، ورنہ ایسی کوئی بات نہ تھی ۔ بعض مشرکین نے خود حضور علیہ السلام سے بھی عرض کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ برحق ہیں مگر ہم ایمان لا کر سارے عرب کو اپنا دشمن نہیں بنا لینا چاہتے ۔ طرف کے سارے قبائل ہم پر چڑھائی کر دیں گے ۔

اللہ نے جواباً فرمایا اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا کیا ہم نے انہیں حرم

مامون نہیں ہے [illegible] دو دو سفر اور سردیوں میں سفر کرنے کے لیے محفوظ [illegible] تھیں ۔۔
تھی۔ فرمایا اللہ نے اُن کے لیے راستے ہی مامون نہیں کر دیے بلکہ اَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝ بلکہ انہیں بھوک کی حالت میں کھانا بھی کھلاتا ہے اور خوف سے مامون بھی رکھتا ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں سرزمینِ عرب میں امن و امان کی حالت اس قدر مخدوش تھی کہ آمد و رفت لوٹ مار کا بازار گرم رہتا کوئی شاہراہ محفوظ نہیں تھی ہر طرف ڈاکوؤں کی عملداری ہوتی جونہی کوئی قافلہ دیکھتے جھٹ حملہ کر کے لوٹ لیا۔ جب مقابلہ ہوتا قتل و غارت ہوتی اور اس طرح سال کا دو تہائی حصہ غیر محفوظ رہتا۔ صرف چار حرمت والے مہینے ایسے تھے جن میں لوٹ مار اور لڑائی جھگڑا بند ہوتا تھا اور عام طور پر تجارتی قافلے انہی مہینوں میں سفر کرتے تھے۔ اس کی تصدیق حضور علیہ السلام کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ یمن کے اطراف میں بسنے والے قبیلہ عبدالقیس کے کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں آپ تک پہنچنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے راستے میں قبیلہ مضر ہے جس کے کافر حرمت والے مہینوں کے علاوہ ہمارے راستے میں ہمیشہ مزاحم ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں کوئی جامع مانع تعلیم ارشاد فرما دیں تاکہ ہم اس پر عمل کرتے رہیں اور بار بار آپ کی خدمت میں نہ آنا پڑے۔

اس تمام تر افراتفری کے باوجود مکے کی سرزمین ایک ایسا خطہ تھی جو سارا سال مامون رہتا تھا۔ بیت اللہ شریف کی حرمت کی وجہ سے لوگ سارے حرم شریف کا احترام کرتے تھے اور یہاں کسی قسم کا جنگ و جدل یا لوٹ مار نہیں ہوتی تھی۔ بیت اللہ شریف ہی کے واسطے سے پورا عرب اس کے متولیان قریش کا بھی احترام کرتے تھے۔ ان کو بیت اللہ کے رہنے والے مانتے، اُن کی عزت کرتے اور سارا سال یہ جہاں جانا چاہتے انہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ ان کے تجارتی قافلے بھی بحفاظت منزل

مقصود تک پہنچ جاتے تھے۔

اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو جواب دیا ہے کہ تم کہتے ہو کہ اگر ایمان لے آئے تو عرب قبائل ہمیں کھا جائیں گے۔ بتلاؤ تو بتاؤ کہ اب تمہاری حفاظت کون کرتا ہے جب کہ پورے عرب میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوتا ہے؟ فرمایا کیا ہم نے تمہیں امن والے حرم شریف میں جگہ نہیں دی جس خدا تعالیٰ نے اس وقت تمہاری حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے کیا وہ ایمان لانے کے بعد تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ اللہ نے فرمایا تمہیں یاد نہیں کَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيلِ (الفیل) اللہ نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جو لوگ بیت اللہ کی حرمت کے درپے ہوتے تھے انہیں چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے تباہ کر دیا اور نہ صرف بیت اللہ کی حفاظت فرمائی بلکہ تمہارے اوپر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ تو اب تم کیسے کہتے ہو کہ محض ایمان لانے کی وجہ سے مارے جاؤ گے۔

حرم میں ثمر آوری

فرمایا یہ وہ حرم پاک ہے يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا کہ جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھینچ کھینچ کر لائے جاتے ہیں مکے کا علاقہ بالکل بے آب و گیاہ خشک پہاڑ ہے جہاں نہ کوئی درخت ہے نہ سبزہ۔ بس چلچلاتی دھوپ اور سڑتے ہوئے پہاڑ۔ اس طرح کے علاقے میں ہر قسم کے پھلوں کی فراوانی محض تائید خداوندی سے ممکن ہے۔ یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا ثمرہ ہے۔ جو انہوں نے حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیل علیہ السلام کو اس مقام پر آباد کرتے ہوئے کی تھی وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم۔ ۳۷) پروردگار! انہیں پھلوں سے روزی دے تاکہ تیرا شکر ادا کریں۔ آپ نے یہ بھی دعا کی اے پروردگار! اس گھر کو امن والا بنا دے۔ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ (البقرہ۔ ۱۲۶) یہاں کے بسنے والوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔ جو ان میں سے ایمان لے آئیں۔ اللہ نے فرمایا کہ البتہ کافروں کو بھی کچھ فائدہ پہنچاؤں گا۔ ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى

عَذَابِ النَّارِ (البقرہ - ۱۲۶) اور پھر گھسیٹ کر جہنم میں بھی داخل کر دوں گا۔ بہر حال اللہ نے قریش مکہ کو یاد دلایا کہ اُس نے پہلے ہی نہ صرف امن دے رکھا ہے بلکہ تمہاری روزی کا بندوبست بھی کمال درجے کا کر دیا ہے اب ایمان کی عدم قبولیت کا تمہارا کوئی حیلہ بہانہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ وہ اپنی لاعلمی اور بے سمجھی کی وجہ سے ہی بہانے تلاش کرتے ہیں۔ فرمایا اگر تم کفر و شرک کو چھوڑ کر ایمان اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرو گے تو اللہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تمہاری حفاظت کرے گا۔ کیونکہ اس کا فیصلہ ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف - ۱۲۸) اچھا انجام متقیوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔

خوشحال اقوام کی ہلاکت

اگلی آیت میں اللہ نے ناشکر گزاروں کو سزا دینے کا قانون بیان فرمایا ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا اور کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا جو اپنی معیشت میں اترا گئی تھیں۔ بطر کا معنیٰ اکڑنا اور متکبر ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی وجہ سے غرور و تکبر میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ آسودہ زندگی کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اپنی گذران پر اترانے لگے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اللہ نے مکہ والوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ دیکھو! ہم نے بہت سی قوموں کو ہلاک کیا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا یہ اُن ہلاک شدگان کی رہائش گاہیں ہیں جن میں ان کے بعد بہت کم ہی رہائش اختیار کی گئی ہے۔ سابقہ اقوام کے اکثر محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ قوم ثمود کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں مگر وہاں کوئی رہائش نہیں ہے۔ جب متنبی شاعر مصر گیا تو اُس نے اہرامِ مصر کے بعض نمونے دیکھ کر کہا تھا۔

اَيْنَ الَّذِيْ الْهَرَمَانِ مِنْ بُنْيَانِهٖ
مَا قَوْمُهٗ مَا يَوْمُهٗ مَا الْمَصْرَعُ

وہاں گئے وہ لوگ جنہوں نے عالیشان محلات بنائے تھے۔ اُن کی قوم کہاں گئی اور ان کے وہ تاریخی ایوان [illegible] — [illegible] یہ لوگ اپنی اولاد میں تھے سب تھے مگر وہ تیرا اللہ نے انہیں کس طرح برباد کیا۔ کسی کو زلزلے کے ذریعے تباہ کیا گیا کسی پر طوفان بھیجا گیا اور کسی پر پتھر مسلط کر دئیے گئے۔ فرمایا وہ خود لوگ تو صفحہ ہستی سے مٹ گئے وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ اب ہم ہی ان کے وارث ہیں کیونکہ ماسوا اللہ۔

ہلاکت کے لیے اتمام حجت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہلاکت اقوام کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا اور تیرا پروردگار بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ اُن کی مرکزی بستیوں میں رسول نہ بھیج دے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب قوم لوط کو اللہ نے تباہ کیا تو ان کی مرکزی بستی سدوم میں لوط علیہ السلام کو بھیجا۔ آپ نے سال ہا سال تک حق تبلیغ ادا کیا مگر قوم نہ مانی، آخر تباہ ہوئی۔ اسی طرح مدین، وادیٔ قریٰ اور تبوک وغیرہ کی بستیوں میں اللہ نے صالح علیہ السلام کو بھیج کر لوگوں کو خبردار کیا۔ یمن کے متمدن علاقے میں ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ بہرحال اللہ نے ہر قوم کی مرکزی بستیوں میں اپنے پیغمبر اُن کے پاس بھیج کر حجت تمام کی اور پھر جب وہ راہ راست پر نہ آئے تو عذاب الٰہی نے ان کو پکڑ لیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (آیت ۱۵) ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے جب تک وہاں رسول نہ بھیج لیں اور اچھی طرح سے بات کھول نہ دیں۔ اللہ نے بدر والوں کے متعلق بھی فرمایا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (الانفال ۴۲) بات پورے طریقے سے واضح ہو چکی ہے۔ اب جس کو ہلاک ہونا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بلاوجہ ہلاک نہیں کرتا۔ بلکہ ہلاک ہونے والی قوم خود اپنی کرتوتوں کا خمیازہ بھگتی ہے۔ فرمایا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي

الْقُرٰى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے باشندے ظالم لوگ تھے۔ سورۃ ہود میں ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (آیت ۱۱۷) تیرا پروردگار کسی بستی کو ظلم کے ساتھ ہلاک نہیں کرتا جب کہ اس کے باشندے صلح پذیر ہوں۔ صرف ظالموں کو ہی ہلاک کیا جاتا ہے۔

جن پرانی قوموں کی ہلاکت کا ذکر قرآن پاک یا تاریخ میں مذکور ہے۔ وہ ظالم لوگ تھے قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم نوح، قوم ابراہیم، بابلی، عراقی سب ناہنجار تھے۔ جن کو خدا نے ہلاک کیا۔ قریش مکہ نے بھی اپنے نبی کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا حتیٰ کہ انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا۔ یہ سب مجرم اور سخت گنہگار لوگ تھے جو ہلاک ہوئے۔ اللہ نے ہلاکتِ اقوام کی یہ حکمت بھی بیان کر دی ہے۔

دنیاوی متاع کی حیثیت

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ جس دنیا کی خاطر تم ایمان کو قبول نہیں کرتے اس کی حیثیت تو یہ ہے وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا تمہیں جو چیزیں بھی دی گئی ہیں، وہ دنیا میں فائدہ اٹھانے کا سامان اور اس کی زینت ہے۔ اس مادی حیات کی ہر چیز عارضی ہے جس سے چند روز تک ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور بالآخر اس کو ختم ہونا ہے۔ صاحب تفسیر کشاف[1] نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے اَلْمُؤْمِنُ يَتَزَوَّدُ وَالْمُنَافِقُ يَتَزَيَّنُ وَالْكَافِرُ يَتَمَتَّعُ مومن آدمی دنیا میں صرف توشہ اختیار کرتا ہے، منافق زیب و زینت میں مشغول ہو جاتا ہے اور کافر خوب فائدہ اٹھاتا ہے ظاہر ہے کہ اصل کردار تو مومن کا ہی ہے جو اس دنیا کو بھی سمجھ کر صرف زادِ راہ پر ہی قناعت کرتا ہے اور دنیا کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ منافق اس دنیا کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور کافر تو اول و آخر دنیا کو ہی سمجھ لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد - ۱۲) پھر وہ جانوروں کی طرح کھانے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی کا

[1] کشاف ص ۴۲۵ ج ۳ (فیاض)

مقصد ہی کھانا اور فائدہ اٹھانا ہوتا ہے مگر یہ چیزیں اُن کی زندگی تک ہی محدود ہوتی ہیں جب موت آجاتی ہے تو آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جاتے ہیں۔

مومن اور منافق کی مثال

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں لکھتے ہیں اَلْمُنَافِقُ لَقَّافٌ وَالْمُؤْمِنُ وَقَّافٌ یعنی منافق نگلنے والا ہوتا ہے اور مومن رکنے والا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافق آدمی کے ہاتھ جو چیز آجائے، وہ حلال حرام، جائز ناجائز کی تمیز کیے بغیر اُس کو کھا لیتا ہے جب کہ مومن آدمی کھانے سے پہلے رک کر دیکھ لیتا ہے کہ خورد و نوش کی اشیا کی کیا حیثیت ہے، جب تک تسلی نہ ہو مومن آدمی ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ خود حضور علیہ السلام کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی چیز پیش کی جاتی تو آپ دریافت کرتے کہ یہ کیا چیز ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرما لیتے اور تناول فرماتے اور اگر صدقہ ہوتا تو کہتے کہ یہ ہمارے لیے روا نہیں ہے۔ گویا مومن کی شان یہ ہے کہ وہ حلال و حرام میں امتیاز کرتا ہے۔ مومن اس بات میں غور کرے گا کہ اس کی خوراک، اس کا لباس، جس کا مکان اور اُس کے دیگر لوازمات جائز ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں یا ناجائز ذرائع سے مومن ہر کام کرنے سے پہلے وقوف کرتا ہے، غور و فکر کرتا ہے اور پھر عملی قدم اٹھاتا ہے۔

خیر و ابقی عند اللہ ہے

فرمایا دنیا کا متاع تو اسی دنیا تک محدود ہے اور ختم ہو جانے والا ہے وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ دنیا کے عارضی مال و متاع کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے آخرت کے مقامات اور انعامات دیرپا ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ دنیا کی محفلیں، یہاں کی رونقیں، کھانے، لباس، عمارات ہر چیز فانی ہے، لہٰذا انسان کو دنیا کی چیزوں میں دل نہیں لگانا چاہیئے، بلکہ محض ضرورت کے مطابق اِن سے فائدہ اٹھانا چاہیئے انسان کا آخری مقام اللہ کے پاس ہے اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ فرمایا

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ دنیا و آخرت کا تقابل پیش کر دیا ہے۔ اب غور و فکر کر کے ان میں سے انتخاب کرنا تمہارا کام ہے۔ دنیا کی زندگی پر فریفتہ ہو کر آخرت کو فراموش کر دینا بدبختی کی علامت ہے۔

أَفَمَنْ وَعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَنْ مَتَّعْنٰهُ
مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ
الْمُحْضَرِينَ ﴿٦١﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ
الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ۚ أَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا
غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوٓا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾
وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا
لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾
وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾
فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ﴿٦٦﴾
فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى أَنْ
يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ
وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ
وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ
فِي الْأُولٰى وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾

ترجمہ:- بھلا وہ شخص جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ۔ پس وہ اس سے ملنے والا ہے، تو کیا یہ اُس کی مثل ہو سکتا ہے جس کو ہم نے فائدہ پہنچایا ہے دنیا کی زندگی کے سامان کا، پھر وہ قیامت کے دن پکڑے ہوئے لوگوں میں حاضر کیا جائے گا (٦١) اور جس دن وہ پکارے گا اُن کو اور فرمائے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم گمان کرتے تھے (٦٢) تو کہیں گے وہ لوگ جن پر ثابت ہو چکی ہو گی بات، اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے ان کو گمراہ کیا، جس طرح خود ہم گمراہ ہوئے۔ ہم بیزاری کا اعلان کرتے ہیں تیرے سامنے کہ یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (٦٣) اور کہا جائے گا بلاؤ اپنے شریکوں کو، پس وہ بلائیں گے۔ پس نہیں جواب دے سکیں گے اُن کو۔ اور دیکھیں گے عذاب کو اپنے سامنے (اور افسوس کریں گے) کاش وہ ہدایت پانے والے ہوتے (٦٤) اور جس دن وہ پکارے گا اُن کو اور کہے گا کہ تم نے کیا جواب دیا رسولوں کو (٦٥) پس تاریک ہو جائیں گی اُن پر خبریں اُس دن۔ پس وہ نہیں ایک دوسرے سے پوچھیں گے (٦٦) بہرحال وہ شخص جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا، پس اُمید ہے کہ یہ لوگ فلاح پانے والوں میں ہوں گے (٦٧) اور تیرا پروردگار پیدا کرتا ہے جو چاہے، اور پسند کرتا ہے۔ نہیں ہے اِن لوگوں کے لیے اختیار۔ پاک ہے اللہ کی ذات اور بلند ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ لوگ اُس

کے ساتھ شریک بناتے ہیں (۶۸) اور تیرا پروردگار جانتا ہے جو چھپاتے ہیں ان کے سینے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (۶۹) اور وہی ہے اللہ، نہیں کوئی معبود اُس کے سوا، اُسی کے لیے ہے تعریف دنیا اور آخرت میں اسی کے ہاتھ میں ہے حکم، اور اُسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے (۷۰)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا شکوہ بیان کیا تھا اور پھر اُن کے بُرے انجام کا ذکر کیا تھا۔ اللہ نے اُن کی گرفت کا ذکر کیا کہ وہ ظلم و تعدی کرنے والوں کو ہی پکڑتا ہے۔ پھر اللہ نے دنیا کے ساز و سامان کی ناپائیداری کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں جو نعمتیں ہیں وہ ہمیشہ رہنے والی ہیں اللہ نے انسان کو ترغیب دلائی کہ عقل سے کام لیں اور پائیدار چیزوں کو اختیار کریں اور عارضی چیزوں میں دل نہ لگائیں۔ اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور نیکی والوں کا تقابل کفر، شرک اور برائی والوں سے کیا ہے۔ اس کے بعد رسالت کا ذکر ہے اور پھر توحیدِ خداوندی کی تائید اور شرک کی تردید فرمائی ہے۔

نیک و بد کا تقابل

ارشاد ہوتا ہے اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ بھلا وہ شخص جس کے ساتھ ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ اور وہ اس کو پانے والا ہے كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو ہم نے صرف دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھانے کا سامان دیا ہے۔ ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ پھر وہ قیامت والے دن (مجرموں کے ساتھ گرفتار) لوگوں میں حاضر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نیک آدمی جس کے ساتھ اللہ نے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ مجرموں کے ساتھ گرفتار شخص کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ایمان اور نیکی والے کو وعدے کے مطابق نہایت اچھا مقام عطا کرے گا، اس کو انعام و اکرام سے نوازے گا، وہ عیش و آرام کی دائمی زندگی بسر کرے گا، اُسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور وہ خدا کی رحمت کے مقام میں داخل ہوگا۔ دوسری

طرف وہ شخص ہے جو اس دنیا کے سازوسامان پر ہی ریجھ گیا ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی رنگینیوں میں ہی الجھ کر رہ گیا ہے اور آخرت کی دائمی زندگی کا کچھ خیال نہیں کرتا۔ وہ بھلا نیک آدمی کے ہم پلہ کیسے ہو سکتا ہے جو دائمی نعمت میں ہوگا۔

معبودان باطل کا اعلان بیزاری

ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ اور جس دن (ان کا پروردگار) ان کو پکار کر کہے گا۔ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم گمان کرتے تھے کہ یہ تمھاری مشکلات حل کر دیں گے اور تمھاری حاجت روائی کریں گے۔ تم نے اُن کو خدائی میں حصہ دار بنا لیا تھا۔ اب بلاؤ تو ان کو اپنی حمایت میں کہ تمھاری مدد کریں۔ اب ان مشرکوں سے تو کوئی جواب نہیں بن پڑے گا۔ البتہ اُن معبودوں کو حاضر کیا جائے گا جن کی یہ لوگ پوجا کیا کرتے تھے۔ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ کہیں گے وہ لوگ جن پر بات ثابت ہو جائے گی۔ اس سے مراد وہ معبودان باطلہ ہیں جن کی مشرک لوگ پوجا کرتے تھے۔ وہ جواب دیں گے۔ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا اے ہمارے پروردگار! یہی وہ مشرک ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا۔ ان میں شیاطین بھی شامل ہیں جو ہمیشہ انسانوں کو ورغلا کر شرک کی دعوت دیتے رہے۔ وہ کہیں گے۔ أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ہم نے ان کو اسی طرح گمراہ کیا جس طرح خود گمراہ ہوئے۔ ہم خود کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا تھے تو ان کو بھی اُسی ڈگر پر چلایا۔ یہ تو دنیا میں ہو چکا۔ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ اب ہم تیرے روبرو بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ یہ مشرک لوگ ہماری پرستش نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چل کر گمراہ ہوئے لہٰذا یہ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں۔

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ اور مشرکوں سے کہا جائے گا کہ آج اپنے معبودوں کو بلاؤ جن کو تم دنیا میں پکارا کرتے تھے۔ فَدَعَوْهُمْ پھر وہ اُن کو بلائیں گے۔ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ مگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ اور

نہ ہی کوئی مدد کر سکیں گے۔ اُس وقت عابد اور معبود سب بے بس اور لاجواب ہو جائیں گے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کو لب کشائی کی ہمت نہیں ہوگی وَرَاَوُا الْعَذَابَ اور وہ عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے۔ اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ اور تمنا کریں گے لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ کاش کہ وہ ہدایت یافتہ ہوتے دنیا میں گمراہی سے بچ کر سیدھے راستے پر چلتے ہوتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر اُس وقت ان کی یہ حسرت کچھ مفید نہیں ہوگی اور انہیں عذاب الٰہی کا مزہ چکھنا ہی ہوگا

رسالت کے متعلق سوال

قیامت والے دن رسالت کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ لوگو! تم نے ہمارے رسولوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اور جس دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پکاریگا۔ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ اور فرمائے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا۔ وہ میری دعوت لے کر تمہارے پاس آئے تھے میرا پیغام پہنچایا تھا۔ بتلاؤ تمہارا کیا ردِ عمل تھا؟ اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں بن آئے گا۔ اور پھر حالت یہ ہو جائے گی کہ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ اُس دن ان پر تمام خبریں تاریک ہو جائیں گی ایسی دہشت طاری ہوگی کہ بات تک نہیں کر سکیں گے فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے بھی نہیں پوچھ سکیں گے مطلب یہ کہ آپس میں مشورہ بھی نہیں کر سکیں گے کہ کوئی معقول جواب دے سکیں۔ اس طرح گویا رسالت کے سوال پر بھی لاجواب ہو جائیں گے۔

کامیابی کا زینہ

گمراہی کی وجوہات تو بیان ہو چکیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کامیابی کس طرح حاصل ہو؟ تو فرمایا فَاَمَّا مَنْ تَابَ بہرحال جس نے توبہ کر لی کفر، شرک اور معاصی سے دنیا میں ہی بیزاری کا اظہار کر دیا۔ اور پھر زندگی بھر اُن کے قریب نہ آیا۔ وَاٰمَنَ اور ایمان لے آیا یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت، معاد، کتب سماویہ، ملائکہ کو دل سے تسلیم کر لیا۔ وَعَمِلَ صَالِحًا اور پھر نیک اعمال شروع کر دیئے۔ گویا یہ تین اعمال کامیابی کا زینہ ہیں۔ جو اس زینے پر چڑھ گیا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ پھر اُمید ہے کہ یہی لوگ فلاح پانے والوں

میں ہوں گے۔ یہ توبہ، ایمان اور عمل کا راستہ ہے۔ جو اس راستے پر گامزن ہو گیا، وہ انشاء اللہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں کو معاف فرمائے گا اور وہ فائز المرام ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ بے نیازی میں اپنے بندوں سے اس طرح خطاب کیا ہے کہ اُمید ہے کہ یہ لوگ کامیاب ہو جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو اور وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے آئندہ کے لیے ایمان اور نیکی کی راہ پر چل نکلیں۔

اختیارِ خداوندی

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ خلق، اپنی پسند، مخلوق کی نفی اور شرک کا رد فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اور تیرا پروردگار جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ صفتِ خلق میں اُس کا کوئی شریک نہیں کسی چیز کے پیدا کرنے سے پہلے اُسے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وَيَخْتَارُ اور وہی پسند کرتا ہے یا جس کو چاہے منتخب کرتا ہے۔ یہ دراصل مشرکین کا رد ہے جو کہتے تھے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف - ۳۱) کہ یہ قرآن مکے اور طائف کی دو عظیم بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل ہوا؟ یہاں پر بڑے بڑے سردار ہیں جن کے باغات ہیں، نوکر چاکر ہیں، مال تجارت ہے، مویشی ہیں، مگر نبوت کے لیے ابو طالب کا یتیم بھتیجا ہی رہ گیا تھا مگر اللہ نے فرمایا، کہ نبوت و رسالت کے لیے مالی طور پر مضبوط ہونا ضروری نہیں بلکہ اس منصب کے لیے صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے کہ کون اس منصب کے اہل ہے۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج - ۷۵) اللہ تعالیٰ ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول منتخب کرتا ہے، وہی اُس کی مصلحت کو بہتر جانتا ہے۔ مخلوق کو اس معاملے میں نہ کوئی اختیار ہے اور نہ اُن کے مشورے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اُس کے سوا کوئی کسی کی مشکل کشائی اور حاجت روائی نہیں کر سکتا۔ مخلوق میں سے کسی کو کچھ بھی اختیار نہیں ہے۔

صحابہ کرامؓ کے مناقب

امام قرطبی نے اپنی تفسیر[1] میں مسند بزار کے حوالے سے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اِخْتَارَ اَصْحَابِیْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ سِوَی النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ	بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو تمام جہان والوں پر پسند کیا ہے سوائے نبیوں اور رسولوں کے۔
وَاخْتَارَ مِنْ اَصْحَابِیْ اَرْبَعَةً وَفِیْ اَصْحَابِیْ کُلِّهِمْ خَیْرٌ وَاخْتَارَ اُمَّتِیْ عَلٰی سَائِرِ الْاُمَمِ وَاخْتَارَ مِنْ اُمَّتِیْ اَرْبَعَةَ قُرُوْنٍ	اور میرے صحابہ میں سے چار کو منتخب فرمایا ہے۔ میرے تمام صحابہ میں بہتری ہے اور میری امتوں کو تمام امتوں کے مقابلے میں منتخب فرمایا ہے اور میری امتوں میں سے چار قرنوں کو خاص طور پر منتخب فرمایا ہے

اس حدیث شریف میں صحابہ کرام کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ نبیوں اور رسولوں کے علاوہ حضور کے صحابہ کو باقی تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اور پھر ان میں سے چار صحابہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ عثمان غنیؓ اور علی المرتضیٰؓ کو باقی صحابہ پر افضلیت حاصل ہے۔ یہی چاروں حضرات خلفائے راشدہ ہیں جس طرح ان چار صحابہ کو باقی صحابہ پر فوقیت حاصل ہے اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساری امت کو باقی امتوں پر فضیلت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے چار زمانے بہترین ہیں۔ یہ چار قرن (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ (۲) صحابہ کا زمانہ (۳) تابعین کا زمانہ۔ اور (۴) تبع تابعین کا زمانہ ہے۔ بہرحال یہ سارا انتخاب اللہ تعالیٰ کا اپنا ہے کسی امت کا انتخاب، اس امت میں سے خاص افراد کا انتخاب اور پھر خاص زمانوں کا انتخاب سب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ اس میں کسی مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔

رافضیوں کی گمراہی

اب ذرا رافضیوں کا باطل عقیدہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ فرقہ حضرت علیؓ کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ان کے بھی آگے بہت سے فرقے ہیں جن میں سے اثنا عشری فرقہ

[1] قرطبی صفحہ ۲۹۷ ج ۱۳ (فیاض)

زیادہ مشہور ہے۔ یہ لوگ اپنے بارہ اماموں کو معصوم تسلیم کرتے ہیں۔ ایران کے شیعہ بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پراپیگنڈا کے زور پہ ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب سے تعبیر کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً اسلامی انقلاب نہیں۔ محض شیعیت کا پرچار ہے۔ اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایران کا سرکاری مذہب شیعہ ہے اور وہاں کی اقلیت سنیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ اہل سنت کو اپنی علیحدہ مسجدیں بنانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ تہران کا شہر دس بارہ لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے مگر وہاں سنیوں کی ایک بھی مسجد نہیں ہے۔ یہ لوگ جمہور صحابہ کرامؓ کے ساتھ سخت نفرت رکھتے ہیں حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو مسلمان تک سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ نعوذ باللہ یہ ان حضرات کو منافق سمجھتے ہیں۔

اب ذرا ان کے امام خمینی کا عقیدہ بھی سن لیجئے جو اُس نے اپنی فارسی کی معتبر کتاب[1] "کشف الاسرار" میں بحوالہ "مرأۃ العقول" نقل کیا ہے۔ یہ کتاب شیعوں کی معتبر کتاب "کافی" کی شرح ہے۔ امام جعفر صادقؒ کے حوالے سے امام خمینی نے یہ روایت نقل کی ہے۔ اللہ نے حضور علیہ السلام سے خطاب کیا۔ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَزَلْ مُتَفَرِّدًا بِوَحْدَانِيَّتِهِ ثُمَّ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَعَلِيًّا وَفَاطِمَةَ ثُمَّ مَكَثُوا أَلْفَ دَهْرٍ ثُمَّ خَلَقَ جَمِيعَ الْأَشْيَاءِ وَفَوَّضَ أُمُورَهَا إِلَيْهِمْ فَهُمْ يُحِلُّونَ مَا يَشَاءُونَ وَيُحَرِّمُونَ مَا يَشَاءُونَ يَا مُحَمَّدُ هٰذِهِ الدِّيَانَةُ .... اے محمد بے شک اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کے ساتھ متفرد تھا، پھر اُس نے تین ہستیوں یعنی محمدؐ، علیؓ اور فاطمہؓ کو پیدا فرمایا۔ پھر یہ ہزاروں سال تک اسی طرح ٹھہرے رہے۔ پھر خدا نے باقی سب چیزوں کو پیدا کیا اور ان تین اصحاب کو گواہ بنایا اور تمام معاملات ان کو تفویض کر دیے۔ پھر وہ جس چیز کو چاہتے حلال اور جس چیز کو چاہتے حرام قرار دے دیتے۔ اور

[1] کشف الاسرار ص۵۵ مطبوعہ ایران (فارسی)

ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ یہ تینوں وہی کچھ چاہتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے، پھر فرمایا اے محمد! یہی دین ہے جو اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کریگا وہ سرکش ہوگا اور جو کوئی پیچھے رہنے کی کوشش کرے گا، مٹا دیا جائے گا۔ اور جو اس کو لازم پکڑے گا وہ حق کے ساتھ مل جائے گا۔

خدا تعالیٰ کی کبریائی

اس کے برخلاف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حلت و حرمت کو تعیین اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ میں سے ہے، یہ صرف اللہ کا حق ہے، اور کسی امامِ معصوم کو حلال حرام کا اختیار حاصل نہیں۔ بہر حال شیعوں کا دین یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اختیارات حضور علیہ السلام حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو سونپ دیئے ہیں۔ اُدھر اللہ کا فرمان یہ ہے کہ وہی پیدا کرتا ہے اور اسی کے پاس سارے اختیارات ہیں۔ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مخلوق کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور بلند ہے اُن چیزوں سے جن کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں فرمایا وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اور تیرا پروردگار خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جس چیز کو یہ ظاہر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ مشرکین کے تمام باطل عقائد و اعمال سے واقف ہے، وہ اِن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریگا۔ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ خالق، مالک، علیم، مختار اور قادر ہے ہر ایک کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کرنے والا وہی ہے لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ دنیا میں بھی اُسی کے لیے تعریف ہے۔ اور آخرت میں بھی وہی تعریفوں کے لائق ہے وَلَهُ الْحُكْمُ اور ہر قسم کا فیصلہ بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر چیز کا فیصلہ خود کرتا ہے اُسے کسی مشیر کی ضرورت نہیں ہے وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے، جب اوّل و آخر اللہ تعالیٰ ہی قادر و مختار ہے

اور محاسبہ اعمال کے لیے بھی اُسی کے سامنے حاضر ہونا ہے، تو اُس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنانے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لطیف پیرائے میں یہ بات سمجھا دی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ ع ۱۵

ترجمہ:- آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) لوگو! یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ بنا دے تمہارے اوپر رات کو ہمیشہ قیامت کے دن تک تو کون ہے اللہ کے سوا الٰہ جو لائے تمہارے پاس روشنی۔ کیا تم سنتے نہیں؟ (۷۱) آپ کہہ دیجئے اے لوگو! بتلاؤ اگر بنا دے اللہ تمہارے اوپر دن کو ہمیشہ قیامت کے دن تک تو کون ہے اللہ کے سوا الٰہ جو لائے تمہارے پاس رات کو

جس میں تم آرام پکڑ سکو ۔ کیا تم دیکھتے نہیں ؟ (۷۲) اور یہ اُس کی رحمت میں سے ہے کہ بنایا اُس نے تمہارے لیے رات اور دن کو تاکہ تم آرام پکڑو ، اور تاکہ تم تلاش کرو اُس کے فضل سے ، اور تاکہ تم (اللہ کی نعمتوں کا) شکر ادا کرو (۷۳) اور جس دن پکارے اُن کو (اللہ) پس فرمائے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم گمان کرتے تھے (۷۴) اور ہم کھینچ کر لائیں گے ہر امت سے گواہ ۔ پس ہم کہیں گے لاؤ اپنی دلیل ۔ پس وہ جان لیں گے کہ حق اللہ کے لیے ہے اور کھو جائیں گی ان سے وہ باتیں جن کو وہ افترا کیا کرتے تھے (۷۵)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا رد فرمایا اور ساتھ دونوں کا انجام بھی بیان کیا ۔ پھر اللہ نے اپنی صفتِ خلق کا ذکر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ وہ جو چاہے پیدا کرے سارا اختیار اُسی کو ہے ۔ مخلوق میں سے کوئی بھی با اختیار ہستی نہیں ہے ۔ فرمایا اللہ کی ذات بلند و برتر ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں ۔ فرمایا خدا تعالیٰ ظاہر و باطن ہر چیز کو جانتا ہے ۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے ، دنیا و آخرت میں اسی کی تعریف ہے اور سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔

لیل و نہار کا نظام

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں دو عقلی دلائل پیش کیے ہیں جو لیل و نہار کے نظام پر مشتمل ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے یعنی کفار و مشرکین کے سامنے یہ دلیل پیش کریں اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ بھلا بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لیے یعنی قیامت کے دن تک رات ہی مسلط کر دے مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ تو اللہ کے علاوہ کون الٰہ ہے ۔ جو

تمھارے پاس روشنی لے آئے۔ سرمد کا معنی دائمی ہوتا ہے جیسے عربی میں یہ محاورہ مستعمل ہے

سہ
لَعَمرُكَ مَا اَمرِي عَلَيَّ بِغُمَّةٍ
نَهَارِي وَلَا لَيلِي عَلَيَّ بِسَرمَدِ

اے مخاطب! تیری جان کی قسم میرا معاملہ مجھ پر تاریک نہیں ہے (یعنی میں بقائمی ہوش و حواس تمام امور انجام دیتا ہوں) میرے شب و روز دائمی نہیں ہیں۔

رات کو دائمی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک تاریکی ہی رہے اور روشنی کی کوئی کرن نہ پھوٹے۔ یا اگر سورج طلوع ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو ہی سلب کر لے۔ زندگی کے تمام کاروبار اور معیشت کا انحصار دن کی روشنی پر ہی ہے فرمایا اگر تمھارا پروردگار اس روشنی کو ہی روک دے تو اس کے سوا کون سی ذات ہے جو تمھارے لیے ایسی روشنی مہیا کر دے جس میں تم معمولات زندگی جاری رکھ سکو۔ اَفَلَا تَسمَعُونَ کیا تم سنتے نہیں؟ اس معاملے میں غور و فکر کرو کہ اللہ نے دن کی صورت میں کتنا بڑا انعام کیا ہے۔

اس کے برخلاف فرمایا قُل اے پیغمبر! آپ یہ بھی واضح کر دیں اَرَءَيتُم اِن جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيكُمُ النَّهَارَ سَرمَدًا اِلٰى يَومِ القِيٰمَةِ بھلا بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لیے تا قیام قیامت دن کو ہی مسلط کر دے تو مَن اِلٰهٌ غَيرُ اللّٰهِ يَاتِيكُم بِلَيلٍ تَسكُنُونَ فِيهِ اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھارے پاس رات کو لے آئے جس میں تم سکون پکڑتے ہو۔ فرمایا اَفَلَا تُبصِرُونَ کیا تم دیکھتے نہیں؟

یہ دونوں عقلی دلیلیں ہیں جنہیں انسان غور و فکر کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ نے شب و روز کا نظام عجیب طریقے سے قائم رکھا ہے۔ یہ دونوں یکے بعد دیگرے وارد ہو کر انسانی زندگی کے معمولات میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دن کے وقت لوگ اپنا کاروبار زندگی انجام دیتے ہیں جب کہ رات کے وقت آرام اور سکون حاصل کر کے اگلے دن کی مصروفیات کے لیے پھر سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ یہ نظام اللہ نے تمام جانداروں کی مصلحت

کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ اگر ان میں ذرا بھی خلافِ معمول تغیر و تبدل واقع ہو جائے تو زندگی کی گاڑی میں خرابی پیدا ہو جائے۔ اللہ نے فرمایا کہ اُس نے اپنی قدرت تامہ کے ساتھ یہ نظام قائم کیا ہے، بھلا کون ہے جو اس میں کوئی تبدیلی لا سکے؟

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان دو آیات کے آخر میں دو مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ پہلی آیت میں جہاں روشنی لانے کا چیلنج کیا گیا ہے وہاں فرمایا اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ کیا تم سنتے نہیں۔ دن کے وقت چونکہ انسان کو بے شمار نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جنہیں وہ شمار بھی نہیں کر سکتے، لہٰذا اس مقام پر "سماعت" کا لفظ استعمال کیا کہ تم سنتے نہیں؟ اور دوسری آیت میں رات کو لانے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ رات کے وقت چونکہ اشتغال کم ہوتا ہے اور انعامات بھی نسبتاً کم ہوتے ہیں، اس لیے وہاں پر "بصارت" کا لفظ استعمال کیا ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے یہ کیسا نظام قائم کر رکھا ہے؟

شب و روز میں تغیر کار

آگے اللہ نے دن اور رات کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ یہ اُس اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا نتیجہ ہے جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن کو بنایا ہے اُس نے عجیب و غریب نظام قائم کر رکھا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تم رات کے وقت سکون پکڑ سکو۔ تمام انسان، درندے، چرند، پرند وغیرہ رات کو آرام کرتے ہیں دن بھر کی مشقت سے تھک ہار کر سو جاتے ہیں۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اور تاکہ تم دن کے وقت اللہ کا فضل تلاش کر سکو یعنی محنت مزدوری تجارت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ کر کے اپنی معیشت کا سامان پیدا کر سکو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کام دن کی روشنی میں ہی بطریق احسن انجام پا سکتے ہیں لہٰذا اللہ نے دن کے اشتغال کو فضل یعنی ذریعہ روزی سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا (الانعام - ۹۶) اُس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا ہے۔ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (النبا - ۱۱) اور دن کو

ے ابن کثیر صفحہ ۳۹۸ ج ۳ (فیاض)

روزگار کا ذریعہ بنایا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس ضمن میں دو اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک اقتراب ہے اور دوسری ارتفاق۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فضل کا تعلق ارتفاق سے ہے یعنی انسان جائز ذرائع رزق حلال حاصل کر کے اپنی زندگی خوش اسلوبی سے بسر کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح - ۲۹) یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ فضل کا تعلق معاش سے ہے جب کہ رضوان کا تعلق اقتراب سے ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت، ریاضت اور ذکر وغیرہ کر کے اس کی رضا حاصل کرتے ہیں اور یہ چیز اُس کے قرب کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہر حال رات اور دن دونوں خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں کہ رات کے وقت انسان ایک تو آرام اور سکون پکڑتے ہیں اور دوسرے اُس کے حضور کھڑے ہو کر اُس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح دن کے وقت انسان اپنے وسائل کے مطابق کاروباری زندگی انجام دے کر اپنی معیشت کا سامان پیدا کرتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔

آگے اللہ نے ایک تیسری بات بھی بیان فرمائی ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکو۔ دن کے وقت کو محض لہو و لعب میں نہ گزار دو اور نہ ہی رات کو غفلت میں بسر کر دو بلکہ دونوں اوقات میں اللہ کے بے پایاں انعامات کا شکریہ ادا کرتے رہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں کو برمحل صرف کیا جائے۔ اگر انعاماتِ الٰہیہ کا استعمال صحیح نہ کیا تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ رات بھر نیند میں پڑے رہے اور اللہ کا ذکر نہ کیا۔ اور اسی طرح پورا دن کھیل کود میں گزار دیا تو اس کی نعمتوں کا شکریہ کیسے ادا ہوگا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے لیل و نہار کا نظام قائم کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔

اللہ کے حضور گواہی

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت والے دن لوگوں کو اپنے حضور حاضر کیے جانے کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا وَیَوۡمَ یُنَادِیۡھِمۡ جس دن اللہ ان کافروں اور مشرکوں کو طلب کرے گا۔ اپنے سامنے کھڑا کریگا۔ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ اور فرمائے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کو تم گمان کرتے تھے کہ یہ ہماری مشکل کشائی اور حاجت روائی کرتے ہیں۔ یا ہماری سفارش کر کے ہمیں خدا تعالیٰ سے چھڑالیں گے۔ فرمایا اُس وقت کوئی حیلہ کام نہیں آئیگا۔ کسی کافر اور مشرک کے حق میں نہ کوئی سفارش کریگا اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوگی۔

فرمایا وہ تو محاسبہ اعمال کا دن ہوگا اور اس مقصد کے لیے وَنَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا ہم ہر امت سے کھینچ کر گواہ لائیں گے۔ ہر امت کا نبی اور اس کا نائب گواہی دینے کے لیے آئے گا۔ اور بتلائے گا کہ ان لوگوں نے اللہ کے دین، شریعت اور احکام کو کس حد تک تسلیم کیا۔ فرشتے بھی انسان کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ خود انسان کے اپنے اعضاء وجوارح بھی بطور گواہ پیش ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ زبانوں پر مہر لگا دیگا اور ہاتھ پاؤں بول کر شہادت دیں گے کہ یہ شخص دنیا میں کیا کچھ کرتا رہا۔ اس کے علاوہ فرمایا شجر اور حجر بھی انسان کے حق میں گواہی دیں گے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ اذان کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے۔ وہاں کی ہر چیز مؤذن کے حق میں گواہی دیگی۔ پھر مشرکوں سے کہا جائیگا فَقُلۡنَا ھَاتُوۡا بُرۡھَانَکُمۡ اگر تمہارے پاس کفر و شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے تو اُسے پیش کرو آج بتلاؤ کہ تم نے کس طرح حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا۔ تم ساری شرکیہ رسوم کس دلیل کی بناء پر ادا کرتے تھے۔ اللہ کی وحدانیت کو کیوں تسلیم نہ کیا، خدا کے پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے اور کیوں اُن کو تکالیف پہنچاتے رہے۔ لاؤ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے۔ مگر اُس دن کسی کو بھی دم مارنے کی ہمت نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی دلیل پیش کر سکیں گے۔

حق و باطل کا امتیاز

فرمایا جب تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی کرتوتوں پر کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے فَعَلِمُوۡٓا اَنَّ الۡحَقَّ لِلّٰہِ تو خوب جان لو کہ بیشک سچی بات اللہ ہی کے لیے

[1] بخاری صفحہ ۸۶ ج ۱ (فیاض)

ہے۔ اُس نے اپنے انبیاء اور رُسل بھیج کر حق کو واضح کر دیا تھا۔ اپنی کتابوں کے ذریعے حق و باطل میں امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے بتلا دیا تھا کہ خالق، مالک، قادرِ مطلق، مختارِ مطلق، نافع اور ضار، مشکل کشا اور حاجت روا صرف وہی ہے۔ نہ خواہ مخواہ مخلوق کی پوجا کرتے رہے۔ اُس نے حقیقت کو واضح کر دیا تھا۔ فرمایا وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ قیامت والے دن وہ تمام چیزیں گم ہو جائیں گی جو انہوں نے افتراء کر رکھی تھیں۔ اُن کے غلط عقائد، بدعتی رسومات اور ایسی چیزیں سب ختم ہو جائیں گی اور اپنے حق میں پیش کرنے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں نجات حاصل نہیں ہوگی۔ کیونکہ نجات کا دارومدار ایمان اور نیکی پر ہے اللہ کی وحدانیت اور رسالت پر ایمان ہی مدارِ فلاح ہے مگر یہ چیزیں ان کے پاس نہیں ہوں گی۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۖ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۖ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٧٨﴾

ترجمہ:- بیشک قارون تھا موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے۔ پس سرکشی کی اُس نے اُن کے خلاف۔ اور ہم نے دیے تھے اُس کو خزانوں میں سے اس قدر کہ بیشک اُنکی چابیاں بوجھل کرتی تھیں ایک طاقتور گروہ کو۔ جب کہا اُس کے لیے اُس کی قوم نے مت اِتراؤ۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا اِترانے والوں کو ﴿٧٦﴾ اور تلاش کرو اُس چیز میں جو اللہ نے تم کو دی ہے آخرت کا گھر۔ اور نہ بھولو اپنا حصہ دنیا

سے ۔ اور احسان کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے ۔ اور نہ تلاش کرو فساد زمین میں ۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا فساد کرنے والوں کو (۷۷) کہا (قارون نے) بیشک دی گئی ہے مجھ کو (دولت) علم کی بنا پر جو میرے پاس ہے (فرمایا) کیا وہ نہیں جانتا کہ بیشک اللہ نے ہلاک کیا اس سے پہلے کئی قوموں کو جو اس سے زیادہ قوت اور زیادہ جتھے میں تھے اور نہیں پوچھے جاتے اُن کے گناہوں کے بارے میں مجرم لوگ (۷۸)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے پہلے مشرکوں کا رد کیا ۔ پھر توحید کے عقلی دلائل بیان فرمائے اور قیامت اور جزائے عمل کا ذکر کیا ۔ اُس سے پہلے مشرکین کو تنبیہ کی گئی جو غرور و تکبر کی وجہ سے توحید اور رسالت کا انکار کرتے تھے اور ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوتے تھے ۔ اللہ نے اُن کو سمجھانے کے لیے بعض پہلی بستیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا ۔ اب سورۃ کے آخری حصے میں اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی نصیحت کے لیے قارون کا واقعہ بیان کیا ہے ۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا آدمی تھا ۔ اللہ نے بے تحاشا مال و دولت دے رکھا تھا ۔ مگر اُس نے سرکشی اختیار کی اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حسد اور ضد کا اظہار کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کے مال و دولت سمیت ہلاک کر دیا ۔ مشرک لوگ بھی چونکہ ضد ، عناد ، حسد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے تھے ، یہ واقعہ بیان کر کے اللہ نے اُن کو بھی عبرت دلائی ہے ۔

قارون کا تعارف

ارشاد ہوتا ہے إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ بیشک قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا ۔ امام بیضاویؒ[1] اور بعض دوسرے مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف موسیٰ علیہ السلام کا ہم قوم تھا بلکہ آپ کا چچازاد بھائی تھا ۔ قارون ابن یصہر ابن قاہث ابن لاوی ۔ موسیٰ علیہ السلام کے باپ کا نام عمران تھا ۔ گویا قاہث کے دو بیٹے تھے ۔ یصہر اور عمران ۔ تاہم بعض نے قارون کو موسیٰ علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی بھی لکھا ہے قارون اگرچہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور انہی میں رلا ملا ہوا تھا ، موسیٰ علیہ السلام کی بظاہر تصدیق بھی کرتا

---

[1] بیضاوی صفحہ ۲۰ ج ۲ (فیاض)

تھا مگر در پردہ فرعون کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا۔ بلکہ اس کا ایجنٹ تھا۔ فرعون جو ٹیکس
وغیرہ اسرائیلیوں سے لینا چاہتا اس کے لیے قارون کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ فرعون
بڑے بڑے ٹھیکے قارون کے سپرد کرتا اور پھر وہ یہ کام معمولی اجرت پر اسرائیلیوں سے کرواتا،
جس کی وجہ سے اس نے بہت سا مال و دولت جمع کر لیا تھا۔

ظالم حکمرانوں کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ وہ بعض لوگوں کو اپنا آلۂ کار
بنا کر قوم کا خون چوستے رہتے ہیں۔ انگریز نے برصغیر میں حکمرانی کے دوران کئی مسلمانوں کو
اپنا ایجنٹ بنا کر پوری قوم کو ذلیل کیا۔ اپنے حامیوں کو بڑے بڑے عہدے، خطاب
اور جاگیریں دیں اور پھر ان کے ذریعے فوجی بھرتی لی اور بہت سے دیگر کام کروائے۔
سر محمد شفیع حضرت مولانا میر محمد تشر قصوری کا خالہ زاد بھائی تھا مگر انگریز کا ایجنٹ تھا۔
اسی طرح سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور پنجاب، سندھ اور سرحد کے دیگر بڑے
بڑے خاندانوں کو مراعات دیں اور بڑے بڑے کام لیے۔ قارون بھی اسی طرح فرعون
کا ایجنٹ تھا اُسے بڑی مراعات حاصل تھیں جس کی وجہ سے وہ بڑا مالدار بن گیا۔

قارون کا غرور اور حسد

فرعون کی غرقابی کے بعد بھی قارون اپنی قوم اسرائیل کے ساتھ ہی رہا، تورات
پڑھتا تھا اور بظاہر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان بھی رکھتا تھا مگر آپ کی سیادت، قیادت
اور نبوت و رسالت کی وجہ سے حسد کرنے لگا۔ کہنے لگا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام
تو دونوں نبی بن گئے، دنیا اور آخرت کی قیادت ان دونوں بھائیوں نے سنبھال
لی مگر اتنے مال و دولت کے باوجود میری تو کوئی قدر و منزلت نہ ہوئی۔ ادھر یہ
حسد پیدا ہوا، اور اُدھر موسیٰ علیہ السلام نے اُسے کل مال کا ایک چوتھائی زکوٰۃ ادا کرنے
کے لیے کہا۔ اس پر قارون اور بھی جل بھن کر کباب ہو گیا کہنے لگا میں نے یہ دولت
اپنے علم و ہنر کی بنا پر حاصل کی ہے اب یہ میری دولت ہی زکوٰۃ لے جانا چاہتا
ہے۔ وہ شخص پہلے ہی متکبر تھا، مال و دولت کر جاتا دیکھا تو مزید غصے سے بگڑ گیا
اور صاف انکار کر دیا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے احکام کی پابندی نہیں کر سکتے۔
یہی صورتِ حال خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ بھی پیش آئی۔

نہ ابوجہل اور ابولہب جیسے بڑے بڑے سردار تھے حضور علیہ السلام نے دعویٰ نبوت سے سخ پا ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر نبوت اس کو مل گئی تو ہمارے پاس کیا رہ گیا؟ حاجیوں کی خدمت پر پہلے بنی ہاشم قابض ہیں، اب نبی بھی اسی خاندان سے بن گیا تو ہماری سرداری کا تو جنازہ نکل گیا۔ چنانچہ انہوں نے حسد اور غرور کی بنا پر آپ کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا۔ بعینہٖ اسی طرح قارون بھی موسیٰ علیہ السلام کا مخالف ہو گیا۔ اور ان پر طرح طرح کی الزام تراشی کرنے لگا۔ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ اس طرح اس نے اسرائیلیوں پر خلاف سرکشی کی۔

قارون کی دولتمندی

اس کی دولت مندی کے متعلق اللہ نے فرمایا وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ ہم نے اسے خزانوں میں سے اس قدر عطا کیا مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ کہ ایک طاقتور جماعت اس کی چابیاں اٹھانے سے بوجھل ہو جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ اس کے خزانوں کی الماریوں اور صندوقوں وغیرہ کی چابیاں اس قدر تھیں کہ بہت سے لوگ مل کر بھی بمشکل اٹھاتے تھے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ عصبہ کا اطلاق تین سے دس افراد کی جماعت پر ہوتا ہے۔ اگر ہر آدمی کے حصے پانچ پانچ سو چابیاں آئیں تو گویا خزانوں کی صندوقوں کی تعداد چار پانچ ہزار بنتی ہے۔ ان میں روپے پیسے ہوں، سونا چاندی ہو یا دیگر قیمتی اشیاء، بہر حال قارون اتنے مال کا مالک تھا۔ مَفَاتِح دو الفاظ کی مشترک جمع ہے یعنی مِفْتَح اور مَفْتَح۔ مَفْتَح کا معنی خزانہ ہوتا ہے جب کہ مِفْتَح چابی کو کہتے ہیں۔ ہر دو الفاظ قارون کی کثرت مال و دولت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس زمانے میں تو اتنا بڑا مالدار شخص اکا دکا ہی ہوتا تھا مگر آج کے دور میں قارون جیسے بے شمار دولت مند موجود ہیں۔ آج کے کروڑ پتی سیٹھوں کی تجوریوں، تہہ خانے، سٹور اور بنک بیلنس وغیرہ کا حساب لگایا جائے۔ ان کے ملازمین، کوٹھیوں اور ایجنسیوں کو شمار کیا جائے تو یہ بھی قارون سے کسی طرح کم نہیں نکلیں گے بلکہ اس سے بڑھ کر مالدار ظاہر ہوں گے۔

بہر حال قارون کی ٹھاٹھ باٹھ، اس کے چال چلن اور غرور و تکبر کو دیکھ کر اذقال

ل بیان القرآن ص۱۲۰ ج ۸ (فیاض)

لَہٗ قَوْمُہٗ اُس کی اپنی قوم نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی اور نصیحت کی لَا تَفْرَحْ کہ اس مال و دولت پہ اتراؤ نہیں۔ فرح کا معنی اترانا بھی ہوتا ہے۔ اور خوش ہونا بھی۔ لوگوں نے کہا کہ اس عارضی مال کی وجہ سے نہ تو غرور و تکبر میں مبتلا ہو اور نہ ہی اس پر خوش ہو۔ ایسا کرنا حرام ہے۔ عناد اور حسد کو چھوڑ دو اور موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت سے باز آجاؤ۔ اسرائیلی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قارون کے ساتھ اڑھائی تین سو آدمی ہر وقت رہتے تھے۔ یہ اُس کے حامیوں کا خصوصی دستہ تھا جن کا کام صرف ہاں میں ہاں ملانا تھا۔ یہ لوگ قارون کو غلط مشورے دے کر اس کی عزت میں اضافہ کا باعث بنتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ اللہ نے تمہیں اس قدر دولت عطا کی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرو اور اس کے راستے میں خرچ کرو۔ یاد رکھو! اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ اترانے والوں یعنی تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی نعمت پا کر تو خوش ہونا چاہیئے نہ کہ اکڑ دکھانی چاہیئے۔ قرآن اور ایمان کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ یہ اس کا فضل اور رحمت ہے فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا (یونس - ۵۸) لوگوں کو اس سے خوش ہونا چاہیئے۔

آخرت کا گھر

قوم نے کہا اس دنیا کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ جو چیز اللہ نے تمہیں عطا کی ہے اس میں آخرت کا گھر تلاش کرو۔ مال و دولت کو صحیح طریقے پر خرچ کرو گے اور اس انعام پر اللہ کا شکر ادا کرو گے، غرباء و مساکین کا خیال رکھو گے۔ تمام حقوق ادا کرو گے تو آخرت میں بہتر گھر حاصل ہوگا۔ فرمایا وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں اتنا مال دیا ہے تو اس سے آخرت کا توشہ بناؤ۔ اس مال سے دنیا میں تمہارا حصہ یہی ہے کہ اس کے ذریعے نیکی کماؤ اور اطاعت کرو۔ اس مال کو حرام راستوں میں خرچ کرنے کی بجائے شکر گزاری کے مقام میں خرچ کرو۔ اس کو عیاشی، فحاشی اور بدمعاشی میں مت گنواؤ۔ بلکہ دنیا میں اس سے فائدہ اٹھا کر آخرت کا سامان

پیدا کرو۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔

اس کے علاوہ قوم نے قارون کو ایک اور نصیحت بھی کی۔ کہنے لگے وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ اور تم بھی لوگوں پر اسی طرح احسان کرو، جس طرح اللہ نے تمھیں مال و دولت دے کر تم پر احسان کیا ہے۔ اس میں سے غربا و مساکین، بیوگان، مسافروں اور قیدیوں کی اعانت کرو، ضرورت مندوں کو قرض دو تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں، صدقہ خیرات کرتے رہو، تاکہ تمھارے مال میں برکت ہو۔

فساد فی الارض

قوم نے یہ بھی کہا وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اور زمین میں فساد مت تلاش کرو۔ فساد سے مراد اخلال بالشرائع، معاصی کا ارتکاب، خدا کی قائم کردہ حدود کو توڑنا اور من مانی کرنا ہے۔ شرک، کفر، بدعت اور رسوماتِ باطلہ کا ادا کرنا فساد فی الارض ہے۔ اسی طرح مال کو غلط جگہ پر خرچ کرنا جیسے منشے، لہو و لعب، شراب نوشی، جوا بازی، پتنگ بازی اور شادی بیاہ کی رسومات پر خرچ کرنا بھی فساد ہے۔ موت کی رسومات تیجا، ساتواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا، قبروں کو پختہ بنانا، غربا و مساکین کا خیال نہ کرنا، صدقہ و خیرات کا غلط طریقہ اختیار کرنا اور لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنا بھی فساد فی الارض میں شامل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف-٥٦) زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔ اصلاح توحید، اطاعت اور عبادت و ریاضت سے ہوتی ہے۔ اگر اس کا الٹ ہو گا تو ظاہر ہے کہ وہ فساد ہے۔ اور اللہ کا قانون یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ بیشک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ بہرحال قارون کی قوم نے اس کو سمجھایا کہ مال و دولت پر اتراؤ نہیں بلکہ اس کے ذریعے آخرت کا بہتر گھر تلاش کرو۔ جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی لوگوں پر احسان کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

علم و ہنر پر اعتماد

قوم کی اس نصیحت کے جواب میں قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ کہنے لگا یہ سب کچھ مجھے میرے علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے

میں اہل علم ہوں، ہنرمند ہوں، استعداد کا مالک ہوں۔ میں نے یہ دولت اپنی عقل و حکمت
کی وجہ سے حاصل کی۔ ... اس میں کسی کا مجھ پر کیا احسان ہے؟ دنیا کے اکثر دولت مند اسی
قبیل سے ہوتے ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سائنس اور [illegible] ہے۔
ہمارے پاس لیبارٹریاں جن میں بڑے بڑے تجربات کر کے نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے
ہیں اور پھر دولت کماتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کے فضل کو دخیل نہیں سمجھتے بلکہ اپنی
عقل، فن اور مہارت کو آمدنی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ
عقل و فہم اور حکمت و دانائی بھی تو اللہ کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے
کسی کو دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔ لہٰذا ہر اچھائی منجانب اللہ ہوتی
ہے اور اسی کی طرف منسوب کرنی چاہئے۔ اللہ کا فرمان ہے: مَآ اَصَابَكَ
مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النساء۔ ۷۹) تمہیں جو بھی بھلائی پہنچتی ہے
وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا علم و ہنر اور استعداد و قابلیت کو اپنی
ذات کی طرف منسوب کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ قارون کے دماغ میں
یہی فتور تھا۔ لہٰذا اس نے مال و دولت کو اپنی ذاتی استعداد کی طرف منسوب کیا۔

طاقتور اقوام کی ہلاکت

اللہ نے فرمایا کہ یہ شخص مال و دولت، قوت اور جمعیت پر غرور کر رہا ہے حالانکہ
اس کو اتنا بھی علم نہیں۔ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ
قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا
کہ اس سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے طاقت میں بھی زیادہ
تھے اور افرادی قوت کے لحاظ سے بھی زیادہ تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ قارون تو ایک عام
پبلک کا آدمی ہے کسی سلطنت کا مالک بھی نہیں، محض مال و دولت پر اترا رہا ہے
ہم نے تو عاد، ثمود، قوم نوح، قوم ابراہیم، قوم لوط، کلدانیوں اور مصریوں جیسی بڑی
بڑی مہذب قوموں کو نیست و نابود کر دیا۔ بلاشبہ وہ قارون کی نسبت ہر لحاظ سے
طاقتور تھے سلطنتوں کے مالک تھے۔ ان کے پاس فوجیں تھیں، دنیا کی ہر چیز
میسر تھی مگر جب انہوں نے سرکشی کی، غرور و تکبر کیا تو ہم نے انہیں صفحۂ ہستی سے

تباہ کر دیا۔ فرمایا وَلَا يُسْـئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مجرموں کو اُن کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر انہیں صفائی کا موقع دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کو اُن کے جرائم کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (آیت - ۴۱) مجرم اپنے چہروں سے ہی پہچانے جاتے ہیں اور پھر انہیں گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دیا جاتا ہے قارون کا بھی یہی حال ہوگا۔ مکے کے مشرکوں کو بھی تنبیہ مقصود ہے کہ وہ بھی مال و دولت اور نفری پر غرور نہ کریں بلکہ حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ ورنہ اُن کا انجام بھی قارون اور سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوگا۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِىَ قَارُوْنُ ۙ
اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ
وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ
الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ
الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ
اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ
لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ
لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ:- پس نکلا (قارون) اپنی قوم کے سامنے اپنی زینت
میں ۔ کہا اُن لوگوں نے جو دنیا کی زندگی چاہتے تھے ، کاش
کہ ہمارے لیے بھی وہی کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے ۔
بیشک وہ البتہ بڑی خوش قسمتی والا ہے (۷۹) اور کہا اُن
لوگوں نے جن کو علم دیا گیا تھا ، خرابی ہے تمہارے لیے ۔
اللہ کا عطا کردہ اجر بہتر ہے اُس شخص کے لیے جو ایمان

رسیوں کے ساتھ گھسیٹ کر گڑھے میں دفن کیا۔ اس کے بڑے بڑے ساتھی تو
جنگ بدر میں مارے گئے تھے مگر اس کو بھی ذلت ناک موت آئی۔

قارون پر رشک

قارون کی شان و شوکت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے فَخَرَجَ
عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ایک روز قارون اپنی قوم کے پاس نہایت
زیب و زینت اور شان و شوکت کے ساتھ نکلا۔ شیخ سعدیؒ نے قارون کے متعلق کہا ہے

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

قارون ہلاک ہو گیا حالانکہ اُس کے پاس سونے سے بھرے ہوئے چالیس مکان تھے
اس کے برخلاف نوشیرواں عادل تھا، اس کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تو فرمایا کہ ایک دن قارون بڑی شان کے ساتھ باہر نکلا۔ کسی تقریب میں جانا
ہوگا۔ نہایت فاخرہ لباس پہن رکھا تھا۔ سنہری زین والے شہابی رنگ کے خچر یا
گھوڑے پر سوار تھا۔ نوکر چاکر، غلام اور لونڈیاں ہمراہ تھے۔ اس کی اس شان و شوکت
کو دیکھ کر قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا کہا ان لوگوں نے
جو دنیا کی زندگی کے ہی خواہشمند تھے۔ اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو دنیا کی زیب
زینت اور ٹھاٹھ باٹھ پر ہی فریفتہ ہوتے ہیں اور وہ اسی کو اول و آخر سمجھتے ہیں
قارون کو اس حالت میں دیکھ کر اُن کے منہ میں بھی پانی بھر آیا اور کہنے لگے یٰلَیْتَ
لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ کاش کہ ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو
دیا گیا ہے۔ دیکھو یہ کتنا خوش قسمت آدمی ہے جسے دنیا کی یہ آسائش حاصل ہے۔ کاش
ہمیں بھی یہ چیزیں میسر آئیں۔ اس زمانے میں بھی لوگوں کا یہی حال ہے۔ کسی کی کار،
کوٹھی، لباس، عیش و عشرت، کارخانے، زمین وغیرہ دیکھ کر ویسی ہی تمنا کرنے لگتے
ہیں۔ بلکہ اللہ نے فرمایا کہ بعض لوگ تو دنیا پر اس قدر ریجھ جاتے ہیں کہ وہ یوں کہتے
لگتے ہیں رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ (ص ۔ ۱۶)
اے ہمارے پروردگار! ہمارا جو کچھ دینا ہے قیامت سے پہلے پہلے اسی دنیا میں

ہے۔ ایسے لوگ لازماً آخرت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بعض لوگوں نے بھی قارون پر رشک کیا اور کہنے لگے اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ بیشک وہ تو بڑا خوش قسمت آدمی ہے جس کے پاس مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہے۔

اہل علم کا نظریہ

اس کے برخلاف وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کہا ان لوگوں نے جن کو علم دیا گیا تھا۔ اس علم سے دنیا کے علوم سائنس، ریاضی، ٹیکنالوجی جغرافیہ وغیرہ نہیں بلکہ اس سے انبیاء علیہم السلام کا علم مراد ہے جو انہیں وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور یہ علم اللہ تعالیٰ کے دین، شریعت اور احکام پر مشتمل ہوتا ہے دنیا کا علم جاننے والے تو آج عیسائی، یہودی اور دیگر لوگ بہت زیادہ ہیں جو آسمانوں پر کمندیں ڈال رہے ہیں مگر یہ علوم آخرت کے لحاظ سے بے سود ہیں۔ مفید علم تو وہ ہے جس پر خدا تعالیٰ راضی ہو جس کے ذریعے اللہ اور اس کی مخلوق کے حقوق معلوم ہو سکیں اور جس سے دل میں روشنی پیدا ہو۔ بہرحال اہل علم لوگوں نے کہا وَيْلَكُمْ تمہارے لیے خرابی ہے، تم دنیا کی ٹھاٹھ باٹھ کی تمنا کرتے ہو حالانکہ یہ ساز و سامان باطل، عارضی اور ناپائیدار ہے۔ یاد رکھو! ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا اللہ کا عطا کردہ اجر و ثواب بہتر ہے مگر اس شخص کے لیے جو ایمان لایا اور جس نے اچھا عمل کیا۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ دنیا کے فانی مال کی تمنا کرنے کی بجائے اللہ کے دائمی انعامات کی خواہش کرے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا بھی سکھلائی ہے[1] اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اے اللہ ہمارا مقصود صرف دنیا کی طلب کو نہ بنا اور نہ ہی ہمارے علم کو صرف دنیا تک محدود رکھ۔ دنیا کی خواہش تو کافر، مشرک اور ملحد کرتے ہیں جب کہ مومنوں کو برزخ اور آخرت کی فکر ہوتی ہے اور وہ اس کی بہتری کے طالب ہوتے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو سو پچاس سال میں ختم ہو جائیگی اور یہاں کی ہر چیز یہیں رہ جائے گی، جب کہ آخرت کی زندگی لامحدود اور دائمی ہے۔ لہٰذا اس کی فکر ہونی چاہیئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تجارتی بددیانتی سے منع

[1] ترمذی ص ۵۱۰ (فیاض)

وعظ کر رہے تھے۔ عین اس وقت قارون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا بدکاری کی یہی سزا ہے؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر قارون نے مزید پوچھا کہ اگر آپ بھی نعوذ باللہ زنا کے مرتکب ہوں تو کیا آپ کو بھی یہی سزا دی جائے گی آپ نے پھر تصدیق کی۔ اتنے میں اس فاحشہ عورت کو اشارہ کیا گیا جس نے عام مجلس کے دوران موسیٰ علیہ السلام پر بدکاری کا الزام لگا دیا اس اچانک حملے سے موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے مگر اللہ نے آپ کو ہمت عطا فرمائی آپ نے اس عورت کو قریب بلایا اور فرمایا تجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ پر توراۃ نازل فرمائی ہے جس نے بحرِ قلزم میں بنی اسرائیل کے لیے راستے بنائے اور جس نے فرعون کو غرق کیا، سچ سچ بتاؤ کہ تم نے یہ الزام کیوں لگایا ہے۔ وہ عورت گھبرا کر حق لینے پر مجبور ہو گئی کہ قارون اور اس کے ساتھیوں نے روپے پیسے دے کر اس سے یہ الزام لگوایا ہے۔ جب حقیقت واضح ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام منبر سے نیچے اتر آئے اور نہایت گریہ وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی کہ پروردگار یہ لوگ حد سے گزر گئے ہیں۔ اب تو ہی ان سے انتقام لے۔ چنانچہ اسی مجلس میں اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا حکم آ گیا کہ ان نابکاروں کو ابھی زمین نگل لے گی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا کہ جو شخص قارون کی اس کمینہ حرکت کو ناپسند کرتا ہے وہ اس سے الگ ہو کر ہمارے ساتھ شامل ہو جائے کیونکہ اب اس پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت نے قارون سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے ساتھ چند افراد رہ گئے جو اس کے گھر والے یا اس کے حامی تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے قارون کے مکانات جن میں مال و دولت جمع کر رکھا تھا، زمین میں دھنسنے لگے۔ اس کے ساتھ قارون اور اس کے حامی بھی زمین میں دھنسا دیے گئے۔

قارون کے علاوہ یہ سزا بعض دوسرے لوگوں کو بھی ملی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ پہلی امتوں میں سے ایک شخص دو دو بہ زیب چادریں اوڑھ کر اترا کر چل

رہا تھا۔ ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھ رکھی ہوگی اور دوسری اوپر اوڑھی ہوگی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اسکے غرور و تکبر کی بنا پر اللہ نے اُس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک دھنستا ہی چلا جائے گا حتیٰ کہ قیامت کے دن کہیں اُس کا قدم جا کر ٹکے گا۔

قارون کی ہلاکت

اگلی آیت میں اللہ نے قارون کی ہلاکت کا حال بیان کیا ہے فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ پھر دھنسا دیا ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں مطلب یہ کہ جن مکانات میں اُس نے خزانے جمع کر رکھے تھے۔ قارون کے ساتھ وہ بھی زمین میں دھنسا دیے گئے اور اس طرح نہ وہ خود باقی رہا اور نہ اس کا مال و دولت۔ اللہ نے خزانوں کو بھی زمین میں غرق کر دیا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ موسیٰ علیہ السلام اُس کی ہلاکت کے بعد قارون کے خزانوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ یہ تو اُس کی اپنی غلط کاروائی کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے اُسے عبرت ناک سزا دی۔ فرمایا اُس کی حالت یہ تھی فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کے سوا کوئی گروہ اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ اور نہ وہ کسی سے انتقام لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ وہ کفِ افسوس ملتا ہوا زمین میں دھنس گیا۔

دنیا میں خسف کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ اخبار میں میں نے ۱۹۴۹ء کا واقعہ پڑھا تھا۔ فیروز پور کے کسی علاقے میں سکول کے بچے سکول میں پڑھ رہے تھے کہ اچانک پوری کی پوری عمارت زمین میں دھنس گئی۔ جب جاپان میں زلزلہ آیا تھا تو زمین میں ہزار ہزار میل لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اس زلزلے میں ڈیڑھ لاکھ انسان لقمہ اجل بنے اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ امریکہ میں شہاب گرنے سے ایک بستی کے تین چار سو آدمی جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔ بہرحال اس قسم کی سزا بعض اوقات ملا کرتی ہے اور قارون بھی اسی طرح کی گرفت میں آیا۔

رشک کرنے والوں کا اعتراف حقیقت

فرمایا جب لوگوں نے قارون اور اس کے خزانوں کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھا وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ تو کل تک جو لوگ قارون کے مرتبے کی تمنا کرتے تھے يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ وہ کہنے لگے تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے روزی وسیع کر دیتا ہے، اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس کی مصلحت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مخلوق اس سلسلے میں بالکل عاجز ہے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ بعض اوقات بدترین قسم کے نافرمانوں کے لیے بھی رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ سونے چاندی میں کھیلتے ہیں۔ جب کہ بعض نہایت ہی صالح آدمی تنگی کی زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔

اُن رشک کرنے والوں نے مزید لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا اگر اللہ تعالیٰ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا اب اُن لوگوں نے حقیقت کو پہچانا۔ کہنے لگے کہ کل تک تو ہم قارون کی شان و شوکت کی تمنا کر رہے تھے مگر اُس کا مال و دولت تو اس کے لیے قہرِ الٰہی کا سبب بن گیا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ ہم اس سزا سے بچ گئے۔ اُن لوگوں نے اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ کہنے لگے تعجب ہے یعنی حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ کافر لوگ کبھی فلاح نہیں پائیں گے، اگر وہ آج بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں تو کل جہنم کے کندۂ ناتراش بننے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کفر و شرک سے محفوظ رکھے۔ انسان کو توبہ کر لینی چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَاۗءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾

ترجمہ :- وہ آخرت کا گھر کر ہم ٹھہراتے ہیں اُس کو اُن لوگوں کے لیے جو نہیں چاہتے بڑائی زمین میں اور نہ فساد۔ اور اچھا انجام متقیوں کے لیے ہے (۸۳) جو شخص لے کر آیا بھلائی، پس اُس کے لیے اس سے بہتر بدلہ ہو گا۔ اور جو لایا برائی پس نہیں بدلہ دیئے جائیں گے وہ لوگ جنہوں نے کی ہیں برائیاں، مگر جو کچھ وہ کرتے تھے (۸۴) بیشک وہ ذات جس نے فرض کیا ہے آپ پر قرآن، البتہ وہ لوٹانے والا ہے آپ کو لوٹنے کی جگہ کی طرف۔ آپ کہہ دیجئے، میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو جو آیا ہدایت لے کر اور اُس کو جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے (۸۵)

ربط آیات — گذشتہ آیات میں اللہ نے قارون کے تکبر، غرور، دولت مندی اور موسیٰ علیہ السلام

کو ایذا رسانی کا ذکر کیا اور پھر اُس کا انجام بھی بیان فرمایا اللہ نے اُسے اُس کے خزانے سمیت زمین میں دھنسا دیا اور ایسے وقت میں اس کی دولت، جتھہ، دوست ساتھی کچھ بھی کام نہ آئے۔ جو لوگ قارون کی شان و شوکت پر رشک کرتے تھے اُن کو بہت ندامت اُٹھانا پڑی۔ اس کی تباہی کو دیکھ کر اُن لوگوں کو کہنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے، رزق کے دروازے کشادہ کر دے اور جس کے لیے چاہے تنگ کر دے۔ دولت کی فراوانی حق کی علامت نہیں بلکہ یہ تو اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ اُن لوگوں نے تسلیم کیا کہ اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا جو ہماری تمنا کے باوجود ہمیں قارون کا ہمنوا نہیں بنایا ورنہ ہم بھی اُس کے ساتھ ہی زمین میں دھنس جاتے اور ہمارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ کافر لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ ان کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

مانعاتِ جنت

آج کی پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے، جو انسان کے جنت کے جانے کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان میں سے ایک غرور ہے اور دوسرا فساد۔ گذشتہ رکوع میں بھی دار الآخرت کا ذکر آ چکا ہے کہ قارون کی قوم نے اُس سے کہا کہ اللہ نے جو مال و دولت تمہیں عطا کیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کرو اور لوگوں پر احسان کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے۔ اب اس آیت میں بھی دار الآخرت کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ یہ اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو غرور اور فساد سے پرہیز کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ آخرت کا گھر وہ ہے کہ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ہم بناتے ہیں اُس کو اُن لوگوں کے لیے جو نہیں چاہتے زمین میں بڑائی اور نہ فساد کرتے ہیں۔ گویا آخرت کے گھر کے حصول میں دو چیزیں بڑائی یعنی غرور و تکبر اور فساد مانع ہیں۔

غرور و تکبر

تکبر روحانی بیماریوں میں سے سب سے بڑی بیماری ہے۔ تکبر ہی کی وجہ سے ابلیس راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ اللہ نے فرمایا اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ

الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ - ۳۴) اُس نے حکمِ خداوندی کا انکار کیا اور تکبر کیا جس کی وجہ سے وہ کافروں میں شمار ہوگیا۔ دوسروں کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنا تکبر کی علامت ہے۔ اس قسم کا تکبر عام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص دوسرے کو علم کے اعتبار سے حقیر سمجھتا ہے۔ کوئی خاندان، برادری اور جتھے کے اعتبار سے۔ کوئی دولت اور قوت کی بنا پر دوسرے کو حقیر جانتا ہے۔ یہ بڑی قبیح چیز ہے اور آخرت کے گھر کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے لَا يَفْخَرُ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَا يَبْغِي بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ کوئی شخص دوسرے کے مقابلے میں فخر نہ کرے اور نہ کوئی ایک دوسرے پر سرکشی کرے۔ اس کی بجائے تواضع اور انکساری کو اختیار کرنا چاہیئے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ تکبر ایسی قبیح بیماری ہے کہ انسانی جسم سے اس کا نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک پہاڑ کو سوئی کے ذریعے اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کرنا آسان ہے مگر تکبر کو انسان سے نکالنا مشکل ہے۔ اسی لیے تکبر کی بیماری سب سے آخر میں نکلتی ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جس آدمی کی جان اس کے جسم سے اس حالت میں جدا ہو کہ وہ شخص تکبر، خیانت اور غلول سے پاک ہو تو ایسا شخص جنت میں داخل ہوگا۔ ایک روایت میں دین یعنی قرضہ کا ذکر بھی آتا ہے کہ اس سے بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ حقوق العباد کا حصہ ہے اور جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کسی کی حق تلفی خیانت ہے جس کے متعلق اللہ کا فرمان ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (الانفال) وہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ خائن اللہ کی نگاہ میں مبغوض ہوتے ہیں۔

فساد فی الارض

دوسری مانع جنت چیز فساد فی الارض ہے۔ فساد کا عام فہم معنی تو قتل و غارت، مار دھاڑ اور ظلم و زیادتی وغیرہ ہوتا ہے۔ تاہم قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی، کفر، شرک اور معاصی کا ارتکاب بھی فساد فی الارض میں داخل ہے۔ ابھی پچھلے رکوع میں گزرا ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے کہا لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ زمین میں فساد نہ تلاش کرو۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا سورۃ الاعراف میں واضح طور پر فساد فی الارض سے منع کیا گیا ہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (آیت ۵۶) نہ فساد کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ بہرحال جب تک قوانین الٰہیہ پر عمل ہوتا رہے گا، لوگوں کو امن حاصل ہو گا۔ جب شرک، کفر اور معاصی کا ارتکاب ہو گا، تو بدامنی اور شر و فساد پیدا ہو گا۔ بدعات اور خلافِ سنت امور بھی فساد کا باعث بنتے ہیں۔ لہٰذا ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

حسد

غرور و تکبر اور فساد فی الارض کے علاوہ حسد کی بیماری بھی عام لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بعض بزرگوں کا قول ہے مَا خَلَا جَسَدٌ عَنْ حَسَدٍ یعنی کوئی انسانی جسم حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لیے حاسد کے حسد سے پناہ مانگی گئی ہے وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (الفلق۔ ۵) ابوداؤد شریف کی روایت[1] میں آتا ہے کہ لوگو! حسد سے بچتے رہو فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنٰتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ کیونکہ حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

بہرحال فرمایا کہ آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے جو تکبر اور فساد فی الارض سے اجتناب کرتے ہیں۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اور اچھا انجام متقیوں کا ہی ہو گا۔ تقویٰ کا معنی ہے محافظت بر حدودِ شرع یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنا ہے۔ جو شخص حدودِ شریعت کو قائم رکھے گا۔ وہ کامیاب ہو گا۔ متقی پر آزمائشیں تو آئیں گی لیکن بالآخر وہ خدا کی رحمت کے مقام میں پہنچ جائیں گے اس کے برخلاف تکبر اور فساد کرنے والے محروم رہ جائیں گے۔

نیکی اور بدی کا بدلہ

آگے ارشاد ہوتا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا

---

[1] کنز العمال صفحہ ۲۶۳ ج ۳ بحوالہ ابن مردویہ و بیہقی درمنثور صفحہ ۴۱۹ ج ۶ (فیاض)

جو شخص نیکی لے کر آیا، اللہ کے ہاں اس کے لیے اس نیکی سے بہتر بدلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (الانعام - ۱۶۰) یعنی نیکی کا کم از کم بدلہ دس گنا ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ یہ بدلہ سات سو گنا یا سات لاکھ گنا سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے انسان کا خلوص جس قدر بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اللہ کے ہاں اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا ہوا کھجور کا ایک دانہ اجر و ثواب میں احد پہاڑ سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا عمل تو ایک محدود وقت کے لیے ہوتا ہے مگر اس کا اجر و ثواب چونکہ دائمی ہوتا ہے، لہٰذا وہ عمل سے بہر صورت بہتر ہوتا ہے۔

فرمایا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور جو کوئی برائی لے کر آیا، تو برائی کا ارتکاب کرنے والوں کا بدلہ اُن کی برائی کے برابر ہی ہوگا، اس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ شاہ عبد القادر دہلوی لکھتے ہیں[1] کہ اللہ نے نیکی کیلئے بہتر اجر کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا وہ تو بہر صورت ملنا ہے مگر برائی کے اجر کے لیے وعدہ نہیں فرمایا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ وہ معاف ہی ہو جائے۔ ہاں اگر کسی کو سزا ملے گی تو اتنی ہی جتنی اس نے برائی کی ہوگی، اس سے زیادہ نہیں۔

واپس لوٹنے کا وعدہ

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو بہتر مستقبل کی پیش گوئی کر کے تسلی دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ وہ ذات جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ وہ آپ کو لوٹانے گا، لوٹانے کی جگہ کی طرف۔ لوٹانے کی جگہ سے متعلق مفسرین کرام دو قسم کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ معاد سے ایک مراد تو قیامت والے دن لوٹانے کی جگہ ہے کہ آپ اس دن بلند ترین مقام پر فائز ہوں گے، جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (آیت - ۷۹) امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ جہاں آپ سجدہ ریز ہوں گے۔

[1] موضح القرآن ص ۴۷۳ [2] ابن کثیر ص ۴۰۳/۳۶ و طبری ص ۱۲۴/۲۰ (فیاض)

اور پھر اذنِ الٰہی سے شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ عظمیٰ کریں گے۔ مطلب یہ کہ اس لوٹنے سے قیامت کا لوٹنا مراد ہے تو وہاں بھی آپ کو نہایت ہی عزت و احترام والے مقام میں لوٹایا جائے گا۔

معاد کا دوسرا معنی مفسرین کرام یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا اشارہ آپ کو مکہ مکرمہ میں واپس لوٹانے کی طرف ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین[2] فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور علیہ السلام کی ہجرت الی المدینہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، وہیں جوان ہوئے، نبوت بھی اسی مقام پر ملی مگر مشرکین مکہ نے آپ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ غارِ ثور سے نکل کر ایک غیر معروف راستے پر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر جب آپ جحفہ کے مقام پر پہنچے تو مدینے کے لیے سیدھا راستہ اختیار کیا۔

اسی دوران آپ خزورہ نامی پہاڑ پر چڑھے اور حرم شریف کی طرف دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا اور نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ فرمایا کہ اگر مکے والے مجھے مجبور نہ کرتے تو اللہ کے گھر کا پڑوس نہ چھوڑ کر جاتا۔ گویا مکہ کی جدائی حضور علیہ السلام کے لیے سخت اضطراب کا باعث تھی۔ مفسرین فرماتے ہیں[3] کہ اس حالت میں اللہ نے یہ آیت نازل فرما کر حضور علیہ السلام کو تسلی دی کہ جس خدا تعالیٰ نے آپ پر قرآن نازل فرمایا وہ ضرور آپ کو مکے کی طرف دوبارہ لوٹائے گا۔ مطلب یہ کہ اب تو آپ مجبوراً مکہ مکرمہ سے رخصت ہو رہے ہیں مگر ایک وقت آئے گا جب آپ فاتحانہ انداز میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس شہر میں واپس آئیں گے۔ اللہ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور ہجرت کے آٹھ سال کے بعد آپ دس ہزار قدسیوں کی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے مگر کسی نے مزاحمت نہ کی۔

قرآن فرض کرنے سے مراد قرآن کا نزول ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت بھی اسی ضمن میں آتی ہے جیسے فرمایا اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (العنکبوت - ۴۵) آپ کے پاس جو کتاب نازل کی گئی ہے۔ آپ اس کی

---

[1] ابن کثیر ص ۴۰۲ ج ۳ [2] ابن کثیر ص ۴۰۳ ج ۳ و قرطبی ص ۳۲۱ ج ۱۳ [3] بیضاوی ص ۲۲۳ ج ۲ (فیاض)

تلاوت کریں۔ اس کے بعد کتاب اللہ کی تعلیم و حکمت۔ اس پر عمل کرنا، اور تزکیہ نفس وغیرہ سب فَرَضَ کے حکم میں داخل ہے۔ تو فرمایا کہ جس خدا نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے، وہ ضرور آپ کو لوٹنے کے مقام پر لوٹائے گا۔ لہٰذا آپ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ تسلی رکھیں۔ سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (آیت ۔۴) آپ کا آخری دور پہلے دور کی نسبت لازماً بہتر ہو گا۔ اللہ نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا فرمایا اور اسلام کو غلبہ عطا کیا۔

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس شخص کو جو ہدایت لے کر آیا ہے۔ وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اور اس کو بھی جانتا ہے جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی نیت، ارادے اور اعمال سے واقف ہے اور انہی کے مطابق ہر ایک کو بدلہ دیگا۔ پہلے نیکی اور برائی کا ذکر کر کے جزائے عمل کو بیان کیا۔ اب ہدایت اور گمراہی کی رو سے بدلے کا ذکر کیا ہے کہ ہر ایک کو اس کے کیے کا پھل ملے گا۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا۟ أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَٰفِرِينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَٱدْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ ۘ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُۥ ۚ لَهُ ٱلْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾

ترجمہ :- اور نہیں آپ توقع رکھتے تھے کہ اتاری جائے آپکی طرف کتاب ، مگر یہ مہربانی ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے ۔ پس نہ ہوں آپ مددگار کفر کرنے والوں کے ﴿٨٦﴾ اور نہ روکیں آپ کو یہ کافر لوگ اللہ کی آیتوں سے بعد اس کے کہ وہ اتاری گئی ہیں آپ کی طرف ۔ اور بلائیں آپ اپنے پروردگار کی طرف اور نہ ہوں آپ شرک کرنے والوں میں سے ﴿٨٧﴾ اور نہ پکاریں آپ اللہ کے ساتھ کسی اور کو ۔ نہیں کوئی معبود اس کے سوا ۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اُس کی ذات ۔ اُسی کا حکم ہے ، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿٨٨﴾

ربط آیات

سورۃ القصص میں بنیادی عقائد توحید ، رسالت ، معاد اور قرآن پاک کی حقانیت و صداقت کے علاوہ بہت سی نصیحت کی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں ۔ اس میں کفر کی مذمت اور غرور و تکبر کی قباحت ذکر ہوئی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے

گزشتہ سبق میں آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں مگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات
کو بھی ذہن میں رکھیں کہ انہیں زندگی بھر کن کن مشکل حالات سے گزرنا پڑا۔ اُن کا واسطہ
بھی بڑے سرکش اور متکبر لوگوں کے ساتھ تھا۔ آپ کے مخالفین بھی بڑے ناہنجار ہیں۔ حضرت
موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون اور ہامان تھے۔ جب کہ حاسدوں میں قارون تھا
اسی طرح آپ کے بھی بڑے بڑے متکبر دشمن اور حاسدین ہیں۔ آپ دل برداشتہ نہ ہوں، بلکہ
حالات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کریں۔ بالآخر کامیابی آپ ہی کے حصے میں آئے گی۔

نبوت عطیہ خداوندی ہے

آج کے درس میں سب سے پہلے نبوت و رسالت اور وحی الٰہی کو عطیہ خداوندی قرار دیا گیا
ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ نبوت کسی کی خواہش یا محنت کی بدولت حاصل نہیں ہوتی۔
بلکہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوتا ہے جو اپنے فضل و رحمت سے جس کو چاہے اس
منصب کے لیے چن لیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوٓا اَنْ
يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اور آپ نہیں اُمید رکھتے تھے کہ آپ کی طرف کتاب
نازل کی جائے گی۔ اللہ نے حضور علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آپ کو کتاب عطا
ہونے یعنی نبوت ملنے کی کوئی امید یا توقع نہیں تھی اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ
بلکہ یہ تو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر خاص رحمت ہے کہ اس نے اپنے فضل
سے نبوت و رسالت آپ کے سر پر سجا دی۔ مطلب یہ کہ عطائے نبوت میں کسی عبادت، ریاضت
یا کسی دوسری محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا کہ کوئی یہ امید کرنے لگے کہ اب مجھے نبوت
ملنے والی ہے۔ یہ تو خالصتاً عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی استعداد
اور خلوص کو جانتا ہے جس کی بنا پر وہ نبوت و رسالت کے لیے انتخاب کرتا ہے۔ کسی
نبی کو نبوت عطا ہونے سے پہلے کوئی توقع یا امید نہیں تھی کہ اُسے اس منصب جلیل
پر فائز کیا جا رہا ہے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ
سخت خوفزدہ ہوئے اور لرزتے کانپتے گھر تشریف لائے۔ حضرت خدیجہؓ کو سارا
واقعہ سنایا جنہوں نے آپ کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہلاک نہیں کرے گا۔
آپ تو صلہ رحمی کرنے والے اور دوسروں کے کام آنے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ

کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ قبل از نبوت بھی کسی نبی سے کوئی گناہ نہیں سرزد ہونے دیتا بلکہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اس ضمن میں قادیانیوں نے نہایت ہی غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے۔ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا محمود نے لکھا ہے کہ کوئی شخص عبادت و ریاضت کرتے کرتے نبی کا درجہ پا سکتا ہے۔ بلکہ نبی سے آگے بھی بڑھ سکتا ہے (نعوذ باللہ) قادیانیوں کے لٹریچر میں اس قسم کی کفریہ باتیں موجود ہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی چیزوں کو پڑھ کر واہ واہ کرتے ہیں۔ دنیا کا اقتدار، ملازمت حکومت، وزارت، ممبری وغیرہ کے لیے تو انسان امیدوار ہوتا ہے، پھر محنت کرتا ہے انتخاب لڑتا ہے، خرچ کرتا ہے۔ تب کہیں جا کر اسے ممبری کی امید ہوتی ہے پھر وہ وزیر بنتا ہے، وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوتا ہے یا وزیر اعظم اور صدر بن جاتا ہے اسی طرح عام ملازمت کا بھی یہی حال ہے۔ انسان کسی معمولی عہدے پر فائز ہوتا ہے اور پھر اپنی محنت اور قابلیت کی بنا پر اعلیٰ عہدے تک ترقی کر جاتا ہے مگر نبوت کے لیے ایسا کوئی قانون نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ نبی کو اپنی نبوت کا اس وقت علم ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ اس پر وحی نازل فرما کر اسے آگاہ کرتا ہے۔ تو یہاں بھی فرمایا کہ آپ کو امید نہیں تھی کہ آپ کو نبوت عطا ہو رہی ہے اور آپ پر یہ کتاب نازل ہونے والی ہے بلکہ یہ تو آپ کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمت تھی کہ اس نے آپ کو اس منصب کے لیے منتخب فرمایا اور تمام انبیاء میں آپ کو بلند ترین مقام عطا فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب۔ ۴۰) آپ کو رسول بنایا اور نبیوں کا خاتم بھی بنا دیا۔ آپ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ اللہ نے فرمایا تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرہ۔ ۲۵۳) ہم نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (البقرہ۔ ۲۵۳) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سب سے اعلیٰ درجہ عطا فرمایا۔

کفار سے عدم تعاون

فرمایا کہ جب اللہ نے آپ پر اس قدر احسان فرمایا ہے فَلَا تَكُوْنَنَّ

ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِينَ پس نہ ہوں آپ کافروں کے مددگار اور پشت پناہ۔ یہی بات موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں سورۃ کی ابتدا میں بیان ہو چکی ہے۔ جب اُن کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر ایک قبطی قتل ہو گیا تو وہ اس فعل پر نادم ہوئے اور اُسے شیطان کا عمل قرار دیا۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور اللہ نے اُن کو معاف بھی کر دیا اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ (القصص) پروردگار! اس وجہ سے کہ تو نے مجھ پر اس قدر احسان کیا ہے تو میں کبھی بھی مجرموں کا مددگار یا پشت پناہ نہیں ہوں گا، بلکہ ہمیشہ حق پرستوں کا ساتھ دوں گا۔

شاہ عبدالقادرؒ یہاں پر ایک اور لطیف بات بھی ذکر کرتے ہیں۔ آپ اس آیت کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنی قوم کو اپنا نہ سمجھیں کہ انہوں نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اب آپ کا وہی اپنا ہے جو ایمان اور توحید کو تسلیم کر کے آپ کا ساتھ دیگا۔ اللہ نے عام مومنوں کے لیے بھی یہی اصول بیان فرمایا ہے۔ وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود-۱۱۳) اے ایمان والو! ظالموں کی طرف مت جھکو۔ اگر ایسا کرو گے تو اُن کی طرح تمہیں بھی جہنم چھوئے گی۔ لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ کسی کافر، مشرک یا مجرم کا ساتھ نہ دے اور نہ ہی اُن کا مددگار یا پشت پناہ بنے۔ اللہ نے ایک عام اصول یہ بھی بتلا دیا ہے۔ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المآئدہ-۲) نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور تعدی کے معاملے میں تعاون نہ کرو۔ کوئی امیر ہو، وزیر ہو، صدر ہو یا بادشاہ ظلم و زیادتی میں کسی کے مددومعاون نہ بنو۔ اگر کفر، شرک، الحاد اور بے دینی میں تعاون کرو گے، تو جہنم کے مستحق ٹھہرو گے۔

مداہنت سے پرہیز

دوسری بات اللہ نے اپنے نبی کو یہ فرمائی وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ مشرک لوگ آپ کو آیات الٰہی کے نزول

کے بعد ان سے رک جائیں مطلب یہ کہ آپ کافروں سے کوئی ایسا معاہدہ نہ کرلیں جو تبلیغ حق کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (آیت-۹) کافر لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے مشن میں کچھ ڈھیلے پڑ جائیں تو وہ بھی مخالفت میں کمی کر دیں گے۔ فرمایا دین کے معاملے میں اس قسم کی سودے بازی درست نہیں۔ دین کے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اس کو مداہنت کہا جاتا ہے کہ کسی لالچ یا دباؤ میں آکر مشن کو ترک کر دیا جائے یا نرمی پیدا کر دی جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کافر لوگ آپ کو دین کی تبلیغ، توحید کی اشاعت یا کفر کی مذمت بیان کرنے کے معاملے میں سودا بازی کریں کہ قرآن کو چھوڑ دو تو ہم تمہیں فلاں فلاں رعایت دے دیں گے۔ اللہ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ آپ اپنے مسلک پر قائم رہیں اور تبلیغ دین کا کام جاری رکھیں۔

دعوت الی اللہ

فرمایا اپنے دین پر استقامت اختیار کرتے ہوئے وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں کہ آؤ اللہ کی توحید، اس کے دین اور اس کی شریعت کو مانو، اس کی کتاب پر ایمان لاؤ، فرشتوں اور قیامت کے دن کو تسلیم کرو۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور آپ شرک کرنے والوں میں نہ ہوں۔ شرکیہ رسوم میں شریک ہونا یا دل سے ان کو اچھا سمجھنا انہی کے ساتھ شامل ہونے والی بات ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ کفر، شرک اور بدعات سے نفرت کرے۔ اگرچہ یہ خطاب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر پوری نوع انسانی کو سمجھانا مقصود ہے کہ کسی طرح بھی شرک میں ملوث نہ ہوں کہ اللہ نے اس گناہ کی عدم معافی کا بار بار اعلان کیا ہے۔

فرمایا وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ اور نہ پکاریں آپ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو پکارنا اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے خواہ وہ فرشتہ ہو، جن ہو، پیغمبر ہو یا کوئی ولی ہو۔ مافوق الاسباب کسی غیر اللہ کو پکارنا الٰہ تصور کرنا ہے۔ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ عالم اسباب میں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر اس کی حتی الامکان مدد بھی حاصل کر سکتے ہیں مگر

جہاں ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی پکارنا روا ہے۔ اگر کسی دوسری ذات کو پکارے گا تو مشرک بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر مقام پر حاضر و ناظر ہے۔ ہر چیز پر وہی متصرف ہے۔ وہی ہر ایک کی پکار کو سنتا ہے اور اس کی حاجت براری کرتا ہے۔ لہٰذا پکارنا بھی صرف اسی کو چاہیئے۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (آیت - ۲۹) اُسی کو پکارو اس حال میں کہ اسی کی اطاعت کرنے والے ہو۔

غیر اللہ کو پکارنا بھی منع ہے اور عبادت کرنا بھی منع ہے۔ عبادت کرنا انتہائی درجے کی تعظیم بجا لانا ہے جو کہ صرف خدا تعالیٰ کے لیے روا ہے۔ یہ تعظیم اگر جسم کے ساتھ ہو تو غیر اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہونا۔ رکوع کرنا یعنی جھکنا یا سجدہ کرنا عبادت میں شامل ہو گا۔ اسی طرح مالی عبادت میں غیر اللہ کی خوشنودی کے لیے قربانی دینا یا صدقہ دینا یا ان کے نام کی منت ماننا، مال صرف کرنا سب عبادت میں شامل ہے۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی دوسرے سے نفع نقصان کی اُمید رکھے گا تو وہ بھی مشرک ہو جائے گا۔ قلبی عبادت بھی روا نہیں۔ اللہ ہی وحدہٗ لاشریک ہے۔ اللہ کے سوا اگر کسی دوسرے کا خوف کھانا کہ فلاں مجھے نقصان پہنچانے پر قادر ہے۔ اسی طرح سوائے اللہ کسی پر بھروسہ رکھنا بھی روا نہیں۔ توکل بھی اللہ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران - ۱۲۲) اگر صاحب ایمان ہو تو اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھو کیونکہ سارا کنٹرول اسی کے قبضہ میں ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے سوا کسی کو مت پکارو۔

آگے اللہ نے اس چند روزہ زندگی کی بے ثباتی کا ذکر فرمایا ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ وجہ کا لفظی معنی تو چہرہ ہوتا ہے مگر اس سے ذات ہی مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ امام بیضاویؒ[1] اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ وَجْهَهٗ

۱؎ بیضاوی ص ۲۰۳ ج ۲ و تفسیر کبیر ص ۲۲ ج ۲۵ (فیاض)

سے اللہ کی ذات مراد ہے۔ ہر چیز فانی ہے، یا تو وہ بالفعل فنا ہے یا آگے چل کر فنا ہونے والی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ذات اور کوئی چیز دائمی نہیں ہے۔ ازلی و ابدی ذات صرف ذات خداوندی ہے۔ جو حی اور قیوم ہے اور جس پر کبھی فنا نہیں۔ فرشتوں کو اللہ نے انسانوں کی تخلیق سے کھربوں سال پہلے پیدا کیا۔ مگر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب اللہ کے مقرب ترین فرشتوں جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل پر بھی موت طاری ہو جائے گی۔ اللہ کی ذات کے سوا کوئی چیز زندہ نہیں رہے گی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضرت لبیدؓ بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ اُن کا شاعری میں مرتبہ ایسا ہی ہے جیسے یہاں پر غالب، میر تقی میر، حسرت موہانی اور اقبال ہوئے ہیں۔ آپ نوے سال تک دورِ جاہلیت میں گزارے اور اس کے بعد اسلام لائے اور مزید چالیس سال اسلام کی حالت میں گزارے۔ مسلمان ہونے کے بعد شاعری ترک کر دی تھی۔ کہتے تھے اب مجھے صرف سورۃ بقرہ ہی کافی ہے حضور علیہ السلام نے اُن کے متعلق فرمایا تھا اصدق کلمۃ قالت العرب قول لبید یعنی عربوں کے ہاں سچا کلمہ اگر کوئی ہے تو وہ لبیدؓ کا ہے۔ آپ نے دنیا کی بے ثباتی کے متعلق کہا ہے ؎

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ
وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ
نَعِيْمُكَ فِي الدُّنْيَا غُرُوْرٌ وَّحَسْرَةٌ
وَاَنْتَ عَنْقَرِيْبٍ عَنْ مُقِيْلِكَ رَاحِلٌ

خدا کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے اور دنیا کی ہر نعمت لامحالہ زائل ہو جانے والی ہے۔ تمہاری دنیا کی نعمتیں باعث افسوس اور حسرت ہیں اور تم عنقریب اپنے ٹھکانے سے کوچ کر کے جانے والے ہو۔ گویا انسان کی ہستی کچھ نہیں۔ سعدی صاحبؒ نے بھی کہا ہے ؎

کس را بقائے دائم و عہد مقیم نیست
جاوید پادشاہی و عہد مقیم تست

لہ ابن کثیر ص۲۰۳ (فیاض)

کسی کے لیے ہمیشگی اور عہدِ مقیم نہیں ہے۔ اے پروردگار ہمیشہ کی بادشاہی اور عہدِ مقیمہ صرف تیری ذات کی ہے۔

نظامِ حیدرآباد کا استاد جلیل مانک پوری بڑا عالم اور شاعر بھی تھا۔ وہ کہتا ہے

ے
ہستی ہے عدم میری نظر میں
سونچی ہے یہی ایک عمر بھر میں

میر تقی میر نے بھی اس مضمون کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

ے
بود و نقش و نگار سا ہے کچھ
صورتِ اعتبار سا ہے کچھ
یہ فرصت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو ایک انتظار سا ہے کچھ

خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن میں اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾
اس جہان کی ہر چیز فانی اور باطل ہے اور باقی رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے جو صاحب جلال وعظمت ہے۔ فرمایا لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ اسی کا حکم ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو۔ ایک دن آنے والا ہے۔ جب ساری مخلوق اس کی عدالت میں حاضر ہوگی۔ اور اس دنیا میں کردہ اعمال کا ثمرہ پائے گی۔

امام ابن جریرؒ کی توجیہ

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں[1] کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کا تعلق انسان کے عمل سے بھی ہو سکتا ہے۔ گویا انسان کا ہر عمل فانی اور زائل ہے سوائے اس عمل کے جس کا رخ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے۔ یعنی جو عمل خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا جائے گا۔ وہی قائم رہیگا، وہی مقبول ہو کر اچھا بدلہ پائے گا۔ اور باقی سارے اعمال ضائع ہو جائیںگے۔ گویا وجهه سے خدا تعالیٰ کی رضا بھی مراد ہو سکتی ہے جیسے ے

أَسْتَغْفِرُ اللهَ ذَنْبًا لَسْتُ مُحْصِيَهُ
رَبُّ الْعِبَادِ إِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ

---

[1] طبری ص ۱۲۷ ج ۲۰ (فیاض)

میں اللہ تعالیٰ سے اُن گناہوں کی معافی طلب کرتا ہوں کہ جن کو میں شمار کرنے سے بھی عاجز ہوں۔ اے بندوں کے پروردگار! انسان اور اس کے عمل کا رُخ اسی کی طرف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو عمل خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے گا۔ وہی قبول ہوگا۔ باقی کچھ نہیں۔ اگرچہ یہ مفہوم بھی بیان کیا جاتا مگر پہلا مفہوم زیادہ راجح ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے[1] کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے آپ کو نصیحت کرنے کے لیے کسی ویران مکان یا کھنڈرات کی طرف نکل جاتے۔ وہاں کسی ٹوٹے پھوٹے درو دیوار پر کھڑے ہو کر آواز دیتے، اے مکان أَيْنَ أَهْلُكَ تیرے مکین کہاں گئے۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرماتے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ اُن کا مقصد عبرت حاصل کرنا ہوتا تھا کہ کتنے عالیشان محلات میں بسنے والے باقی نہ رہے۔ اُن کی رہائش گاہیں بھی اجڑ گئیں۔ گویا ہر چیز فانی ہے۔ قبرستان میں جا کر بھی انسان کو یہی نصیحت ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی قائم و دائم ہے۔

---

[1] ابن کثیر ص ۴۰۳ ج ۳ (فیاض)

سُوۡرَۃ

العنکبوت

مکّیۃ

درس اول ۱ — آیت ۱ تا ۷

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ عنکبوت مکی ہے۔ اس کی انہتر ۶۹ آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ

جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا

يَعْمَلُوْنَ ۝٧

ترجمہ: الٓمّٓ ① کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور ان کی آزمائش نہیں کی جائیگی ② البتہ تحقیق ہم نے آزمائش میں ڈالا اُن لوگوں کو جو اُن سے پہلے گزرے ہیں پس ضرور اللہ تعالیٰ ظاہر کریگا اُن لوگوں کو جو سچے ہیں اور ظاہر کرے گا اُن لوگوں کو جو جھوٹے ہیں ③ کیا گمان کیا ہے اُن لوگوں نے جو بُرائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں کہ وہ بچ جائیں گے ہم سے! بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ④ جو شخص امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی پس اس کا مقرر کردہ وقت ضرور آنے والا ہے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ⑤ اور جس شخص نے مشقت برداشت کی بیشک وہ مشقت اٹھاتا ہے اپنے نفس کے لیے۔ بیشک خدا تعالیٰ غنی ہے تمام جہان والوں سے ⑥ اور وہ لوگ

جو ایمان لائے، اور جنہوں نے اچھے کام کیے۔ ہم ضرور معاف کریں گے اُن سے اُن کی بُرائیاں، اور ضرور بدلہ دیں گے اُن کو بہتر کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے (۷)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام اس کی آیت ۴۱ میں آمدہ لفظ عنکبوت سے ماخوذ ہے۔ سورۃ العنکبوت سے۔ اللہ نے اس آیت میں شرک کے بودہ پن کو مکڑی کے جالے کے ساتھ تشبیہ دے کر بات سمجھائی ہے کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود ٹھہرانے کی مثال مکڑی کے جالے کی طرح ہے جو کہ کمزور ترین گھر ہوتا ہے۔ ترتیب نزول کے اعتبار سے یہ سورۃ سورۃ الروم کے بعد نازل ہوئی مگر ترتیب تلاوت میں اس کو مقدم رکھا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی دور کے اس زمانہ میں نازل ہوئی جب کہ اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ چنانچہ اللہ نے ابتدائی آیات میں ہی مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد آزمائش سے گزرنا پڑے گا، اور جو اس کسوٹی پر پورا اُترے گا۔ وہی ابدی فلاح پائے گا۔

اس سورۃ مبارکہ کی ۶۹ آیات اور سات رکوع ہیں اور یہ ۹۸۰ الفاظ اور ۴۳۵۷ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ کا خاص موضوع ایمان اور ابتلا ہے۔ ایمان کے ساتھ آزمائش ضروری ہے۔ اس ضمن میں اللہ نے چند ایک نبیوں کا ذکر بھی کیا ہے جن پر شدید بڑی آزمائشیں آئیں مگر انہوں نے صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا استقلال تو ضرب المثل بن چکا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام پر بہت سی آزمائشیں آئیں اور وہ ہر آزمائش پر پورا اُترے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے واقعات گزشتہ سورۃ میں بھی بیان ہو چکے ہیں اور اس سورۃ میں بھی ان کے صبر و استقلال کا ذکر آیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے اَشَدُّ الْبَلَاءِ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں، پھر ان لوگوں پر جو اُن کے قریب ہونے میں۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی

۱؎ ابن کثیر ص ۴۰۴ ج ۳ و قرطبی ص ۳۲۵ ج ۱۳ ۲؎ ابن کثیر ص ۴۰۴ ج ۳ و قرطبی ص ۳۲۵ ج ۱۳ (فیاض)

یُبْتَلَی الرَّجُلُ عَلٰی قَدْرِ دِیْنِہٖ آدمی کی آزمائش اس کے دین کے مرتبے کے مطابق ہوتی ہے۔ دین میں جس قدر پختگی ہوگی آزمائش بھی اتنی ہی کڑی ہوگی

اس سورۂ مبارکہ میں جہاد اور ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان دونوں چیزوں کو اہلِ ایمان کے لیے مدارِ فوز و فلاح قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مکی سورتوں کی طرح توحید، رسالت، بعث بعد الموت، جزائے عمل اور استقامت علی الدین کے مباحث بھی بیان ہوئے ہیں۔ سابقہ سورۃ القصص کی طرح فرعون، ہامان اور قارون کا ذکر اس سورۃ میں بھی کیا گیا ہے۔ انسانی سوسائٹی کے یہ تینوں کردار مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جابر اور جابر حکمرانوں کی نمائندگی فرعون کرتا ہے، نوکر شاہی یعنی بیوروکریسی کا نمائندہ ہامان ہے جب کہ سرمایہ دار طبقہ کی نمائندگی قارون کرتا ہے۔ عام طور پر یہی طبقات دین کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں۔ چونکہ دینِ حق کی موجودگی میں ان لوگوں کی خواہشات کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ لہٰذا انبیاء کی تاریخ میں یہی طبقات مخالفت میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اللہ نے ان کی مثال بھی بیان فرمائی ہے۔

حروفِ مقطعات

اس سورۂ مبارکہ کی ابتدا بھی حروفِ مقطعات الٓمّٓ سے ہوئی ہے۔ بعض مفسرینؒ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر الف سے مراد اللہ تعالیٰ کا اسم پاک ہے۔ ل سے مراد لطیف اور لطف ہے جب کہ م سے مراد مجید اور مجد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ لطیف ہے اور اس کی صفت لطف یعنی مہربانی اور باریکی ہے۔ اسی طرح بزرگی اور عظمت بھی خدا تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ غرضیکہ ان حروف میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ اپنا رخ خدا تعالیٰ کی طاعت کی طرف موڑ دے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور لطف حاصل ہوگا اور اگر طاعت میں وہ زندگی میں کوتاہی کرے گا تو نقصان اپنا ہی ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ تو ہر حالت میں بزرگی والا ہے۔ اس کی عزت و احترام میں تو کوئی فرق نہیں آنے کا۔

بعض مفسرینؒ فرماتے ہیں الٓمّٓ سورۃ کا عنوان ہے اور وہ اس طرح کہ الف سے مراد آتا ہے۔ ل سے لازم اور م سے مطلوب مراد ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ آزمائش ایک لازمی چیز ہے جو اہلِ ایمان سے ہر حالت میں مطلوب ہے۔

[1] ابن جریر طبری ص۸۶ و تفسیر کبیر ص۔۔ [2] الفوز الکبیر ص ۱۰۸، ۱۰۹ (فیاض)

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تشفی طریقے پر آلمّ سے عالمِ غیب سے آنے والے وہ علوم مراد لیتے ہیں جو اس مادی جہان میں آکر لوگوں کے بُرے اعمال، اخلاق اور عادات سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ تاہم امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کی تحقیق میں نہیں پڑنا چاہئے مبادا کہ انسان بہک جائے۔ لہٰذا زیادہ سلامتی والی صورت یہی ہے کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا اِن حروف کی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور ان حروف سے جو بھی مراد ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کو ہر چیز کا علم تو نہیں ہے، چنانچہ ان حروف کے متعلق بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ ہمیں ان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے۔ ان کے مفہوم کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

انسانوں کی معروضی آزمائش

ارشاد ہوتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا محض اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔ فرمایا ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی شخص محض زبانی دعویٰ ایمان کی بدولت آزمائش سے بچ نہیں سکتا۔ ذرا سابقہ اقوام کی طرف نظر مار کر دیکھ لو۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ہم نے آزمایا ان لوگوں کو بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سابقہ اقوام آزمائش سے نہیں بچ سکیں تو ان کو بھی ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ ان کی بھی ضرور آزمائش ہوگی۔ اور پھر اس کے نتیجے میں فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا اللہ تعالیٰ ضرور ظاہر کرے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ اور ان کو بھی ظاہر کرے گا جو جھوٹے ہیں۔

علم کا عام فہم معنی تو جاننا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سچے اور جھوٹے لوگوں کو ازل سے ہی جانتا ہے مگر یہاں پر علم سے مراد ظاہر کرنا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو امتحان میں ڈالتا ہے تو پھر اس کے نتیجے پر متعلقہ فرد یا قوم

---

[1] الفوز الکبیر صفحہ ۲۲ [2] جلالین صفحہ ۲ (فیاض)

کی بنیادی یا جھوٹ کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے کہ ان کی پوزیشن یہ ہے۔ ... عام لوگوں کو بھی ایک دوسرے کے حق و باطل کا علم ہو جاتا ہے اور ہر شخص جان لیتا ہے کہ فلاں شخص مومن ہے یا مشرک اور فلاں مخلص ہے یا منافق اور فلاں دھوکہ باز ہے یا ایماندار۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی آزمائش ان کی حیثیت کی وضاحت کے اظہار کے لیے کرتا ہے۔

برائی پر لازمی گرفت

ارشاد ہوتا ہے اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا کیا گمان کرتے ہیں وہ لوگ جو برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ جائیں گے؟ اکثر لوگ معاد کی طرف سے غافل ہوتے ہیں۔ آخرت کے لیے کچھ تیاری نہیں کرتے جس کی وجہ سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بالکل محفوظ بیٹھے ہیں۔ فرمایا اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ تو بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ بندوں کو مہلت ضرور دیتا ہے مگر بالآخر مجرموں کو پکڑ لیتا ہے۔ ہر شخص کی نیت، عمل اور کردار اس کے علم میں ہے۔ لہٰذا وہ کسی کو جزا یا سزا کے بغیر نہیں چھوڑتا۔

اللہ سے ملاقات

آگے ارشاد ہوتا ہے مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ جو شخص امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ تو اللہ کا مقرر کردہ وقت تو ضرور آنے والا ہے۔ وہ ٹل نہیں سکتا۔ رجی امید اور خوف دونوں معنوں میں آتا ہے یعنی جو شخص اللہ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے یا اس کی ملاقات سے خوف کھاتا ہے۔ دونوں معنی درست ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات یعنی اس کے حضور پیشی تو ایمان کا جزو بھی ہے يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَلِقَآئِهٖ یعنی ایمان لاتا ہے اللہ پر اور اس کی ملاقات پر کہ ایک دن ضرور اس کے سامنے حاضر ہونا ہے اور پھر اللہ کے ساتھ بالمشافہ گفتگو ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تَرْجُمَانٌ یعنی اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان

بھی نہیں ہوگا۔ سورۃ النحل میں ہے یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا ﴿آیت ۔ ۱۱۱﴾ ہر نفس کو اپنی طرف سے خود جواب دینا پڑے گا وہاں کوئی وکیل پیش نہیں ہوگا۔ جو کسی شخص کی ترجمانی کرسکے تو فرمایا کہ اللہ کا مقررہ وعدہ ضرور آنے والا ہے۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کے ارادے، عمل اور اخلاص کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

مجاہدہ کی اہمیت

ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اور جس نے مجاہدہ کیا یعنی محنت و مشقت کی تو بیشک وہ محنت اٹھاتا ہے اپنے ہی نفس کے لیے۔ مجاہدہ میں جہاد بالسیف بھی آتا ہے۔ اور خود اپنے نفس سے بھی جہاد کرنا پڑتا ہے تاکہ پہلے اپنی اصلاح ہو۔ آگے جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ انسان کبھی مال کے ساتھ جہاد کرتا ہے تو کبھی زبان کے ساتھ تبلیغ حق کے سلسلہ میں زبان اور قلم سے جہاد ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ مشرکین کے ساتھ مال، جان اور زبان سے جہاد کرو۔ غیر مسلموں کے ساتھ بحث و تمحیص کرنے اسلام کے متعلق ان کے شکوک و شبہات رفع کرنا بھی جہاد ہی کا حصہ ہے۔

جہاد یا مجاہدہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔ کوئی شخص جتنی محنت کرے گا اسی قدر اللہ کے قریب ہوگا۔ عبادت و ریاضت کرنے والا مجاہد بعض اوقات خود پسندی کا شکار بھی ہو جاتا ہے اللہ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ کسی شخص کو اپنی محنت پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے اور محض کسی چیز کا خالی دعویٰ کر دینا بھی درست نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ عمل اور نیکی شامل نہ ہو۔

تو فرمایا جو شخص مشقت اٹھاتا ہے، وہ اپنی ہی ذات کے لیے ایسا کرتا ہے اس محنت کا فائدہ خود اسی کو ہوگا۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ اللہ تعالیٰ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی شخص کی عبادت و ریاضت اور محنت و مشقت کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اللہ تعالیٰ نے

کو اس کا کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس سے خدا تعالیٰ کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ - ۲۸۶) انسان کو اچھے اعمال کا فائدہ بھی پہنچتا ہے اور بُرے اعمال کا خمیازہ بھی اُسی کو بھگتنا پڑے گا۔ اگر ساری مخلوق نیک ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کوئی اضافہ نہیں ہو جائے گا۔ اور سارے کے سارے نافرمان ہو جائیں، تب بھی اُس کی سلطنت میں کوئی خرابی نہیں آئیگی۔ یہ نفع نقصان تو خود انسان کی اپنی ذات کے ساتھ ہی والبتہ ہے

ایمان اور اعمال صالحہ کا بدلہ

ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ اس کے بدلے میں ہم ضرور اُن کی برائیاں اُن سے دُور کر دیں گے یعنی معاف کر دیں گے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے[1] کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ معاف کرتا رہتا ہے۔ بشرطیکہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے۔ چھوٹی موٹی تقصیریں تو انسان کے اعضاء و جوارح سے بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں جو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کی بدولت از خود معاف فرما دیتا ہے۔ البتہ کبائر کی معافی توبہ اور تلافی کے بغیر نہیں ہوتی مطلب یہ ہے ایمان و نیک اعمال ہی مدار فوز و فلاح ہیں۔

فرمایا ایسے لوگوں کی ایک تو ہم برائیاں دور کر دیں گے وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان کے اعمال سے اُن کو بہتر بدلہ عطا کریں گے بہتر بدلے سے مراد یہ ہے کہ ہر نیکی کا کم از کم بدلہ دس گنا ہوگا۔ جس کو اللہ تعالیٰ جتنا چاہے بڑھا بھی دیتا ہے نیکی کا بدلہ اس لیے بھی نیکی سے بہتر ہوگا کہ نیکی کا کام تو ایک محدود وقت میں انجام دیا جاتا ہے مگر اس کا بدلہ دائمی ہوگا جو ہمیشہ ملتا رہیگا۔ بہرحال نیکو کار اہل ایمان کی برائیاں اللہ تعالیٰ معاف بھی کرتا رہتا ہے اور ان کو بہتر اجر بھی عطا کرتا ہے یہ اہل ایمان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی۔

[1] مظہری صفحہ ۱۹۰ ج ۲، والسراج المنیر صفحہ ۱۲۵ ج ۳ (فیاض)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ
جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۞ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَ
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي
الصَّالِحِينَ ۞ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا
بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ
النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ
رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ
اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۞
وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ

الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿١١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا
هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ
وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ؗ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣﴾ ع

ع ١٣ ١٣

ترجمہ:۔ اور ہم نے تاکیدی حکم دیا ہے انسان کو اُس کے
والدین کے بارے میں اچھا سلوک کرنے کا۔ اور اگر وہ زور
ڈالیں تجھ پر تاکہ تو شریک بنائے میرے ساتھ اُس چیز کو
جس کا تجھے علم نہیں۔ پس نہ بات مان ان دونوں کی۔ میری
طرف ہی تمہارا لوٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتلا دوں
گا جو کام تم کیا کرتے تھے ﴿٨﴾ اور وہ لوگ جو ایمان
لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، ہم ضرور داخل کریں
گے ان کو نیک لوگوں کی جماعت میں ﴿٩﴾ اور بعض
لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر
پس جب اُس کو تکلیف دی جاتی ہے اللہ کے بارے
میں تو سمجھتا ہے لوگوں کی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح
اور اگر آئے کوئی مدد تیرے پروردگار کی طرف سے تو
وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ

اچھی طرح نہیں جانتا اس چیز کو جو جہان والوں کے سینوں میں ہے (۱۰) اور البتہ ضرور ظاہر کرے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور ضرور ظاہر کرے گا منافقوں کو (۱۱) اور کہا اُن لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں کہ تم پیروی کرو ہمارے راستے کی، ہم اٹھائیں گے تمہارے گناہوں کو حالانکہ نہیں ہیں وہ اٹھانے والے گناہوں میں سے کچھ بھی۔ بیشک البتہ وہ جھوٹ بولنے والے ہیں (۱۲) اور البتہ اٹھائیں گے وہ اپنے بوجھ اور دوسرے بوجھ بھی اپنے بوجھوں کے ساتھ۔ اور ضرور اُن سے پوچھا جائے گا قیامت کے دن اُن باتوں کے بارے میں جن کو وہ افترا کیا کرتے تھے (۱۳)

ربط آیات

اس سورۃ کا ایک خصوصی موضوع ابتلا بالایمان ہے یعنی جہاں ایمان ہو گا وہاں آزمائش بھی آئیگی۔ چنانچہ ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی وضاحت کی ہے کہ لوگوں کو صرف ایمان کا اقرار کرنے کی بنا پر چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کی آزمائش بھی ہوگی، اور اس امتحان میں کامیابی ہی اُن کی اصل کامیابی کی بنیاد ہوگی۔ پھر اللہ نے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر فرمایا اور اس کے بہتر اجر کی نوید سنائی۔ اس ضمن میں اللہ نے صبر، استقامت اور برداشت کی تلقین فرمائی ہے کہ ان چیزوں کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔

والدین سے حسن سلوک

اب اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے ارشاد ہوتا ہے وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے تمام کتب سماویہ اور خاص طور پر قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر یہ حکم دیا گیا ہے۔ معاشرے میں سب سے زیادہ حق والدین کا ہوتا ہے، اُن کی عزت و احترام اور خدمت خاطر کو اللہ تعالیٰ

نے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (آیت ۲۳) گویا سابقہ امتوں اور ہماری امت سب کے لیے یہی حکم ہے۔ کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ظاہر ہے کہ والدین ہی کسی شخص کی دنیا میں آمد اور پھر اس کی پرورش کا سبب بنتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کی تربیت میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرتے ہیں اور مالی بوجھ اٹھاتے ہیں۔ باپ کی نسبت ماں زیادہ مشقت برداشت کرتی ہے والدین کا اولاد کے لیے مشقت برداشت کرنا ایک مثال اور نمونہ ہے۔ لہٰذا اولاد کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک کا پورا پورا حق ادا کرے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

شرک بالٰہ کی ممانعت

جہاں اللہ تعالیٰ نے والدین کی اطاعت گزاری کا حکم دیا، وہاں ایک خاص حکم یہ بھی دیا فَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اگر وہ دونوں (ماں باپ) تجھے مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ اُن چیزوں کو شریک بنا جن کا تجھے علم تک نہیں فَلَا تُطِعْهُمَا تو پھر تمہیں اُن کا یہ حکم ماننے کی اجازت نہیں ہے۔ پہلے اللہ نے والدین کے ساتھ مطلق حسن سلوک کا حکم دیا جس میں اُن کی اطاعت گزاری پہلے نمبر پہ آتی ہے مگر شرک ایک ایسی قبیح بیماری ہے کہ اللہ نے واضح طور پر فرما دیا کہ اگر والدین بھی اس پر آمادہ کریں تو اُن کی بات نہ مانو۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں خدا کی شریک کوئی چیز نہیں ہے۔ جب یہ بات ہے تو پھر مشرکوں کو کیسے علم ہوا کہ فلاں چیز خدا کے اختیار یا اس کی صفت میں شریک ہے۔ سورۃ یونس میں ہے قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (آیت ۱۸) اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کیا تم خدا تعالیٰ کو وہ چیز بتلانا چاہتے ہو جو وہ زمین و آسمان میں نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ خدا کے علم میں تو اس کا کوئی شریک نہیں ہے مگر تمہیں اس کا علم ہے

جسے تم خدا تعالیٰ پر ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ یہ کتنی بیہودہ بات ہے۔

بہرحال فرمایا کہ والدین اگر شرک کی ترغیب دیں تو اُن کی اطاعت نہ کریں۔ البتہ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمٰن - ۱۵) دنیا میں اُن سے ساتھ معروف اور اچھے طریقے سے پیش آؤ خواہ وہ کافر، مشرک یا بے دین ہی کیوں نہ ہوں۔ مفسرین[1] اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ صرف شرک ہی کی ممانعت نہیں ہے بلکہ شریعت اور سنت کے خلاف اگر والدین بھی آمادہ کریں تو اُن کا حکم ماننے کی اجازت نہیں ہے۔ والدین کسی فرض کو چھڑانا چاہیں یا کسی واجب یا سنت کو ترک کرنے کی ترغیب دیں تو وہ واجب الاطاعت نہیں ہوں گے۔ البتہ والدین کے حکم پر مستحبات کو ترک کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً اگر والدین نفل پڑھنے کی بجائے کوئی دوسرا کام کرنے کو کہیں تو پھر نفل چھوڑ کر دوسرا کام کرے۔ ہاں! مسجد میں نماز جماعت سنت مؤکدہ ہے۔ جو واجب کے قریب ہے۔ لہٰذا اسے ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح بدعت کا کام مکروہ اور ناجائز ہے۔ اس معاملے میں بھی والدین کا حکم نہ مانو، ویسے ہر لحاظ سے اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

فرمایا اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ تم سب نے میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ پھر میں تمہیں بتا دوں گا، جو کچھ تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اور پھر اس عمل اور عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا۔

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین[2] کرام مسلم اور نسائی وغیرہ میں آمدہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نوجوانی کے عالم میں ابتداء ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ اس وقت ابو سفیانؓ کا خاندان تو اسلام کا سخت دشمن تھا۔ آپ کی والدہ ابو سفیان کی بیٹی تھی جب آپ اسلام لائے تو والدہ سخت ناراض ہوئی۔ اُس نے بہتیری کوشش کی کہ اس کا بیٹا ایمان کو ترک کر دے۔ مگر حضرت سعدؓ بھی توحید کا مزہ چکھ چکے تھے اور واپس آنے والے نہیں تھے۔ بالآخر اُن کی والدہ نے اعلان کر دیا کہ جب تک سعد اسلام کو نہیں چھوڑتا، میں نہ کچھ کھاؤں گی، نہ پیوں گی اور نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ خاندان

---

[1] السراج المنیر ص ۱۲۶/۳۲ و خازن ص ۱۸۹/۵ و مدارک ص ۲۵۱/۳ [2] ابو سعود ص ۱۶۵/۴ و مدارک ص ۲۵۱/۳ و روح المعانی ص ۳۹/۲۰ (فیاض)

کے لوگوں نے اس کی بھوک ہڑتال توڑنے کی بڑی کوشش کی حتیٰ کہ اس کے منہ میں زبردستی کھانا ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ سعدؓ کو کہتی تھی کہ تمہارا اسلام والدین سے حسنِ سلوک کا درس دیتا ہے مگر تم میری بات نہیں مانتے۔ آخر تم نے کون سا اسلام قبول کیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل فرمائے کہ اگر والدین شرک پر آمادہ کریں تو اُن کی بات ماننے کا حکم نہیں ہے۔ البتہ ویسے ان کے ساتھ حسنِ سلوک جاری رکھو۔ اس قسم کے احکامات اس سورۃ کے علاوہ سورۃ لقمان سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ احقاف اور سورۃ البقرہ میں بھی موجود ہے۔

صالحین کی رفاقت

ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور وہ لوگ جو صدقِ دل سے ایمان لائے، جن باتوں کو ماننا ضروری ہے اُن کی تصدیق کی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال بھی انجام دیے۔ ظاہر ہے کہ اچھے اعمال کا مدار ایمان پر ہے۔ اگر ایمان ہوگا تو اعمال کام آئیں گے ورنہ رائیگاں جائیں گے۔ ایمان کے بغیر اچھے سے اچھا عمل بھی بیکار محض ہے۔ تو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد نیک اعمال انجام دیے، اللہ نے فرمایا لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ، ہم ضرور ان کو صالحین کے گروہ میں شامل کریں گے۔ اللہ نے وعدہ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو اچھے اور نیک لوگوں کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اس کے لیے تو انبیاء بھی دعائیں کرتے رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا، اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے دنیا و آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (یوسف - ۱۰۱) مجھے فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی حالت میں وفات دینا اور نیک لوگوں کی رفاقت نصیب فرمانا۔ نیک لوگوں کی رفاقت بڑی اعلیٰ چیز ہے اور اچھی سوسائٹی کا مل جانا بڑی سعادت کی بات ہے۔ سورۃ الفجر میں اللہ کا فرمان ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (آیت ۲۹ - ۳۰) پہلے میرے نیک بندوں کے گروہ میں شامل ہو جاؤ اس کے بعد جنت کا داخلہ ملے گا۔ اور یہ

اس کے برخلاف وَلَئِنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ اگر ان کو آپ کے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو خوش ہو کر مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور ہم پکے سچے مسلمان ہیں مطلب یہ کہ ایسے لوگ میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا تھو کا مکمل مصداق ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح کی آسائش چاہتے ہیں اور جونہی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو بگڑ جاتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتداء میں بھی یہ مضمون بیان ہو چکا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (آیت ۸) لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو زبان سے تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا دعوے کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ ایماندار نہیں ہیں۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ فائدہ کس طرف ہے اگر ایمان والوں کو کوئی بھلائی پہنچی تو ان کی طرف ہو گئے اور اگر دوسرا پلہ بھاری دیکھا تو ان کو یقین دلایا کہ ہم دل سے مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (البقرہ ۱۴) ہم ان کے ساتھ ٹھٹھا کرنے کے لیے ان کو حمایت کا یقین دلاتے ہیں۔

اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (بقرہ ۹) یہ تو خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ فرمایا اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ کیا اللہ تعالیٰ اتنا بھی نہیں جانتا کہ جہان والوں کے دلوں میں کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو خوب جانتا ہے کہ مومن کون ہے اور منافق کون۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیت اور ارادے تک سے واقف ہے۔ اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کریگا۔ فرمایا وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور اللہ تعالیٰ ضرور ظاہر کریگا ایمان والوں کو وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ اور ضرور ظاہر کریگا منافقوں کو بھی۔ اللہ تعالیٰ اسی لیے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تاکہ ایمان اور نفاق ظاہر ہو جائے۔ امتحان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی

بوجھ وہ ہے گا جو اس نے دوسروں کو گمراہ کیا۔ اس طرح گویا ضلال اور اضلال کے دو بوجھ اٹھانے پڑیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ خود تو گمراہ ہوا تھا مگر دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب بھی بنا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[1] کہ قیامت تک جتنے بھی قتل ناحق ہوتے ہیں۔ اُن میں ہر ایک کا ایک ایک گناہ تو قاتل کے سر پر پڑے گا اور ایسا ہی ایک ایک گناہ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل پر بھی پڑے گا جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے اس فعل شنیع کی بنیاد رکھی۔ قیامت والے دن یہ منظر بھی دیکھنے میں آئے گا[2] کہ ایک شخص نیکیوں کے پہاڑ لے کر بارگاہِ رب العزت میں پیش ہوگا مگر اُس نے دنیا میں لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی روا رکھی ہوگی، لوگوں کے حقوق غصب کیے ہوں گے، مال چھینا ہوگا، قتل کیا ہوگا یا کسی کو تنگ کیا ہوگا۔ ایسے تمام مظلوم اللہ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ مولا کریم! ہمیں اس شخص سے بدلا دلایا جائے۔ اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اس شخص کی نیکیاں ان حقداروں میں تقسیم کر دو۔ پھر تمام نیکیاں اس کے کھاتے سے نکل کر دوسروں کو مل جائیں گی مگر ابھی کچھ حقوق باقی ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ ان مظلوموں کے گناہ اس شخص پر ڈال دو تاکہ حق یہ شخص ادا نہیں کر سکا۔ تو اس طرح اُسے نہ صرف اپنی نیکیوں سے محروم ہونا پڑے گا بلکہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص خود ہدایت یافتہ ہے اور وہ دوسروں کے لیے بھی ہدایت کا ذریعہ بنا ہے تو ہر ہدایت یافتہ کے نیک عمل کا ایک ایک حصہ اس کو بھی ملتا رہے گا۔ اس سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کا اجر و ثواب بے شمار ہوگا۔ کیونکہ انہی اپنی امت کے لیے وہی ہدایت کا منبع ہیں اور امت کے تمام نیک کام کا ایک ایک اجر قیامت تک برابر ان کو بھی ملتا رہتا ہے۔

وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ

اور ضرور ان سے قیامت والے دن پوچھا جائے گا۔ اُن کاموں کے متعلق جو وہ افتراء کرتے ہیں۔ آج یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے۔ یہ محض افتراء

[1] ابن کثیر ص۴۲۰ ج۳ [2] قرطبی ص۳۳۲ ج۱۳ ابن کثیر ص۴۲۰ ج۳ (فیاض)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ

فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿١٤﴾

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٥﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ

اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ

رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ

وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَاِنْ

ترجمہ:۔ اور البتہ تحقیق ہم نے رسول بنا کر بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف پس ٹھہرے وہ اُن کے درمیان ایک ہزار سال سے پچاس سال کم۔ پھر پکڑا اُن کو طوفان نے اور وہ ظلم کرنے والے تھے (۱۴) پس ہم نے نجات دی اُس (نوح) کو اور کشتی والوں کو اور بنایا ہم نے اُس (کشتی) کو نشانی جہان والوں کے لیے (۱۵) اور ابراہیم علیہ السلام (کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا) جب کہا انہوں نے اپنی قوم سے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم سمجھ رکھتے ہو (۱۶) بیشک تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا بتوں کی اور تم گھڑتے ہو جھوٹ۔ بیشک وہ جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا، نہیں مالک وہ تمہارے لیے روزی کے۔ پس تلاش کرو اللہ کے پاس روزی۔ اور اُسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (۱۷) اور اگر تم جھٹلاؤ۔ پس جھٹلایا ان امتوں نے جو تم سے پہلے گزری ہیں اور نہیں ہے رسول کے ذمے مگر پہنچا دینا کھول کر (۱۸) کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ابتدا کرتا ہے مخلوق کی، پھر لوٹاتا ہے اُس کو۔ بیشک یہ اللہ پر آسان ہے (۱۹) آپ کہہ دیجئے۔ چلو زمین میں پس دیکھو کیسے اللہ نے ابتداء کی مخلوق کی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اٹھائے گا اس کو دوسری اٹھان۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (۲۰) سزا دے گا جس کو چاہے، اور رحم کرے گا

عطا ہوئی۔ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا

پھر آپ نے ساڑھے نو سو سال قوم میں رہ کر تبلیغ کی۔ پرویز اور چکڑالوی وغیرہ تو نوح علیہ السلام کی اتنی عمر تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ یہ عمر پوری قوم کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں پر تبلیغ کی مدت ساڑھے نو سو سال مذکور ہے۔ جب اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود قوم نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کی صورت میں عذاب بھیجا جس میں اہل ایمان کے سوا باقی ساری قوم غرق ہو گئی۔ طوفان تھمنے کے بعد نوح علیہ السلام مزید ساٹھ سال تک اس دنیا میں موجود رہے اور اس طرح آپ کی کل عمر ۴۰ + ۹۵۰ + ۶۰ = ۱۰۵۰ سال بنتی ہے۔

زندگی کی ناپائیداری

اکثر لوگ اس لمبی عمر پر تعجب کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی کو عمر نوح بھی مل جائے تو وہ بھی بالآخر ختم ہو جانے والی ہے۔ تفسیر مدارک میں روایت[1] ہے کہ آخری وقت میں جب ملک الموت حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے تو آپ کو اس طرح مخاطب کیا یَا أَطْوَلَ الْأَنْبِيَاءِ عُمْرًا كَيْفَ وَجَدْتَ الدُّنْيَا اے نبیوں میں سب سے زیادہ عمر پانے والے اللہ کے نبی آپ نے دنیا کو کیسا پایا تو نوح علیہ السلام نے جواب دیا كَدَارٍ لَهُ بَابَانِ دَخَلْتُ مِنْ أَحَدِهِمَا وَخَرَجْتُ مِنَ الْآخَرِ یعنی اتنی لمبی عمر پانے کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا ایک گھر ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے میں داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا ہوں۔ دنیا کی زندگی کی بس اتنی سی حقیقت ہے۔ انسانی زندگی ایک ایسا ناپائیدار چیز ہے کہ جس پہ کچھ اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائیدار دیکھ

زندگی کی بے ثباتی کا یہ نقشہ بھی عجیب ہے۔ ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے۔

[1] مدارک ص ۲۵۴/۳ (فیاض)

کی کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا فَأَنجَيْنَٰهُ وَأَصْحَٰبَ
السَّفِينَةِ پھر ہم نے بچا لیا نوح علیہ السلام کو اور باقی کشتی والوں کو اللہ تعالے
نے اہلِ ایمان کو بچانے کی تدبیر بھی خود ہی بتائی تھی وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا
(ہود۔ ۳۷) اے نوح علیہ السلام ! ہمارے سامنے اور ہماری نگرانی میں کشتی تیار کرو۔
اور سارے اہلِ ایمان کو اس میں سوار کر لو۔ کہتے ہیں کہ یہ جہاز بہت بڑی ۵۰۰ فٹ
لمبی کشتی تھی جس کی کئی منزلیں تھیں۔ فرمایا ہم نے اس کشتی کے سواروں کو بچا
لیا وَجَعَلْنَٰهَآ ءَايَةً لِّلْعَٰلَمِينَ اور اس کشتی کو جہان والوں کے لیے ایک
نشانی بنا دیا۔ یہ کشتی ایک لمبے عرصے تک جودی پہاڑ پر پڑی رہی۔ لوگ صدیوں تک
اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے رہے۔ اس کے علاوہ اس کشتی کا ذکر تاریخ اور
کتب سماویہ خاص طور پر قرآن پاک میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

اس کشتی کو حضور علیہ السلام کے واقعات سے بھی کسی حد تک مناسبت ہے
اسلام کے ابتدائی دور میں جب مشرکینِ مکہ نے اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کر
دیا تو ان کی دو جماعتیں کشتی پر سوار ہو کر ہی حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی تھیں۔ پھر واپسی کا
سفر بھی انہوں نے کشتی پر کیا کیونکہ راستے میں سمندر پڑتا تھا۔ حدیث میں ان کشتی والوں
کا حال بھی آتا ہے کہ ان میں مرد اور عورتیں بھی تھیں اور اللہ نے اُن کی حفاظت کشتی
پر کی تھی کہ ایک ملک سے دوسرے ملک بحفاظت پہنچایا۔ اور پھر وہاں سے واپس
مدینہ طیبہ کے لیے بھی کشتی استعمال کی۔

ابراہیم علیہ السلام کا درسِ توحید

نوح علیہ السلام کے بعد اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے وَإِبْرَٰهِيمَ
اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا۔ اُن کا حال بھی ملاحظہ کریں إِذْ قَالَ
لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ
اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ
تَعْلَمُونَ۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ فرمایا کفر اور
شرک سے باز آ جاؤ کہ یہ تمہاری ہلاکت کا باعث ہو گا۔ تمہاری حالت تو یہ ہے

دریغ نہ کرتے ۔ قوم تباہ ہو جائے ، ملک غرق ہو جائے مگر ان کو مال ملنا چاہیئے
ان بیوقوفوں کو اتنا علم نہیں کہ روزی تو اللہ نے ہر حالت میں دینی ہے مگر تم غلط ذرائع
اختیار کر کے اپنے ایمان کو کیوں ضائع کرتے ہو ؟ جائز ذرائع اختیار کرو ، محنت
مشقت کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے جائز رزق کا سوال کرو ۔ اللہ تعالیٰ برکت دے گا ۔

فرمایا اللہ ہی کے ہاں رزق تلاش کرو وَاعْبُدُوْهُ اور عبادت بھی اسی کی کرو
اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ۔ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اور اس کی عطا کردہ
نعمت پر اس کا شکر بھی ادا کرو ۔ یاد رکھو ! کفر اور شرک سے بڑھ کر ناشکری کی
کوئی بات نہیں ۔ تم نعمت دینے والے کے ساتھ دوسروں کو شریک بنا کر اس کی نعمت کی
ناشکری کے مرتکب ہوتے ہو ۔ وہ تمہاری حاجت براری نہیں کر سکتے ، وہ تو خود مجبور
لاچار اور درماندہ ہیں ۔ وہ تو خدا تعالیٰ سے تنکے کے برابر بھی نہیں ہیں ۔ فرمایا ، اے تم
اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو اور ان کو حاجت روا سمجھتے ہو ، اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔ وہ تم سے ایک ایک
عمل کا حساب لے گا ، لہٰذا قیامت کے دن کی رسوائی سے بچنے کے لیے آج ہی انتظام
کر لو ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کو قبول کر لو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت بناؤ ۔

فرمایا وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ
اگر تم اللہ کے رسولوں اور اس کی نازل کردہ کتاب کو جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات
نہیں ہے ۔ تم سے پہلے کتنی قوموں نے اپنے اپنے انبیاء کی تکذیب کی اور انہیں طرح
طرح کی تکالیف پہنچائیں جس کے نتیجے میں عاد ، ثمود ، قوم لوط ، قوم ابراہیم ، قوم نوح
اور کتنی ہی نافرمان قومیں تباہ ہوئیں ۔ آج بھی اللہ کا قانون وہی ہے ۔ اگر تم اللہ کے
اس آخری رسول کو بھی جھٹلاتے ہو تو یاد رکھو وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ کہ ہمارے رسول کے ذمے تو اللہ کا پیغام کھول کر پہنچا دینا ہے ۔ اس کے
بعد اس پر ایمان لانا یا نہ لانا تمہارا کام ہے ۔ اس نے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے
اب اگر تم نہیں مانتے تو تمہارا حشر بھی سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ جس طرح

بالآخر سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ اس کے محاسبہ سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔

انسان کی بے بسی

ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ اور تم زمین و آسمان میں خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ کہ تم اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نکل نہیں سکتے، وہ جب چاہے گا تمہیں پکڑ لے گا۔ دنیا میں تو مجرم بعض اوقات قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کو پکڑنے والے عاجز آجاتے ہیں مگر اللہ کی عدالت میں ایسی کوئی بات نہیں کائنات کی ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لہٰذا اس کو کوئی بھی عاجز نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی یاد رکھو! وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اس کے بغیر تمہارے لیے نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار ہر ایک کا کام بھی وہی بناتا ہے اور پھر جب پکڑتا ہے تو مدد کو بھی کوئی پہنچ نہیں سکتا، جو تمہیں چھڑا لے۔ آج جن چیزوں پہ بھروسہ کر رہے ہو، اگلے جہاں میں وہ سب زائل ہو جائیں گی اور تمہیں کوئی چیز خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکے گی۔

اللہ کی رحمت سے مایوسی

فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔ آیات میں توحید، رسالت، احکام، شرائع اور تمام مسائل آجاتے ہیں، جس نے ان کا انکار کیا اور ملاقات یعنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وہ لوگ میری رحمت سے مایوس ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس نے کفر، شرک، بدعات اور معاصی کا ارتکاب کیا اس نے نہ تو اللہ کی آیتوں کو تسلیم کیا اور نہ ہی بعث بعد الموت کو برحق جانا، ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ کی رحمت حاصل نہیں ہو سکے گی اور وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہی رہیں گے۔ خدا کی رحمت سے مایوسی بجائے خود کفر ہے۔ گویا انکار کرنے والے خدا کی رحمت سے مایوس ہیں وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ
الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ
الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ ع

ع ۳ ۸ ۱۵

ترجمہ :- پس نہیں تھا جواب آپ (ابراہیم) کی قوم کی طرف
سے مگر یہ کہ انہوں نے کہا ۔ اس کو قتل کر دو یا زندہ
جلا ڈالو ۔ پس نجات دی اس کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے
بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو
ایمان رکھتے ہیں ﴿۲۴﴾ اور کہا (ابراہیم علیہ السلام نے) بیشک
بنا لیا ہے تم نے اللہ کے سوا بتوں کو معبود آپس کی دوستی
کے لیے دنیا کی زندگی میں ۔ پھر قیامت کے دن کفر کریں گے
بعض تمھارے بعض کے ساتھ ۔ اور لعنت بھیجیں گے بعض
تمھارے بعض پر ۔ اور ٹھکانا تمھارا دوزخ کی آگ ہوگی ۔ اور
نہیں ہوگا تمھارے لیے کوئی مددگار ﴿۲۵﴾ پس تصدیق کی
اس (ابراہیم) کی لوط علیہ السلام نے اور کہا (ابراہیم علیہ السلام
نے) بیشک میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے پروردگار
کی طرف ۔ بیشک وہ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾

ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کی کوشش

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپ کے دینِ توحید کا کوئی مدلل جواب دینے کی بجائے تشدد پر اُتر آئی تھی۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ

آپ کی قوم کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کو قتل کر ڈالو یا زندہ جلا دو۔ یہاں پر تو تفصیلات نہیں ہیں۔ البتہ سورۃ الانبیاء اور بعض دیگر سورتوں میں بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح آپ نے اپنے باپ اور پھر قوم اور خود نمرود کے ساتھ مناظرہ کیا۔ دلائل توحید بیان کیے مگر وہ کوئی مدلل جواب دینے سے عاجز آ گئے۔ اور انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ ساری قوم کو گمراہ کر دے، اُسے قتل کر دینا چاہیے یا آگ میں زندہ جلا دینا چاہیے۔ چنانچہ بہت سا ایندھن جمع کر کے آگ جلائی گئی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق پر باندھ کر آگ کے وسط میں پھینک دیا گیا۔

پرویز نے ابراہیم علیہ السلام کو بالفعل آگ میں ڈالے جانے کا انکار کیا ہے جس کی وہ کوئی معقول دلیل پیش نہیں کر سکا۔ اس کے برخلاف سورۃ الانبیاء میں ہے کہ اللہ نے فرمایا قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (آیت - ۶۹) ہم نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی ضرورت تبھی پڑی جب آپ کو بالفعل آگ میں ڈال دیا گیا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر آگ کو ٹھنڈی ہو جانے کے حکم کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس مقام پر ہے فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ اللہ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ دشمنوں نے تو آپ کو آگ میں پھینک ہی دیا تھا مگر سورۃ الانبیاء والے تکوینی حکم کے ذریعے اللہ نے آپ کو بچا لیا۔ چنانچہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آگ میں پھینکے جانے کے باوجود آگ نے آپ کا ایک بال بھی نہیں جلایا۔ البتہ وہ رسی جل گئی تھی جس کے ساتھ آپ کو جکڑ کر آگ میں پھینکا گیا تھا۔

نشانات قدرت

فرمایا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

فرمایا ان بتوں کی پوجا مَوَدَّةَ بَيۡنِكُمۡ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا۔ دنیا کی زندگی میں تمہارے لیے آپس میں دوستی کا ذریعہ ہے۔ مطلب یہ کہ کسی خاص بت قبر یا درخت کی پوجا قدرِ مشترک بن جاتی ہے اور پھر اسی کی بنا پر تم آپس میں بھائی بن کر ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہو۔ ہر وقت اسی معبود کے گن گاتے ہو اور اسی پر جیتے اور اسی پر مرتے ہو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مَوَدَّةَ کا مصدر میمی مفعول کے معنی میں مَوۡدُوۡدَةً ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تم ان معبودوں کے ساتھ محبت کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ہر عابد اپنے معبود کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ مگر سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی صفت یہ بیان کی ہے۔ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (آیت۔ ۱۶۵) کہ ان کی شدید ترین محبت اپنے معبودِ برحق خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔

فرمایا دنیا میں تو تم ان جھوٹے معبودوں کی محبت میں سرشار ہو ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُ بَعۡضُكُمۡ بِبَعۡضٍ پھر قیامت والے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے۔ یہاں کی دوستی اس وقت دشمنی میں بدل جائے گی اور جن معبودوں کی تم عبادت کرتے تھے وہ بھی انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے تو ان کو نہیں کہا کہ ہماری پرستش کرو۔ یہ تو خود اپنی خواہش پر چلتے رہے۔ اپنی حاجت براری کے لیے ہمارے نام پر بنائے ہوئے بتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ہمارا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے ان کو کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟ جیسا کہ سورۃ المائدہ میں موجود ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام انکار کر دیں گے اور عرض کریں گے کہ مولا کریم! میں نے تو اپنی قوم کے سامنے وہی بات کی تھی کہ تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيۡ وَرَبَّكُمۡ (آیت۔ ۱۱۷) کہ صرف میرے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔

فرمایا، قیامت والے دن بتوں کی پوجا کرنے والے نہ صرف ایک دوسرے کا

---

[۱] کشاف صفحہ ۴۵۰ ج ۳ (فیاض)

سے کچھ فاصلے پر بستی الخلیل میں آپ کی قبر ہے۔ فرمایا میں اپنے رب کے حکم سے ہجرت کر رہا ہوں اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ بیشک وہ اللہ تعالیٰ زبردست، کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا لہٰذا میں اسی کے حکم سے ہجرت کر رہا ہوں۔

بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہجرت میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت کار فرما تھی۔ آپ نے شام و فلسطین کو اپنا مستقل مستقر ٹھہرایا اور پھر عرصہ دراز کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد سے بھی نوازا۔ پہلے اللہ نے حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام پیدا کیے، جیسا کہ اس مقام پہ ذکر ہے بعد میں حضرت سارہؓ کو بھی اولاد دی۔ اللہ نے سو سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی خواہش کو پورا فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دو سو سال کی عمر پائی اور آپ کی زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسحاق علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام بھی عطا فرمایا اور دونوں کو نبی بھی بنایا۔ فرمایا وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہم نے نبوت اور کتاب رکھ دی۔ آپ کے بعد دنیا میں جتنے بھی نبی آئے بشمول نبی آخر الزمان سب کے سب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے فرمایا وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کا صلہ دنیا میں بھی دیا۔ دنیا میں آپ کو عزت و اکرام دیا۔ آپ کی اولاد کو نبوت و رسالت عطا کر کے آپ کو ابوالانبیا بنا دیا۔ آپ کو دنیا کی امامت عطا فرمائی اور آپ کی ملت کو جاری فرمایا اور دوسری امتوں کو بھی حکم دیا فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (آل عمران ۹۵) یعنی ملت ابراہیمی کی پیروی کرو۔

یہ تو دنیا کے انعامات تھے۔ فرمایا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور بیشک آپ آخرت میں بھی نیکو کاروں میں سے ہیں۔ دنیا میں بھی

ہو وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کہ تم راہ کاٹتے ہو یعنی راستے پر چلتے لوگوں پر ڈاکے ڈالتے ہو اور اُن کا مال و اسباب لوٹ لیتے ہو۔ راہ کاٹنے کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نسل انسانی کی راہ کو کاٹتے ہو۔ نسلِ انسانی کی بقا کے لیے اللہ نے مرد اور عورت کا جوڑا بنایا ہے مگر تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے لذت حاصل کرتے ہو۔ اور اس طرح فطری طریقے کو چھوڑ کر نسلِ انسانی کو منقطع کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ بھلا دو مردوں کے اختلاط سے اولاد کہاں پیدا ہوگی اور نسلِ انسانی کیسے آگے بڑھے گی؟ اسی لیے مشت زنی اور جانوروں کے ساتھ اختلاط کو بھی ملعون کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی سے انسان کا دین، اخلاق اور صحت برباد ہوتی ہے۔ اللہ نے شہوت رانی کے لیے منکوحہ بیوی یا شرعی لونڈی کو مقرر کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع ناجائز اور حرام ہیں۔

لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کی تیسری خرابی یہ بیان فرمائی وَتَأْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ اور تم اپنی بھری مجلسوں میں برائی کا ارتکاب کرتے ہو اور اس معاملہ میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ برائی میں اس قدر طاق ہو چکے تھے کہ برائی اُن کے نزدیک برائی نہیں رہی تھی، لہٰذا وہ عام مجلسوں میں اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ قربِ قیامت میں لوگ گدھوں کی طرح حیوانیت کے کام کریں گے، پھر جب دنیا میں خدا کا نام لینے والا کوئی نہیں رہیگا۔ تو قیامت کا بگل بج جائیگا۔ قوم لوط کے لوگ راہ چلتے لوگوں پر آوازے کستے تھے، اُن کو پتھر مارتے تھے، گالی گلوچ کرتے اور بداخلاقی کے ذریعے کام کرتے تھے۔ عام مجلس میں گوز مارنے میں حیا محسوس نہیں کرتے تھے۔ امام مخشریؒ[1] لکھتے ہیں کہ وہ گوز مارنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے، اور اُن کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ہم جنسی کے مرتکب ہوتے تھے۔

عذاب کا مطالبہ

جب لوط علیہ السلام نے قوم کو ان قبیح کاموں سے منع فرمایا فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ تو قوم کا اس

[1] کشاف صفحہ ۳۵۲ (فیاض)
۳۶۰

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا
اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا
كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ٞ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا
امْرَاَتَهٗ ٞ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَلَمَّآ اَنْ
جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ
بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۟ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ
الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةً ۢ بَيِّنَةً
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ
شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا

بیشک اس بستی میں لوط علیہ السلام بھی رہتے ہیں کہا (فرشتوں نے) ہم خوب جانتے ہیں اُس میں رہنے والوں کو۔ ہم ضرور بچا لیں گے اس (لوطؑ) کو اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے (٣٢) اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط علیہ السلام کے پاس تو وہ ناخوش ہوئے اور اُن کا دل تنگ ہوا اُن کی وجہ سے کہا (فرشتوں نے) مت خوف کر اور مت غمگین ہو۔ بیشک ہم بچانے والے ہیں تجھے اور تیرے گھر والوں کو، سوائے تیری بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے (٣٣) تحقیق ہم اتارنے والے ہیں اس بستی کے رہنے والوں پر عذاب آسمان کی طرف سے، اس وجہ سے کہ یہ فسق کیا کرتے تھے (٣٤) اور البتہ تحقیق ہم نے کر دیا اس کو ایک کھلی نشانی اُس قوم کے لیے جو عقل سے کام لیتی ہے (٣٥) اور اسی طرح ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ انہوں نے کہا اے میری قوم کے لوگو! عبادت کرو اللہ کی اور توقع رکھو آخرت کے دن کی، اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے (٣٦) پس جھٹلایا انہوں نے اُس (شعیبؑ) کو۔ پس پکڑا ان کو زلزلے نے۔ پس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والے (٣٧) اور عاد اور ثمود (کو) بھی ہم نے ہلاک کیا، اور بیشک واضح ہو چکی ہیں تمہارے لیے ان کی رہائش گاہیں۔ اور مزین کیا تھا اُن کے لیے شیطان نے اُن کے اعمال کو۔ پس روکا تھا اُن کو سیدھے راستے سے، اور تھے یہ لوگ ہوشیار (٣٨)

کے پاس جا کر انہیں اس پیرانہ سالی میں بیٹے کی خوشخبری دیں اور بعد قوم لوط کی ہلاکت کے لیے اُن کی بستی میں جائیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب حکمت تھی کہ ایک طرف پوری قوم کو تباہ کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف بیٹے کی بشارت دی جا رہی ہے جس کی نسل سے عظیم قوم بنی اسرائیل کو پیدا کرنا مقصود تھا۔ اس واقعہ کی تفصیلات تو سورۃ ہود اور سورۃ حجر اور بعض دوسری سورتوں میں مذکور ہیں تاہم یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ اس واقعہ کو محض عبرت کی بنا پر بیان کیا ہے۔

ارشاد ہوا ہے وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى جب ہمارے بھیجے ہوئے قاصد ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے یہاں پر خوشخبری کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ دوسری سورتوں میں تفصیل موجود ہے کہ قاصد انسانی شکل میں جبرائیل، میکائیل، اسرافیل علیہ السلام وغیرہ فرشتے تھے مگر ابراہیم علیہ السلام اُن کو پہچان نہ سکے۔ اُن کو انسانوں کی صورت میں مہمان سمجھا۔ بچھڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر مہمانوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے ہیں۔ آخر مہمانوں نے اپنا تعارف خود کرایا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ آپ کو بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ سورۃ الحجر میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے دریافت کیا قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (آیت ۵۷) اے فرشتو! تم کس مقصد کے لیے آئے ہو تو انہوں نے کہا قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ کہ ہم سدوم کی بستی والوں کو ہلاک کرنے کے لیے آئے ہیں کیونکہ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ اس بستی کے بسنے والے بڑے ظالم لوگ ہیں اور ان کی ہلاکت کا حکم ہو چکا ہے۔

بستی کی تباہی کی خبر سن کر ابراہیم علیہ السلام پریشان ہو گئے قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا اور کہنے لگے کہ اس بستی میں تو اللہ کا نبی اور میرا بھتیجا لوط علیہ السلام بھی ہے، اُن کا کیا ہو گا۔ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا فرشتوں نے کہا کہ ہم

ہیں بڑے حسین وجمیل مہمان آئے ہیں۔ چنانچہ لوگ آپ کے گھر میں آنا شروع ہو گئے۔ کوئی دیواریں پھلانگنے لگے اور بعض نے دروازے توڑ دیئے۔ وہ کہتے تھے کہ ان مہمانوں کو ہمارے سپرد کر دو تاکہ ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکیں۔ لوط علیہ السلام نے ہر چند سمجھایا قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَـكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِىْ ضَيْفِىْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (ہود - ۷۸) اے لوگو! یہ میری قوم کی لڑکیاں ہیں تمہارے لیے حلال ہیں۔ خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کو بے آبرو نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں ہے؟ مگر وہ بدطینت لوگ کہاں ماننے تھے کہنے لگے مَا لَنَا فِىْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ (ہود - ۷۹) ہمیں تمہاری لڑکیوں سے کچھ غرض نہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ لہذا مہمانوں کو ہمارے سپرد کر دو۔

فرشتوں کی طرف سے تسلی

جب معاملہ اس حد تک طول پکڑ گیا تو فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو بازو سے پکڑ کر کہا کہ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہم انسان نہیں فرشتے ہیں اور قوم کی تباہی پر مامور من اللہ ہیں۔ اور پھر جیسا کہ سورۃ القمر میں موجود ہے فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ (القمر - ۳۷) جبرئیل علیہ السلام نے ذرا ہاتھ ہلایا تو سارے حملہ آوروں کی آنکھیں اندھی ہو گئیں مگر اس کے باوجود اُن کے ذوقِ معصیت میں فرق نہ آیا اور وہ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر مہمانوں کو تلاش کرتے رہے۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے تسلی دی وَقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ کہنے لگے کہ نہ خوف کھاؤ اور نہ غمگین ہو اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ہم تجھے اور تیرے گھر والوں کو بچالیں گے ماسوائے تیری بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہے۔

قوم کی ہلاکت

فرشتوں نے آخرکار لوط علیہ السلام کو صاف بتا دیا اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ

یعنی آپ کی نبوت و رسالت کا ہی انکار کر دیا اور کہنے لگے اے شعیب! ہمارے دین میں واپس آجاؤ، یہ روز روز کی تبلیغ چھوڑ دو ورنہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ (الاعراف - ۸۸) ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ انہوں نے اس طرح کی دھمکی بھی دی وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (ہود - ۹۱) اگر تیری برادری کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم کبھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ تمہاری برادری کے آدمی ہماری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ہم ان کے لحاظ میں تمہارے خلاف انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کر رہے ہیں۔

بالآخر اس کا نتیجہ ہوا فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ اُن نافرمانوں کو زلزلے نے آپکڑا۔ دوسری جگہ موجود ہے اس قوم پر دو قسم کا عذاب آیا ہے۔ یعنی نیچے سے زلزلہ آیا اور اُوپر سے سخت چیخ بھی آئی جس سے اُن کے دل اور جگر پھٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گئے۔ ایکہ والے بھی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم سے تھے۔ اور آپ اُن کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ سورۃ الشعراء میں ہے فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (آیت - ۱۸۹) ہم نے اُن کو سائبان کے عذاب میں پکڑ لیا۔ سیاہ بادل گھِر کر آئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ اب بارش ہو گی۔ جب لوگ اُس سائبان نما بادل کے نیچے جمع ہو گئے تو اس سے آگ برسنے لگی جس نے سب کو بھسم کر دیا۔

بہرحال فرمایا کہ مدین والوں کو زلزلے نے پکڑ لیا فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ پس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والے۔ ظاہر ہے کہ جب زلزلہ آتا ہے تو لوگوں کے قدم ٹک نہیں سکتے اور وہ گھٹنوں کے بل اوندھے منہ گرتے ہیں اُس وقت اتنی دہشت طاری ہوتی ہے کہ پرندے بھی زمین پر پر پھیلا دیتے ہیں۔

قومِ عاد و ثمود

اس کے بعد اللہ نے قومِ عاد اور ثمود کا ذکر فرمایا ہے۔ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا اور قومِ عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کیا۔ اُن کی ہلاکت کی نشانی یہ ہے۔ وَقَدْ تَّبَيَّنَ

اور ظالم بادشاہ تھی۔ انتہائی درجے کا خود سر اور مغرور تھا۔ سورۃ یونس میں ہے۔
وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ (آیت ۸۳)
بیشک فرعون زمین میں بڑا بنا ہوا تھا یعنی مغرور تھا اور وہ بے لگام لوگوں میں سے تھا اس کا
وزیر ہامان بیوروکریسی یعنی نوکر شاہی کا نمونہ تھا۔ یہ نوکر شاہی آج بھی موجود ہے۔ یہ خاص
ذہنیت اور خاص ڈھب کے لوگ ہوتے ہیں جو حکومت میں دخیل ہوتے ہیں۔ تنخواہیں،
وظیفے، پنشن اور دیگر مراعات حاصل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر حاکم کو اپنے پیچھے چلنے
پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی من مانی کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ سرمایہ داروں کا ہے
جس کی مثال قارون کی شکل میں موجود ہے۔ یہ لوگ مال و دولت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ (الہمزہ ۳) اور گمان کرتے ہیں کہ ان کا مال انہیں
لازوال بنا دے گا۔ سیٹھ قسم کے ان لوگوں کی تجوریاں دولت سے بھری رہتی ہیں۔
بنک بیلنس بہت ہوتا ہے۔ تجارت پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ صنعت و حرفت کے
مالک ہوتے ہیں اور اپنی دولت کی بنا پر دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ اپنی چودھراہٹ
اور رسومات کو ہی دنیا میں جاری کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ نہ خدا کو مانتے ہیں، نہ
اس کے نبی کو اور نہ دین کو۔ دیکھ لیں فرعون اور قارون نے کس طرح موسیٰ علیہ السلام
کی مخالفت کی۔ بہرحال اللہ نے قارون، فرعون اور ہامان کو علی الترتیب سرمایہ دار،
جابر حکمرانوں اور بیوروکریسی کا نمونہ قرار دیا ہے۔ فرمایا ہم نے ان تینوں کو بھی ہلاک کیا۔
وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ موسیٰ علیہ السلام ان تینوں یعنی
قارون، فرعون اور ہامان کے پاس آئے واضح نشانیاں لے کر۔ فَاسْتَكْبَرُوا
فِي الْأَرْضِ انہوں نے زمین میں تکبر کیا، موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر
دیا وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ اور وہ کہیں بھاگ کر جانے والے نہیں تھے
اپنے تمام تر وسائل کے باوجود وہ خدا کی گرفت سے آزاد نہیں تھے۔ پھر جب
ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اللہ نے فرمایا فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ
تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ ان پر عذاب الٰہی کا نزول ہو

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ :- مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے بنائے ہیں اللہ کے سوا کارساز ، مکڑی کی مثال ہے جس نے بنایا ہے گھر ۔ اور بیشک تمام گھروں سے کمزور گھر البتہ مکڑی کا گھر ہوتا ہے اگر ان لوگوں کو سمجھ ہوتی ﴿۴۱﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جن کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا کوئی چیز بھی ۔ اور وہ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۴۲﴾ اور یہ مثالیں ہیں جن کو ہم بیان

تیار کرتے ہیں اور اُن میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ صحراؤں اور جنگلوں میں رہنے والے لوگ خیمے کا گھر بناتے ہیں۔ جنگلوں میں رہنے والے درندے غاروں اور گڑھوں کو گھر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

پرندے درختوں پر اپنے گھونسلے بناتے ہیں اور وہیں انڈے بچے دیتے ہیں۔ رینگنے والے جانور کیڑے مکوڑے، سانپ بچھو وغیرہ زمین کے اندر گھر بناتے ہیں۔ چیونٹیوں کا ذکر سورۃ النمل میں ہو چکا ہے، وہ بھی اپنی بلوں میں رہتی ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ ان تمام گھروں کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ کہ سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر یعنی اُس کا جالا ہوتا ہے جو نہ اُسے گرمی سردی سے بچا سکتا ہے اور نہ تیز ہوا کو برداشت کر سکتا ہے۔ ذرا آندھی یا بارش آئی تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اگر آگ قریب سے بھی گزر جائے تو یہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ تمام گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ اور مشرکین کے نظریات بھی بعینہٖ اتنے ہی کمزور ہوتے ہیں جو غیر اللہ کو اپنا کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اُن سے حاجت براری کرتے ہیں۔ فرمایا لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ کاش ان لوگوں کو سمجھ ہوتی اور یہ جان سکتے کہ شرک کتنی کمزور چیز ہے جس پر وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ سورۃ الحج میں اللہ کا فرمان موجود ہے، لوگو! ذرا غور سے سنو جو لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنی حاجتوں میں پکارتے ہیں، وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اُس سے واپس نہیں لے سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (آیت-۳۷) کہ مانگنے والا اور جس سے مانگا جا رہا ہے دونوں کمزور ہیں۔ مانگنے والا تو ظاہر ہے کہ وہ اُس چیز سے محروم ہے جس کو طلب کر رہا ہے۔ اور جس سے مانگتا ہے، نہ وہ چیز اُس کے پاس موجود ہے اور نہ وہ دینے پر قادر ہے، لہٰذا طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں۔ حقیقت یہ ہے أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا

کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ جو لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں وہ روزی کے مالک نہیں ہیں لہٰذا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (آیت - ۱۷) روزی بھی اللہ ہی کے ہاں تلاش کرو۔ زمین و آسمان سے روزی کے تمام اسباب اللہ تعالیٰ ہی مہیا کرتا ہے۔ مخلوق تو خود روزی کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کے متعلق فرمایا کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ (المائدہ - ۷۵) کہ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے، جو کھانے کا محتاج ہے وہ الٰہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب اللہ کے نبی معبود نہیں ہو سکتے تو باقی مخلوق کس شمار میں ہے؟ انسان کھانے پینے کے علاوہ سانس لینے کے لیے ہوا کا محتاج ہے، چلنے پھرنے کے لیے زمین کا محتاج ہے لوگ بلاوجہ انسانوں کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ کوئی یا علیؓ مدد پکار رہا ہے، کوئی یا حسینؓ سے مدد مانگتا ہے۔ کوئی یا غوث الاعظم کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔ کوئی کسی ولی کو پکار رہا ہے کوئی کسی صحابی کو اور کوئی جبرائیل اور میکائیل فرشتوں سے مدد کا طالب ہے۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو یہ سب انکار کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کریں گے کہ مولا کریم! ہم نے تو تیرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہیں مانا پھر انہوں نے ہمیں کیسے اپنا کارساز مان لیا؟ ہم نے تو انہیں نہیں کہا کہ ہمیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا تسلیم کر لو۔ بہرحال فرمایا کہ ہر قسم کا شرک مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہے، اس پر قطعی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

فرمایا حقیقت یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اُن چیزوں کو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور وہ کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ سارا اختیار اُسی کے پاس ہے۔ ہر ایک کی حاجت روائی اور مشکل کشائی وہی کرتا ہے۔ اُس نے کسی کو اختیار نہیں دیا۔ واجب الوجود، خالق، مدبر اور معبود وہی ہے

اس کے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں، نہ کوئی نفع نقصان پہنچا سکتا ہے، وہ جس طرح چاہے تصرف کرے اس کے سامنے کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ کمال قدرت اور حکمت کا مالک وہی وحدہٗ لاشریک ہے۔

مثال کی اہمیت

فرمایا وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ یہ مثالیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل اور قرآن پاک میں بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ اس مقام پر مکڑی کے جالے کی مثال ہے جب کہ سورۃ نمل میں چیونٹیوں کی مثال بیان کی ہے اور سورۃ النحل میں شہد کی مکھیوں کی مثال ہے۔ سورۃ النور میں نورِ خداوندی کی مثال بیان کی گئی ہے۔ کہیں مکھی، مچھر اور کیڑے مکوڑوں کی مثالیں ہیں۔ کہیں مومن اور کافر کی مثال ہے تو کہیں کلمۂ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ہے۔ الغرض! اللہ نے بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ اسی طرح احادیثِ مبارکہ میں بھی بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں امام ترمذیؒ نے کتاب الامثال کے نام پر ایک مستقل باب بیان کیا ہے۔ اور مثال بیان کرنے کا فلسفہ یہ ہے کہ کسی باریک مضمون کو انسانی عقل و فہم کے قریب لایا جاسکے۔ حضرت عمرو ابن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے سن کر ایک ہزار مثالیں یاد کر رکھی ہیں۔ آپ فاتح مصر ہیں۔ پہلے کفر میں شدید تھے مگر جب ایمان لے آئے تو اسلام کی فداکاری میں بھی پیش پیش رہے۔ کلیلہ دمنہ نامی کتاب تبت والوں نے آج سے دو ہزار دو سو سال قبل لکھی تھی جس کا ترجمہ سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں میں ہوا۔ اسمیں گیدڑ، لومڑی، ہاتھی، سانپ، بچھو وغیرہ کی زبانوں سے بڑی سبق آموز اور حکمت کی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ یہ بھی جانوروں کی مثالیں ہیں اور ان کے ذریعے کوئی چیز آسانی سے سمجھ سکتے ہیں فرمایا وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ان مثالوں کو اہل علم اور اہل عقل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور پھر آگے دوسروں کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا عام لوگوں کو اہل علم کا اتباع کرنا چاہیئے۔

تخلیق ارض و سما

آگے اللہ نے ارض و سما کا اپنی نشانی کے طور پر ذکر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا حق کے ساتھ۔ اللہ نے اس کائنات کو بیکار محض پیدا نہیں کیا، بلکہ یہ اس کی حکمت کا ایک نمونہ ہے انسان کی تخلیق بھی عبث نہیں۔ اس کا انجام بھی سامنے آنے والا ہے فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ اس میں ایمان والوں کے لیے نشانی ہے۔ جو لوگ ایمان اور عقل سے عاری ہیں۔ وہ ان نشانیوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اللہ نے ایمان کے ساتھ ابتلا کا سلسلہ بیان فرمایا ہے۔ اور اس کے لیے نیک بندوں کا حال ذکر کیا ہے، اور ساتھ ساتھ کافروں کی سزا کا ذکر بھی کیا ہے۔ دین اور توحید کے بنیادی مسائل کا ذکر فرمایا ہے اور شرک کی قباحت کو مثال کے ذریعے واضح کیا ہے تاکہ لوگ شرک سے باز آجائیں۔

اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: آپ پڑھ کر سنائیں وہ چیز جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف کتاب سے اور قائم کریں نماز کو بیشک نماز روکتی ہے بے حیائی اور برائی سے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿۴۵﴾

تلاوت قرآن پاک

گذشتہ آیات میں ایمان کے ابتلاء کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایک مثال کے ذریعے کفر و شرک کی کمزوری کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اب کتاب الٰہی کی صداقت اور رسالت کا ضمناً بیان ہے۔ اس کے بعد توحید اور معاد کا ذکر ہوگا۔ آج کی آیت میں پہلے قرآن پاک کے متعلق ارشاد ہے۔ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ آپ پڑھیں اس چیز کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے کتاب کی صورت میں یعنی قرآن کریم۔ تلاوت کا معنی پڑھنا ہوتا ہے اور یہ دو مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔ تلاوت کا ایک مقصد حصول ثواب اور روحانی تسلی ہوتا ہے، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کے ایک ایک حرف کی تلاوت پر اللہ تعالیٰ دس دس نیکیاں عطا فرماتا ہے[1]۔ یہ ایسی بابرکت چیز ہے کہ ہر اہل ایمان نماز میں تلاوت قرآن پاک کا پابند ہے۔ نماز کے علاوہ بھی زبانی طور پر یا قرآن پاک کو کھول کر ناظرہ پڑھنا بھی باعث اجر و ثواب ہے البتہ دیکھ کر پڑھنے میں زبانی پڑھنے کی نسبت زیادہ ثواب ہوتا ہے بیہقی شریف کی روایت میں موجود ہے کہ زبانی تلاوت سے ایک ہزار اور دیکھ کر

[1] ترمذی ص ۱۱۹/۲۲۰ (فیاض)

پڑھنے سے دو ہزار نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ باوضو ہو کر قرآن پاک کو پکڑنا، اس کو کھولنا، اوراق کو الٹنا پلٹنا اور پھر الفاظ پر نگاہ ڈالنا، یہ سب چیزیں موجب اجر و ثواب ہیں تاہم قرآنِ پاک کی افضل ترین تلاوت وہ ہے جو دورانِ نماز کی جائے۔

تلاوت کا دوسرا مقصد لوگوں کی تعلیم، وعظ اور نصیحت ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کا ایک فرضِ منصبی یہ بھی ہے يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (الجمعۃ ۲) کہ وہ لوگوں کو قرآنِ پاک کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ لوگوں کو کتاب الٰہی کی طرف متوجہ کرنا، اس کے احکام کی وضاحت کرنا اور اُن پر عمل کی ترغیب دینا بڑا عظیم مقصد ہے۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (آیت ۴۴) ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر یعنی قرآنِ پاک اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان کریں اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔ نیز فرمایا وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (القصص ۵۱) ہم نے لوگوں کے لیے ملا دیا ہے قول کو تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ مطلب یہ کہ جس طرح پہلی قوموں کی طرف اللہ کا پیغام آتا رہا اسی طرح آخری امت کے پاس اللہ کا قول بصورت قرآنِ حکیم آچکا ہے لہٰذا اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس میں غور و فکر کر کے نصیحت حاصل کریں۔ یہ غور و فکر جبھی ہوگا جب کوئی شخص قرآنِ پاک کو خود پڑھے گا، یا کسی دوسرے سے سنے گا تو گویا تلاوتِ کلام پاک ایک عظیم مقصد ہے۔ البتہ تعلیم و تبلیغ کے لیے تلاوت درجہ اوّل میں آتی ہے جب کہ محض ثواب حاصل کرنے کے لیے پڑھنا درجہ دوم کا عمل ہے۔ اس سے حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت کا علم بھی ہو گیا۔ کیونکہ اللہ نے آپ کو نبوت عطا کر کے اپنے کلام کو پڑھ کر سنانے کا حکم دیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک آپ کی ذاتِ بابرکات پر بذریعہ وحی جلی نازل کیا گیا۔

نماز پر ثواب سے روکتی ہے

تلاوتِ قرآن کو نماز کے ساتھ خاص تعلق ہے کہ یہ نماز کا لازمی جزو ہے

لہذا آگے اللہ نے فرمایا وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اور آپ نماز قائم کریں کیونکہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ بیشک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ یہ خطاب تو پیغمبر علیہ السلام سے ہے مگر تمام اہل ایمان اس کے مکلف ہیں۔ جیسے سورۃ الکوثر میں فرمایا فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (آیت ۲) آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی کے راستے میں رکاوٹ ہے جب کہ روزمرہ مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور برائیوں کا ارتکاب بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کا اشکال حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بھی پیدا ہوا تھا۔ آپ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے، مگر دن کو چوری کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، فکر نہ کرو، ابھی اس پر پوری طرح اثر نہیں ہوا۔ نماز اس کو ضرور برائی سے روکے گی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کی تاثیر تو یہی ہے کہ وہ بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے مگر اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں اور اگر وہ شرائط پائی جائیں اور موانعات بھی نہ ہوں تو پھر یقیناً نماز اپنا اثر ظاہر کریگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض دوائیاں بعض امراض کے لیے تیر بہدف ہوتی ہیں مگر وہ بعض مریضوں پر اثر نہیں کرتیں جس کی وجوہات ہوتی ہیں۔ مثلاً ملیریا بخار کے لیے کونین سو فیصدی علاج ہے لیکن بعض اوقات یہ بھی فائدہ نہیں دیتی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مریض ملیریا کے علاوہ کسی دوسری بیماری میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مریض صحت یاب نہیں ہوتا۔ بعض اوقات صرف ملیریا نہیں بلکہ ساتھ کوئی دوسرا بخار بھی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے کونین مفید نہیں ہوتی۔

شرائط نماز

غرضیکہ نماز برائیوں سے اُس وقت روکے گی جب وہ پوری شرائط کے ساتھ ٹھیک طریقے سے ادا کی جائے گی۔ مثلاً سورۃ الماعون میں ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ ہلاکت اور تباہی ہے اُن نمازیوں کے لیے جو نماز کے مقصد

سے ہی غافل ہیں نماز محض روا روی میں پڑھ جاتے ہیں اور اس کی حقیقت سے واقف ہی نہیں یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کی نقل اتارے جو کہ مفید نہیں ہو سکتی۔

نماز کے لیے طہارت بھی شرط ہے۔ جو شخص نماز پڑھتا ہے مگر طہارت کا خیال نہیں رکھتا، وہ بھی اس شرط کو پورا نہیں کرتا۔ لہٰذا نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھاتی۔ نماز کے لیے دلجمعی اور سکون کی بھی ضرورت ہے اللہ کا فرمان ہے وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ (البقرہ۔ ۲۳۸) اور خدا تعالیٰ کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہو۔ اگر کوئی شخص دورانِ نماز سکون نہیں پکڑتا۔ کپڑوں اور بالوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ فضول حرکات کرتا ہے۔ نظر کو ادھر اُدھر کرتا ہے تو اُس کو نماز کیسے مفید ہوگی اور وہ اپنی تاثیر کیسے ظاہر کرے گی۔ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کو نماز میں فضول حرکات کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا لَوْ خَشَعَ قَلْبُهٗ لَخَشَعَ جَوَارِحُهٗ اگر اس کے دل میں عاجزی ہوتی تو اس کے اعضا بھی عاجزی کا اظہار کرتے اور اس کے ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں وغیرہ سکون پکڑتے۔

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ۔ ۱۴) میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ لیکن اگر انسان نماز کے مقصد و مفہوم سے ہی واقف نہیں، اس طرف بالکل توجہ ہی نہیں۔ بلکہ منافق کی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کا کیا اثر ظاہر ہوگا۔ حدیث شریف میں منافق کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کا مالک اس پر بوجھ لادے۔ ڈنڈا مار دیتا ہے یا اس کے سامنے چارہ ڈال دیتا ہے۔ کبھی اُس کو باندھ رکھتا ہے اور کبھی کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ مگر گدھے کو کچھ معلوم نہیں کہ اُسے کیوں مارا گیا۔ کیوں باندھا گیا اور کیوں چھوڑا گیا۔ غافل نمازی کی بھی یہی مثال ہے جو نہیں جانتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے، کیوں پڑھ رہا ہے اور کہاں کھڑا ہے؟ اس کے برخلاف اہلِ ایمان ان سب چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اوقاتِ نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ طہارت کا خیال رکھتے ہیں۔ خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں مناجات کرتے ہیں تو اُن کی نمازوں کا یقیناً اثر ہوتا ہے اور وہ بے حیائی اور برائی سے بچ جاتی ہیں۔

بوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ عام آدمیوں کی نمازوں میں مقبولیت کا حصہ کسی کا دسواں کسی کا نواں اور کسی کا آٹھواں یا ساتواں حصہ ہوتا ہے۔ وہ بڑا ہی خوش قسمت آدمی ہوتا ہے جس کی آدھی نماز قبول ہو جائے اسی طرح اس کو پھیلائیں تو کسی کی نماز میں نناواں حصہ اور کسی کا سواں حصہ مقبول ہوگا۔ وجہ یہی ہے کہ نماز کی شرائط اور خشوع وخضوع مکمل نہیں ہوتا۔ نماز ایک بہترین عبادت ہے مگر اسے عادتاً پڑھا جاتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] الصلوٰۃ ام العبادات المقربۃ یعنی اللہ کا قرب دلانے والی عبادتوں کی جڑ اور بنیاد نماز ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے جس شخص کی نماز اُسے بے حیائی اور برائی سے نہیں بچاتی تو ایسے شخص کو قرب الٰہی کی بجائے لَمْ یَزْدَدْ اِلَّا بُعْدًا دوری ہی نصیب ہوگی کیونکہ اُس نے نماز کو اُس کی روح کے مطابق ادا ہی نہیں کیا۔

نماز کا اقتضائے طبعی

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں[2] کہ نماز کا اقتضائے طبعی یہ ہے کہ اس کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات اور تمام ارکان وہیئات چاہتے ہیں کہ انسان برائی کا ارتکاب نہ کرے جو شخص اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے، یا رکوع وسجود کی حالت میں ہے۔ قرأت کر رہا ہے یا مناجات اور تسبیحات بیان کر رہا ہے۔ وہ برائی کا کام کیسے کریگا؟ ان ارکان کا تقاضا ہے کہ وہ برائی کی بات نہ کرے۔ اور اگر انسان ان چیزوں کا پورے طریقے سے خیال نہیں رکھے گا تو اسے نماز برائیوں سے کیسے روکے گی۔؟

شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں[3] کہ اگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو کم از کم اتنی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جتنی دیر تک کوئی آدمی نماز کی حالت میں رہتا ہے اتنی دیر تک تو بے حیائی اور برائی سے رکا رہتا ہے۔ ایسے آدمی سے توقع رکھنی چاہیئے کہ بعد میں بھی وہ برائی سے رکنے کی کوشش کرے گا۔ بے حیائی میں زنا، لواطت، عریانی، بداخلاقی، گالی گلوچ، فلمی گانے، فوٹو گرافی سب کچھ آتا ہے۔ اور منکر ان چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ جو شریعت اور عقل کے نزدیک بُری ہیں۔ ان میں لڑائی جھگڑا، حق تلفی، ظلم وزیادتی، دھوکہ فریب، ترک فرائض، شریعت کی طرف سے عدم توجہی، اللہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۳ ج ۱۲ [2] تفسیر نسفی صفحہ ۲۵۹ ج ۳، مظہری صفحہ ۲۱۱ ج ۷، روح المعانی صفحہ ۱۶۳ ج ۲۰ [3] موضح القرآن صفحہ ۴۹۸ (فیاض)

اور اس کے رسول کے حکم سے لاپرواہی، رسومات فاسدہ کی تائید وغیرہ شامل ہیں۔ نمازی سے توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ ان تمام فحش اور منکرات سے بچنے کی کوشش کرے۔

ذکرِ الٰہی کی برکات

پھر فرمایا وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے نماز اللہ کے ذکر ہی کی ایک صورت ہے جس کے قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ انسان کے اعمال کو اگر درجے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بڑا درجہ ذکر کا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے مَا مِنْ شَيْءٍ اَنْجٰى مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اللہ کے عذاب سے بچانے والی ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ کا فرمان ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (آیت۔ ۴۱) اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ سورۃ الانفال میں فرمایا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آیت۔ ۴۵) لوگو! اللہ کا کثرت سے ذکر کیا کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ یہ لسانی ذکر ہے جس میں قرآن کی تلاوت، تسبیحات، استغفار اور حمد و ثنا وغیرہ شامل ہیں اور یہ ذکر کی عام صورت ہے۔

اس کے علاوہ قلبی ذکر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کر کے اس کا شکر ادا کرنا قلبی ذکر ہے۔ حصن حصین کی روایت میں آتا ہے كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ وَهُوَ ذَاكِرٌ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا ہوا ہے، وہ اللہ کا ذکر کرنے والا ہے، ہر نیکی کا کام انجام دینے والا آدمی ذاکر ہے۔ تاہم آسان ذکر زبان سے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنا ہے۔ ایک شخص[۱] نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کونسا عمل افضل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ تو ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔ ایک موقع پر[۲] آپ علیہ السلام سفر میں جا رہے تھے کہ سامنے جمدان نامی پہاڑ آیا۔ آپ[۳] نے فرمایا سِيْرُوْا هٰذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ لوگو! چلتے جاؤ۔

۱؎ مظہری ص۲۱۲ ج۷ ونسفی ص۲۵۹ ج۳ ۲؎ مظہری ص۲۱۲ ج۷ ۳؎ و معالم التنزیل ص۱۴۳ ج۳ (فیاض)

یہ جمدان پہاڑ ہے اور مفرد لوگ سبقت لے گئے۔ پہاڑ کا ذکر آپ نے اس لیے کیا کہ پہاڑ اور شجر و حجر ہر چیز اللہ کا ذکر کرتی ہے۔ پھر صحابہؓ نے عرض کیا حضرت! مفردون کون لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا اَلذّٰکِرُوْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ یعنی اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ مفرد کا لغوی معنی اپنے آپ کو الگ تھلگ اور ہلکا پھلکا کرنے والا ہے۔ مطلب یہ کہ کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنے والے جب پل صراط پر سے گذریں گے تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔

الغرض! وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ کا ایک معنی تو یہ ہوگیا کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے جس کا آگے چل کر بڑا فائدہ ہوگا اور اس کا دوسرا مفہوم مفسرین کرام یہ بیان کرتے ہیں کہ تمہارے ذکر کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے تمہارا ذکر کرنا تمہارے ذکر کی نسبت بہت بڑا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اُس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ پھر جب وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ اور وہ لوگوں کے سامنے میرا ذکر کرے تو میں اُن سے بہتر بندوں کی جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ یعنی فرشتوں کی جماعت میں اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ دیکھو! میرا یہ بندہ میرا ذکر کر رہا ہے۔ بہرحال خدا تعالیٰ کا بندوں کا ذکر کرنا بندوں کے ذکرِ الٰہی سے بہتر ہے۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ جو ذکرِ الٰہی کرتا ہے خواہ وہ زبان سے کرتا ہے یا جوارح سے یا قلب سے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے تو اس کے بدلے میں اللہ جو اس کا ذکر کرے گا۔ یعنی اُس کو جو اجر و ثواب عطا کرے گا۔ وہ بندے کی نیکی سے ہر صورت بہتر ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (الانعام۔ ۱۶۱) جو ایک نیکی کرتا ہے اللہ سے کم از کم دس گنا اجر پاتا ہے جس کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اجر بندے کے ذکر سے بہرحال بہتر ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی

لہ ابو داؤد صفحہ ۱۶ (فیاض)

اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَذْکُرُہٗ فِیْ کُلِّ اَحْیَانِہٖ یعنی رسول مقبول علیہ السلام اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے یعنی ان کا کوئی وقت ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ فرمایا وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اُس کے علم میں ہے کہ کون غافل ہے اور کون ذاکر ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ کون کس نیت اور ارادے سے ذکر کرتا ہے کس شخص میں خلوص ہے اور کس میں ریاکاری پائی جاتی ہے۔ تمھاری کارکردگی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ اور وہ اسی کے مطابق بدلہ دیگا۔

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ
اَحۡسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡٓا
اٰمَنَّا بِالَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ
وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَهٗ
مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ
الۡكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يُؤۡمِنُوۡنَ
بِهٖ ۚ وَمِنۡ هٰٓؤُلَاۤءِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا
يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنۡتَ
تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنۡ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ
بِيَمِيۡنِكَ اِذًا لَّارۡتَابَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۴۸﴾
بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ
اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ وَمَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۹﴾
وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥٠﴾
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى
لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ ع

ترجمہ :۔ اور نہ جھگڑا کرو تم اے اہل ایمان! اہل کتاب
کے ساتھ مگر اس طریقے سے جو بہتر ہو ۔ ہاں مگر وہ جو
ظالم ہیں اُن میں سے ۔ اور کہو تم کہ ایمان لائے ہم اس چیز
پر جو اتاری گئی ہے ہماری طرف اور جو اتاری گئی ہے ۔ تمھاری
طرف ۔ ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہی ہے ۔ اور ہم اُس
کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۴۶) اور اسی طرح اتاری ہم نے
آپ کی طرف کتاب ۔ پس وہ لوگ کہ جن کو ہم نے کتاب
دی ہے ایمان رکھتے ہیں اُس پر ۔ اور اُن (مشرکین) میں سے
بھی ایمان رکھتے ہیں ۔ اس پر ۔ اور نہیں انکار کرتے ہماری
آیتوں کا مگر کافر لوگ (۴۷) اور نہیں تھے آپ پڑھتے اس سے
پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتے تھے اُس کو اپنے دائیں ہاتھ
سے ۔ اُس وقت البتہ شک کرتے باطل پرست لوگ (۴۸)
بلکہ یہ تو آیتیں ہیں صاف اُن لوگوں کے سینوں میں جن کو علم
دیا گیا ہے ۔ اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر ظالم
لوگ (۴۹) اور کہا اُن لوگوں نے کیوں نہیں اتاری جاتیں اس
پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے ۔ آپ کہہ دیجئے بیشک
نشانیاں اللہ کے پاس ہیں اور بیشک میں تو کھول کر ڈرانے

والا ہوں ﴿۵۰﴾ کیا اِن کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ کہ بیشک ہم نے اُتاری ہے آپ کی طرف وہ کتاب جو پڑھ کر اِن کو سنائی جاتی ہے۔ بیشک اس میں البتہ رحمت اور نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۵۱﴾

ربطِ آیات

سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر ایمان کے ساتھ ابتلاء کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض انبیاء کی آزمائش کے واقعات بیان کر کے اہل ایمان کو تسلی دی ہے کہ کسی کو بغیر آزمائش کے نہیں چھوڑا جائے گا۔ پھر اللہ نے شرک کی قباحت کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا، پھر توحید کی دعوت دی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ جو چیز آپ کی طرف بصورت وحی نازل کی جاتی ہے اس کو پڑھیں اور نماز قائم رکھیں کہ یہ بے حیائی اور برائی سے روکنے والی چیز ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہاری تمام کارگزاریوں سے واقف ہے۔

اہلِ کتاب کے ساتھ مجادلہ

اہلِ کتاب اور مشرک لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے بیہودہ اعتراض کرتے تھے۔ پھر نبی کریم علیہ السلام کو اُن کا جواب بھی دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے بحث مباحثہ بعض اوقات طول پکڑ جاتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں بعض ہدایات دی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے جو آسمانی کتابیں تورات اور انجیل نازل ہوئیں اُن کو ماننے والے اہل کتاب کہلاتے ہیں۔

بلاشبہ یہ دونوں کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں جن میں ان امتوں کی راہنمائی کے لیے ٹھیک ٹھیک احکام موجود تھے مگر خود ان کے ماننے والوں نے بعد میں ان کتابوں میں تحریف کر کے ان میں تغیر و تبدل پیدا کر دیا۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک تک اگرچہ یہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھیں، پھر بھی ان میں بعض باتیں محفوظ

رہ گئی تھیں اور وہ قرآن پاک سے مطابقت رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں اکثر بحث و تمحیص ہوتی رہتی تھی۔ اللہ نے مشرکین کے ساتھ بھی بحث مباحثہ کی اجازت دی ہے۔ مگر اُن کے دین کی توجڑ اور بنیاد ہی غلط تھی۔ اُن کے پاس کوئی آسمانی کتاب کسی صورت میں بھی موجود نہیں تھی۔ البتہ اہلِ کتاب کے پاس چونکہ آسمانی کتابیں موجود تھیں اگرچہ وہ تحریف شدہ تھیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ بحث کرنے میں احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اُن کی کسی صحیح بات کا بھی انکار کر بیٹھو یا کسی غلط بات کو تسلیم کر لو۔

بخاری شریف کی روایت[1] میں آتا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ تورات کا کچھ حصہ پڑھ کر مسلمانوں کو سناتے تو بعض اوقات مسلمان اُسے پسند کرتے تھے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لَا تُصَدِّقُوْا اَھْلَ الْکِتٰبِ وَلَا تُکَذِّبُوْا تم اہلِ کتاب کی نہ تو تصدیق کرو، نہ تکذیب کرو بلکہ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْکُمْ یوں کہو کہ ہم اُس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ کیونکہ وَاِلٰھُنَا وَاِلٰھُکُمْ وَاحِدٌ تمہارا اور ہمارا معبود ایک ہے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم اُس کے فرمانبردار ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا (آیت۔ ۶۴) آپ اہلِ کتاب سے کہہ دیں کہ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اہلِ کتاب کے ساتھ بحث کرتے وقت نرم رویہ اختیار کریں اور اُن کی بات کی نہ تو تصدیق کریں اور نہ تکذیب بلکہ اس چیز پر ایمان لانے کا اعلان کریں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ

[1] کشاف صفحہ ۲۵/۲ و معالم التنزیل صفحہ ۱۳۲/۱۲ (فیاض)

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ مگر ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کو یہ نرمی والی رعایت حاصل نہیں ہوگی۔ ان کے ساتھ گفتگو میں اگر تلخ کلامی بھی ہو جائے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ظالموں سے کون لوگ مراد ہیں۔ ظالم تو سارے کے سارے اہل کتاب تھے کیونکہ وہ شرک کے مرتکب ہوتے تھے مگر یہاں پر وہ لوگ مراد ہیں جو ہٹ دھرم تھے اور کسی بات کو سننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ تاہم جو لوگ نرم رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ نرم لہجے میں بات کرو۔ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ اور یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور اس پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری طرف تو اللہ تعالیٰ نے اپنا قرآن نازل فرمایا ہے اور اپنے نبی کو خاص شریعت احکام، مسائل اور دین عطا کیا ہے لہٰذا ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اور تمہاری طرف بھی اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل نازل فرمائی تھیں۔ جو بالکل برحق ہیں۔ ہمارے لیے اب بھی یہی حکم ہے کہ ہم تمام کتب سماویہ پر ایمان لائیں۔ سورۃ الشوریٰ میں بھی اللہ نے یہ حکم دیا وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (آیت - ۱۵) اے پیغمبر! آپ صاف کہہ دیں کہ اللہ نے جو بھی کتاب اتاری ہے میرا اس پر ایمان ہے کہ وہ برحق ہے۔ اگر ان لوگوں نے بعد میں کوئی تبدیلیاں کر لی ہیں تو اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔ ہم تو تمام اصل آسمانی کتب اور صحائف پر ایمان رکھتے ہیں۔

فرمایا، آپ اہل کتاب سے یہ بھی فرما دیں وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود بھی ایک ہی ہے۔ یہ تمہارے ساتھ ایک گونہ اشتراک بھی ہے کہ ہمارا سب کا معبود ایک ہی اللہ جل جلالہٗ ہے۔ اہل کتاب کے ساتھ تو یہ قدر مشترک ہے مگر مشرکین کے معبود بھی جدا جدا ہیں لہٰذا ان کے ساتھ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ ان کے متعلق تو یہی حکم ہے لَآ اَعْبُدُ

مَا تَعْبُدُوْنَ (الکٰفرون - ۲) میں اُن باطل معبودوں کی پوجا نہیں کر سکتا جن کی تم کرتے ہو۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکٰفرون - ۶) تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔ مشرکوں کے ساتھ تو نقطۂ اتحاد توحید ہی نہیں جس پر سب کی نگاہ مرتکز ہو سکے، لہٰذا اُن کو دو ٹوک جواب دو اور اہلِ کتاب کے ساتھ نرمی سے یہ رکھو کہ اُن کے ساتھ قدرِ مشترک موجود ہے۔

منصف مزاج اہلِ کتاب

ارشاد ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ اور اسی طرح ہم نے اُتاری ہے آپ کی طرف کتاب۔ یعنی جس طرح اہلِ کتاب کی طرف تورات اور انجیل نازل کی گئی۔ اسی طرح آپ کی طرف قرآن پاک جیسی عظیم کتاب نازل کی گئی ہے فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ پس وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اہلِ کتاب سارے کے سارے تو قرآن پاک پر ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک قلیل تعداد ایمان لائی۔ سورۃ آل عمران میں وضاحت موجود ہے۔ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (آیت - ۱۱۰) اگر وہ سارے ایمان لے آتے تو اُن کے لیے بہتر تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن میں سے تھوڑے ایمان لاتے ہیں جب کہ اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارکہ سے لے کر آج تک اہلِ کتاب کی اکثریت نافرمان ہی رہی ہے اور اصل یہ مشرکوں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ البتہ ہر زمانے میں اُن میں سے کچھ لوگ ضرور منصف مزاج پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مدینہ کے اطراف میں دس بڑے بڑے یہودی عالم تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر یہ سارے کے سارے ایمان لے آئیں تو روئے زمین پر کوئی یہودی ایمان قبول کیے بغیر نہ رہے۔ مگر ان دس علماء میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلامؓ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے جب کہ باقی نو اپنی ضد اور عناد پر ہی اڑے رہے۔ بعد کے ادوار میں بھی بعض لوگ ایمان قبول کرتے رہے ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں عبداللہ کوئلیم بہت بڑا بیرسٹر تھا جس نے ایمان قبول کیا۔ اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ اس کے اسلام لانے سے انگریز بہت سیخ پا ہوئے تھے مگر وہ مردِ مومن مع اپنے چالیس ساتھیوں کے ایمان پر ڈٹا رہا۔

جنگِ عظیم کے دوران مارماڈیوک پکتھال کو انگریز نے جاسوسی کے لیے ترکی بھیجا۔ وہ سات سال تک شیخ الاسلام کی مجلس میں بیٹھا تو اللہ نے اس کا دل پھیر دیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس نے انگریزی زبان میں قرآن پاک کا بڑا مستند ترجمہ کیا ہے۔ حیدرآباد دکن میں انگریزی اخبار کا ایڈیٹر بھی رہا۔ حال ہی میں فرانس کے ایک بڑے فلسفی نے ایمان قبول کیا ہے۔ جرمنی کا لیوپولڈ یہودی تھا۔ کہیں بدو کے ساتھ سفر میں جا رہا تھا۔ راستے میں کھانے کا وقت ہوا تو بدو نے کھانا لیا، بسم اللہ کہہ کر دسترخوان پر چنا اور اپنے ہم سفر کو بھی دعوت دی۔ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا اور کھانے کے بعد الحمد للہ کہا تو اس شخص پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ بڑا عالم فاضل آدمی تھا محمد اسد[1] نام رکھا۔ اب بھی کہیں یورپ میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ اسلام لانے کے بعد اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں "اسلام چوراہے پر" (ISLAM AT THE CROSS ROAD) اور "شاہراہِ مکہ" (ROAD TO MAKKAH) مشہور تصنیفات ہیں۔ بہر حال منصف مزاج لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں جو حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں مگر اہلِ کتاب کی غالب اکثریت ہمیشہ عناد کا شکار بھی رہی ہے۔

منصف مزاج مشرکین

فرمایا وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ اور ان میں سے یعنی مشرکین میں سے بھی بعض ایسے ہیں جو ایمان قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ جاپان کا پروفیسر ہاشم تھا۔ اس کے ہاتھ قرآن کا نسخہ آ گیا۔ اس نے بنظرِ عمیق مطالعہ کیا تو اللہ نے کایا پلٹ دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ دو سال تک مصر میں رہ کر عربی زبان سیکھی اور اسلامی لٹریچر کا

---

[1] ۵ فروری ۱۹۹۲ء سپین میں کسی جگہ وفات پا گیا ہے۔ رحمۃ اللہ

مزید مطالعہ کیا۔ وہ تو کہتا ہے کہ میں مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوا، بلکہ خوش قسمتی سے مجھے قرآن پاک میسر آگیا، اس کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قرآن سچا ہے اور اس کا لایا ہوا اسلام سچا ہے۔ باقی سارے ادیان غلط ہیں۔ جاپانی اکثر مشرک یا بدھ ہیں مگر اللہ نے اس شخص کو ایمان کی دولت سے نوازا۔ ہندوؤں اور صابیوں میں سے بھی بعض اوقات منصف مزاج نکل آتے ہیں جو اسلام کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں مشرکین عرب میں سے بھی بعض لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ایمان لے آتے ہیں وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر، فرمان لوگ جو بڑے ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ وگرنہ جن میں قبولیتِ حق کا تھوڑا سا جذبہ موجود ہوتا ہے، وہ ایمان قبول کر لیتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل

فرمایا اے پیغمبر آخر الزمان! آپ کی صداقت کی یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ کہ آپ اس سے پہلے تو کتاب نہیں پڑھتے تھے وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ اور نہ آپ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر آپ پہلے سے پڑھے لکھے ہوتے۔ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ تو یہ باطل پرست لوگ شک کرتے کہ یہ تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ کہیں پرانی کتابوں سے مضامین اخذ کر کے ہمیں سناتا رہتا ہے، مگر آپ نے تو کبھی پڑھا اور نہ لکھا، نہ کسی سکول کالج میں گئے نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اس کے باوجود آپ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب پڑھتے ہیں، اور لوگوں کے سامنے علوم و معارف کے سمندر بہاتے ہیں۔ یہی تو آپ کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہے کہ امی ہونے کے باوجود اللہ نے آپ کی زبان پر قرآن کو جاری فرما دیا ہے۔ اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو یہ لوگ آپ پر شک کر سکتے تھے مگر اب ان کے پاس شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی۔

قرآن پاک کی حفاظت

فرمایا بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ بلکہ یہ تو واضح آیتیں ہیں جو اہلِ علم لوگوں کے سینوں میں محفوظ

ہیں ۔ یہ بھی اس کتاب کے برحق ہونے کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ پوری کی پوری کتاب حفاظ کے سینوں میں بند کر دی ہے ہمارا اندازہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی ایک ارب کی آبادی میں ایک کروڑ حافظ ضرور موجود ہیں۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ تو یاد ہے ۔ جو وہ نماز میں پڑھتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ میں سے تورات یا انجیل کا ایک بھی حافظ آپ کو نہیں ملے گا ۔ کیا یہ کتاب الٰہی کے برحق ہونے کی کھلی دلیل نہیں ہے ؟ ایک زمانے میں انگریزوں نے اس کتاب پاک کو ختم کرنے کا منصوبہ بنانا چاہا ۔ مگر انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ ایسی کتاب ہے جسے کبھی مٹایا نہیں جا سکتا ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث قدسی میں اللہ کا فرمان ہے نزلت الیک کتٰبا تقرءہ نائما ویقظان میں نے آپ کی طرف ایک ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جس کو آپ بحالت نیند بھی پڑھتے ہیں اور بیداری میں بھی یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کو نہ آگ جلا سکتی ہے اور نہ پانی دھو سکتا ہے اگر کسی وقت اس کے تمام نسخے بھی ضائع ہو جائیں تو حافظ صاحبان اسے پھر سے تیار کر لیں گے ۔ جہاں تک نیند کے دوران قرآن پاک کی تلاوت کا تعلق ہے تو ایسے واقعات بھی سننے میں آتے رہتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ کے ایک استاد نے لکھا ہے کہ میں نے خواب میں الحمد سے لیکر والناس تک پورا قرآن پاک حضور علیہ السلام کے سامنے پڑھا ۔ جسے آپ علیہ السلام نے سماعت فرمایا ۔ تو دنیا میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے نیند کی حالت میں قرآن بھی پڑھا اور حضور علیہ السلام کی زیارت بھی نصیب ہوئی ۔ بہرحال فرمایا کہ یہ واضح آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں ۔ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر ظالم لوگ جو حد سے زیادہ بے دھرم اور ضدی ہوتے ہیں اور اتنی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ۔ اللہ نے اہل کتاب اور مشرکین کے بے انصاف لوگوں کا شکوہ بھی کیا ہے ۔

معجزات کا مطالبہ

آگے مشرکین کی ایک اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری جاتیں؟ مشرکین چاہتے تھے کہ نبی علیہ السلام ہماری مرضی کے مطابق معجزات ظاہر کریں تو پھر ہم ایمان لائیں گے۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ آپ کہہ دیں کہ نشانیاں تو ساری اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں پیغمبر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ تمہاری خواہش پر جب چاہے کوئی معجزہ پیش کر دے۔ یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کوئی نشانی ظاہر کر دیتا ہے۔ جہاں تک نبی کی ذات کا تعلق ہے تو آپ کہہ دیں وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ کہ میں تو کھول کر ڈر سنانے والا ہوں۔ میں تو اللہ کا پیغام سناتا ہوں اور برے انجام سے ڈراتا ہوں یعنی میرا کام انذار و تبشیر ہے۔ نشانیاں ظاہر کرنا نہیں اور نہ فرمائشیں پوری کرنا میرے اختیار میں ہے۔ سورۃ المؤمن میں صراحت موجود ہے وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آیت ۷۸) کسی نبی اور رسول کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی معجزہ پیش کر سکے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ وہ کبھی فرمائش پوری کر دیتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔

قرآن بطور رحمت اور نصیحت

فرمایا اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ اور یہ نازل بھی ایسی ہستی پر ہوئی ہے جو بالکل امی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً بے شک اس میں رحمت ہے۔ رحمت ہدایت پر چلنے کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو اختیار کرے گا، وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہو گا۔ وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ اور یہ کتاب نصیحت ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان لاتے ہیں اس کے برخلاف جو ضد اور عناد سے کام لیتے ہیں۔ جو ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کتاب الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے

کچھ نہیں ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے۔ جو انصاف پسند ہیں بہرحال یہ قرآنِ پاک اہل ایمان کے لیے نصیحت اور رحمت کا ذریعہ ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ
يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ
وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ
وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾
يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ
لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ
وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾
يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِىْ وَاسِعَةٌ
فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر) کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ۔ جانتا ہے وہ جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ اور وہ لوگ جو باطل پہ یقین رکھتے ہیں اور اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۵۲﴾ اور آپ سے جلدی مانگتے ہیں یہ لوگ عذاب کو۔ اور اگر نہ ہوتا ایک مقررہ وقت تو البتہ پہنچتا ان کے پاس عذاب۔ اور ضرور آئیگا ان کے پاس اچانک۔ اور ان کو خبر بھی نہ ہو گی ﴿۵۳﴾ جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے عذاب کو حالانکہ دوزخ گھیرنے والی ہے کفر کرنے والوں کو ﴿۵۴﴾ جس دن کہ ڈھانپ لے گا ان کو عذاب اُوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے بھی۔ اور فرمائے گا وہ چکھو جو کچھ تم کام کیا کرتے تھے ﴿۵۵﴾ (ایمانداروں سے فرماتا ہے): اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو۔ بیشک میری زمین وسیع ہے۔ پس خاص میری ہی عبادت کرو ﴿۵۶﴾ ہر ایک نفس چکھنے والا ہے موت کا مزا۔ پھر ہماری طرف ہی تم سب لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۷﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے ،
ہم ضرور ان کو ٹھکانا دیں گے جنت کے بالاخانوں میں ۔
جاری ہیں ان کے سامنے نہریں ، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے
ان میں ۔ اچھا ہے بدلہ عمل کرنے والوں کا (۵۸) وہ جنھوں
نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (۵۹)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب اور مشرکین کا شکوہ کیا تھا جو ایمان لانے کی بجائے طرح طرح کی نشانیاں طلب کرتے تھے ۔ اللہ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ آپ صاف صاف کہہ دیں کہ میرا کام تو کھول کر ڈر سنانا ہے ۔ نشانیاں پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے کوئی نشانی ظاہر کر دیتا ہے ۔ اللہ نے فرمایا کہ اس سے بڑی نشانی اور معجزہ کیا ہوگا کہ ایک اُمّی آدمی ایسی عظیم الشان کتاب پڑھ کر سناتا ہے جس نے نہ کوئی کتاب پڑھی ہے اور نہ لکھنا سیکھا ہے ۔ یہ کتاب ایسے علوم و معارف پر مشتمل ہے جس کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا ۔

رسالت پر شہادتِ خداوندی

اللہ نے فرمایا کہ اگر انکار کرنے والے انکار کرتے ہیں تو قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے ۔ مطلب یہ کہ اگر تمہیں میری رسالت پر شک ہے اور طرح طرح کی نشانیاں طلب کرتے ہو اور میری تصدیق کرنے کی بجائے تکذیب کرتے ہو تو میں نے اللہ تعالیٰ کی گواہی پر چھوڑتا ہوں کیونکہ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو وہ خوب جانتا ہے ۔ وہ میری رسالت سے بھی واقف ہے اور تمھاری مخالفت اور سرکشی سے بھی واقف ہے ۔ جو کچھ تم زبان پر لاتے ہو اُس سے بھی واقف ہے اور جو دل میں مخفی ہو اُس کو بھی جانتا ہے ۔ لہٰذا میں اپنے اور تمھارے درمیان فیصلے کے لیے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں ۔ وہ جو بھی فیصلہ کرے مجھے منظور ہے اور تم بھی

اس کو قبول کر لو۔

فرمایا تم لوگ حق شناسی سے اجتناب کرتے ہو مگر یاد رکھو! وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ جو لوگ باطل پر یقین رکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ یہ بڑے بدبخت لوگ ہیں جو جھوٹی باتوں کو تو مانتے ہیں مگر خدا کی وحدانیت، اُس کی وحی اور نبیوں کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے حصے میں ہمیشہ کی ناکامی آئیگی۔

عذاب کا مطالبہ

فرمایا یہ لوگ تعصب اور عناد کی وجہ سے وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ آپ سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں کہ اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ہم پر کوئی عذاب بھیج دے۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (بنی اسرائیل - ۹۲) یا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرا دے۔ یا فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال - ۳۲) ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ اور اگر یہ وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر فوراً عذاب آجاتا اور یہ خدا کی گرفت میں آجاتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہر امت اور قوم کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف - ۳۴) پھر جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ فوراً گرفت شروع ہو جاتی ہے۔

فرمایا یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب طلب کرتے ہیں وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً یہ یقیناً اُن کے پاس اچانک آجائے گا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور انہیں پتہ بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح موت بھی اچانک آجاتی ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا مگر انسان موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح

اقوام کو شکست بھی اچانک ہی آجاتی ہے۔ اللہ نے فرعونیوں کو سزا دی تو وہ سوچ بھی نہیں
سکتے تھے کہ اتنی جلدی سارے کے سارے غرق ہو جائیں گے۔ جب مکے والوں کا وقت
پورا ہو گیا تو حضور علیہ السلام دس ہزار۔ قدسیوں کی جماعت کے ساتھ عازم مکہ ہوئے
جب کہ وہ بالکل بے خبر تھے حتیٰ کہ مسلمانوں کی جماعت مر الظہران تک پہنچ گئی۔ اب مکے
والوں کو علم ہوا کہ اُن کی سزا کا وقت آگیا ہے۔ خیبر کے یہودی بھی اسی طرح اچانک
گرفت میں آئے۔ وہ صبح سویرے حسب معمول اپنے ٹوکرے اور بیلچے وغیرہ
لے کر اپنے کھیتوں کی طرف کام پر جا رہے تھے کہ اچانک خدائی لشکر اُن کے سروں
پر پہنچ گیا۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ موت کا اور سزا کا ایک وقت مقرر ہے جب
وہ آجاتا ہے تو پھر ڈھیل نہیں ملتی اور کام تمام ہو جاتا ہے۔ فرمایا یہ لوگ عذاب مانگتے
ہیں مگر وہ اپنے وقت پر اچانک آجائے گا۔

کفار کی جہنم رسیدگی

پھر فرمایا یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب طلب
کرنے میں۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ عذاب آکر رہے گا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ
بِالْكٰفِرِيْنَ اور بیشک جہنم کافروں کو گھیرنے والی ہے بس مرنے کی دیر ہے۔ فوراً
جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ اس دن اُن کی حالت یہ ہوگی يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ
مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ کہ اوپر سے بھی اور پاؤں
کے نیچے سے بھی ان کو اللہ کا عذاب ڈھانپ لے گا۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک
رہے ہوں گے۔ جس طرح آج یہ لوگ کفر، شرک اور معاصی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایمان
اور توحید سے دور ہیں۔ اسی طرح عذاب ان کو ہر طرف سے گھیرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ
کا ارشاد ہوگا۔ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اب اپنے اعمال کا مزہ
چکھو۔ یہ تمہاری کارکردگی کے بدلے میں تمہیں سزا دی جا رہی ہے۔ بخاری شریف کی
روایت میں مانعین زکوٰۃ کے متعلق آتا ہے کہ اُن کا مال قیامت والے دن سانپ بن کر
اُن کے گلے میں لٹکا دیا جائیگا اور انہیں کاٹے گا اور وہ یوں کہے گا اَنَا كَنْزُكَ
اَنَا مَالُكَ میں تیرا مال اور خزانہ ہوں جسے تو سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ اور اس میں سے

اللہ اور بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ شخص پیچھے چلائے گا مگر اب اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

ہجرت کا حکم

دوسری طرف ایمان والوں کو تسلی بھی دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اے میرے ایماندار بندو! اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ بیشک میری زمین کشادہ ہے فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ لہٰذا خالص میری ہی عبادت کرو۔ اگر تمہیں کفار مکہ کی سرزمین میں رہنے نہیں دیتے تو یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔ دین میں ہجرت کو بھی بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ ساری زمین اللہ کی ہے۔ اگر کسی علاقے کے لوگ اللہ کی عبادت میں رکاوٹ بنتے ہیں تو اس سرزمین کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاؤ، جہاں تم آزادی کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود ہو سکو۔ دین اور آخرت کی خاطر وطن کو چھوڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترک وطن بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ لوگوں کو اپنے وطن کے ساتھ انس ہوتا ہے۔ اُن کی زمین، مکان، دکان، کاروبار ہر چیز سے پیار ہوتا ہے۔ انسان کی رشتہ داری اور برادری ہوتی ہے، یار دوست ہوتے ہیں۔ آب و ہوا موافق ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو خیرآباد کہہ کر دوسری جگہ چلے جانا جہاں یہ چیزیں فوری طور پر میسر نہیں آتیں، ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ مکے کے مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو اُن کو بھی مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی اور وہ بیمار ہونے لگے۔ حضور علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ مولا کریم! جس طرح ان کو مکہ محبوب اور موافق تھا، اسی طرح مدینہ کو بھی بنا دے۔[1] الغرض! اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ہجرت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

ہجرت کی فرضیت

جب کافر لوگ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیں، اُن کا غلبہ اتنا شدید ہو کہ مسلمان شعائر اسلام بھی ادا نہ کر سکیں، نہ اذان دے سکیں، نہ نماز باجماعت ادا کر سکیں تو ایسی حالت میں ہجرت فرض عین ہو جاتی ہے۔ مکے میں یہی حالت پیش آئی تھی جب اللہ نے آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ہجرت کا حکم دیا۔ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ہجرت دو وجہ سے فرض ہوتی ہے۔ ایک وجہ یہ ہے

---

[1] بخاری ص ۲۵۳ ج ۱ (فیاض)

کہ کوئی اہلِ ایمان اپنے دین اور ایمان کی حفاظت نہ کر سکے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ایسی جگہ سے چلا جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہؓ نے اس وجہ کی بنا پر مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی۔ ایسے حالات میں جو شخص ہجرت کی استطاعت رکھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرتا اُس کی سزا جہنم ہے جیسے سورۃ النساء میں فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (آیت - ۹۰) شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر ہجرت اُس وقت بھی فرض ہو جاتی ہے جب کسی مقام پر اُس کے لیے رزق حلال حاصل کرنا محال ہو جائے یا وہ گناہ سے نہ بچ سکے۔ ہجرت کی فرضیت کے یہ دو مقامات ہیں۔

موت کا پروانہ

فرمایا، دیکھو! كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہر نفس نے ہر کو موت کا پیالہ پینا ہے ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ پھر تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہو کر اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ لہٰذا دنیا میں ایسا عمل اختیار کرو جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہو اور جس کی وجہ سے اللہ کی گرفت سے بچ جاؤ۔ دنیا میں ایمان اور توحید کے بعد نیک اعمال انجام دو، کفر، شرک اور معاصی سے بچ جاؤ تو خدا کی نعمتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستفید ہونے والے بن جاؤ گے۔

اہلِ ایمان کے لیے انعامات

آگے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے بعض انعامات کا ذکر کیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیے۔ ایمان سے مراد صحیح عقیدہ توحید ہے اور اچھے اعمال میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، قربانی اور صدقہ خیرات وغیرہ امور ہیں۔ فرمایا ایسے لوگوں کو لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا ہم ضرور جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ حدیث شریف میں بالاخانوں کی بڑی تعریف آئی ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کی دیواریں ایسی شفاف ہوں گی کہ اندر کی چیز باہر سے اور باہر کی چیز اندر سے صاف نظر آئے گی۔ ایک دیہاتی آدمی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ بالاخانے کن لوگوں کو ملیں گے۔ تو آپ نے فرمایا
لِمَنْ اَلَانَ الْکَلَامَ وَ اَطْعَمَ الطَّعَامَ۔ وَاَدَامَ الصِّیَامَ وَصَلّٰی
وَالنَّاسُ نِیَامٌ یہ ان لوگوں کو میسر ہوں گے جو محتاجوں کو کھانا کھلائیں گے
نفلی روزے رکھیں گے، خوش اخلاقی سے کلام کریں گے اور ایسے وقت میں
نماز پڑھیں گے جب لوگ سوئے ہوں گے۔ فرمایا یہ ایسے بالاخانے ہوں گے تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ خٰلِدِیْنَ
فِیْهَا وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے یعنی وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے۔
نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ یہ عمل کرنے والوں کا نہایت ہی اچھا بدلہ ہوگا۔ ہر
عامل کا عمل نتیجہ خیز ثابت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرےگا بشرطیکہ
اس کی تہ میں ایمان اور اخلاص موجود ہو۔

صبر و توکل

فرمایا یہ اُن عاملین کا تذکرہ ہے اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا جنہوں نے ہر قسم
کی تکالیف کو برداشت کر کے صبر کا مظاہرہ کیا، مخالفین کی ایذائیں جھیلیں، وطن
سے ہجرت کی اور دیگر مصائب برداشت کیے۔ اللہ کی توحید، خدا کا ذکر، اُس کی
نعمتوں کا شکر اور نماز کی طرح صبر بھی ہمارے دین کا بہت بڑا اصول ہے۔ صبر
مصیبت کے وقت بھی کرنا پڑتا ہے اور عبادت کے وقت بھی صبر کی ضرورت
ہوتی ہے۔ نفسانی خواہشات اور رسوماتِ باطلہ کے ترک کرنے میں بھی صبر
کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو شخص صبر نہیں کرتا وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

فرمایا کہ آخرت کے انعام اُن لوگوں کا حصہ ہیں جنہوں نے صبر کیا وَعَلٰی
رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اور جنہوں نے اپنے پروردگار پر بھروسہ کیا۔ جن کو
یقین ہے کہ سارا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہی قادرِ مطلق اور علیم کل ہے
وہی وحدہٗ لاشریک ہے اور نیکی کا بدلہ دینے والا بھی وہی ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی
میں اپنی کوشش کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہیں اُن کو
جنت میں یقیناً اعلیٰ درجات حاصل ہوں گے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ
يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ
فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۶ ۲

ترجمہ:- اور بہت سے زمین میں چلنے پھرنے والے جانور ہیں کہ نہیں اٹھاتے وہ اپنی روزی خود۔ اللہ ہی اُن کو روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہی ہے سننے والا اور جاننے والا ﴿۶۰﴾ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو

اور زمین کو ، اور کس نے مسخر کیا ہے سورج کو
اور چاند کو تو یقیناً کہیں گے یہ لوگ کہ اللہ تعالیٰ نے
پھر کدھر یہ لوگ پھیرے جاتے ہیں (۶۱) اللہ ہی کشادہ
کرتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اپنے بندوں میں
سے ، اور تنگ کرتا ہے اس کے لیے جس کے لیے
چاہے ، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۶۲)
اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے اتارا ہے آسمان
کی طرف سے پانی ، پھر زندہ کیا ہے اس کے ساتھ خشک
زمین کو بعد اس کے مردہ ہو جانے کے تو یقیناً کہیں گے
یہ لوگ کہ اللہ تعالیٰ نے ۔ آپ کہہ دیجئے ، سب
تعریف اللہ کے لیے ہے ۔ بلکہ ان میں سے اکثر سمجھ نہیں
رکھتے (۶۳)

ربطِ آیات

اس سورۃ مبارکہ میں زیادہ تر ایمان کے ساتھ ابتلا کا ذکر ہے ۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی مثالیں بھی بیان فرمائیں کہ اس نے اپنے جلیل القدر بندوں کو کس طرح آزمائش میں ڈالا ۔ پھر کفر و شرک کا رد کیا ، نبوت و رسالت پر معترضین کے اعتراضات کے جوابات دیے ۔ پھر ابتلاء ہی کے ضمن میں ہجرت کا مقام بیان فرمایا اور اہل ایمان کو حکم دیا کہ جب کفار اہل ایمان پر عرصہ حیات تنگ کر دیں اور انہیں دینی شعائر بھی ادا نہ کرنے دیں تو موحد انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ ایسی جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کر جائے کیونکہ اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے ۔ مسند احمد کی روایت میں حضرت زبیر بن العوامؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَلْبِلَادُ بِلَادُ اللّٰهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰهِ فَحَيْثُ مَا كَسَبْتَ خَيْرًا فَاَقِمْ یعنی شہر بھی اللہ کے ہیں اور بندے بھی اسی کے ہیں ، لہٰذا جہاں تمہیں بہتری نصیب ہو وہاں جا کر قیام کرو ۔ یعنی اگر کسی مقام پر کفار کا تسلط غلبہ ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ ۔

اس کے علاوہ اللہ نے اہل ایمان کے اچھے انجام کا ذکر فرمایا۔ نیز یہ بھی کہ ہر نفس پر موت وارد ہونے والی ہے اور سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر اہل ایمان اپنا وطن، برادری، کاروبار، مکان، دکان وغیرہ چھوڑ کر ہجرت کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں عالیشان محل عطا فرمائیگا۔ جو کہ اعمالِ حسنہ انجام دینے والوں کا صلہ ہے۔ ایسے ایمان والے کہ جن کا خاصہ صبر علی المصائب اور توکل علی اللہ ہوتا ہے۔

رزق رسانی کی ذمہ داری

ہجرت کے نتیجے کے طور پر انسانی ذہن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ جب آدمی اپنا گھر بار، عزیز و اقارب، کاروبار چھوڑ کر چلا جائے گا، تو اس کی گذر اوقات کیسے ہوگی؟ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے، روزی رسانی کا اصول بیان کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا زمین میں چلنے پھرنے والے بہت سے جانور ہیں، جو رزق کو اپنی پشتوں پر نہیں اٹھائے پھرتے، بلکہ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ اللہ ہی رزق پہنچاتا ہے۔ ان جانوروں کو بھی اور تمہیں بھی۔ رزق رسانی کا اختیار اللہ نے اپنے پاس رکھا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کاروبار، ملازمت، کھیتی باڑی یا محنت مزدوری وغیرہ سے روزی ملتی ہے حالانکہ وسائل رزق تو اللہ کے پاس ہیں۔ وہ اسباب پیدا کرتا ہے تو انسان کی محنت بھی کارگر ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہو تو اپنی پوری جدوجہد کے باوجود انسان روزی کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ سورۃ الذریٰت میں ہے۔ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (آیت۔ ۲۲) تمہاری روزی کا حکم آسمان سے نازل ہوتا ہے اور اسی کے مطابق تمہاری زیست کا سامان ہوتا ہے۔ اسی طرح موت کا پروانہ بھی اوپر ہی سے آتا ہے۔ گویا روزی اور موت انسان کے اپنے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ رب العزت کے اختیار میں ہے۔ سورۃ الذریٰت میں ہی مزید ارشاد ہے إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (آیت ۔ ۵۸) بیشک اللہ تعالیٰ ہی رزق اور مضبوط قوت کا مالک ہے۔ جو لوگ رزق کو اپنے اختیار میں سمجھتے ہیں یا اس پر حرص کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ غلط ہے۔ خواہش کے مطابق کسی کو روزی نہیں ملتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ

کا انتظام ہے کہ وہ مصلحت کے مطابق جس کو جتنی روزی چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

ابن ابی حاتم کے حوالے سے امام ابن کثیر[1]، امام بغوی اور بعض دیگر مفسرین نے حضرت عبد اللہ بن عمر کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ ایک باغ میں داخل ہوا۔ آپ نے اُس باغ میں سے کھجوریں تناول فرمانا شروع کیں اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دی۔ میں نے عرض کیا لَا اَشْتَهِي حضرت! مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا لٰكِنِّيْ اَشْتَهِيْهِ کہ مجھے تو اس وقت کھانے کی خواہش ہے کیونکہ آج چوتھا دن ہے کہ میں نے کچھ نہیں کھایا۔ پھر فرمایا اے ابن عمرؓ! اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو وہ مجھے قیصر و کسریٰ سے زیادہ خزانے عطا کر دے مگر میں یہ نہیں چاہتا۔ میں تو اس چیز کو پسند کرتا ہوں کہ اَشْبَعُ يَوْمًا وَّ اَجُوْعُ يَوْمًا کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ جب کھانے کو مل جائے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گا اور نہیں ملے گا تو صبر کروں گا کہ اس پہ مجھے اجر ملے گا۔ فرمایا، اُس وقت کیا حال ہوگا جب لوگ سال بھر کے لیے اناج وغیرہ ذخیرہ کر کے رکھیں گے۔ یعنی لوگوں کا یقین اتنا کمزور ہو جائے گا۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابھی ہم اُسی باغ میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہی آیت نازل فرمائی وَكَاَيِّنْ مِّنْ ...... وَاِيَّاكُمْ

ذخیرہ اندوزی کا مسئلہ

اسی بناء پر عام حالات میں اناج وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی پسندیدہ نہیں ہے البتہ اگر اناج کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو تو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانے میں ایسا کیا تھا۔ ترمذی شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔[2] لَا يَدَّخِرُ شَيْئًا لِّغَدٍ یعنی حضور علیہ السلام کوئی چیز کل کے لیے ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتے تھے۔ البتہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب خیبر یا فدک کی زمین کی پیداوار کا اناج آتا تو حضور علیہ السلام اپنی ازواج مطہرات میں سال بھر کا غلہ تقسیم فرما دیتے۔ مگر وہ نہیں فرماتے ہیں کہ ازواج مطہرات اپنا اپنا حصہ وصول کر لیتیں مگر وہ اُسے ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ فی سبیل اللہ خرچ کر دیتیں اور خود خدا پر توکل کر کے گزر اوقات کرتیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ کا بھی یہی معمول تھا کہ وہ اپنی گورنری کے دوران بیت المال سے

---

[1] ابن کثیر ص ۴۲۲ ج ۳ و معالم التنزیل ص ۱۴۵ ج ۳ [2] معالم التنزیل ص ۱۴۵ ج ۳ (فیاض)

وظیفہ تو وصول کر لیتے مگر سلسے کا سارا اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتے اور خود محنت مشقت کی کمائی سے گزر اوقات کرتے۔ چنانچہ امام سفیان ابن عیینہؒ کا قول[1] ہے کہ تمام مخلوق میں انسانوں، چیونٹیوں اور چوہوں کے سوا کوئی مخلوق ذخیرہ اندوزی نہیں کرتی۔ اس بیماری کا آغاز انسانوں میں یہودیوں سے ہوا اور انہوں نے دنیا میں باقی لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے عام لوگوں کو غلے کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی لیے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ یعنی ذخیرہ اندوز ملعون ہے جو شخص اس لیے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تاکہ غلے کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اس کے دام بڑھائے جائیں اور مناسب وقت پر زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا وَالْجَالِبُ مَرْزُوقٌ جو شخص کھینچ کر مال منڈی میں لاتا ہے تاکہ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق خریداری کر سکیں اور غلے کی قلت پیدا نہ ہو تو فرمایا ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ مزید روزی دیتا ہے اور اس پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

توکل علی اللہ

حضرت عمرؓ کی روایت[2] ترمذی اور ابن ماجہ شریف میں موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، لوگو! لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرتے جس طرح توکل کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ تمھیں بھی اسی طرح روزی پہنچاتا جس طرح پرندوں کو پہنچاتا ہے۔ وہ صبح کو خالی پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو اللہ کے بھروسے پر ہی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ کونسا ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت[3] میں حضور علیہ السلام کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا اَمَرْتُكُمْ بِهٖ لوگو! میں نے ہر وہ چیز جو تمھیں جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کرتی ہے۔ وہ تمھیں بتلا دی ہے۔ اور ہر وہ چیز جو تمھیں جنت

---

[1] تفسیر مدارک ص ۲۶۳ ج ۳ [2] معالم التنزیل ص ۱۴۵ ج ۳ [3] معالم التنزیل ص ۱۴۵ ج ۳ (فیاض)

سے دُور اور دوزخ کے قریب کرتی ہے۔ اُس سے تمہیں منع کر دیا ہے۔ پھر فرمایا اَلَا اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ اَنَّ لِنَفْسٍ لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَھَا سنو! جبرائیل علیہ السلام نے میرے جی میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی جاندار اُس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے حصے کا رزق مکمل طور پر حاصل نہیں کر لیتا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب کسی انسان کی تخلیق ہوتی ہے تو فرشتے اپنے رجسٹروں میں درج کر لیتے ہیں کہ مَا رِزْقُہٗ مَا اَجَلُہٗ مَا عَمَلُہٗ شَقِیٌّ اَوْ سَعِیْدٌ اس شخص کو روزی کتنی ملے گی۔ اس کی عمر کتنی ہوگی اور عملی طور پر یہ بدبخت ہوگا یا خوش بخت۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے مزید فرمایا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ سنو! اللہ سے ڈرو اور روزی اچھے راستے سے تلاش کرو۔ اور اگر کسی وقت روزی کے حصول میں تاخیر ہو جائے تو گناہوں کے ذریعے اُسے تلاش نہ کرنے لگو کیونکہ لَا یُدْرَکُ مَا عِنْدَ اللّٰہِ اِلَّا بِطَاعَتِہٖ اللہ کے پاس جو چیز ہے وہ اُس کی اطاعت سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ معصیت کے ساتھ وہ چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی روزی تو اللہ کے ہاں مقرر ہے لہٰذا اُسے اُس کی تلاش میں ناجائز ذرائع اختیار نہیں کرنے چاہئیں۔

خاندانی منصوبہ بندی

یہ آیت کریمہ خاندانی منصوبہ بندی کے نظریہ کو بھی باطل قرار دیتی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی آبادی کو بڑھنے سے روکا جائے۔ ایسی دوائیں استعمال کی جائیں یا نس بندی کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جو کہ مانع حمل ہو۔ آجکل یہ ساری منصوبہ بندی اقوام متحدہ کے زیر نگرانی ہو رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا میں خوراک کی قلت ہے اور اگر آبادی بڑھے گی تو بھوکوں مرے گی۔ یہ نظریہ دنیا میں ایک انگریز مالتھوس نے قائم کیا تھا کہ خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے آبادی پر کنٹرول کیا جائے اور اس طرح خوراک کا مسئلہ حل کیا جائے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں عرب کے لوگ بھی قتلِ اولاد کے مرتکب ہوتے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر دو وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ بچیوں کو محض اس لیے قتل کر دیتے تھے کہ وہ باعثِ عار

سمجھتے تھے کہ کوئی ان کا داماد بنے۔ اور دوسری وجہ یہی معاشی تنگی کہ بچے زیادہ ہوں گے تو ان کی روزی کہاں سے آئیگی اس نظریہ کے برخلاف اللہ نے حکم دیا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (بنی اسرائیل ۳۱) اپنی اولاد کو فقر کے ڈر سے قتل نہ کرو کیونکہ انکو روزی ہم دیتے ہیں اور تمھیں بھی روزی پہنچانا تو ہمارے ذمہ ہے تم کیوں فکر کرتے ہو؟ یہاں فرمایا کہ کتنے جاندار ہیں جو اپنی روزی اپنی پشتوں پر نہیں لادے پھرتے مگر انہیں اور تمھیں سب کو ہم ہی روزی پہنچاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جانداروں کے لیے روزی کی کمی نہیں بلکہ کاربرداز ان اقتدار اس کی تقسیم غلط طریقے سے کرتے ہیں۔ اگر خوراک کی تقسیم کا نظام درست ہو جائے تو کوئی آدمی بھوکا نہ رہے۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ صاحبِ ثروت لوگ دن میں چھ چھ مرتبہ کھاتے ہیں جب کہ دوسروں کو ایک وقت کا کھانا بھی بافراط میسر نہیں۔ اگر یہی لوگ صرف دو وقت کھائیں اور باقی چار وقت کا کھانا دوسرے لوگوں کے لیے چھوڑ دیں تو لوگوں میں فاقہ کشی کی نوبت نہ آئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عمومی حکمت کا تقاضا ہے کہ نسلِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے جیسے فرمایا هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (الملک ۲۴) خدا تعالیٰ کی ذات وہی ہے جو تمھیں زمین میں پھیلاتا ہے اور پھر تم سب اُس کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اس کے برخلاف جب اس زمانے کے بڑے بڑے منصوبہ ساز آبادی کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں تو اس سے مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کیا ترقی یافتہ ملکوں میں فاقہ کشی نہیں ہوتی اور کیا وہاں کوئی بیماری نہیں ہے؟ یہ مسائل محض غریب ممالک میں نہیں ہیں کہ ان میں خاندانی منصوبہ بندی کو رائج کیا جائے بلکہ یہ مسائل تو ترقی یافتہ ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں مگر وہاں ایسی کوئی پلاننگ نہیں کی جاتی۔

تقسیمِ رزق کی حکمت

الغرض تقسیمِ رزق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور وہ اسے خاص حکمت کے تحت تقسیم کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی کسی کو بھوکوں مارنا چاہے

تو پھر دنیا میں کون ہے جو ایک دانہ بھی پہنچا سکے۔ روزی کی کمی وبیشی تقسیم کی اللہ نے یہ حکمت بھی بیان فرمائی ہے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (الشوریٰ۔ ۲۷) اگر اللہ تعالیٰ سب کے لیے روزی کے دروازے یکساں کشادہ کر دیتا تو لوگ سرکشی پر اُتر آتے۔ وہ تو ہر ایک کی روزی اپنے اندازے کے مطابق نازل کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے اور اُن کو دیکھ رہا ہے۔ اُن کی مصلحت کے مطابق اُن کو روزی پہنچاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اس کی مصلحت کے مطابق جہاں روزی کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر وہاں کسی کی منصوبہ بندی کام نہیں کرتی بلکہ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ (الطلاق۔ ۳) وہ ضرورت مند کی ضرورت ایسی جگہ سے پوری کر دیتا ہے جو اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ کوئی پرندہ اپنے منہ میں دانہ اٹھائے اپنے گھونسلے کی طرف جا رہا تھا کہ خدا تعالیٰ نے اُس کے منہ سے دانہ گرا کر گندی نالی میں موجود ایک معذور کیڑے کے منہ میں ڈال دیا جو بیچارہ کھانے کے لیے کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ بسا اوقات اللہ تعالیٰ طاقتور سے چھین کر کمزوروں کو بھی دے دیتا ہے مگر یہ اس کی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

درس توحید

فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اگر آپ ان مشرکوں سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اور سورج اور چاند کو کس نے کام میں لگا رکھا ہے لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ تو یہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا خالق اور مدبر ہے۔ فرمایا اگر اس چیز کو تسلیم کرتے ہو فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ تو پھر یہ کدھر پھیرے جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اور اُس کے ساتھ

شریک کیوں بناتے ہو؟

فرمایا اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ

لَہٗ اللہ تعالیٰ ہی رزق کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے۔ اور رزق تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ یہ تو اس کی مرضی اور حکمت پر موقوف ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وہ اپنے علم کے مطابق ہی تمام فیصلے کرتا ہے۔ پھر فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان کی طرف سے پانی کون نازل کرتا ہے فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا پھر اس پانی کے ذریعے مردہ زمین کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ اس میں سبزہ، اناج، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں۔ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ اس کا جواب بھی یہی دیں گے کہ یہ سب کچھ بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو اس قدر قادر مطلق سمجھتے ہو تو پھر شرک کے کیوں مرتکب ہوتے ہو؟

فرمایا کفر اور شرک کرنے کی بجائے قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ یوں کہو کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی ہیں۔ وہی خالق ہے، وہی مسبب الاسباب ہے۔ جب پانی برسانے اور روزی پہنچانے والا وہی ہے تو معبود برحق بھی وہی ہے بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرکوں کی اکثریت اللہ کی عطا کردہ عقل کو بروئے کار نہیں لاتی جس کی وجہ سے سوچنے سمجھنے سے عاری اور شرک کی مرتکب ہوتی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمہ:- اور نہیں ہے یہ دنیا کی زندگی مگر دل کا بہلانا اور کھیل۔ اور بیشک آخرت کا گھر البتہ ہمیشہ زندہ رہنے کا مقام ہے اگر ان لوگوں کو کچھ ہوتی ﴿۶۴﴾ پس جب یہ سوار ہوتے ہیں کشتی پر تو پکارتے ہیں اللہ کو خالص اُس کی اطاعت کا عقیدہ رکھتے ہوئے۔ پس جب وہ اُن کو نجات دیتا ہے خشکی کی طرف تو اچانک وہ شرک کرتے ہیں ﴿۶۵﴾ تاکہ وہ کفر کریں اُس چیز کے ساتھ جو ہم نے اُن کو دی ہے اور تاکہ وہ فائدہ اٹھالیں۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے ﴿۶۶﴾

ربطِ آیات

ابتلا اور آزمائش کے ذکر اور اس کی مثالیں بیان کرنے کے بعد اللہ نے کافروں اور مشرکوں کا شکوہ بیان کیا کہ واضح دلائل کی موجودگی میں اُن کا توحید سے انکار اور کفر و شرک پر اصرار بڑی زیادتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کے متعلق فرمایا

کہ سب کا روزی رساں وہی ہے۔ پھر ارض وسماء کی تخلیق اور شمس و قمر کی تسخیر کے متعلق فرمایا
کہ یہ سب کچھ اُسی کے اختیار میں ہے۔ یہ چیزیں تو محض اسباب ہیں وگرنہ حقیقی روزی رساں
تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق کسی کی روزی کشادہ کر
دیتا ہے اور کسی کی تنگ کر دیتا ہے۔ پھر اللہ نے بارش کے نزول کی طرف توجہ دلائی
کہ آسمان کی طرف سے پانی برسا کر خشک زمین کو زندہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے فرمایا
اس بات کو سب کافر اور مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے باوجود اللہ کی وحدانیت
کو نہیں مانتے بلکہ اُسکے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟

دنیا ایک کھیل تماشا

اب اللہ تعالیٰ نے توحید کے انکار کے اسباب میں سے دنیا کی زندگی، اُس
کی زینت اور ریل پیل کا ذکر کرکے فرمایا کہ اسی میں مبتلا ہو کر اکثر لوگ ایمان اور توحید
کو اختیار کرنے کی بجائے کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرمایا وَمَا هٰذِهِ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ اور نہیں ہے یہ دُنیا کی زندگی مگر جی کا
بہلانا اور کھیل تماشا۔ انسان اس چند روزہ عارضی دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر دائمی زندگی
کو بھول جاتے ہیں۔ بعض مفسرین[۱] فرماتے ہیں لہو بچوں کے کھیل کو کہا جاتا ہے جب کہ
لعب نوجوانوں کے کھیل پر بولا جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کی زندگی
کھیل تماشے سے زیادہ نہیں ہے۔ کھیل محض ایک بناوٹی ڈرامہ ہوتا ہے جس میں حقیقت
کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ڈرامہ میں کام کرنے والے کردار محض وقتی طور پر اپنا اپنا کردار
پیش کرتے ہیں اور جب کھیل ختم ہوتا ہے تو پھر نہ وہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے
اور نہ مجرم حقیقت میں مجرم ہوتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس کھیل تماشے کی
سرپرستی خود حکومتیں کر رہی ہیں۔ ان کے لیے وزارتیں قائم کی جاتی ہیں۔ فنڈز مختص کیے
جاتے ہیں مگر حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح دنیا کا حال ہے۔ جونہی یہ زندگی ختم
ہوتی ہے تو کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان ہیں کہ اسی میں مشغول ہو کر آخرت کو بھول
جاتے ہیں۔

دنیا کی بے ثباتی

اس دنیا کی بے ثباتی کو حکماء، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز کے مطابق

۱؎ تفسیر مدارک للنسفی ص ۲۶۳ ج ۳ (فیاض)

بیان کیا ہے۔ چنانچہ مولانا جامی فرماتے ہیں۔

؎ دلا تا کے درین کاخ مجازی
کنی مانند طفلاں خاک بازی

اے دل! تو کب تک اس مجازی محل میں بچوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا۔ بچے مٹی کے یا ریت کے گھروندے بنا کر کھیلتے ہیں اور پھر جاتے وقت پاؤں کی ٹھوکر سے انہیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ دنیا کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔

حافظ شیرازی صاحب بھی فرماتے ہیں۔

؎ مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اس منزلِ جاناں میں عیش و آرام کیسے حاصل ہو سکتا ہے جب کہ گھنٹی بج رہی ہے اور ہر وقت خبردار کیا جا رہا ہے کہ کجاوے کس لو عنقریب کوچ کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ اس عارضی زندگی کے خاتمے کے لیے ہر آن حکم خداوندی کا انتظار رہتا ہے۔ تو ایسی دنیا کی بے ثباتی پر لوگ غور کیوں نہیں کرتے!

تامل في الوجود بعين فكر
ترى الدنيا جميلة كالخيال

اگر غور کی آنکھ سے دیکھو تو اس حسین دنیا کو خیال سے زیادہ نہیں پاؤ گے۔ مطلب یہ کہ ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے تو کتنی دیر قائم رہتا ہے؟ بس جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے۔ دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی ہر چیز جلد فنا ہو جانے والی ہے۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمٰن - ۲۷) اور خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔

اقبال نے بھی کہا ہے ؎

آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی ناپائیدار دیکھ

انسان ایک شعلہ یا چنگاری کی مانند ہے جو کہ ذرا سی دیر کے لیے بھڑکتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی حیثیت اس شعلے سے زیادہ نہیں ہے۔
شیخ سعدی نے یہی بات بڑے پیارے انداز میں بات کی ہے۔

جہاں بر آب نہاد ست و زندگی بر باد
اے من غلام آں کہ دل بروے نہ نہاد

جہان کو تو اللہ نے پانی پر رکھا ہے اور انسانی زندگی کی بنیاد ہوا پر قائم ہے۔ جب تک سانس آتا رہتا ہے چلتی رہتی ہے۔ اور جونہی سانس یعنی ہوا رک گئی، یہ زندگی بھی ختم ہو گئی یہ اتنی ناپائیدار ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

کس را بقائے دائم و عہد مقیم نیست
بقائے دائم و عہد مقیم تست

کسی ذات کے لیے بقائے دائم اور عہد قائم نہیں ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کہ وہی قائم و دائم ہے اور اسی کا عہد مقیم ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ہر روز مشاہدہ میں آتا ہے کہ کوئی آج جا رہا ہے تو کوئی کل۔ کوئی صبح گیا اور کوئی شام۔ زندگی اتنی ناپائیدار چیز ہے کہ ایک سیکنڈ کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے دنیا کو کھیل تماشا قرار دیا اور اس کی بے ثباتی کا تذکرہ فرمایا ہے۔

آخرت کا گھر

فرمایا دنیا کی بے ثباتی کے مقابلے میں وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ آخرت کا گھر ہی مستقل قرارگاہ حیات ہے۔ دنیا تو محض لہو و لعب ہے۔ اگر اس عارضی زندگی کی پونجی کو کسی اچھے کام میں لگائے گا تو آخرت کی ہمیشہ کی زندگی اچھی ہو جائے گی، ورنہ خسارے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گی۔ سورۃ اعلیٰ میں اللہ کا ارشاد ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت ہی بہتر اور

دیرپا ہے لہٰذا اسی کی طرف دھیان دینا چاہیئے اور اُسی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ اللہ نے اس دنیا کو آخرت کی کھیتی بنایا۔ جو کچھ یہاں بوؤ گے وہی آگے جا کر کاٹو گے لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر یہ بات تمھاری سمجھ میں آجائے تو پھر کامیاب ہو جاؤ گے ۔ کاش کہ یہ لوگ شرک اور معصیت کا راستہ چھوڑ کر ایمان اور توحید کا راستہ اختیار کرتے اور پھر دائمی زندگی میں بہتری حاصل کرتے ۔

ترقی یافتہ دور میں شرک کا نظریہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا شیوہ بیان فرمایا ہے ۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں ۔ یعنی جب وہ کسی بحری راستے سے عازم سفر ہوتے ہیں اور ان کی کشتی یا جہاز طوفان میں گھر جاتا ہے یا کسی ڈوب جانے کا خطرہ ہو جاتا ہے تو پھر دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ تو پھر خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اعتقاد رکھ کر مدد کے لیے صرف اُسی کو پکارتے ہیں ۔ یہاں پر دین سے مراد اطاعت ہے ۔ اس وقت اُن کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا اس مصیبت سے نجات دینے والا کوئی نہیں ہے ۔ جب سمندروں میں طوفان آتے ہیں تو ایک لاکھ ٹن وزنی جہاز بھی سمندروں کی لہروں پر تنکے کی طرح تیرتا پھرتا ہے ۔ پندرہ بیس سال پہلے "ڈار" نامی جہاز ڈوبا تھا جس میں بارہ سو آدمی سوار تھے مگر صرف اڑھائی سو کے قریب بچائے جا سکے ۔ بچ رہنے والوں نے جہاز کی غرقابی کا جو منظر دیکھا اُس قیامتِ صغریٰ کو وہی جانتے ہیں ۔ غرضیکہ ایسے مشکل وقت میں بعض لوگ صرف اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جیسا کہ عدیؓ بن حاتم طائی کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب کشتی طوفان میں پھنس گئی تو ملاحوں نے کہا کہ اب صرف اللہ ہی بچا سکتا ہے ۔ اس موقع پر کوئی دوسری ہستی کچھ نہیں کر سکتی ۔ اسی بات سے عدیؓ کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اگر خشکی پر پہنچ گیا تو فوراً جا کر اپنا ہاتھ پیغمبر اسلام کے ہاتھ میں دے دوں گا ۔

البتہ بعض شدید قسم کے مشرک ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھنور میں پھنس کر بھی اللہ کی بجائے پیروں فقیروں کو پکارتے ہیں اور اُن کے نام ہی کی دہائی دیتے ہیں ۔ چنانچہ آپ نے اس قسم کے نعرے سُنے ہوں گے " یا بہاء الحق بیڑا دھک " تاہم عام طور پر

بڑے سے بڑا مشرک بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور مشکل وقت میں اسی کو پکارتا ہے۔ فرمایا فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو طوفان سے بچا لیتا ہے اور خشکی کی طرف لے جاتا ہے اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ تو یہ لوگ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ پھر کہیں پیر کے حق میں، نذر و نیاز جتق ہے کبھی داتا صاحب کی قبر پہ حاضری دی جاتی ہے۔ کبھی خواجہ صاحب کے ہاں اور کبھی کسی دوسرے قبر والے کے ہاں گویا طوفان سے بچانے والے یہی ہیں جس اللہ نے انہیں موت کی آغوش سے بچایا اس کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔

انجام کار

اللہ نے فرمایا یہ اس وجہ سے ہوتا ہے لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ تاکہ وہ انکار کریں اس چیز کا جو ہم نے انہیں دی ہے مطلب یہ کہ اللہ نے ان کی جان بچائی، ان کو بحفاظت خشکی تک پہنچایا مگر وہ لوگ اللہ کے اس احسان کی ناقدری کرتے ہیں اور احسان فراموشی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے غیر اللہ کی نذر و نیاز دیتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے وَلِيَتَمَتَّعُوْا تاکہ وہ فائدہ اٹھائیں اس چیز سے جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لِيَكْفُرُوْا اور لِيَتَمَتَّعُوْا کا لام لام عاقبت ہے۔ یعنی ان کے کفر اور فائدہ اٹھانے کا سبب یہ ہوگا۔ کہ وہ سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ لام امر ہے اور معنی یہ بنتا ہے کہ چاہیے کہ یہ کفر کریں اور فائدہ اٹھائیں یعنی اگر یہ اسی طرف جانا چاہتے ہیں تو پھر چلے جائیں۔ اس قسم کا امر تہدید کے لیے ہوتا ہے جیسے فرمایا اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (حٰمٓ سجدہ۔ ۴۰) جو تمہارا جی چاہتا ہے کرلو۔ ہم حساب لے لیں گے، آخر ہمارے پاس ہی آنا ہے۔ یہ وعید ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ لام عاقبت ہے۔ یعنی یہ لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں اور شکریہ ادا نہیں کرتے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ ہماری عطا کردہ چیزوں کے ناشکر گزار بن جائیں گے۔ اور اس دنیا کے مال و متاع سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے جو کہ بالکل عارضی چیز ہے۔ سورۃ زمر میں ہے قُلْ

تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ (آیت ۸) یہ اپنے کفر کیساتھ تھوڑا فائدہ اٹھالیں، انہیں بالآخر جہنم میں ہی جانا ہے فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ یہ لوگ عنقریب جان لیں گے۔ پھر انہیں پتہ چل جائیگا کہ انہوں نے دنیا کی عارضی مہلت کو کس طرح ضائع کیا اور خدا تعالیٰ کی نعمت پر شکر ادا کرنے کی بجائے کفر، شرک اور شرکیہ رسومات ادا کرتے رہے۔ گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٦٩﴾ ع ۲

ترجمہ :- کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے کہ بیشک ہم نے بنایا ہے حرم کو امن کی جگہ۔ اور اُچک لیے جاتے ہیں لوگ اُن کے اردگرد سے۔ کیا یہ باطل پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ؟ (۶۷) اور اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ پر افتراء باندھتا ہے جھوٹ۔ یا جھٹلائے وہ سچی بات کو جب وہ اُس کے پاس آجائے۔ کیا نہیں ہے جہنم ٹھکانا کفر کرنے والوں کا ؟ (۶۸) اور وہ لوگ جنہوں نے مجاہدہ کیا ہمارے لیے، ہم ضرور راہنمائی کریں گے ان کی اپنے راستوں کی طرف۔ اور بیشک اللہ تعالے

البتہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے ۶۹

ربط آیات

سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر ایمان کے ساتھ ابتلاء کا ذکر کیا ہے اور اس پر مثالیں بیان کی ہیں۔ پھر کفر اور شرک کی تردید کی ہے اور توحید و رسالت کے اثبات کا ذکر کیا ہے اب آخر میں ایک تو اللہ کی نعمت یاد دلائی گئی ہے کہ اہل مکہ کو اللہ نے امن جیسی عظیم نعمت عطا کی اور اس کے ساتھ مشرکوں کو وعید بھی سنائی ہے۔ سورۃ کی آخری آیت میں مجاہدے کا مضمون بیان کیا ہے جیسا کہ سورۃ کی ابتداء میں وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ میں آیا گیا تھا۔ مجاہدہ بھی آزمائش ہی کی ایک صورت ہے۔

قریش مکہ پر احسان

نزول قرآن کے زمانے میں سرزمین عرب میں سال بھر میں زیادہ سخت بدامنی کے ہوتے تھے۔ اس دوران قافلوں پر حملے ہوتے لوٹ مار ہوتی، قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان آٹھ ماہ میں سارے راستے پر خطر ہوتے تھے۔ کوئی قافلہ بحفاظت سفر نہیں کر سکتا تھا جس کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا تھا۔ البتہ سال کے باقی چار مہینے حرمت والے مہینے کہلاتے تھے جن میں ہتھیار پھینک دیئے جاتے تھے۔ کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ تجارتی قافلے بے دھڑک اپنا سفر جاری رکھتے تھے، گویا اس دوران میں ہر قسم کا سفر پرامن ہوتا تھا۔

البتہ قریش مکہ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ بیت اللہ شریف کی تولیت کی وجہ سے ان کے لیے سارا سال پرامن ہوتا تھا۔ ان کے تجارتی اور دیگر قافلے بلا روک ٹوک جہاں چاہتے سفر کرتے اور ان کے راستے میں کوئی مزاحم نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ احسان ہے جو اللہ نے سورۃ القریش میں بھی بیان کیا ہے کہ ان کے تجارتی قافلے موسم گرما میں شام کی طرف جاتے تھے اور موسم سرما میں یمن کا رخ کرتے تھے مگر ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی تھی۔ لوگ ان کا ادب احترام کرتے تھے۔ اس مقام پر بھی اسی احسان کا تذکرہ فرمایا ہے أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا کیا قریش مکہ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم پاک کو امن کا خطہ بنا دیا ہے اور اسی وجہ

حرم کے متولی قریش بھی مامون ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے برخلاف انہیں مکمل امن و امان حاصل ہے اور یہ جہاں چاہیں بلا روک ٹوک جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حرم کو پُر امن خطہ کسی لات، منات یا عزیٰ نے تو نہیں بنایا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے تخلیقِ ارضی کے زمانے سے ہی اسے امن والا خطہ بنا دیا تھا۔ اسی علاقے میں جنگ جدال ممنوع قرار دی گئی اور ہر گناہ کے لیے دوہری سزا مقرر کی گئی جس کی وجہ سے قریش کو مکمل طور پر امن حاصل ہو گیا۔

حرم پاک کے علاوہ باقی عرب کی حالت یہ تھی وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کہ قریش کے ارد گرد کے علاقوں سے لوگ اچک لیے جاتے تھے۔ وہاں کسی کی جان، مال اور عزت محفوظ نہ تھی۔ ہمیشہ فتنہ و فساد کا بازار گرم رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کو یہی احسان یاد دلایا اور فرمایا کہ بیت اللہ شریف کے پروردگار کی عبادت کرو الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۙ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (قریش - ۴) جس نے انہیں بھوک میں روزی اور خوف میں امن عطا فرمایا۔ یہ محض اللہ کے گھر کی برکت تھی کہ لوگوں کے دلوں میں متولیانِ کعبہ کی عزت و احترام تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تعمیرِ کعبہ کے وقت اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی تھی۔ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (ابراہیم - ۳۷) اے مولا کریم! لوگوں کے دلوں کو بیت اللہ شریف کی طرف مائل کر دے اور یہاں کے بسنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ یہ تیرا شکر ادا کریں۔ الغرض! اللہ نے قریش مکہ کو امن و امان اور روزی رسانی کا احسان یاد دلا کر فرمایا کہ اس احسان کے بدلے میں ان کو چاہیے تھا کہ وہ شرک نہ کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرتے۔ اس کے برخلاف ان لوگوں نے اللہ کی اس نعمت کی قدر نہ کی اور اہلِ ایمان کو ایذا رسانی پر تُل گئے۔

قریش کے اس قبیح عقیدہ و کردار کی بنا پر اللہ نے فرمایا أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ کیا یہ لوگ باطل پر یقین رکھتے ہیں؟ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ اور اللہ تعالیٰ

کی عطا کردہ نعمت کی ناقدری کرتے ہیں؟ قریش مکہ کا تو خاص طور پر فرض تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے احسانات کا شکر ادا کرتے اور اس کی وحدانیت کو تسلیم کرتے مگر پیغمبر آخر الزمان
کو تکالیف پہنچانے میں یہی لوگ پیش پیش تھے۔ یہ ان کی بدبختی کی علامت ہے۔

سب سے بڑا ظالم

فرمایا وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا اس سے
بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ جو شخص خدا کا شریک ٹھہراتا
ہے، وہ اس پر افترا باندھتا ہے کیونکہ وہ تو وحدہٗ لاشریک ہے۔ خدا کا شریک
بنانے کا مطلب یہ ہے أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ
(الرعد۔ ۳۳) گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کو وہ زمین میں
نہیں جانتا۔ اس قسم کا خیال بذات خود لغو کی بات ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اس شخص
سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔ فرمایا ظالم کی ایک
علامت تو یہ ہے کہ وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اور دوسری یہ أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ
لَمَّا جَاءَهُ یا جب کوئی حق بات اس کے پاس آجاتی ہے تو وہ اس کو جھٹلا دیتا ہے
یہ بھی اس کے بڑا ظالم ہونے کی نشانی ہے۔ جب خدا کا پیغمبر اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتا
ہے وحی الٰہی کی بات کرتا ہے تو یہ شخص اس کی تکذیب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ سب سے
بڑا ظالم ہے۔ کوئی سلیم الفطرت انسان اللہ اور اس کے رسول کی بات کو جھٹلانے کی جرأت
نہیں کر سکتا۔ فرمایا جو شخص سچی بات کو جھٹلاتا ہے أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ
مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟ یقیناً ایسے
لوگ جہنم کا نشانہ بنیں گے۔

مجاہدے کی فضیلت

مجاہدہ بھی آزمائش کی ایک صورت ہے۔ اس لیے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ
نے مجاہدہ کرنے والوں کو تسلی دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے لیے مجاہدہ
کیا ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔ مجاہدہ جہاد سے
ماخوذ ہے جس کا معنی اپنی پوری ظاہری اور باطنی قوت کو دشمن کے مقابلے میں

صرف کرنا ہے۔ جہاد کی ایک صورت جہاد بالسیف ہے یعنی تلوار کے ساتھ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنا۔ جنگ عام حالات میں تو فرض کفایہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ اس میں بہ وقت شریک ہوتے ہیں اور ملکی سرحدوں کا دفاع کرتے ہیں جب کہ باقی لوگ اپنے گھروں میں رہ کر باقی امور زندگی (ذریعہ کاروبار، محنت مزدوری، کھیتی باڑی اور ملازمت وغیرہ) انجام دیتے ہیں۔ البتہ جب دشمن کے خلاف بالفعل جنگ شروع ہو جاتی ہے تو پھر یہ ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتی ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں ایسی جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔

مجاہدے کی ایک صورت حصول علم بھی ہے کہ یہ بھی محنت و مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ یعنی علم سیکھنے سے آتا ہے۔ عام لوگوں کا تو یہی دستور ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کو وحی کے ذریعے علم سکھایا جاتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے بعد اسے دوسروں تک پہنچانا یعنی تبلیغ دین کا کام انجام دینا بھی بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ یہ بھی عام حالات میں فرض کفایہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تبلیغ دین کا کام کرتے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ معمول کے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ البتہ اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ کسی بستی، علاقے یا خطے میں دین پہنچانے والا کوئی نہ ہو۔ تو جس شخص کو اس بات کا علم ہو جائے کہ فلاں جگہ پر دین حق کی تشنگی پائی جاتی ہے تو اس پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ دین کا پیغام وہاں تک پہنچائے ورنہ گنہگار ہو گا۔

قلم بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں مصنفین نے دین اسلام کی تائید و تشریح میں لاکھوں کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن پاک اور سنت رسول کی تشریح و توضیح کی ہے جو کہ بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ اگر کوئی شخص نیت صادقہ کے ساتھ دین اسلام کے دفاع میں ایک مضمون شائع کرتا ہے تو گویا جہاد میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف محض تفریح طبع کے لیے جھوٹے سچے مضامین لکھنا بے سود ہے۔ آج کل صحافی حقیقی خبر کی بجائے بازاری خبریں شائع کرتے ہیں۔ اس زمانے میں خبر بنائی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں

۱؎ بخاری ص۱۶ ج۱ (فیاض)

ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کی اجارہ داری ہے اور وہ اپنی مرضی کی خبریں بناتے ہیں اور پھر انہیں اپنے مفاد کے لیے دنیا بھر میں شائع کراتے ہیں۔ ایسی خبروں کا کچھ اعتبار نہیں اگر نیت صحیح ہو اور حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہو تو صحافت کا پیشہ بھی جہاد کا حصہ بن سکتا ہے۔ اور یہ قلم کا جہاد تصور ہوگا۔ سورۃ العلق میں ہے اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا۔

آجکل کی بناوٹی خبروں کی طرح انگریز کا جاری کردہ قانون شہادت بھی بناوٹی ہے۔ اللہ کا فرمان تو یہ ہے وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ یعنی اللہ کی رضا کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔ مگر موجودہ قانونِ شہادت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے گواہی بنانی پڑتی ہے۔ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے وکیل اور پولیس ان گواہ کو پڑھاتے ہیں کہ اس طرح گواہی دینا اور یوں نہ کہنا ورنہ کیس خراب ہو جائے گا۔

ابوداؤد اور مسند احمد میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُشْرِكِیْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ یعنی کافروں اور مشرکوں کے ساتھ اپنے مالوں، زبانوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ زبان کے ذریعے تقریر کرتا ہے۔ غیر اقوام کے شکوک و شبہات دور کرتا ہے۔ اسلام کی تشریح و توضیح کرتا ہے تو یہ جہاد باللسان ہے۔ اور کوئی شخص مال رکھتا ہے مگر جسمانی طور پر کمزور ہے یا تقریر و بیان پر ملکہ نہیں رکھتا تو وہ مال کے ذریعے جہاد میں شریک ہو سکتا ہے اور جو شخص نوجوان اور صحت مند ہے وہ براہ راست میدان جنگ میں تلوار کے ساتھ جہاد کرے گا۔ غرضیکہ جہاد ہر مسلمان پر کبھی فرض کفایہ ہوتا ہے اور کبھی فرض عین۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ لینے کا پابند ہے اللہ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے ہمارے لیے مجاہدہ کیا۔ ہم ضرور ان کی اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے یعنی اُن کے لیے راستے واضح کر دیں گے۔ یہاں پر سُبُلَنَا جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح مجاہدے مختلف قسم کے ہیں۔ اسی طرح ہمارے راستے بھی مختلف قسم کے ہیں جب مجاہدے میں خلوص نیت کار فرما ہوگا اس کیلئے راستہ بھی واضح ہو جائیگا جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک

پہنچ جائے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اعدائے دین چار ہیں جن میں سے دو ظاہری اور دو باطنی ہیں جن کے ساتھ مجاہدہ کرنا ضروری ہے۔ ظاہری دشمنوں میں کافر اور منافق ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (التوبہ ۷۳) یعنی کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کرو۔ کافروں کے ساتھ جہاد تو تلوار کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ منافقوں کے ساتھ زبان سے جہاد کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کے نفاق کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر کے ان کو ذلیل و رسوا کیا جا سکے۔ اور لوگ ان کے نفاق سے بچ سکیں۔

چار اعدائے دین

باطنی دشمنوں میں ایک شیطان ہے جو نظر نہیں آتا اور يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ (الناس ۵) لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے انہیں برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ لوگوں کے برے اعمال کو مزین کر کے دکھاتا ہے تاکہ لوگ اسی برائی میں پھنسے رہیں اور راہ راست کی طرف نہ آ سکیں۔ اس کے بعد دوسرا باطنی دشمن خود انسان کا نفس امارہ ہے جو انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ ان سب اعداء کے خلاف جہاد کرنا بھی جہاد ہی کا حصہ ہے۔ کوئی شخص جس بھی صورت میں مجاہدہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے راستے واضح کرتا چلا جائے گا اور اس کا صحیح نتیجہ سامنے آئے گا۔

نیکو کاروں کے لیے معیت الٰہی

فرمایا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ اللہ تعالیٰ البتہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو شخص نیکی کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور نصرت اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ البتہ قابل غور بات یہ ہے کہ انسان واقعی نیکی کی طرف راغب ہو۔ ایسا نہ ہو کہ غلط کام کر رہا ہو، مگر سمجھتا یہ ہو کہ وہ نیکی کا کام کر رہا ہے۔ تمام اہل بدعت کا یہی حال ہے کہ وہ رواج کو بدعات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ کی تائید و حمایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور

مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کرتا ہے، وہی نیکی انجام دینے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سورۃ

الرّوم

مکّی

سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ روم مکی ہے۔ اس کی ساٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾

ترجمہ: الٓمّٓ (۱) مغلوب ہو گئے رومی (۲) قریب کی سرزمین میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے (۳) چند سالوں میں۔ اللہ کے اختیار میں ہے معاملہ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس دن خوش ہوں گے ایمان والے (۴) اللہ کی مدد سے۔ وہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحم کرنے والا ہے (۵) یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ نہیں خلاف کرتا اپنے وعدے کو۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (۶) جانتے ہیں وہ ظاہری دنیا کی زندگی کو۔ اور وہ آخرت سے غافل ہیں (۷)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الروم ہے جو اس کی دوسری آیت میں آمدہ لفظ "روم" سے اخذ کیا گیا ہے۔ مفسرین کے مطابق یہ سورۃ مکی زندگی میں سورۃ انشقاق کے بعد نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ کی ساٹھ آیات ہیں اور یہ چھ رکوع پہ مشتمل ہے۔ اس میں ۸۱۹ الفاظ اور ۳۵۲۰ حروف ہیں یہ سورۃ طوالت کے لحاظ سے درمیانی سورتوں میں شمار ہوتی ہے

رومی سلطنت

روم ایک سلطنت کا نام تھا جسے نزول قرآن کے زمانہ میں رومۃ الکبریٰ بھی کہتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح کچھ عرصہ پہلے تک برطانیہ کو برطانیہ عظمیٰ (GREAT BRITAIN) کہا جاتا تھا۔ اس سلطنت کا اصل مرکز اٹلی میں تھا مگر بعد میں اس کا ایک حصہ الگ ہو کر جدید روم کہلایا جس کا دارالخلافہ قسطنطنیہ (استنبول) تھا اور اس کے تحت شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک کے دوسرے علاقے تھے۔ اس سلطنت کا بادشاہ ہرقل عیسائی مذہب رکھتا تھا جسے حضور علیہ السلام نے ۶ ہجری میں دعوت نامہ اسلام بھیجا تھا۔

بعد کے دور میں لفظ روم عیسائیوں کے لیے مخصوص ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے

والی وم ذوات القرون اذا ھلك قرن خلفه قرن آخر

رومی یعنی عیسائی لوگ قرناً بعد قرن دنیا میں موجود رہیں گے۔ جب ایک گروہ ختم ہو جائے گا تو دوسرا آجائے گا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا۔ چنانچہ یہ لوگ آج تک دنیا میں بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک چلے آ رہے ہیں مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد ساری زمین غیر مذاہب سے پاک ہو جائے گی۔ اور دنیا میں صرف اسلام ہی باقی رہ جائے گا۔

دو عظیم حکومتیں

نزول قرآن کے زمانہ میں دنیا پر دو بڑی زبردست سلطنتیں تسلیم کی جاتی تھیں۔ ایک ایرانیوں کی حکومت کسریٰ جس کے زیر نگیں تقریباً آدھی دنیا بشمول ہندوستان کی مختلف ریاستیں، چین، روس وغیرہ تھی۔ اگر کوئی علاقائی بادشاہ بھی تھا تو وہ بھی کسریٰ کا باجگزار تھا۔ دوسری آدھی دنیا قیصر روم کے ماتحت تھی۔ اس میں یورپ، افریقہ، مصر وغیرہ شامل تھے اس زمانے میں قیصر اور کسریٰ کی حیثیت دنیا میں اسی طرح تسلیم کی جاتی تھی جس طرح آج کے زمانے میں امریکہ اور روس دو بڑی سلطنتیں ہیں اور دنیا کے بیشتر ممالک، سیاسی، اقتصادی یا معاشرتی لحاظ سے کسی نہ کسی طرح ان دو کے دست نگر ہیں۔ بہرحال اُس زمانے میں رومی عیسائی تھے۔ جب کہ ایرانی مجوسی تھے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی معرکتہ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ[1] میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ ان دونوں بڑی سلطنتوں کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے عرب کے خطے میں اپنے نبی امی کو مبعوث فرمایا جو نہ رومیوں کے ساتھ ملے تھے اور نہ ایرانیوں کے ساتھ۔ اللہ نے آپ کی ذات کے ذریعے ان دو بڑی حکومتوں کو مٹا دیا جنہوں نے دنیا پر ظالمانہ ڈھائے تھے۔ یہ عظیم سلطنتیں حضور علیہ السلام کے صحابہؓ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں۔ چنانچہ جنگ یرموک میں عیسائیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور قادسیہ کی جنگ میں ایرانی مجوسیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ہوا۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۵ (فیاض)

سلطنت روم سے متعلق پیشین گوئی

حضور علیہ السلام کی نبوت کو چھ سال گزر چکے تھے جب یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورۃ ہجرت مدینہ سے چھ سال قبل نازل ہوئی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کفار کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ اُسی زمانے میں رومی اور ایرانی آپس میں برسرِپیکار تھے۔ مختلف مقامات پہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ رومی عیسائی آپس میں یعقوبی، نسطوری وغیرہ کئی فرقوں میں تقسیم ہو کر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے عیسائیوں کے اندرونی خلفشار سے مجوسیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور انہوں نے یکبارگی حملہ کر کے رومیوں کے بہت سے علاقوں پہ قبضہ کر لیا۔ ایرانیوں نے قسطنطنیہ پہ حملہ کر کے وہاں کے عیسائیوں کو بھی محبوس ہونے پہ مجبور کر دیا۔ ان حالات میں یہ سورۃ الروم نازل ہوئی جس میں واضح کیا گیا کہ رومی مغلوب ہو چکے ہیں مگر ساتھ یہ پیشین گوئی بھی کر دی کہ چند ہی سالوں میں یہ دوبارہ غالب آجائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ پیشین گوئی نو سال کے عرصہ میں پوری کر دی۔

پیشین گوئی پر شرط

اُس زمانے میں مکے کے مشرکوں کو ایرانی مجوسیوں کے ساتھ دلی ہمدردی تھی۔ کیونکہ دونوں فریق مشرک تھے۔ اُدھر مسلمانوں کو بالطبع روم کے عیسائیوں کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی کہ وہ بھی اہلِ کتاب تھے اور مسلمانوں کی تمام انبیاء پہ ایمان تھا۔ جب رومی مغلوب ہو گئے تو مسلمانوں کو ذہنی طور پہ تکلیف پہنچی کیونکہ وہ ایک حد تک ان کے ہمدرد تھے۔ دوسری طرف مکے کے مشرک خوشیاں مناتے تھے کہ اُن کی پارٹی غالب آئی تھی اور اسی ضمن میں وہ مسلمانوں کا منہ چڑاتے اور دل آزاری کرتے کہ دیکھو جس طرح رومی عیسائی مغلوب ہو گئے ہیں اسی طرح تم بھی مغلوب ہی رہو گے اور تمہارے غلبے کی حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔

اسی دوران میں جب اس سورۃ کے ذریعے پیشین گوئی کی گئی کہ رومی عنقریب دوبارہ غالب آجائیں گے تو مشرک ہنسی اڑاتے تھے کہ دیکھو مسلمان کیسی فضول اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ اس ضمن میں مسلمانوں اور مشرکوں کا بحث مباحثہ بھی ہوتا رہتا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک موقعہ پہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ابی ابن خلف مشرک

لہ روح المعانی ص ۱۸ ج ۲۱ و ابن کثیر ص ۴۲۲ ج ۳ و خازن ص ۲۰۰ ج ۵ (فیاض)

سے کے درمیان جب جنگ نے طول پکڑا تو دونوں نے درمیان ایک شرط طے پا گئی
کہ اگر رومی چار پانچ سال کے اندر اندر دوبارہ غالب آگئے تو ابی ابن خلف دس
اونٹ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیگا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر حضرت صدیقؓ دوسرے
فریق کو دس اونٹ دیں گے۔ جب اس شرط کا تذکرہ حضور علیہ السلام کے سامنے کیا گیا۔ تو
آپ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ بضع کا اطلاق تین سے نو تک کی گنتی پر ہوتا ہے
اور اللہ کے فرمان بضع سنین سے مراد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نو سال کے عرصہ میں
عیسائی اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کی طرف سے
چار پانچ سال کی مدت کا تعین درست نہیں۔ اسے نو سال تک بڑھانا چاہئے تھا تاکہ
اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے۔ حضرت صدیقؓ نے اس ضمن میں ابی ابن خلف سے دوبارہ
بات کی اور شرط میں اس حد تک ترمیم کر دی گئی کہ تکمیل پیشن گوئی کی مدت نو سال
ہو گی اور شرط کی مقدار دس اونٹ کی بجائے سو اونٹ ہو گی۔

پیشن گوئی کی تکمیل

اس شرط کے تقرر سے چند سال بعد ۶۲۲ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ادھر قیصر روم قسطنطنیہ کے ایرانی محاصرہ
سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہرقل پے در پے شکستوں سے سخت مایوس ہو کر
افریقہ کی طرف بھاگ جانا چاہتا تھا کہ دفعتاً اسے ایک تدبیر سوجھی ہرقل
جانتا تھا کہ ایرانیوں کی بحری طاقت کمزور ہے۔ اس نے اس
کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران کی پشت سے بحری بیڑے کے ذریعے
حملے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اس نے اچانک حملہ کر کے ایرانیوں کے قدم اکھاڑ دیے
پھر دوسرے سال آذربائیجان میں گھس کر ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدہ کی اینٹ
سے اینٹ بجا دی اور اس طرح رومی ایرانیوں پر دوبارہ غالب آگئے اسی زمانے میں
یعنی ۲ھ میں مسلمانوں کو میدان بدر میں کفار کے خلاف عظیم فتح حاصل ہوئی۔ اور
اس طرح قرآن پاک کی دونوں پیشن گوئیاں پوری ہوئیں۔ ادھر عیسائیوں کو فتح نصیب
ہوئی تو ادھر مسلمان کفار پر غالب آگئے۔ اس سورۃ مبارکہ کی ابتدائی آیات کا یہ
پس منظر ہے

خلاصہ سورۃ

گذشتہ سورۃ العنکبوت میں ایمان کے ساتھ ابتلا کا ذکر تھا۔ نیز اس میں بنیادی عقائد توحید، رسالت، قیامت اور مشرکین کے رد کا بیان تھا۔ اس سورۃ مبارکہ میں بھی بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ یہاں پر توحید کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ نبوت و رسالت پر اعتراضات کے جوابات ہیں۔ محاسبے اور جزائے عمل کا ذکر ہے۔ پچھلی سورۃ میں ابتلاء کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں مسلمانوں کے لیے بشارت ہے کہ ثابت قدمی کی صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب کرے گا۔ اس کے علاوہ اس سورۃ میں بہت سے حقوق کا ذکر بھی ہے۔

حروف مقطعات

اس سورۃ کی ابتدا حروفِ مقطعات الٓمّٓ ① سے کی گئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ ان حروف سے اللہ تعالیٰ کے بعض اسمائے پاک کی طرف اشارہ ہے جیسے اَ سے اللہ، لَ سے آلاء یعنی اس کی نعمتیں یا اس کا اسم لطیف یا لطف ہے جس کا معنی مہربانی اور شفقت ہوتا ہے۔ اور مَ سے مراد علیم ہے تو اس طرح ان حروف کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے حق میں نہایت ہی مہربان ہے جن کا انجام اچھا ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں[2] کہ اَ سے مراد الوہیت ہے جب کہ لَ سے مراد اللہ کی آلاء یعنی نعمتیں ہیں اور مَ سے مراد ملک یا بادشاہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ الوہیت بھی خدا تعالیٰ کی ہے اور انعامات اور بادشاہی بھی اسی کے فیضان سے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[3] کہ اَ سے اللہ، لَ سے جبرائیل علیہ السلام اور مَ سے محمد مراد ہیں۔ یہ قرآن حکیم کی حقانیت و صداقت کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ آخری کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[4] کہ خدا تعالیٰ نے مجھے کشفی طور پر بتایا ہے کہ الٓمّٓ سے عالم مجرد کا وہ غیب مراد ہے جو اس مادی جہان میں آکر متعین ہو ہے اور لوگوں کے برے اعمال و اخلاق کے ساتھ ٹکراتا رہتا ہے۔ اس کے ذریعے

---

[1] ابن کثیر ص ۴۲۶ ج ۳ [2] ابن کثیر ص ۴۲۶ ج ۱ [3] تفسیر کبیر ص ۶۰ ج ۲ [4] الفوز الکبیر ص ۹۳ (فیاض)

لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اور اس سے انبیاء علیہم السلام کے مقامات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ذٰ غیب مجرد کی طرف اشارہ ہے جب کہ لٰ تعیین پر دلالت کرتا ہے اور مٓ سے مراد مادہ (MATTER) ہے مقصد یہ ہے کہ عالم غیب سے جو قانون، تشریح یا تحقیق آکر متعین ہوتی ہے وہ لوگوں کے عادات، علوم اور سنگدلی کے ساتھ ٹکراتی رہتی ہے گویا اس کا تصادم برے اعمال واخلاق اور فاسد ارادوں سے ہوتا رہتا ہے۔ تو اس سورۃ مبارکہ میں انہی چیزوں کا ذکر ہوگا۔ گویا الٓمٓ سورۃ کی سرخی (HEADING) ہے اور اس کی تفصیلات سورۃ میں موجود ہیں۔

تاہم امام جلال الدین سیوطیؒ[1] اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بیان کردہ معانی ومطالب میں سے کوئی بھی یقینی معنی نہیں ہے۔ مفسرین کرام یہ معانی محض تقریب فہم کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے اذہان کو قرآن کریم کے قریب لایا جاسکے۔ البتہ زیادہ سلامتی والا راستہ یہ ہے کہ ان حروف کے بارے میں یہی نظریہ قائم کیا جائے کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ ان حروف سے جو بھی مراد ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو بہتر جانتا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے کہ جو بھی اللہ کی مراد ہے وہ برحق ہے ہمیں اس کی کرید نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے گمراہی میں پڑنے کا احتمال ہے۔

رومیوں کا زوال وعروج

ارشاد ہوتا ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ رومی عیسائی مغلوب ہوگئے فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ قریب کی سرزمین میں۔ اس سے سرزمین عرب مراد ہے کہ شام وفلسطین اور ایشیائے کوچک وغیرہ کے علاقے عرب سے قریب تھے۔ جہاں پر عیسائی مغلوب اور مجوسی غالب آگئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اللہ نے یہ پیشین گوئی بھی فرمادی وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ اور یہ رومی مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب آجائیں گے۔ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ اور ان کو دوبارہ غلبہ چند سالوں میں حاصل ہوجائے گا۔ بضع کا اطلاق تین سے نو

[1] جلالین ص ۳۴۷ (فیاض)

بکس کے اعداد پر ہوتا ہے مطلب یہ کہ نو سال کے اندر اندر رومی اپنا وقار دوبارہ حاصل کر لینگے۔

اُدھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو بھی بشارت سنائی لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں سارا معاملہ ہے پہلے بھی اور بعد بھی۔ مختارِ مطلق وہی ہے۔ ہر چیز پر تصرف اُسی کا ہے۔ ان دنیاوی بادشاہوں کو تو عروج و زوال ہوتا رہتا ہے مگر اللہ کی ذات ہی ہے جس کو کبھی زوال نہیں اور دُنیا کی تمام اُونچ نیچ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جب اُسکی مشیت ہوتی ہے تو کسی قوم کو عروج حاصل ہو جاتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے تو وہی قوم قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے۔

فرمایا رومی چند سالوں میں دوبارہ غالب آجائینگے وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ اور اُس دن اہلِ ایمان بھی خوش ہو جائیں گے۔ کس طرح؟ بِنَصْرِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی مدد سے۔ اللہ کی یہ مدد مسلمانوں کو میدانِ بدر میں مشرکینِ مکہ کے خلاف حاصل ہوئی۔ اُدھر رومی ایرانیوں پر غالب آئے اور اِدھر مسلمانوں نے کافروں کو شکست فاش دے دی اور اس طرح یہ دونوں پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں یعنی رومی بھی غالب آگئے اور اہلِ ایمان بھی خوش ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ جب رومیوں کو ایرانیوں کے خلاف فتح حاصل ہوئی تو اُس وقت شاہ ہرقل حمص میں تھا اس نے نذر مان رکھی تھی کہ شام و فلسطین پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی صورت میں وہ پیدل چل کر بیت المقدس کی زیارت کریگا۔ چنانچہ اس نے اپنی یہ منت پوری کی۔

فرمایا يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ وہ کمال قدرت کا مالک اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے پورا کرتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں۔ دیکھ لیں اللہ تعالیٰ نے اس پیشین گوئی کو کس طرح حرف بحرف پورا کیا۔ اس سے قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام

کی صداقت بھی واضح ہوتی ہے

فکرِ معاش اور فکرِ معاد

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی حالت یہ ہے یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کہ وہ دنیا کے ظاہری نشیب و فراز کو تو خوب جانتے ہیں۔ لوگ معاشیات، سیاسیات، سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت وغیرہ سے تو خوب واقف ہیں اور ان معاملات سے متعلق بڑے بڑے دعوے بھی کرتے ہیں۔ پرانی اقوام عاد اور ثمود وغیرہ کے متعلق بھی اللہ نے فرمایا وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (العنکبوت - ۳۸) بڑے سوجھ بوجھ والے لوگ تھے، دنیا کے اعتبار سے بڑے کامیاب لوگ تھے اور آج بھی ہیں۔ مگر فرمایا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ یہ لوگ آخرت کی زندگی سے بالکل غافل ہیں۔ انہیں مرنے کے بعد عالم برزخ، عالم حشر اور عالم آخرت کا کچھ علم نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ عقل معاش میں تو طاق ہیں مگر عقل معاد سے بالکل خالی ہیں۔ آج بڑے بڑے فلاسفر، پیرسٹر اور سائنسدان دنیا میں موجود ہیں جو ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں مگر آخرت کے انجام سے بے خبر ہیں۔ وہ اس دائمی زندگی کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتے جس کی وجہ سے سراسر نقصان میں جا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف اہل ایمان دنیاوی لحاظ سے اگر کمزور بھی ہوں مگر ان کا آخرت کے متعلق عقیدہ صحیح ہے اور یہی ان کی دائمی فلاح کا ذریعہ ہے یہ اللہ کے نزدیک یقیناً کامیاب ہوں گے جبکہ کافر، مشرک، ملحد، بے دین جہنم کے کندۂ ناتراش بن کر رہیں گے کیونکہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں ہے

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ⑧ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ⑨ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑩

ترجمہ: کیا اِن لوگوں نے غور نہیں کیا اپنے نفسوں میں۔ نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور ایک مقررہ مدت کے لیے۔ اور بیشک لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات سے انکار کرنے والے ہیں ⑧ کیا یہ لوگ نہیں چلے پھرے زمین میں کہ دیکھتے کیسے ہوا انجام اُن لوگوں کا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ طاقت والے تھے۔ انہوں نے زمین کو جوتا اور آباد کیا زیادہ اُس سے جو انہوں نے آباد کیا ہے۔ اور آئے اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی نشانیاں لے کر۔ پس نہیں اللہ تعالیٰ کہ اُن پر ظلم کرے بلکہ وہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ⑨ پھر جن لوگوں نے برائیاں کیں ان کا انجام بُرا ہوا۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اور وہ اُن کے ساتھ ٹھٹا کرتے تھے ⑩

ربطِ آیات سورۃ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ مغلوب رومی عیسائی چند سالوں میں دوبارہ غالب آجائیں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی نو سال کے اندر اندر پوری ہوگئی۔ ادھر عیسائیوں نے اپنے مقدس مقامات مجوسیوں سے واگذار کرلیے اور اُدھر اللہ نے بدر کے میدان میں مسلمانوں کو کافروں پر فتح عطا فرمائی۔ اس پیشین گوئی پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ابی ابن خلف کے درمیان ایک ایک سو اونٹ کی شرط بھی لگ چکی تھی۔ عیسائیوں کے دوبارہ غلبے پر حضرت صدیقؓ شرط تو جیت گئے مگر ابی ابن خلف میدانِ بدر میں مارا گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت صدیقؓ نے سو اونٹ ابی ابن خلف کے رشتہ داروں سے وصول کیے تھے۔

قمار بازی کا مسئلہ

جب اس بات کا تذکرہ حضور علیہ السلام کے سامنے ہوا کہ حضرت صدیقؓ نے شرط کے سو اونٹ وصول کر لیے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ اونٹ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں کیونکہ یہ قمار بازی سے حاصل ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کو صدقہ کر دو۔ واضح ہے کہ قمار بازی کی ممانعت کا حکم ۲ھ میں سورۃ البقرہ میں جنگ بدر کے بعد نازل ہوا تھا۔ اس سے فقہائے کرام یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس شرط یا جوئے کا مال موجود ہو تو اُس کے لیے اب یہی حکم ہے کہ وہ مال اُس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کرے اور اگر مالک فوت ہو چکا ہے تو اُس کے وارثوں کو پہنچایا جائے۔ اور اگر ایسی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو پھر یہ مال صدقہ کر دیا جائے۔ اس صدقہ سے ثواب حاصل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ ایسے ناجائز مال کے بوجھ سے بچنا مطلوب ہو۔ اگر ثواب کی نیت سے صدقہ کرے گا۔ تو خطرہ ہے کہ اُس پر کفر لازم آجائے۔ اس صدقہ کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی شخص کے جسم یا کپڑے پر نجاست لگ جائے تو وہ فوراً دھو لیتا ہے اور اس دھونے میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ نجاست سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح ناجائز مال کے صدقہ سے اُس سے گلو خلاصی مراد ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے اس سے ایک دوسرا مسئلہ بھی نکالا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں کسی حربی کافر کے ساتھ اس قسم کے ناجائز معاملات بھی کیے جا سکتے ہیں۔ جس طرح جنگ کے دوران حربی کافر سے مالِ غنیمت حاصل کرنا جائز ہے اُسی طرح اُس سے سود بھی لیا جا سکتا ہے یا اس کے کسی دیگر مال پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے برخلاف اس کے ذمی کافر کا مال، جان اور عزت و آبرو اُسی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ جس طرح کسی مسلمان کی۔ اسی طرح کسی معاہد کافر جس کے ساتھ بعض شرائط پہ صلح کا معاہدہ ہو چکا ہو، کا مال بھی غصب نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دوسرے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جب حضرت صدیقؓ نے ابی ابن خلف کے ساتھ شرط لگائی تھی، اُس وقت قمار بازی کی حرمت نہیں آئی تھی، لہٰذا وہ کسی حد تک جائز تھی۔ مگر اب جب کہ اس کی صراحت کے ساتھ ممانعت آچکی ہے۔ اب کسی حربی کافر کے ساتھ بھی ایسا معاملہ کرنا درست نہیں۔ یہ قمار بازی

ہے جو کہ قطعی عذاب ہے۔

وقوع قیامت

گذشتہ درس میں اشارہ مشرکین کی اس بات کا ذکر بھی ہوا تھا کہ یہ لوگ دنیا کے ظاہری حالات سے تو خوب واقف ہیں مگر آخرت کے معاملہ میں بالکل غافل ہیں جس کی وجہ سے وہ قیامت کا انکار ہی کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ طعن کے طور پر پوچھتے تھے۔ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الملک۔ ۲۵) اگر تم وقوع قیامت کے وعدے میں سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا یعنی قیامت کب برپا ہوگی۔ وہ کہتے تھے کہ البعث بعد الموت کا فلسفہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (الواقعہ۔ ۴۷) جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے؟ یہ بھی کہتے ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (النازعات۔ ۱۱) جب ہماری ہڈیاں کھوکھلی ہو جائیں گی یعنی ان میں مادہ حیات باقی نہیں رہے گا۔ تو کیا پھر بھی ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ ایسے ہی لوگوں کا اللہ نے رد فرمایا ہے کہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں ورنہ وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال کا اس طرح انکار نہ کرتے۔ ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کیا انہوں نے اپنے نفسوں میں غور و فکر نہیں کیا؟ انسان کی جان اس کے قریب ترین چیز ہے اگر یہ اسی میں غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کے ساتھ اس کے جسم میں جان ڈالی ہے جس کا سلسلہ سانس یعنی ہوا کے ساتھ قائم کیا ہے۔ جب یہ سانس چلتا رہتا ہے۔ انسان زندہ سلامت رہتا ہے اور جونہی سانس کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو انسان کا جسم بھی بیکار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی یہی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ جس طرح ہر نفس کے لیے اللہ نے حیات اور موت کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ اسی طرح جمیع عالم کے لیے بھی ایسا ہی نظام قائم کیا ہے۔ جب تک اس کی مشیت ہے یہ نظام رہے گا۔ پھر جب اس کا وقت پورا ہو جائے گا تو یہ سارا نظام درہم برہم کر کے اس کی جگہ [illegible] ... سنت اور یہ فنا ہو کر رہے گی۔

سورۃ الذاریات میں بھی اللہ نے انسان کی توجہ اُس کے نفس کی طرف دلائی ہے۔ فرمایا
وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (آیت ۲۱) تمھارے نفسوں
میں قدرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں کیا تم ان کو نہیں دیکھتے یعنی ان میں غور نہیں
نہیں کرتے؟ اگر ذرا بھی غور کرتے تو تمھیں قیامت بعید نظر نہ آتی عقلی اور نقلی دلائل
سے ثابت ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور وہ آکر رہے گی۔

جزائے عمل

پھر فرمایا مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا
بِالْحَقِّ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور اُن کے درمیان والی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر
حق کے ساتھ۔ یہاں پر حق سے مراد حکمت ہے یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمالِ حکمت
کی شاہکار ہے۔ اللہ نے کسی چیز کو بے کار محض پیدا نہیں فرمایا بلکہ قیامت تو اس کا
نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ انسان کو اللہ نے مکلف پیدا کیا ہے اور قیامت کے
دن اُس کا محاسبہ ہو گا اور ہر ایک کے عمل کا فیصلہ ہو گا۔ سورۃ القیٰمۃ میں فرمایا
اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (آیت ۳۶) کیا انسان گمان کرتا
ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ نہیں بلکہ اللہ نے اُسے قانون کا پابند بنایا ہے اُس
کی زندگی کا ایک خاص مقصد ہے جس کی تعمیل اُسے کرنا ہے۔ لہٰذا اگر انسان اپنے آپ
میں ہی غور کرے تو اُسے قیامت اور جزائے عمل کا مسئلہ سمجھ میں آسکتا ہے۔

فرمایا ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو اپنی خاص حکمت اور مصلحت کے
تحت پیدا کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے وَاَجَلٍ مُّسَمًّی یہ سارا نظام ایک
مقررہ وقت تک کے لیے ہے۔ سورۃ الطلاق میں فرمایا قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ
لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (آیت ۳) اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر
کر رکھا ہے۔ جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسی طرح
اقوام و ملل کی اجتماعی زندگی کا وقت بھی مقرر ہے۔ پھر پوری کائنات کے لیے وقت
مقرر ہے جب وہ پورا ہو جائے گا تو سارا نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا اور پھر اگلے جہان
کے لیے ایک نیا نظام قائم کیا جائے گا۔ دیکھئے کچھ عرصہ پیشتر تک انگریزوں کو

دنیا میں کس قدر عروج حاصل تھا انکی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب اس کا وقت پورا ہو گیا تو آج وہی برطانیہ عظمیٰ ایک جزیرے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اُن کے ہم زبان دیگر چھوٹے چھوٹے جزیرے آئرلینڈ وغیرہ بھی باغی ہو چکے ہیں۔ اب امریکہ کو دنیا بھر میں بالادستی حاصل ہے۔ روس اس کے ہم پلہ طاقت تھی مگر اُس کا سورج بھی غروب ہو رہا ہے۔ یہاں پر ستر برس قبل کیمونسٹ نظام آیا مگر آج وہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ اب دیکھئے امریکی عروج کب تک باقی ہے اور نئی کونسی اقوام ابھرنے والی ہیں۔ غرضیکہ ہر فرد، جماعت، ملک و قوم کے عروج و زوال کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق چل رہا ہے۔ تو فرمایا ہر چیز کے لیے ایک مدت مقرر ہے وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكَٰفِرُونَ مگر بہت سے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی محاسبہ نہیں ہے اور نہ کوئی جزا اور سزا کا تصور ہے، وہ لوگ اسی دنیا کی زندگی کو اول و آخر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ اللہ نے انسان کو عقل و شعور دے کر پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنی پیدائش پر ہی غور کرے تو بعث بعد الموت کا مسئلہ اس کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر انسان اپنے آغاز یعنی پیدائش سے واقف ہے تو پھر وہ انجام کا کیوں انکار کرتا ہے۔ جس ذات نے اُسے پیدا کیا ہے، وہی اُسے انجام تک بھی پہنچائے گا، لہذا انسان کو جزائے عمل سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر انسان کو جان لینا چاہیئے۔ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (یٰسین ۳۲) تمام کے تمام لوگ اللہ کی بارگاہ میں حاضر کیے جائیں گے۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (آل عمران - ۳۰) اُس دن ہر شخص اپنے اعمال کو موجود پائیگا۔ پوری زندگی کا اعمالنامہ سامنے رکھ دیا جائے گا جس کا جواب دینا پڑے گا اور پھر جزائے عمل کے متعلق فیصلے ہوں گے۔

فرمایا أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں

پہلی قوموں کا انجام

چلے پھرے فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
تاکہ دیکھتے کہ اُن سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ
قُوَّةً وہ تو طاقت میں ان سے بھی زیادہ تھے۔ یہ نزولِ قرآن کے زمانے کے کافروں کو
تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم کس غرور کا شکار ہو، تم سے پہلے لوگ تو تم سے بھی زیادہ طاقتور
تھے۔ وَأَثَارُوا الْأَرْضَ انہوں نے زمین میں ہل چلا کر کھیتی باڑی کی اور اس سے
فائدہ اٹھایا۔ عراق اور مصر وغیرہ میں وسیع پیمانے پہ کاشتکاری ہوتی تھی اور لوگ خوشحال
تھے۔ زمین کے اندر بھی معدنیات تھیں جنہیں نکالا جاتا تھا۔ فرمایا اُن لوگوں نے زمین
میں کاشتکاری کی وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا اور اسے آباد
کیا زیادہ اس سے جو انہوں نے آباد کیا۔ وہ بھی متمدن لوگ تھے۔ بڑے
خوشحال تھے۔ تمہیں تو اُن کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں۔ دنیا میں فرعونی، کلدانی، قدیم
مصری، گندھارا، ہڑپہ، موہنجوداڑو جیسی عظیم تہذیبیں گزری ہیں۔ عاد اور ثمود جیسی بڑی
بڑی قومیں صفحہ ہستی پہ اُبھری ہیں مگر آج اُن کے صرف کھنڈرات ہی نظر آتے ہیں۔ ان
کی کھدائی کے دوران برآمد ہونے والی اشیاء سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کیسی کیسی صنعت
کاری کرتے تھے۔ اُن کی بڑی بڑی نقش و نگار والی عمارات کے نمونے دیکھ کر انسان دنگ
رہ جاتا ہے۔ قومِ عاد کی عمارتوں کے نمونے تو پانچ ہزار برس تک قائم رہے۔ اہرامِ مصر
آج بھی موجود ہیں جن میں بڑے بڑے وزنی پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتی کہ
اُس زمانے میں اتنے وزنی پتھروں کو کس طرح اس قدر بلندی تک پہنچایا۔ حالانکہ ان کے
پاس جدید دور کی مشینری بھی نہیں تھی۔ اس زمانے میں لاشوں کو محفوظ کرنے کا رواج بھی
تھا۔ آج تو کچھ عرصہ کے لیے لاش کو شیشے کے بکس میں بند کر کے ہوا بند (AIR
TIGHT) کر دیا جاتا ہے مگر اس زمانے میں لاش کو کھلے رکھ کر اس پہ ایسا
مسالہ لگایا جاتا تھا کہ ہزاروں سال محفوظ رہتی تھی۔

فرمایا کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے کہ اپنے سے پہلے لوگوں کا انجام دیکھتے
جو ان کی نسبت بڑے شہ زور تھے۔ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا

فٰرِهِيْنَ (الشعراء - ۱۴۹) اور پہاڑوں کو تراش تراش کر رہنے کے لیے گھر بنانے تھے۔ جو کہ پر تکلف اور پر آسائش ہوتے تھے اُن کے بنائے ہوئے مینار اور بڑے بڑے گنبد آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ برصغیر میں قریب زمانے کی بنی ہوئی بہت سی عمارات ہیں جیسے تاج محل آگرہ۔ لال قلعہ دہلی۔ شاہی مسجد اور قلعہ لاہور مقبرہ جہانگیر اور نور جہاں۔ یہ عمارات آج بھی یادگار کے طور پر موجود ہیں۔ فرمایا: سب تم سے زیادہ طاقتور اور زیادہ کار بجیر قومیں نہ رہیں تو تم کو بھی بقا حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اپنی پیدائش میں غور کر کے اپنے انجام کی فکر کرلو۔

زمین کی آباد کاری

اس آیت میں زمین کی آباد کاری کا اصول بھی موجود ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ زمین کو بے آباد نہ رہنے دے بلکہ اس کی آباد کاری کے لیے انتظام کرے۔ اگر کوئی مالک اپنی زمین کو آباد نہیں کرتا تو اس سے زمین لے کر کسی کاشتکار کو دی جائے تاکہ اُسے آباد کر کے اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ بعض آئمہ فرماتے ہیں کہ زمین کی آباد کاری حکومت کی اجازت سے کرنی چاہیئے تاکہ بعد کے آباد کرنے کا حق فائق رہے، تاہم حکومت کی اجازت کے بغیر بھی زمین کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جس شخص نے بنجر زمین کو آباد کیا اسے اس کا حق حاصل ہو جائے گا۔

جزائے عمل

فرمایا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ پس اُن کے رسول ان کے پاس واضح نشانیاں اور معجزات لے کر آئے مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی اور وہ عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اللہ نے فرمایا کہ ان کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی زیادتی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ تو اُن پر ظلم نہیں کرنا چاہتا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے جس کی پاداش میں وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے۔ سورۃ قٓ میں اللہ کا فرمان ہے وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آیت - ۲۹) میں تو اپنے بندوں پر زیادتی نہیں

کرتا ہوں تو بے شک میں عادل ہوں۔ البتہ لوگوں کو جزائے عمل سے دوچار کرتا ہوں چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم! یہ جو کچھ تو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ یہ تمہارے اپنے ہی کئے ہوئے اعمال ہیں جن کو ہم نے شمار کر رکھا ہے۔ اگر ان میں کوئی اچھی چیز پاؤ تو میرا شکریہ ادا کرو اور اگر کوئی بُری چیز پاؤ تو اس کے لیے اپنے ہی نفوس کو ملامت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ خود انسان ہیں جو بُرائی کا ارتکاب کر کے اپنے لیے ہلاکت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

فرمایا ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗآى پھر بُرائی کا ارتکاب کرنے والوں کا انجام بُرا ہی ہوا۔ جن لوگوں نے دنیا میں کفر، شرک کیا، لوگوں کی حق تلفی کی اور ان پر مظالم ڈھائے، ظاہر ہے کہ آخرت میں ان کا انجام بُرا ہی ہوگا۔ انہوں نے دنیا میں بھی عبرتناک سزا پائی اور آگے تو ہمیشہ کی سزا ان کی منتظر ہے بہر حال اُن کا یہ بُرا انجام اس لیے ہوا اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ کہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ آیات میں تمام دلائل، احکامات، معجزات اور تعلیمات آجاتی ہیں۔ اللہ کے نبی اُن کو اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے، انہیں معجزات دکھاتے تھے مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر نہ صرف انکار کرتے تھے بلکہ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ اُن کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق کرتے تھے۔ اللہ کی طرف سے جو بھی حکم آتا اس کا اور اہل ایمان کا تمسخر اڑاتے۔ فرمایا کیا ان مشرکین نے دنیا میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان جیسے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟

له مسلم ص ... (فیاض)

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ
شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ
تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ
الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾
فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ
تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾
يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ

الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط
وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ ⑲ ع

ع ٦ ۲
٥

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ ہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے مخلوق کو پھر وہ اس کو لوٹائیگا پھر اُسی کی طرف تم سب پھیرے جاؤ گے (۱۱) اور جس دن برپا ہو گی قیامت مایوس ہو جائیں گے مجرم لوگ (۱۲) اور نہیں ہوں گے اُن کے لیے اُن کے شریکوں میں سے کوئی سفارشی ۔ اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کرنے والے ہوں گے (۱۳) اور جس دن برپا ہو گی قیامت ۔ اُس دن یہ جدا جدا ہو نگے (۱۴) پس بہرحال وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیے ۔ وہ باغوں کے اندر خوش کیے جائیں گے (۱۵) اور بہرحال وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ۔ اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۔ اور آخرت کی ملاقات کو ۔ پس یہ لوگ عذاب میں دھکیل کر حاضر کیے جائیں گے (۱۶) پس پاکی ہے اللہ تعالیٰ کے لیے جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو (۱۷) اور اُسی کے لیے تعریف ہے آسمانوں اور زمین میں ۔ اور پچھلے پہر اور جس وقت تم دوپہر گزارتے ہو (۱۸) وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے ۔ اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اُس کے مرجانے کے بعد ۔ اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے (۱۹)

ربط آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے رومیوں کے غلبہ کی پیشین گوئی

فرمائی اور پھر کفر اور شرک کی قباحت بیان کی منکرین قیامت اور اُن کے انجام کا خاص طور پر ذکر کیا پھر برائی کرنے والوں کے بُرے انجام کا بھی ذکر کیا کہ وہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اُن سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے وقوعِ قیامت کا ذکر فرمایا ہے اور شکوہ کیا ہے کہ لوگ اس میں غور نہیں کرتے ورنہ یہ کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے بلکہ اس کے نمونے روزمرہ مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔

وقوعِ قیامت کی عقلی دلیل

ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ابتداء میں اللہ تعالیٰ ہی ساری مخلوق کو پیدا کرتا ہے ثُمَّ يُعِيدُهٗ پھر وہی اس کا اعادہ بھی کریگا یعنی ایک دفعہ فنا کرنے کے بعد دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ بظاہر یہ مشکل نظر آتا ہے کہ جب انسان مر کر مٹی میں مل جائے گا، اُس کا گوشت پوست اور ہڈی پسلی باقی نہیں رہے گی، تو پھر وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو جائے گا۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے گزشتہ درس میں بھی عرض کیا تھا کہ کافر لوگ یہی اعتراض کرتے تھے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو تو آج تک دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا نہیں۔ بھلا جب ہم مٹی میں رل مل جائیں گے اور ہماری ہڈیاں بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو پھر کیسے جی اٹھیں گے۔ اللہ نے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ جس خالق نے تمہیں پہلی دفعہ بغیر نمونے کے پیدا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں؟ بیشک وہ قادرِ مطلق ہے اور وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (یٰسٓ - ۸۱) ہے۔ وہ سب کو ضرور دوبارہ زندہ کریگا، پھر حساب کتاب اور جزائے عمل کی منزل آئیگی اور ہر شخص کو اُس کی کارگزاری کا اچھا یا بُرا بدلہ مل کر رہے گا۔ فرمایا وہ خدا تعالیٰ ہے جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا، وہی ان دوبارہ بھی کرے گا ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے جب قیامت برپا ہوگی تو تم سب کو زندہ کرکے اپنی بارگاہ میں جمع کرے گا۔

مجرموں کی مایوسی

پھر قیامت کا کچھ حال ذکر کیا ہے وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ جس دن قیامت برپا ہوگی يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ اس دن مجرم لوگ مایوس ہو جائیں گے وہ اپنے بہتر انجام سے مایوس ہو جائیں گے اور جان لیں گے کہ اب عذاب الٰہی

سے بچنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ انھیں معاً خیال آئے گا کہ ہم نے دُنیا میں بت سے شریک بنا رکھے تھے اور اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ آج کے دن ہماری سفارش کر کے چھڑا لیں گے۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ اُن کی یہ حسرت دل ہی میں رہ جائے گی کیونکہ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ آج اُن کے شریکوں میں سے کوئی سفارشی نظر نہیں آئے گا جو آگے بڑھ کر اللہ کے ہاں اُن کی سفارش کر سکے۔ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کرنے والے ہونگے پھر قیامت کے دن ایک ایسا موقع بھی آئے گا کہ مشرک لوگ خود اپنے شرک کا انکار کر دیں گے اور کہیں گے وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (الانعام - ۲۳) بخدا ہم تو شرک نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ سمجھیں گے کہ اس طرح شرک کا انکار کر کے مؤاخذے سے بچ جائیں گے مگر اُس دن کوئی چیز چھپی نہیں رہے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (الطارق - ۹) اُس دن تمام راز کھول دیے جائیں گے۔ انسان کے خلاف شجر و حجر، زمین کے خطے، فرشتے حتیٰ کہ اُس کے اپنے اعضاء و جوارح بھی بطور گواہ کھڑے ہو جائیں گے اُس کی ساری کارگزاری ظاہر ہو کر ثابت ہو جائیگی اور پھر اُسے اپنے کیے کی سزا پانا ہوگی۔

نیک اور بد گروہ

ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ جس دن قیامت برپا ہوگی يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ اُس دن سب لوگ جدا جدا ہو جائیں گے مطلب یہ کہ مومن اور کافر، مشرک اور موحد، منافق اور مخلص، نیک اور بد سب الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، اور ہر شخص اپنے اپنے گروہ کی طرف جائے گا۔ اور پھر ہر گروہ میں سے نیکی اور بدی کے معیار کے حساب سے مزید گروہ بندی ہوگی۔ نیک لوگ اپنی نیکی کے اخلاص کی بنا پر علیحدہ علیحدہ گروہوں میں بٹ جائیں گے اور مجرم لوگ اپنے جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مزید گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے مثال کے طور پر سود خور کے مجرموں کی علیحدہ قطار ہوگی اور نوسر باز لوگوں کی علیحدہ، علی ہذا القیاس۔ آج تو سب نیک و بد دنیا کی معاشرت میں گھلے ملے ہیں۔ ایک

دوسرے کی شادی غمی اور رسم و رواج میں شریک ہوتے ہیں مگر قیامت والے دن یہی لوگ اپنی نیکی اور بدی کی نسبت کے مطابق جدا جدا گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

مومنوں کے لیے انعام

پھر کیا ہوگا؟ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اور وہ لوگ جو ایمان لائے جنہوں نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیا کہ یہی چیز مدارِ فلاح ہے۔ اس کے علاوہ نبی کی رسالت پر یقین کیا، اللہ کے فرشتوں، کتابوں، اور بعث بعد الموت پر ایمان لائے۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال انجام دیے۔ نیک اعمال میں ارکانِ اربعہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سرفہرست ہیں۔ جس نے ان فرائض کو ادا کیا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کی۔ فرمایا فَهُمۡ فِیۡ رَوۡضَةٍ یُّحۡبَرُوۡنَ ۝ ایسے لوگوں کو باغ میں خوش کیا جائے گا۔ روضہ کا معنی باغ ریاض یا جنت ہے۔ نیکوکاروں کو ایسے باغات میں جگہ ملے گی جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور وہ محض باغ نہیں ہوں گے بلکہ جَنّٰتُ عَدۡنٍ رہائشی باغات ہوں گے جن میں سب کے لیے عالیشان مکانات ہوں گے جن میں ہر طرح کی آسائش حاصل ہوگی۔ یہ اُن کی نیکی اور ایمان کا صلہ ہوگا۔ اِن انعامات کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ کبھی واپس نہیں لیے جائیں گے اور نہ ان باغات سے نکالے جانے کا کوئی خطرہ ہوگا۔ وہاں نہ موت کا ڈر ہوگا، نہ تعطیل، پریشانی یا حوادثات کا۔ دنیا میں تو اکثر نشیب و فراز آتے رہتے ہیں مگر آخرت کے انعامات میں کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔

کفار کی بدبختی

اس کے برخلاف وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے انبیاء، ملائکہ، کتب اور تقدیر پر ایمان نہ رکھا۔ وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے دلائل، معجزات اور احکام کی تکذیب کی وَلِقَآیِٔ الۡاٰخِرَةِ اور آخرت کی ملاقات یعنی وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کو بھی جھٹلایا ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِکَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ کہ وہ عذاب میں جکڑے ہوئے حاضر کیے جائیں گے۔ فرشتے ان کو گرفتار کرکے اللہ

کی بارگاہ میں پیش کریں گے حکم ہوگا۔ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (الحاقہ۔ ۳۰) پکڑو اور
گلے میں طوق پہنا دو اور پھر ستر گز لمبی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم میں پھینک دو۔

بہرحال اللہ نے فرمایا کہ قیامت ضرور واقع ہونے والی ہے۔ كَمَا بَدَأْنَآ
اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (الانبیاء۔ ۱۰۴) جس طرح
ہم نے پہلی دفعہ لوگوں کو پیدا کیا۔ اسی طرح دوبارہ بھی اٹھائیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے
اور ہم ضرور ایسا کریں گے۔

خدا تعالیٰ کی تسبیح کے اوقات

فرمایا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ پس اللہ کی پاکی بیان کرو جبکہ
تم شام کرتے ہو۔ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ اور جب کہ تم صبح کرتے ہو۔ وَلَهُ
الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اُسی کے لیے ہر طرح کی تعریف
ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ اور اسی کی تسبیح بیان کرو وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ
تُظْهِرُوْنَ پچھلے پہر بھی اور جب کہ تم دوپہر گزارتے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے
ہیں کہ جس تسبیح و تنزیہ کا حکم دیا ہے وہ دل سے بھی ہونی چاہیئے اور زبان سے
بھی۔ انسان کے اعضاء و جوارح بھی اس تسبیح میں شامل ہونے چاہئیں۔

اوقات صلوٰۃ خمسہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ اس آیت میں پانچ نمازوں اور ان کے اوقات کی
طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نافع ابن ازرق خارجی نے
نمازوں کے اوقات کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔
اس آیت کریمہ میں تُمْسُوْنَ سے مراد مغرب تُصْبِحُوْنَ سے فجر،
عَشِيًّا سے عصر اور تُظْهِرُوْنَ سے ظہر کی نماز مراد ہے۔ چار نمازیں تو یہ ہو
گئیں اور پانچویں عشاء کی نماز کے متعلق سورۃ نور کی آیت ۵۸ تلاوت فرمائی جس میں وَمِنْۢ
بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ کی تصریح کے ساتھ ذکر ہے۔ اس آیت کریمہ میں نابالغ
بچوں کو بھی تین اوقات میں خلوت میں آنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ جو کہ یہ ہیں۔ فجر سے
پہلے، دوپہر کو آرام کے وقت اور عشاء کے بعد۔ اس طرح حضرت عبداللہ ابن عباسؓ
نے اس خارجی کے سامنے پانچوں نمازوں کا ذکر کر دیا۔ آپ ہی سے یہ قول بھی منقول ہے

---

[1] خازن ص ۲۰۵ ج ۵ [2] طبری ص ۲۹ ج ۲۱ (فیاض)

کہ تُمْسُوْنَ میں مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اشارہ ہے اور باقی تین نمازوں کا ذکر تُصْبِحُوْنَ، عَشِیًّا اور تُظْهِرُوْنَ میں آگیا ہے۔ نمازوں کے اوقات کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں بھی موجود ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (آیت ۷۸) یعنی نماز قائم کریں سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کی تاریکی تک اور فجر کی نماز کہ جس میں قرآن کریم زیادہ پڑھا جاتا ہے اور جو فرشتوں کی حاضری کا وقت ہوتا ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سورج ڈھلنے میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں آتی ہیں جب کہ رات کی تاریکی سے مراد عشاء کی نماز ہے اور پانچویں نماز فجر کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

ان اوقات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان اوقات میں نعمت کے اظہار کا زیادہ موقع ہوتا ہے اور ان میں نشاناتِ قدرت زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ رات اور دن کی تبدیلی یعنی طلوع و غروب آفتاب اور عین دوپہر کے وقت نشاناتِ قدرت اچھی طرح واضح ہوتے ہیں اس لیے ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا ہے۔

ہمارے ملک کے بعض گمراہ فرقے نماز کے پنجگانہ اوقات کو تسلیم نہیں کرتے ان میں ملحد قسم کے چکڑالوی اور پرویزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض تین نمازوں کے قائل ہیں اور بعض صرف ایک پر اکتفا کرتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ نے آیاتِ قرآنی سے پانچوں نمازیں مراد لی ہیں۔

بعث بعد الموت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان بتلایا ہے یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ اللہ تعالیٰ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اور مردہ کو زندے سے نکالتا ہے۔ مثلاً زمین مردہ ہے اللہ تعالیٰ اس میں سے جاندار چیزوں کو نکالتا ہے۔ انڈا مردہ ہوتا ہے مگر اس سے زندہ چوزہ نکلتا ہے۔ انسان کا مادہ منویہ ایک بے جان قطرہ ہوتا ہے جس سے انسان جیسی اشرف المخلوقات پیدا ہوتی

ہے۔ ایک کافر کی مثال مردہ کی سی ہے مگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ابوجہل سے عکرمہؓ جیسا زندہ یعنی صاحب ایمان انسان پیدا کر دے۔ آزر بت فروش اور پکا کافر تھا مگر اللہ نے اُس سے ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو پیدا فرمایا۔ اس کے برعکس مرغی زندہ ہوتی ہے مگر اس سے مردہ انڈا پیدا ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ بڑا نیک اور ایماندار ہے مگر اولاد نافرمان نکلتی ہے جو کہ مردہ کے مشابہ ہے۔ بعض دہریے بن جاتے ہیں اور بعض مرزائیت کو قبول کر لیتے ہیں۔ زمین بالکل خشک یعنی مردہ ہوتی ہے۔ اُس کی نشو و نما کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ بارش برسا کر اُس کو زندہ کر دیتا ہے اور پھر اُس سے پھل، پھول اور فصل پیدا ہوتے ہیں جن سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ فرمایا وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اللہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہونے کے بعد پھر زندہ کر دیتا ہے۔ اُس میں ہریالی آجاتی ہے اور وہ اپنے خزانے اگلنے لگتی ہے وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ فرمایا قیامت والے دن تم بھی اسی طرح زمین سے زندہ نکالے جاؤ گے۔ جس طرح تم روزمرہ زندگی میں مردہ سے زندہ ہوتے دیکھتے ہو۔ اسی طرح قیامت کو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے لا کھڑا کرے گا اور پھر حساب کتاب اور جزائے عمل کی منزل آئے گی جس سے ہر شخص کو گزرنا پڑے گا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ
اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ
اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا
لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً
وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ
وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ :- اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔ پھر تم انسان ہو کر زمین میں منتشر ہو ﴿۲۰﴾ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے

تمہارے نفسوں میں سے تمہارے جیسے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کر سکو - اور بنائی ہے اُس نے تمہارے درمیان دوستی اور مہربانی . بیشک اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (۲۱) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا اور تمہاری زبانوں کا مختلف ہونا اور تمہارے رنگوں کا . بیشک اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں (۲۲) اور اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات کے وقت اور دن کے وقت - اور تمہارا تلاش کرنا اُس کے فضل سے . بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن کے لیے جو سنتے ہیں (۲۳)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور کفار کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا . پھر مجرموں کی گرفتاری اور خدا تعالیٰ کے حضور پابند سلاسل پیشی کا ذکر فرمایا اللہ نے ان اوقات کا ذکر کیا جن میں تجدید نعمت ہوتی ہے اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں - ان اوقات میں اللہ کی تسبیح اور عبادت کرنے کا حکم دیا گیا . پھر اللہ کی قدرت کا تذکرہ ہوا کہ وہ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور اس مشاہدے کو اللہ کی قدرت کی نشانیاں اور توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا . ساتھ ساتھ یہ وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت پر بھی دلیل بنتی ہے کہ جس طرح یہاں پر اللہ تعالیٰ مردہ چیز سے زندہ کو نکالتا ہے - اسی طرح قیامت کو مردہ زمین سے مردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے کھڑا کر دے گا .

نشاناتِ قدرت

آج کی آیات میں بعض دیگر نشاناتِ قدرت کا ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ انسان کی ابتدائی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی جو کہ ایک بے جان چیز ہے۔ دنیا میں اولین انسان اور پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران۔ ۵۹) اللہ نے آپ کو مٹی سے پیدا کیا۔ یہ بات قرآن میں بار بار دہرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اولین تخلیق مٹی سے کی۔ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ پھر تم انسان ہو جو زمین میں منتشر ہوتے ہو یعنی پھیل جاتے ہو۔ دیکھو یہ اللہ کا کمال قدرت ہے کہ کہاں حقیر مٹی اور کہاں اشرف المخلوقات انسان۔ تو جس طرح اللہ نے انسان کو پہلی دفعہ مٹی سے تخلیق کیا، اسی طرح وہ اُسے دوبارہ بھی مٹی سے ہی اٹھائیگا۔ جب تم پہلی تخلیق کو تسلیم کرتے ہو تو دوبارہ زندگی کو تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہے۔

میرے حق میں مالک نے یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا سو مجھے انسان کیا

بہرحال اللہ نے توحید، وقوع قیامت اور بعث بعد الموت پر یہ عقلی دلیل پیش کر دی ہے۔

انسان کو اسی لیے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کی مقرب ترین مخلوق فرشتوں سے بھی بلند تر مقام رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاک میں وہ کمالات ودیعت کر دیے ہیں جو دوسرے عناصر میں نہیں پائے جاتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ نے فرشتے کو حکم دیا کہ تمام روئے زمین سے تھوڑی تھوڑی مٹی اکٹھی کی جائے۔ اس مٹی سے خمیر تیار کر کے آدم علیہ السلام کا جسم بنایا گیا اور پھر اللہ نے اُس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ جس طرح روئے زمین کے مختلف خطوں میں کہیں کی مٹی سرخ ہے اور کہیں کی سیاہ، کہیں کی سخت اور کہیں کی بھربھری، اسی طرح اللہ نے مختلف خطوں کے لوگوں کو بھی مختلف الانواع بنایا ہے۔ کوئی گورا ہے اور کوئی کالا، کوئی سرخ ہے اور کوئی زرد

لے ابن کثیر ص ۳۲۹/۳ (فیاض)

اسی طرح اُن کی طبایع بھی مختلف ہیں۔ کوئی سخت طبیعت ہے تو کوئی نرم مزاج۔ یہ اُس مٹی کا اثر ہے جو انسان کی تخلیق میں داخل ہے۔

انسانی جوڑا

ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یہ بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا اُس نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔ سارے کے سارے مرد یا ساری کی ساری عورتیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ہر صنف کے لیے اُس کا جوڑا بنایا۔ سورۃ النساء کی ابتدائی آیت میں فرمایا۔ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈر جاؤ جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (آیت ۔ ۱) اور پھر اُسی میں سے اُس کا جوڑا پیدا کیا۔ پھر اس جوڑے میں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پیدا کر کے زمین میں پھیلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور پھر انہی سے حضرت حواؑ کو پیدا کر کے اُن کا جوڑا بنا دیا جن کے اختلاط سے پوری نوع انسانی وجود میں آئی۔ تو گویا مرد اور عورت دونوں کی جنس ایک ہی ہے البتہ ان کی صنف الگ الگ ہے تاکہ ان کا دائرہ کار متعین ہے اور مقصد تخلیق پورا ہوتا ہے۔ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا تاکہ تم اُن کے پاس سکون پکڑو۔ عورت اور مرد میں اللہ نے ایسی کشش رکھی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعث سکون ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (آیت ۔ ۱۸۷) عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور تم اُن کے لیے ہو، گویا عورتوں کی پردہ پوشی تمہارے ذریعے ہے اور تمہاری پردہ پوشی اُن کے ذریعے ہے جس طرح لباس جسم کے ساتھ متصل ہوتا ہے اسی طرح اللہ نے تمہارے درمیان بھی اتصال کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ انسانی زندگی میں طرح طرح کے حوادثات پیش آتے ہیں۔ انسان کو غم، پریشانی اور اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں زوجین ہی ایک دوسرے کے غمگسار اور ذریعہ تسلین بنتے ہیں۔

اس کے علاوہ فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

اللہ نے تمھارے درمیان دوستی اور مہربانی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ میاں بیوی کے درمیان قریب ترین دوستی اور مہربانی کا تعلق ہوتا ہے۔ اگر اپنے دل میں طلب پیدا ہوتی ہے تو یہ محبت ہوگی اور اگر طلب دوسری صنف کی طرف سے ہے تو رحمت اور مہربانی کا ظہور ہوگا، اور پھر اس محبت اور مہربانی کے جذبہ کے تحت ہی ایک دوسرے کا طلاپ ہوگا جو کہ ذریعہ اولاد ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان محبت، دوستی، اور رحمت کا رشتہ قائم کر کے اسے نسلِ انسانی کی بقاء کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

غور و فکر کی دعوت

ان تمام چیزوں کے متعلق فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ کہ اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اللہ نے انسان کی توجہ اس کی پیدائش کی طرف دلائی ہے کہ دیکھو! ابتدائی طور پر تمھیں مٹی سے تخلیق کیا۔ پھر آگے قطرۂ آب سے نسلِ انسانی کو چلایا۔ اس قطرۂ آب میں بھی مٹی کا اثر موجود ہے کیونکہ انسان کی ساری خوراک مٹی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کتنی بڑی نشانی ہے کہ انسان جیسی باکمال ہستی کو ایسے ناپاک قطرہ سے پیدا کیا کہ اگر جسم یا کپڑے کو لگ جائے تو دھوئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ پھر مرد و زن میں محبت و الفت کی کشش پیدا کر کے نسلِ انسانی کے آگے چلانے کا بندوبست کیا۔ ان چیزوں میں غور کرنے سے اللہ کی وحدانیت اور وقوعِ قیامت کا مسئلہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ اللہ نے بار بار غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا (محمد - ۲۴) یہ لوگ قرآن پاک میں غور کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ اس کے باوجود جو شخص دھیان ہی نہیں کرتا اس کے لیے کوئی چیز نشانی نہیں بن سکتی، اور نہ ہی وہ اُس کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

ارض و سما کی تخلیق

آگے اللہ نے اپنی قدرت کی ایک اور نشانی کا تذکرہ کیا ہے وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ارض و سما کی تخلیق بھی اُس کی

زمانہ میں سے ہے۔ اللہ نے اتنی بڑی زمین [illegible] فرما کر فضا میں معلق کر دیا اور اسے
متعلق اللہ نے فرمایا: اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (النبا ۶) کیا ہم نے زمین
کو بچھونا نہیں بنایا۔ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (النبا ۱۲)
اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے ہیں۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی [illegible]
چیزیں کون [illegible] کر سکتا ہے [illegible] تخلیق ہے اور اس کی وحدانیت اور قدرت
کی دلیل ہے۔

زبانوں کا اختلاف

پھر فرمایا وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ تمہاری زبانوں کا مختلف ہونا بھی
اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اولادِ آدم
ہزاروں بولیاں بولتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا میں تین ہزار سے چار
ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ بھی قدرت کا جاری کردہ نظام ہے کہ جس طرح پہلی
نسلیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور نئی نسلیں آتی رہتی ہیں۔ اسی طرح بعض پرانی بولیاں بھی
ختم ہو جاتی ہیں اور نئی نئی زبانیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ ہماری اردو زبان آج سے آٹھ سو
سال پہلے دنیا میں کہیں نہیں بولی جاتی تھی۔ اسی برصغیر میں مختلف اقوام کے اختلاط
سے اس زبان نے جنم لیا اور اب یہ اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اس میں علوم کے
ذخیرے موجود ہیں اور دنیا پر کم و بیش ایک ارب انسان یہ زبان بولتے ہیں
اسی طرح انگریزی، عربی، فارسی، فرانسیسی، جرمنی، روسی، چینی بے شمار زبانیں ہیں۔
ان بڑی زبانوں کے علاوہ ہر علاقے کی چھوٹی چھوٹی اپنی زبانیں ہیں جیسے ہمارے
ہاں مرکزی پنجابی کے علاوہ [illegible] پوٹھوہاری، سرائیکی، [illegible] کشمیری، پشتو اور [illegible]
زبانیں ہیں اسی طرح ملک کی علاقائی زبانیں ہیں۔ ان سب کا شمار کیا جائے تو
شمار سے باہر ہو جائیں۔ ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں تو دو زبانیں تو سرکاری طور
پر تسلیم شدہ ہیں اور ان کے علاوہ علاقائی زبانیں تو بے شمار ہیں۔ بہر حال زبان کا اختلاف
کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مختلف زبانوں کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تبادلہ خیال
ہوتا ہے اور پھر ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ آج انگریزی دنیا کی اول درجے کی زبان

ہے جسے ساری دنیا میں بولا اور سمجھا جاتا ہے مگر آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس زبان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

دنیا میں عربی زبان کو سب پر افضلیت حاصل ہے یہ مختصر ہونے کے باوجود انتہائی ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کے حروف مختصر اور قواعد سائنٹیفک ہیں۔ انگریزی زبان میں اس لحاظ سے طوالت پائی جاتی ہے کہ اس زبان میں بہت سے حروف زائد ہوتے ہیں جو بولنے میں نہیں آتے۔ پھر اس کے بعض حروف مختلف آوازیں دیتے ہیں کسی لفظ میں حرف سی (C) ک کی آواز دیتی ہے۔ جب کہ کسی دوسرے لفظ میں یہی حرف س کی آواز دیتا ہے۔ کہیں TION شن بنتا ہے اور کہیں SION یہی آواز دیتا ہے۔ کہیں CH چ کی آواز دیتا ہے اور کہیں ک۔ عربی زبان میں ایسا تفاوت نہیں پایا جاتا بلکہ ہر لفظ کے اپنے ہجے اور ہر حرف کی مستقل آواز ہے۔ گرامر کے مطابق اس کے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں اور کہیں بھی مسلمہ اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ بہر حال ہر خطے کی اپنی اپنی زبان ہے اور کسی زبان کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے ہر زبان کا ماحول، اس کے علوم اور اس کی شاعری کے اپنے اپنے اسلوب ہوتے ہیں جب مختلف زبانیں ملتی ہیں تو اسی سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر پوری دنیا میں ایک ہی زبان بولی جاتی تو تمدن اتنی ترقی نہ کر سکتا۔

رنگوں کا اختلاف

فرمایا جس طرح تمہاری زبانیں مختلف ہیں اسی طرح وَأَلْوَانِكُمْ تمہارے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ نے زمین کے مختلف خطوں میں مختلف رنگ کے لوگ پیدا کئے ہیں۔ گرم ممالک کے رہنے والے لوگوں کا رنگ عام طور پر کالا ہوتا ہے۔ جب کہ سرد علاقوں کے لوگ سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ بعض گندمی رنگ کے انسان ہیں اور بعض زرد اور سرخ رنگ کے ہیں۔ یہ سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ لہٰذا رنگ کی بنا پر کسی شخص کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جس طرح اللہ نے رنگ مختلف بنائے ہیں اسی طرح شکل و صورت بھی مختلف ہے۔ انسان کے چہرے کا طول عرض کتنا ہوگا مگر آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت تک پیدا ہونے والے اربوں لوگوں میں سے کسی

ایک کی شکل وصورت بھی ہو بہو دوسرے سے نہیں ملتی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بہت بڑا نشان ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے ہاتھ سے مختلف شکل وصورت کی تصویریں بنانا چاہے تو سو پچاس تک جانے کے بعد عاجز آجانے گا کہ اب کیسی شکل بناؤں جو پہلی شکلوں سے مختلف ہو مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے کہ کسی ایک انسان کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ اسی طرح ہر آدمی کی آواز بھی مختلف ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بغیر دیکھے محض آواز سے پہچان لیتے ہیں۔ اللہ نے ہر انسان کا گلا ایک سا بنایا ہے مگر ہر گلے کی آواز مختلف ہے۔ یہ بھی اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔ فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ اس میں نشانیاں تو ہیں مگر اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور ان چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جاہل لوگ نہ تو ان کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ان کو سمجھ سکتے ہیں۔

نیند ذریعہ آرام

آگے ارشاد ہوتا ہے وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ رات اور دن کے وقت تمہاری نیند بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ سورۃ الانعام میں اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا (آیت ۹۶) اس نے رات کو سکون کا باعث بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ طبعی نظام کے تحت تمام انسان اور جانور رات کے وقت آرام کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کی تحلیل شدہ قوتیں بحال ہوجائیں اور وہ اگلے دن کے کام کے لیے دوبارہ تازہ دم ہوجائیں۔ دن کے وقت انسان تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اپنی معاش کے لیے کاروبار ملازمت، کھیتی باڑی یا محنت مزدوری کرتے ہیں تاہم اگر کوئی شخص کسی اشتغال کی وجہ سے رات کو نہیں سو سکتا تو وہ دن کو بھی سو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں کام کاج اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ بعض کام متواتر چوبیس گھنٹے کرنا پڑتے ہیں۔ اگرچہ اب کام کا بیشتر حصہ مشینوں نے سنبھال لیا ہے مگر مشینوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا کتنی ہی صنعتیں ہیں۔ جن میں دن رات وہ ہو

سے یہ معاملات وہ سارا نظام چوبیس گھنٹے چلتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ یہی ڈیوٹی رات کے وقت انجام دیتے ہیں، وہ دن کو آرام کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے یہاں پر یہی فرمایا ہے کہ رات اور دن کو تمہارے لیے نیند کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ بہرحال ہر جاندار کے لیے نیند ضروری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اگر کسی شخص کو دو دن نیند نہ آئے تو اس کا دماغ ہی خراب ہو جائے۔ تو نیند میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔

رزق حلال کی تلاش

فرمایا وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ تلاش رزق حلال بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اللہ کے فضل میں سرفہرست رزق حلال ہے۔ انسان دن رات کے کسی حصہ میں اپنے حالات کے مطابق روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں جو ان کے لیے رزق کا سبب بنتا ہے۔ یہ بھی انسان کے لیے ضروری ہے۔ حتیٰ کہ جمعہ کے دن جہاں اللہ تعالیٰ نے نماز جمعہ کی ادائیگی کی تاکید کی ہے وہاں فکر معاش کا بھی حکم دیا ہے فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعۃ۔ ۱۰) جب نماز ختم ہو جائے تو رزق حلال کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔ یہودیوں کے ہاں ہفتہ کا دن صرف عبادت کے لیے مخصوص تھا اور اس میں کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اہل ایمان کو اللہ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہو کر اپنے کاروبار میں لگ جاؤ۔ بہرحال دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں جس طرح نیند اور آرام ضروری ہے اسی طرح روزی کی تلاش بھی ضروری ہے۔ اور یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس ضمن میں دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ایک اقتراب ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کر کے اس کا قرب حاصل کرے۔ اور دوسری چیز ارتفاق ہے یعنی زندہ رہنے کے لیے ضروریات زندگی مہیا کرنا۔ اہل ایمان آدمی کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ سورۃ الفتح میں صحابہ کرامؓ کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

(آیت ۲۹) وہ اللہ کا فضل یعنی رزق حلال کی جستجو بھی کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی
یعنی قرب حاصل کرنے کے لیے بھی برابر تگ و دو کرتے ہیں۔ مگر عام اہل دنیا کا
طریقہ یہ ہے کہ وہ فکر معاش میں اضطراب کی حد تک مشغول ہو جاتے ہیں اور آخرت سے
غافل ہو جاتے ہیں

فرمایا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ اس میں اُن
لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔ جس طرح آنکھیں ذرائع علم ہیں اسی
طرح انسان کانوں سے سن کر بھی بہت سا علم حاصل کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص سننے
سے ہی عاری ہے تو کسی چیز میں غور و فکر کیسے کرے گا؟ اسی لیے فرمایا کہ مذکورہ چیزوں
میں سننے اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ
دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾
وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ
قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ
الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ ع

ترجمہ :۔ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی خوف اور امید کے ساتھ۔ اور اتارتا ہے آسمان کی طرف سے پانی پس زندہ کرتا ہے اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے

سے کے بعد بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں (۲۴) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے۔ پھر جب وہ بلائے گا تمہیں بلانا زمین سے تو اچانک تم نکلو گے (۲۵) اور اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُسی کے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں (۲۶) اور وہی ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے مخلوق کو اور پھر اس کو لوٹائے گا۔ اور یہ آسان ہے اُس پر۔ اور اسی کے لیے ہے صفت بلند آسمان میں اور زمین میں۔ اور وہ زبردست اور حکمت والا ہے (۲۷)

قدرتی بجلی بطور نشانی

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بہت سی نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور وقوعِ قیامت کی دلیل بنتی ہیں اب اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ اور یہ بھی اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا کہ وہ دکھاتا ہے تم کو بجلی خوف اور اُمید سے۔ یہ آسمانی بجلی کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے تو اس سے نقصان ہو جانے کا خوف بھی آتا ہے اور نزولِ رحمت کی اُمید بھی ہوتی ہے۔ حضرت قتادہؓ سے منقول ہے[1] کہ مسافروں کے لیے باعث خوف ہوتی ہے کہ بجلی ان کے اوپر نہ آ گرے۔ جب کسی مقام پر بجلی گرتی ہے تو سخت نقصان ہوتا ہے۔ کہیں آگ لگ جاتی ہے اور کبھی انسان اور جانور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ابھی گذشتہ ہفتے کی بات ہے کہ دو آدمی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ جب بجلی چمکی تو وہ بھاگ کر درخت کے نیچے چلے گئے۔ مگر اُن پر بجلی گری اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اسی طرح سیالکوٹ کا واقعہ ہے کہ دو بچے سکول جا رہے تھے۔ جب طوفان باد و باراں تھا تو انھوں نے کسی چھت کے نیچے

[1] طبری ص ۳۲ ج ۲۱ (فیاض)

بنا دیکھا۔ وہ مگر بجلی گری اور دونوں بچے ہلاک ہو گئے تو حسرت تھی۔ ... یہ ہے کہ بجلی میں مسافروں کے لیے خوف اور مقیم لوگوں کے لیے امید ہوتی ہے۔ بارش برسے گی تو کھیت لہلہا اٹھیں گے اور پھل پھول اور اناج پیدا ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ خوف اس بات کا بھی ہو سکتا ہے کہ چمکنے والی بجلی بارش سے خالی نہ ہو اور بارش آنے کی امید بھی ہوتی ہے۔ غرضیکہ بجلی میں خوف اور امید دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔

مصنوعی بجلی

یہ تو قدرتی بجلی کا ذکر تھا۔ تاہم جو بجلی ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں یہ انسانی ہاتھوں کی تیار کردہ ہے۔ اب اسی بجلی کا استعمال اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اگر تھوڑی سی دیر کے لیے بھی بند ہو جائے تو نظام زندگی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس بجلی سے بڑے بڑے کام لیے جا رہے ہیں۔ دیو ہیکل مشینوں کا چلانا بجلی ہی کے ذریعے ممکن ہوا۔ اس سے بڑے بڑے کارخانے چلتے ہیں اور ضروریات زندگی کی ہزاروں چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ اگر بجلی نہ ہو تو عام استعمال کی چیزوں کی تیاری میں بڑی دقت آئے اور چیزیں بہت زیادہ مہنگی ہو جائیں۔ شہری زندگی میں روشنی کے لیے بجلی کا استعمال ایک بنیادی ضرورت بن گیا ہے۔ پرانے زمانے میں مٹی کے تیل کے لیمپ روشن ہوتے تھے مگر اب تو دیہات بھی بجلی سے روشن ہو چکے ہیں۔ کھیتی باڑی کے لیے ٹیوب ویل بجلی سے چلتے ہیں۔ ذرائع مواصلات میں بھی بجلی کا استعمال عام ہے۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں بجلی کی ضرورت نہ ہو۔

آج کے ایٹمی دور میں ہر ملک ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش میں ہے اس کا زیادہ تر انحصار بھی بجلی پر ہے۔ ابھی حال ہی میں روس کے ایٹمی ری ایکٹر میں خرابی پیدا ہوئی تو اس سے ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے۔ اب دنیا بھر میں ... رہے ہیں کہ ایٹمی اثرات سے حفاظت کیسے ممکن ہو۔ کسی زمانے میں سرعت رفتاری کو بجلی سے تشبیہ دی جاتی تھی کہ فلاں واقعہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رونما ہوا۔ شاعر لوگ بھی تیز رفتاری کے لیے گویا بجلی کی اصطلاح استعمال

---

۱ طبری ص ۲۱۲ (فیاض)

کرتے تھے مثلاً فلاں گھوڑا ہوا کی طرح تیز رفتار ہے یا وہ بجلی کی سی تیزی سے کودجاتا ہے۔ بجلی کی رفتار سینکڑوں میل فی سیکنڈ ہے جب کہ روشنی اس سے بھی تیز ہے اور ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے۔ بہرحال مصنوعی بجلی سے بھی بڑے مفید کام لیے جاتے ہیں۔ تاہم اس میں دونوں چیزیں یعنی خوف اور اُمید پائی جاتی ہیں۔ جب بجلی کا کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے جانی یا مالی نقصان ہوجاتا ہے تو اس سے خوف پیدا ہوتا ہے اور جب یہ مفید کام انجام دیتی ہے تو یہ اس کا اُمید کا پہلو ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی بجلی منقطع ہوجائے تو زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کارخانے بند ہو کر کارکن بیکار بیٹھ جاتے ہیں۔ گھروں، دفتروں اور دکانوں میں دن کے وقت بھی تاریکی چھا جاتی ہے۔ بجلی قدرتی ہو یا مصنوعی یہ بھی اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔

وائرلیس یا لاسلکی

موجودہ زمانے کی ایجاد وائرلیس یا لاسلکی بھی اسی قبیل سے ہے پیغام رسانی کا یہ بھی تیز ترین ذریعہ ہے۔ دوران جنگ جب دیگر ذرائع مواصلات منقطع ہوجاتے ہیں تو پیغام رسانی کے لیے یہی ذریعہ کام آتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوران جنگ مختلف محاذوں کا مرکز کے ساتھ رابطہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو محاذ پر موجود سپاہیوں کو کمک اور گولہ بارود پہنچایا جا سکتا ہے، نہ اُن کو بروقت ہدایات دی جاسکتی ہیں اور نہ اُن کے لیے خوراک کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ وائرلیس کی آوازیں فضا میں موجود ایتھر نامی مادہ کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں۔ جب امریکہ میں یہ سسٹم دریافت ہوا تو مصری شاعر حافظ ابراہیم نے کہا تھا۔

وَتَخِذْتُمُوا مَوْجَ الْأَثِيرِ بَرِيدًا
حِيْنَ خِلْتُمْ أَنَّ الْبُرُوْقَ كُسَالَى

تم نے ایتھر کی موجوں کو اس وقت پیغام رسانی کا ذریعہ بنالیا جب خیال کیا کہ اس کے مقابلے میں بجلی سست رفتار ہے۔

بارش کا نزول

آگے فرمایا کہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً کہ وہ آسمان کی طرف سے پانی نازل فرماتا ہے۔ یعنی بارش ہوتی ہے فَيُحْيِ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا پھر اس پانی کے ذریعے مردہ اور خشک زمین کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو زمین میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں جس سے پھل، پھول، اناج پیدا ہوتے ہے اور جانوروں کے لیے گھاس پھونس اُگتا ہے۔ ہر جاندار کی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء - ۳۰) ہم نے پانی کے ذریعے ہر چیز کو زندگی بخشی ہے۔ نہ صرف انسان اور جانور پانی کے محتاج ہیں بلکہ اس کے بغیر نباتات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اور جانوروں کی خوراک کے لیے درختوں، پھلوں اور اناج کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک پانی نہ ہو، یہ چیزیں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ سائنسی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں دوڑنے والے خون کا اسّی فیصد حصہ پانی ہے اور باقی بیس فیصدی میں غذائی چیزیں اور معدنیات ہوتی ہیں۔ اللہ نے پانی کو ایسی مفید چیز بنایا ہے کہ یہ خود پاک ہے اور دوسری چیزوں کو پاک کرتا ہے پانی ہی سے غسل کر کے لوگ اپنا جسم پاک کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کپڑے، برتن اور دوسری استعمال کی چیزیں صاف کرتے ہیں۔ جس قدر وسیع پیمانے پر پانی کی ضرورت ہے۔ اللہ نے اس کے ذخائر بھی اتنے ہی وسیع پیدا کر دیئے ہیں۔ زمین پر جگہ جگہ دریا، نہریں اور ندیاں چلا دی ہیں جو انسانوں، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے لیے پینے اور کاشتکاروں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پھر اللہ نے زمین کے اندر بھی پانی کے وسیع ذخائر بند کر دیے ہیں جنہیں کنوؤں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکال کر استعمال کیا جاتا ہے۔ فرمایا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ بیشک اس میں نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اُس کی قدرت کی نشانی ہے کہ اُس نے اپنی مخلوق کے لیے اتنی کارآمد چیز پیدا کی ہے۔ اگر انسان ذرا بھی عقل کو بروئے کار لائے تو یہ نشانی دیکھ کر

لیے اللہ کی وحدانیت اور وقوع قیامت پر یقین آسکتا ہے۔ مگر جو شخص عقل کو استعمال ہی نہ کرے، اس کے لیے یہ نشانیاں بھی کچھ مفید نہیں ہوتیں۔

نظامِ کائنات

آگے اللہ نے وسیع تر نظامِ کائنات کو نشانی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے اور اسی نے ایک نظام کے تحت ان کو کام میں لگا رکھا ہے۔ چاند، سورج، ستارے اور سیارے سب اللہ کی مخلوق ہیں كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (الرعد-۲) سب کے سب اپنے اپنے مدار میں ایک مقررہ مدت کے لیے رواں دواں ہیں۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا (فاطر-۴۱) ان متحرک چیزوں کو گرنے یا ٹکرا جانے سے اللہ ہی نے روک رکھا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ وقت آجائے گا تو سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر قائم نہیں رہے گی۔ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم-۴۸) جس دن اس زمین اور آسمان کی جگہ نئے زمین و آسمان قائم کیے جائیں گے۔ اس واقعہ کو طامۃ الکبریٰ (بڑا ہنگامہ) کا نام دیا گیا ہے۔ اس وقت قیامت برپا ہو جائے گی ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سب کو بلاوا آئے گا۔ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ اور تم اچانک نکل پڑو گے۔ یہ بلاوا صورِ اسرافیل کے ذریعے ہوگا اور تمام لوگ اپنی قبروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اپنی منزل کی طرف جائیں گے۔

سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق زمین، آسمان اور تمام کرّے قانونِ کششِ ثقل کے مطابق اپنے اپنے راستوں پر چل رہے ہیں اور یہ آپس میں ٹکراتے نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کششِ ثقل کا قانون کس نے پیدا کیا ہے؟ آخر وہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہے۔ پھر جب وہ چاہتا ہے تو وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم

تبدیلیاں بھی لاتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ معمول کے خلاف چاند گرہن یا سورج
گرہن کے واقعات بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ یہ سارا نظام کائنات خداتعالیٰ
ہی کا قائم کردہ ہے اور آخر ہر چیز خداتعالیٰ کے حکم کی طرف ہی راجع ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کبریائی

ارشاد ہوتا ہے وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اُسی کے
لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کائنات کی ہر چیز اسی خداوند قدوس کی پیدا
کردہ ہے، اسی کی ملک میں ہے اور اسی کے تصرف میں ہے۔ دوسری جگہ اللہ نے
اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر فرمایا اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ
(النحل - ۱۷) کیا پیدا کرنے والا اور نہ پیدا کرنے والا برابر ہیں؟ خالق تو ایک
ہے اور باقی سب مخلوق ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مخلوق عاجز ہے اور جو عاجز ہے وہ
الٰہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے مجازی طور پر انسان کو بعض چیزوں کا مالک بنایا ہے،
مگر وہ اس عارضی اور مجازی ملکیت پر مغرور ہو کر اس کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں
حقیقت یہ ہے کہ ساری مخلوق عاجز ہے اور اس کا کسی چیز پر کچھ اختیار نہیں۔ سارا
تصرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ
السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ (السجدة - ۵) آسمان کی بلندیوں سے لے
کر زمین کی پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر وہی کرتا ہے كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ
اور ہر چیز اسی کی اطاعت گزار ہے۔ فرشتے تو ہر وقت خداتعالیٰ کے مطیع ہیں۔
لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ
(التحریم - ۶) وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ انسان
اور جنوں میں سے بھی خدا کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں اور بعض لوگ سرکشی
بھی کرتے ہیں۔ اللہ کے تکوینی حکم کے سامنے وہ بھی مجبور ہوتے ہیں۔ تکوینی
کا قانون ہر ایک پر حاوی اور نافذ رہتا ہے۔ ان کے سامنے ساری مخلوق عاجز ہے اور
از میں طوعاً و کرہاً ان قوانین کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال یہ سب دلائل قدرت
ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ اور وقوع قیامت سمجھ میں آتی ہے۔

ابتدائی تخلیق اور اعادہ

ارشاد ہوتا ہے وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ
خدا کی ذات وہی ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی وہی کرے گا
اُس نے ارض و سما کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے ملائکہ کو پیدا کیا۔ پھر ارض بنا
کر پیدا فرمایا۔ جنات کو پیدا کیا۔ پھر زمین و آسمان کو پیدا کیا اور پھر آخر میں اولین انسان
حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کی ابتدا اسی نے کی اور قیامت
کو دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا۔ بعض لوگ بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں
ہر مذہب و ملت کا پیروکار اپنی ابتدائی پیدائش کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب
کرتا ہے۔ چند دہریوں کو چھوڑ کر باقی سب اس کے قائل ہیں۔ جب ابتدائی
تخلیق کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر دوسری زندگی کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ جس
خدا تعالیٰ نے پہلی دفعہ پیدا کیا، کیا دوبارہ پیدا کرنا اُس کے لیے مشکل ہو گا؟۔
فرمایا۔ نہیں، وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ یہ بھی اس کے لیے بالکل آسان ہے
اُس کے حکم کی اتنی دیر ہو گی اور ہر چیز دوبارہ سامنے آ جائے گی۔ حقیقت
یہ ہے کہ کسی چیز کا پہلی دفعہ بنانا یعنی تخلیق اور دوبارہ اعادہ کرنے سے
مشکل ہو سکتا ہے۔ مگر جسے پہلی تخلیق پر کوئی دقت پیش نہیں آئی۔
اُس کے لیے دوبارہ تخلیق کرنے میں کونسی دشواری پیش آئے گی؟
وہ کمال قدرت کا مالک ہے وہ جس طرح چاہے کسی چیز میں تصرف
کرے۔ اس کے راستے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوتی

شانِ ربوبیت

آگے اللہ تعالیٰ کی صفت بیان ہوتی ہے وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ارض و سما میں اُسی کی صفت
اور شان بلند ہے۔ یہاں پر مثل سے مراد صفت اور شان ہے۔ مثل اور
مثل میں فرق ہے۔ کسی کی چیز کی مثل سے مراد اس کی نوع اور جوہر
میں شراکت ہوتی ہے جیسے فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ ۱۱)

اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ اور جہاں شرک کا رد فرمایا، وہاں ہے فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل - ۷۴) اللہ کے سامنے ایسی مثالیں بیان نہ کرو کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ ہر حیثیت سے پاک اور منزہ ہے۔ وہاں تو اللہ تعالےٰ کی مثال کی نفی کی گئی ہے مگر آیت زیر درس میں مثال کا اثبات پایا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مثل کا معنی "کسی چیز میں" فی الجملہ شراکت" ہوتا ہے۔ اگر ظاہری طور پر کسی صفت میں شراکت ہے تو یہ مثل ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا جیسے فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ (النور - ۳۵) اللہ کے نور کی مثال قندیل کی ہے۔ تاہم جوہر اور نوع میں اس کی کوئی مثل نہیں ہے۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں[1] کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان زمین و آسمان میں بلند ہے۔ اور اس بلند صفت سے مراد کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ امام مالکؒ بھی فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفت یہ ہے کہ وہی معبود برحق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ آسمانوں میں بھی وہی معبود ہے اور زمین میں بھی وہی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان نے میری تکذیب کی ہے اور یہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ نیز انسان نے مجھے گالی دی ہے اور یہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ پھر فرمایا کہ میری تکذیب یہ ہے کہ انسان یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا نہیں کریگا۔ گویا جزائے عمل کا انکار کر دے۔ اور گالی یہ ہے کہ انسان کہے اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ اَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ میں وحدہٗ لاشریک ہوں، بے نیاز ہوں جس نے نہ کوئی جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا بنا لیا ہے، حالانکہ یہ افترا ہے۔ اگر اس سے حقیقی بیٹا مراد ہو تو وہ جنسیت پر دلالت کرے گا اور اس سے عادت

[1] طبری صفحہ ۳۹ ج ۲۱ (فیاض)

ثابت ہوگی اور ایسا عقیدہ رکھنا خدا تعالیٰ کی توہین ہے۔ خدا تعالیٰ کا مجازی بیٹا بھی مراد نہیں لیا جا سکتا کہ اس سے کسی کو اختیارات کی تفویض ثابت ہوتی ہے۔ جیسے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ اللہ نے کسی کو اختیار نہیں دیا بلکہ وہ ہر کام براہِ راست خود کرتا ہے۔ اس حدیث میں تکذیب اور گالی کا یہی مطلب ہے۔

فرمایا اُس کی صفت اور شان ارض و سما میں بلند ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اور وہ کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ اس کے ارادے اور مشیت میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اگرچہ وہ انسانوں کے ادراک سے باہر ہو۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ
لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ
شُرَكَآءَ فِىْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ
تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ
اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ
عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ
لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ
النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ ۙ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿٣٢﴾

ترجمہ:- بیان کی ہے (اللہ نے تمہارے لیے مثال تمہارے نفسوں سے۔ کیا ہے تمہارے لیے۔ اُن میں سے جن کے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہیں، کوئی شریک اُس چیز میں جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے۔ پس تم سب اُس میں برابر ہو جاؤ۔ تم خوف کھاتے ہو اُن سے جیسا کہ ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔ اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیات ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں (۲۸) بلکہ پیروی کی ہے۔ اُن لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا ہے، اپنی خواہشات کی بغیر علم کے۔ پس کون ہدایت دیگا اُس کو جسے اللہ گمراہ کر دے اور نہیں ہے اُن کے لیے کوئی بھی مددگار (۲۹) پس قائم کریں آپ اپنے چہرے کو دین کے لیے حنیف بن کر۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ نہیں تبدیلی اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں۔ یہ مضبوط دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (۳۰) رجوع رکھنے والے ہو اُس (اللہ) کی طرف اور ڈرو اُس سے۔ اور قائم کرو نماز کو، اور نہ ہو شرک کرنے والوں میں سے (۳۱) اُن لوگوں میں سے جنہوں نے تفریق ڈالی اپنے دین میں اور گروہ درگروہ ہو گئے۔ ہر ایک گروہ اپنے پاس موجود چیز سے خوش ہونیوالا ہے (۳۲)

شرک کی مثال

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیوں کو ذکر کیا جو اُس کی وحدانیت اور وقوعِ قیامت کی دلیل بنتی ہیں۔ پھر آخر میں فرمایا کہ اللہ کی صفت بلند ہے جس کے ساتھ کوئی چیز مماثلت نہیں رکھتی۔ اب آج کی پہلی آیت میں اللہ نے شرک کی قباحت کو سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان کی ہے ارشاد ہوتا ہے ضَرَبَ لَكُم مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفسوں میں سے ہی ایک مثال بیان کی ہے۔ یعنی یہ مثال خود تمہارے افراد اور سوسائٹی میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی ایسا ہے جو ہماری عطا کردہ روزی میں تمہارا شریک ہو فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ اور پھر تم اُس چیز میں برابر ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارے زرخرید غلام تمہارے مال و دولت میں برابر کے حصے دار بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنی جائیداد میں اپنے غلام کی شراکت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ فرمایا صرف مال میں شراکت تک ہی بات محدود نہیں بلکہ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ تم اُن غلاموں سے بھی اسی طرح خوف کھاؤ جس طرح تم آزاد ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔ آزاد لوگوں کا تو آپس میں جھگڑا بھی ہو سکتا ہے کہیں ایک دوسرے کا مال غصب کر لیا تو خوف پیدا ہو گیا کہیں جائیداد کا تنازعہ اور کہیں ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی بھڑائی کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا ڈر ہوتا ہے مگر غلام تو بیچارے مملوک ہوتے ہیں۔ اُن سے ڈرنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ہر حالت میں اطاعت گزار اور خدمت گزار ہوتے ہیں۔ وہ تمہارے حقیقی مملوک نہیں بلکہ مجازی مملوک ہیں۔ جب تم ان غلاموں کو کسی صورت میں بھی اپنے برابر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر اُس خداوند قدوس کے ساتھ کیسے شریک ٹھہراتے ہو، جو ہر چیز کا حقیقی مالک ہے۔ یہ کتنی بے انصافی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کی صفات یا اس کی عبادت میں کوئی فرشتہ، جن یا انسانوں میں نبی، ولی، پیر یا بزرگ کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے مثال کے ذریعے یہ بات سمجھا دی ہے۔ ... كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ اسی طرح ہم تفصیل کے ساتھ اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں مگر صاحبِ عقل لوگوں کے لیے۔ یہ مثال اسی شخص کے لیے مفید ہو سکتی ہے جو اپنی عقل کو برتے۔ وہ اگر سوچے کہ جب ایک مجازی غلام اپنے مجازی آقا کا ہمسر نہیں ہو سکتا تو حقیقی مملوک اپنے حقیقی مالک کا کیسے شریک ہو سکتا ہے؟

غلامی کا رواج

نزولِ قرآن کے زمانہ میں پوری دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ جنگی قیدیوں کو لونڈیاں اور غلام بنا لیا جاتا تھا۔ پھر وہ مختلف ہاتھوں میں بکتے بکتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے تھے۔ اور اس طرح غلامی کا یہ نظام پوری دنیا میں پھیل چکا تھا۔ آقا اپنے غلاموں سے سخت مشقت لیتے تھے اور اُن پر مظالم ڈھاتے تھے مگر ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ جب اسلام آیا تو اُس نے غلامی کے رواج کو یکسر ختم نہیں کیا۔ بلکہ اس میں اصلاحِ احوال کا حکم دیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ غلام بھی تمہارے بھائی ہیں۔ یہ کسی وجہ سے تمہارے ہاتھوں میں آگئے ہیں۔ ان پر ظلم نہ کرو۔ آخر یہ بھی انسان تو ہیں۔ اسلام نے حکم دیا کہ اپنے غلاموں کو بھی ویسا ہی لباس، خوراک اور رہائش دیا کرو جیسا خود استعمال کرتے ہو۔ ان کی اچھی تربیت کرو۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی کی ترغیب دی اور اُسے بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ بعض جنایات کے کفارے کے لیے غلاموں کی آزادی کا حکم دیا۔ غرضیکہ اسلام نے اس نظام کو فی الفور ختم نہ کیا کیونکہ معیشت کا زیادہ تر دارومدار انہی غلاموں کے ہاتھوں میں تھا۔ البتہ اس رواج کے تدریجی خاتمہ کے لیے عملی اقدام کیے۔ چنانچہ آج دنیا کے کسی گوشے میں بھی انفرادی غلامی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

خواہشات کا اتباع

اگرچہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرانے کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں تاہم اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم قرار دے کر شرک کرنے

کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ کہ ان ظالموں یعنی مشرکوں نے شرک کے ارتکاب کے لیے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے اور وہ بھی بغیر علم کے۔ یعنی خواہشات نفسانی کے اتباع کے لیے بھی اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ اس سے باز نہیں آتے۔ اللہ نے فرمایا فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ بھلا اس کو کون ہدایت دے سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے۔ جب کوئی شخص اپنی ضد، بے انصافی اور زیادتی کی بناء پر توحید خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا، تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور جدھر وہ جانا چاہتا ہے اُدھر ہی کی توفیق دے دیتا ہے تو فرمایا ایسے شخص کو اللہ کے سوا کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ پھر جب لوگ اس قعر ذلت میں گر پڑتے ہیں وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ تو پھر اُن کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ آج یہ لوگ جن شرکاء کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں، ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے طالب ہوتے ہیں۔ قیامت والے دن ان کے کسی کام نہیں آئیں گے اور وہاں پہ یہ بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ وہ ان کی مدد کرنے کی بجائے اُلٹا ان کے خلاف بیان دیں گے۔

دین کی طرف توجہ

شرک کی قباحت بیان کرنے کے بعد رجوع الی الدین کی تلقین فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا اپنے چہرے کو دین کی طرف قائم کریں حنیف بن کر۔ چونکہ چہرہ انسانی جسم کا اہم ترین حصہ ہے جس میں تمام حواس ظاہرہ اور باطنہ مشمولہ آنکھیں، کان، عقل اور دماغ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے چہرہ بول کر اس سے ذات مراد لی جاتی ہے اور حنیف کا معنی ہے ہر طرف سے کٹ کر صرف ایک طرف لگنے والا۔ تو جملے کا مطلب یہ ہوا کہ کفر، شرک، نفاق اور الحاد وغیرہ سے ہٹ کر صرف دین خالص کی طرف متوجہ ہوں۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں جو شخص نماز کے وقت خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرتا ہے خدا تعالیٰ کی توحید کو مانتا ہے، فریضہ حج ادا کرتا ہے اور ختنہ کرواتا ہے، وہ حنیف

سے حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ
يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران ۶۷) ابراہیم علیہ السلام
نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ حنیف اور مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔
اللہ نے تمام لوگوں کو بھی حنیف بننے کا حکم دیا ہے حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ
بِهٖ (الحج ۳۱) سارے کے سارے حنیف یعنی ہر طرف سے کٹ کر صرف
اللہ کی طرف رجوع کرنے والے بن جاؤ اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے نہ
بنو۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یہ اللہ کی فطرت
ہے جس پر اس نے لوگوں کو تراشا ہے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اللہ کی
پیدا کردہ چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ
یہی مضبوط دین ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ
مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

فطرت کا مفہوم

بعض[1] کہتے ہیں کہ اس مقام پر فطرت سے مراد اسلام ہے۔ یہ اللہ کا دین اسلام ہے اور اسی پر قائم رہنا چاہیئے۔ تاہم مفسرین[2] کرام کی اکثریت کا نظریہ یہ ہے کہ فطرت سے مراد وہ صلاحیت اور استعداد ہے جس کی بنا پر انسان نیکی یا بدی کو منتخب کرتا ہے۔ اللہ نے ہر انسان میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت رکھ دی کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ہر بچہ میں فطرت یعنی حق قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان میں یہ استعداد ودیعت نہ کرتا تو اسے ایمان لانے کی دعوت ہی نہ دی جاتی کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استعداد سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ گویا اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مگر بعد میں لوگ خود اس صلاحیت کو خراب کر دیتے ہیں۔ فرمایا[3] ہر بچہ فطرت سلیمہ پر ہی پیدا ہوتا ہے مگر بعد میں اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ جس مذہب پر وہ خود ہوں اسی

[1] درمنثور ص ۱۵۵ ج ۵ وطبری ص ۴۱ ج ۲۱ [2] درمنثور ص ۱۵۵ ج ۵ ومدارک ص ۲۶۲ ج ۳ (فیاض)

راستے پر بچے کو بھی ڈال دیتے ہیں۔ ابوجہل اور فرعون میں بھی یہ صلاحیت موجود تھی مگر انہوں نے دنیا کی رنگینیوں میں پھنس کر خود اس کو خراب کر لیا۔

تین نجات دہندہ اشیاء

امام ابن جریرؒ نے روایت[1] بیان کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت معاذؓ بیٹھے ہوئے ملے۔ آپ نے حضرت معاذؓ سے پوچھا مَا قِوَامُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یعنی اس اُمت کا ڈھانچہ کیا ہے جس پر درستگی قائم ہوتی ہے تو انہوں نے کہا کہ امت کا قوام تین چیزوں پر ہے۔ اور فرمایا هُنَّ مُنْجِيَاتٌ یہ تین چیزیں نجات دلانے والی ہیں۔ فرمایا پہلی چیز اخلاص ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (الاعراف - ۲۹) اللہ کو پکارو خالص اُسی کے اطاعت گذار بن کر۔ گویا تم میں اخلاص ہونا چاہیئے کیونکہ جہاں اخلاص ہوگا۔ وہاں شرک اور نفاق نہیں ہوگا۔ یہ اخلاص فطرت میں داخل ہے اور ہر انسان میں پایا جانا چاہیئے۔

فرمایا دوسری نجات دہندہ چیز نماز ہے جس پر ملت کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اللہ کے ساتھ تعلق کی درستگی نماز [illegible] ہے۔ اور فرمایا تیسری چیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت عصمت ہے جس کے ذریعے انسان کفر، شرک، نفاق، الحاد اور معاصی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ تو فرمایا ان تین چیزوں پر امت کا قوام یعنی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تشریح

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[2] فرماتے ہیں کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جو سارے نبیوں کی شریعت میں تھیں اور ہماری آخری شریعت میں بھی ضروری ہیں۔ (۱) طہارت یعنی پاکیزگی (۲) اخبات یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار (۳) سماحت یعنی خود غرضی اور خسیس چیزوں سے بچنا (۴) عدالت یعنی عدل و انصاف۔ ان چاروں چیزوں سے جو مرکب کیفیت انسان میں پیدا ہوتی ہے اُسی کو فطرت کہا جاتا ہے پھر فرمایا اس فطرت کے راستے میں تین حجاب رکاوٹ بنتے ہیں۔

(۱) حجاب طبع کہ انسان دنیا کی مادیت میں ہی ڈوب کر رہ جائے اور آخرت

---

[1] طبری صفحہ ۲۱۲/۴ [2] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۳/۱ و ہمعات صفحہ ۸۹ (فیاض)

کا خیال دل سے نکل جائے۔

(۲) حجابِ رسم یعنی انسان ماحول کے رسم و رواج میں ہی پھنس جائے اور حقیقت کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(۳) حجابِ سوءِ معرفت یعنی خدا کی پہچان تو مگر غلط طریقے سے۔ اس کی وجہ سے انسان شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے یا پھر تشبیہ میں۔ اگر خدا تعالیٰ کی صفتِ خاصہ بندے میں مانی جائے تو یہ شرک ہو گیا۔ مثلاً خدا بھی عالم الغیب اور فلاں بزرگ یا نبی بھی عالم الغیب ہے۔ اور اگر بندے کی صفت خدا میں تسلیم کی جائے تو یہ تشبیہ ہے مثلاً بندہ صاحبِ اولاد ہے تو اللہ کی بھی اولاد تسلیم کی جائے۔

الغرض! یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو انسان کی اصل فطرتِ سلیمہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتیں۔ جو شخص ان حجابات سے بچ گیا وہ کامیاب ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت عام طور پر حجابِ طبع میں مبتلا رہتی ہے۔ اگر اس سے بچ جائیں تو لوگ حجابِ رسم میں آ پھنستے ہیں۔ اور اگر وہ آگے بڑھیں تو حجابِ سوءِ معرفت میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ پھر نہ تو اللہ کی صحیح پہچان ہوتی ہے اور نہ وہ شرک و تشبیہ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی ساری عمر گمراہی میں گزر جاتی ہے۔

بہرحال اللہ نے فرمایا کہ حنیف بن کر اپنے چہرے کو دین کے لیے قائم کریں۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے اور اللہ کی پیدا کردہ چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ یہی مضبوط دین ہے جس کے اصول اٹل ہیں اور ہر زمان و مکان کے لیے کارآمد ہیں مگر لوگوں کی اکثریت لاعلمی کی وجہ سے ان اصول و ضوابط کے خلاف ہی چلتی ہے۔

فرمایا دین کے لیے چہرے کو قائم کریں مُنِيبِينَ إِلَيْهِ اس حالت میں کہ تم خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہو۔ وَاتَّقُوهُ اسی سے ڈرتے رہو یعنی اندر صفتِ تقویٰ پیدا کرو۔ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ اور نماز قائم کرو۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو یعنی شرک

کی تردید ہی ہوگئی کہ یہ فطرت سلامت کے خلاف ہے۔

فرقہ بندی

آگے فرقہ بندی کی مذمت بیان کی گئی ہے مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ ان لوگوں میں سے بھی نہ ہوں جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کی۔ جب کسی اصول دین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو ایک نیا فرقہ جنم لیتا ہے۔ البتہ فروعاتِ دین کے اختلافات مذموم نہیں بلکہ باعث رحمت ہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک میں کوئی اصولی اختلاف نہیں بلکہ یہ تو خدا تعالیٰ کی رحمت کی علامت ہیں۔ اصول دین کا اختلاف یہ ہے کہ توحید، رسالت یا قیامت کے متعلق اختلاف کیا جائے۔ جو ان پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر یا منافق ہو گیا۔

جن لوگوں نے اصول دین میں غلط راستہ اختیار کیا وَكَانُوْا شِيَعًا اور گروہ در گروہ تقسیم ہو کر جہنمی بن گئے اُن کی حالت یہ ہے كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ اُن میں سے ہر گروہ اپنے اپنے عقیدہ میں مگن اور خوش ہے اور سمجھتا ہے کہ وہی صحیح راستے پر ہے۔ اسماعیلی فرقے والوں کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ امام میں حلول کر گیا ہے گویا امام کو الوہیت کے درجے پر پہنچا دیا۔ رافضیوں نے بھی اپنے امام کو معصوم قرار دیدیا اور قادیانیوں نے نبوت کے متعلق اپنے عقیدے کو مسخ کر لیا اور کافر ہو گئے۔ بعض فرشتوں کا انکار کر کے گمراہ ہوئے اور بعض نے غلط تاویل کر کے فرائض کا انکار کیا اور علیحدہ فرقہ بن گئے۔ یہ سب جہنمی فرقے ہیں۔ اللہ نے ان کی مذمت بیان کی ہے اور حکم دیا ہے کہ حنیف بن کر اپنے چہرے کو دین کے لیے قائم رکھو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رکھو۔ اُس سے ڈرتے رہو۔ نماز قائم کرو۔ اور مشرکین میں سے نہ بن جاؤ۔ فرقہ بندی سے بچتے رہو اور کوئی غلط راستہ اختیار نہ کرو کہ کامیابی کا یہی راستہ ہے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم
مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ
رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ
يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ
فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾ أَمْ
أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ
بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ﴿۳۵﴾ وَإِذَا
أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا
وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ
أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ﴿۳۶﴾
أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ :- اور جب پہنچتی ہے اِن کو کوئی تکلیف تو پکارتے ہیں اپنے پروردگار کو ، اسی کی طرف رجوع رکھنے والے ہوتے ہیں ۔ پھر جب وہ اِن کو چکھاتا ہے اپنی طرف سے مہربانی کا مزہ تو اچانک ایک گروہ اِن میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے (۳۳) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ، کہ وہ کفر کرتے ہیں اُس چیز کے ساتھ جو ہم نے اُن کو دی ہے ۔ پس فائدہ اٹھا لو ، عنقریب تم جان لو گے (۳۴) کیا ہم نے اُتاری ہے اِن پر کوئی دلیل ۔ پس وہ بول رہی ہے اس چیز کے بارے میں جس کے ساتھ یہ اُس کے ساتھ شریک بناتے ہیں (۳۵) اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو مہربانی کا مزہ تو خوش ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ۔ اور اگر پہنچتی ہے اُن کو کوئی برائی اُس کی وجہ سے جو اِن کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے تو اچانک وہ مایوس ہو جاتے ہیں (۳۶) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لیے چاہے ، اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (۳۷)

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید اور قیامت کا ذکر فرمایا تھا نیز یہ کہ توحید ایک فطری چیز ہے ۔ ہر مولود اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اس میں توحید خداوندی کو تسلیم کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے ۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ اسی کی طرف رجوع کرو اور اسی سے ڈرو ۔ نیز فرمایا کہ نماز قائم کرو

اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ شرک خلافِ فطرت چیز ہے یہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ جب عقائد بگڑ جاتے ہیں تو فرقے پیدا ہوتے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے عقیدہ پر خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ صرف وہی راہِ راست پر ہے۔ یہ سب گمراہی ہے۔ توحید کو ماننا ہی فطری امر ہے۔

توحید کی دلیل

اس کی دلیل اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ جب کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی طرف رجوع رکھنے والے ہوتے ہیں مطلب یہ کہ تکلیف کے وقت انسان لازمی طور پر خالص اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور تکلیف کے ازالے کے لیے اُسی کے آگے دستِ بدعا ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ جب تمام مادی وسائل ختم ہو جاتے ہیں تو اُس وقت اللہ کی طرف رجوع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اگر فوق الاسباب کوئی اور بھی مشکل کشا ہوتا تو لوگ اُس کی طرف رجوع کرتے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

فرمایا ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً پھر جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت اور مہربانی کا مزا چکھاتے ہیں یعنی اُن کی تکلیف دُور کر دیتے ہیں۔ ان کے فقر کو غنیٰ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ بیماری کی بجائے صحت عطا کرتے ہیں شکست کو فتح اور تنزل کو ترقی میں بدل دیتے ہیں اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ تو اچانک اُن میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ تکلیف کے وقت ان کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ مگر جب وہ مشکل کو حل کر دیتا ہے تو اُسے دوسروں کے نام منسوب کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی بجائے غیروں کی نذر و نیاز دینے لگتے ہیں کبھی کسی قبر پر چادر چڑھاتے ہیں اور کبھی کسی زندہ کے آگے سر نیاز خم کرنے

ہیں کہ اُس کی وجہ سے تکلیف دُور ہوئی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بارش تو
اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتی ہے مگر لوگ اُسے ستاروں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ
فلاں نچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی۔ یہ کفرانِ نعمت ہے اور یہی شرک ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ کہ جو کچھ ہم نے
اُن کو عطا کیا ہے اُس کی ناشکری کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت کو غیروں کی
طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا فَتَمَتَّعُوْا پس آج تو تم اس نعمت
سے فائدہ اٹھا لو۔ دنیا کی زندگی میں عیش و آرام کر لو اور سمجھتے رہو کہ ہم ٹھیک راستے
پر جا رہے ہیں۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ دنیا میں
تم نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ تمہاری حالت تو یہ تھی کہ پریشانی کے وقت
خالص خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے اور گڑگڑا کر اسی سے دعائیں مانگتے
تھے مگر جب وہ پریشانی دُور ہو گئی تو عبادت اور نذر و نیاز دوسروں کی ہونے لگی۔
یاد رکھو! تکلیف کے رفع ہونے پر یا نعمت کے عطا ہونے پر اللہ تعالیٰ ہی کا شکر
ادا کرنا چاہیے اور اُسی کی خوشنودی کے لیے اُسی کی نذر و نیاز ہونی چاہیے۔ تم نے
یہ غلط کام کیا جس کا نتیجہ عنقریب سامنے آنے والا ہے۔ جونہی موت آئے گی تمام پردے
ہٹ جائیں گے اور تمہاری ساری کارگزاری سامنے آ جائے گی مگر اس وقت کا افسوس
تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔

شرک کی دلیل

آگے اللہ نے شرک کے رد میں فرمایا اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا
کیا ہم نے اُن کی طرف شرک کی کوئی دلیل نازل کی ہے؟ کیا کسی کتاب میں لکھا ہے کہ
کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں نبی، ولی، بزرگ یا صاحبِ قبر کو کوئی اختیار دے دیا ہے کہ وہ لوگوں
کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے کسی کو کوئی اختیار
نہیں دیا۔ وہ ہر چیز کی تدبیر خود کرتا ہے۔ اس کا کوئی معاون و مددگار نہیں۔
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ) آسمانوں کی بلندیوں سے
کر زمین کی پستیوں تک ہر چیز کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے کسی مخلوق

کو اختیار نہیں دیا کہ فلاں کام وہ کر دیا کرے حتیٰ کہ فرشتے بھی کسی کے حکم کے پابند نہیں ہیں اور وہ وہی کام کرتے ہیں جس کا اللہ انہیں حکم دیتا ہے۔ فرمایا کیا اُن کے پاس کوئی دلیل ہے فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ جو انہیں بتائے کہ خدا کے ساتھ شریک کرنا بتلاتی ہے؟ فرمایا اللہ نے ایسی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ بلکہ یہ از خود شرک کے مرتکب ہو کر اپنے لیے جہنم کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

خوشی اور مایوسی

اب اللہ نے انسانوں کی دوسری حالت بھی بیان فرمائی ہے وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً جب ہم لوگوں کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں یعنی اُن پر انعام و اکرام کی بارش کرتے ہیں۔ انہیں مال و دولت صحت اور خوشحالی عطا فرماتے ہیں فَرِحُوا بِهَا تو وہ اس کے ساتھ خوش ہو جاتے ہیں وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ لیکن جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ اور وہ بھی بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ اس وجہ سے کہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے یعنی ان کے اپنے بُرے کرتوتوں کی وجہ سے جب وہ گرفتار مصیبت ہوتے ہیں، کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے قحط سالی واقع ہو جاتی ہے، بیماری لاحق ہو جاتی ہے یا کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ تو اچانک وہ نا امید ہو جاتے ہیں۔ اور پھر خدا کا شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ مگر جب آسودہ حالی آتی ہے تو اسے خدا کا انعام سمجھنے کی بجائے اپنے علم و ہنر اور عقل و دانش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ مشرک لوگ تو تکلیف میں مایوس ہو کر منہ پھیر جاتے ہیں مگر اہل ایمان کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمانِ مبارک ہے لَا يَقْضِي اللّٰهُ الْقَضَاءَ إِلَّا كَانَ خَيْرًا لَّهُ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ اُن کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے اور اُن کا یہی ایمان ہوتا ہے۔ چنانچہ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ جب ایسے کسی شخص کو راحت نصیب ہوتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وَكَانَ خَيْرًا لَّهُ اور یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔

رزق کی کشادگی اور تنگی

آگے اللہ تعالیٰ نے رزق کی کشادگی اور تنگی کا فلسفہ بیان فرمایا ہے اَوَلَمۡ یَرَوۡا کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے روزی جس کی چاہتا ہے وَیَقۡدِرُ اور تنگ کر دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہتا ہے۔ رزق کی وسعت اور تنگی میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ مشیت ایزدی پر موقوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق روزی کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری جگہ اللہ نے اس کی حکمت بھی بیان کر دی ہے وَلَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَلٰکِنۡ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ (الشوریٰ - ۲۷) اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے سب کے لیے رزق کے دروازے کشادہ کر دیتا تو وہ بغاوت پر اتر آتے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک اندازے کے مطابق روزی نازل کرتا ہے۔ اس کی مصلحت کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی شخص کے حق میں کتنی روزی بہتر ہے اور اس سے زیادہ خود اسی کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بعض نابکاروں اور بیوقوفوں کی روزی بہت زیادہ وسیع کر دیتا ہے جب کہ بعض عقلمند اور ہنرمند بھی تنگی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی حکمت کو وہی بہتر جانتا ہے اور اس کا تذکرہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوتا ہے۔

توحید کے اثبات اور شرک کی قباحت کی جو جو باتیں بیان کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کے اختیار اور تدبیر کا جو بھی مسئلہ ذکر ہوا ہے۔ فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ بے شک اس میں نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو ایمان اور یقین رکھتے ہیں۔ اہل ایمان بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ کا فرمان برحق ہے۔ البتہ مشرک، کافر اور منافق وغیرہ شک و شبہات میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ تسلیم کرنے کی بجائے اعتراض ہی کرتے رہتے ہیں غرضیکہ انسانوں کو اپنی فطری حالت ہی اختیار کرنی چاہیے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہر قسم کے اختیارات اسی کے پاس ہیں اس نے کسی دوسرے کو یہ اختیار تفویض نہیں کیے ہر چیز کی تدبیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے لہٰذا کفر اور شرک جہالت

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ :- پس دے دو قرابتدار کو اُس کا حق اور مسکین کو اور مسافر کو یہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں اللہ کی رضا - اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے ﴿۳۸﴾ اور جو تم دیتے ہو سود کے طور پر

تاکہ بڑھے وہ لوگوں کے مالوں میں ، پس وہ نہیں بڑھتا اللہ کے نزدیک ، اور جو دیتے ہو تم زکوٰۃ ، ارادہ کرتے ہو اس کے ساتھ اللہ کی رضا کا ، پس یہی لوگ ہیں جو اپنے اجر کو دگنا کرنے والے ہیں (۳۹) اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ، پھر وہ تمہیں روزی دیتا ہے ، پھر وہ موت طاری کرتا ہے پھر وہ تم کو زندہ کرے گا ، کیا ہے تمہارے شریکوں میں سے کوئی جو ان کاموں میں سے کوئی کام کرتا ہو ؟ پاک ہے اس کی ذات اور بلند ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ اُس کے ساتھ شریک بناتے ہیں (۴۰)

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی مذمت اور قیامت کا مسئلہ بیان فرمایا اور دینِ فطرت کو اختیار کرنے کا حکم دیا ۔ اللہ نے خدا کی طرف رجوع کرنے اور اسی سے ڈرنے کی بھی تلقین کی ۔ اقامتِ نماز کا تاکیدا حکم دیا اور فرمایا کہ مشرکوں میں سے نہ ہو جو دینی معاملہ میں خرابی پیدا کر کے گروہ در گروہ ہو گئے حالانکہ ہر گروہ باطل عقیدے پر تھا ۔ پھر اللہ نے انسانوں کی عام حالت بھی بیان فرمائی کہ جب اُن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اُن میں فطری جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور وہ خدا کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں ۔ پھر جب وہ تکلیف دور ہو جاتی ہے تو اکثر لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اللہ کے سوا دوسروں کی نذر و نیاز دینے لگتے ہیں اور قبروں پر چڑھاوے چڑھانا شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ اپنی آسائش ، آسودہ حالی اور کامیابی کو خدا کی بجائے دوسروں کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں ۔ فرمایا یہ کفرانِ نعمت ہے ، جس کا نتیجہ انہیں عنقریب بھگتنا پڑے گا ۔

اللہ نے یہ حقیقت بھی بیان فرمائی کہ جب ہم لوگوں پر کوئی مہربانی کرتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ

جاتے ہیں۔ یہ دونوں حالتیں انسان کے حق میں نقصان دہ ہیں۔ پہلی حالت میں وہ اترانے لگتے ہیں۔ غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ دوسری حالت ان کے لیے مایوسی کا باعث بنتی ہے۔ اس کے برخلاف مومن کے حق میں دونوں حالتیں بہتر ہوتی ہیں۔ جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ صبر کا دامن تھام لیتا ہے۔ پھر اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں وسعت عطا کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے۔ رزق کی فراہمی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے ساتھ ہے، اس میں کسی انسانی ہاتھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

قرابتدار کا حق

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ روزی کا کنٹرول صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو پھر انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے عطا کردہ مال کو خرچ کرنے میں بخل نہ کرے بلکہ اس مال میں سے تمام حقداروں کے حقوق ادا کرے۔ چنانچہ اس مقام پر اللہ نے سب سے پہلے قرابتدار کے حق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ قرابتدار کو اس کا حق ادا کرو۔ یہ صیغہ تو واحد مخاطب کا ہے اور اس سے بظاہر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارک ہی مراد ہے۔ لیکن عامۃ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حکم تمام اہل ایمان کے لیے ہے کہ اگر اللہ نے انہیں رزق میں وسعت دی ہے تو وہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کریں۔ قرابت داروں میں سب سے پہلے ذوی الفروض آتے ہیں، اور یہ وہ عزیز ہیں جن کا وراثت میں حصہ اللہ نے قرآن پاک میں مقرر کر دیا ہے پھر عصبات ہیں جو کسی شخص کے قریبی رشتے دار ہوتے ہیں اور تیسرے نمبر پر ذوی الارحام یعنی دور کے رشتہ دار ہیں۔ جیسے چچا، ماموں یا ان کی اولاد وغیرہ۔

ان رشتہ داروں کے حقوق دو قسم کے ہیں۔ ایک واجب اور دوسرے مستحب۔ واجبات میں والدین کی خدمت پہلے درجہ میں آتی ہے۔ اگر وہ محتاج ہیں تو ان کی مالی معاونت کی جائے اور ان کی دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اسی

طرح اولاد کا بھی والدین پر حق ہے۔ جب تک اولاد چھوٹی ہے اس کی ساری ذمہ داری والدین پر آتی ہے۔ اُن کی اچھی تربیت، لکھائی پڑھائی، ہنر سند وغیرہ۔ پھر جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو وہ خود ذمہ دار بن جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے اور اس کے رشتہ دار محتاج ہیں تو اس پر واجب ہے کہ اپنے غریب قرابتداروں کو خرچہ دے۔ امام احمدؒ سے بھی ایسے ہی منقول ہے اور اگر والدین یا دوسرے رشتہ دار صاحبِ استطاعت ہیں تو اُن کی مالی خدمت ضروری نہیں ہوگی۔ البتہ اُن کو جسمانی طور پر راحت پہنچانا، والدین کی مٹھی چاپی کرنا، ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اور اُن کی بات ماننا، صلہ رحمی کرنا وغیرہ مستحبات میں داخل ہے۔

نادار اور مسافر کا حق

قرابت داروں کے حقوق کے بعد فرمایا وَالْمِسْكِيْنَ اور نادار کا حق بھی ادا کرو۔ تمہارے مال میں اللہ نے اس کا حق بھی رکھا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج ۲۴، ۲۵) سوالی اور نادار کو اس سے محروم نہ رکھو بلکہ اُن کا حق بھی ادا کرو۔ پھر فرمایا وَابْنَ السَّبِيْلِ تمہارے مالوں میں مسافروں کا بھی حق ہے۔ دورانِ سفر ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں کہ کسی مسافر کا مال ضائع ہو جائے، جیب کٹ جائے یا کوئی دوسری پریشانی لاحق ہو جائے۔ ایسا مسافر اگرچہ اپنے گھر میں صاحبِ مال ہو مگر بحالت میں اُسے اعانت کی ضرورت پڑی ہے۔ اس حالت میں صاحب حیثیت لوگوں پر اس کی مدد کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے مسافر کا حق زکوٰۃ میں بھی رکھا ہے۔ فرمایا ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ایسے صاحب مال حضرات جنہیں آخرت پر یقین ہے اور وہاں کی کامیابی کے لیے انہیں اللہ کی رضا کی ضرورت ہے، اُن پر ضروری ہے کہ مذکورہ حقوق ادا کریں اور اس معاملہ میں غفلت کا مظاہرہ نہ کریں۔ اگر انہوں نے یہ حقوق ادا کر دیے وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تو یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ انہیں دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہوگی اور آخرت کی کامیابی تو بہ حال دائمی ہے جو انہیں میسر آنے کی۔

سود کی ناپسندیدگی

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں سود کی قباحت اور زکوٰۃ کی برکات کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا اور جو تم سود کے طور پر دیتے ہو لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ تاکہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو جائے فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ پس ایسا مال اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔ سورۃ روم مکی ہے اور مکی زندگی میں سود کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ حرمت ہجرت کے دوسرے سال سورۃ البقرہ میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہاں جو سود کا ذکر آیا ہے اس کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے وہ سود مراد نہیں جو قطعی حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ زیادتی ہے جو کسی لین دین کے معاملہ میں وصول کی جائے مثلاً ایک شخص دوسرے آدمی کو اس نیت کے ساتھ کوئی تحفہ پیش کرتا ہے کہ کسی ایسے ہی موقعہ پر وہ اس سے بہتر تحفہ وصول کریگا۔ تو یہ چیز اگرچہ سود میں داخل نہیں مگر سماحت کے خلاف ہے جس کو ناپسند کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ تھوڑی چیز دے کر زیادہ کی توقع کرنا فیاضی جیسی نیک خصلت کے خلاف ہے۔ ایسی توقع سے حرص، لالچ اور کمینگی کا اظہار ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر میں بھی اللہ کا فرمان ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (آیت - ٦) زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کرو۔ ہمارے ہاں بیاہ شادی کے موقع پر نوتا یا نیوندرا کی رسم پائی جاتی ہے۔ صاحب خانہ کو اس کے عزیز واقارب، یار دوست اور محلے والے کچھ رقوم بطور نیوندرا ادا کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ نیت یہ ہوتی ہے کہ جب ہمارے ہاں ایسی تقریب ہوگی تو ہم اس سے زیادہ وصول کریں گے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے پیش نظر اہل خانہ وصول شدہ رقوم کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتے ہیں تاکہ آئندہ سے لوٹانے میں آسانی رہے۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ اگر کوئی شخص وصول کردہ رقم سے زیادہ ادا نہیں کر پاتا تو قابل ملامت گردانا جاتا ہے۔ یہی کمینہ پن ہے۔ اگر کسی تقریب پر کسی کو ہدیہ پیش

۱؎ طبری صفحہ ۲۲/۲۱۲ (فیاض)

کیا ہے تو اس سے زیادہ وصول کرنے کی نیت نہیں ہونی چاہیئے بلکہ صحیح بات یہ ہے
کہ تحفہ اسی اس بات کا ہوتا ہے جو بے لوث ادا کی جائے اور واپس لینے کی نیت نہ ہو
اگر کوئی شخص کسی موقع پر اس کو بھی کوئی تحفہ پیش کرتا ہے تو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ
اس کے دل میں ملال نہیں ہونا چاہیئے اور تحفہ کو بخوشی قبول کر لینا چاہیئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش
کرتا تو آپ اُس کا بدلہ عطا کرتے اور دوسروں کو بھی یہی کہتے کہ ہدیہ کا بدلہ دیا کرو۔
اگر بالفرض بدلہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے تو اس کے لئے دُعا ہی کر دو۔
جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا یعنی اللہ تجھے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ اس قسم کا تحفہ یا
اس کا بدلہ حسب توفیق دینا مستحب ہے مگر یہ نیت کرنا کہ اس سے زیادہ ہی لوں گا بالکل
غلط رسم ہے۔ الغرض! اللہ نے فرمایا کہ جو تم سود کے طور پر دیتے ہو تاکہ لوگوں کے
مال میں اضافہ ہو، اللہ کے نزدیک تو اس میں اضافہ نہیں ہوتا یعنی ایسے مال میں برکت
نہیں ہوتی۔

زکوٰۃ میں برکت۔

آگے فرمایا وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ جو کچھ تم زکوٰۃ کی صورت
میں دیتے ہو تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ اور اس سے تمہیں رضائے الٰہی مطلوب
ہوتی ہے۔ فرمایا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ایسے ہی لوگ ہیں
جو اپنے اجر و ثواب کو دو چند کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز پاکیزگی
اور اخلاص کے ساتھ فی سبیل اللہ دی جائے وہ اللہ کے نزدیک ترقی کرتی ہے۔
حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ کھجور کا ایک دانہ
اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ قیامت
والے دن وہ کھجور کا دانہ پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔ گویا متعلقہ شخص کو تھوڑے سے خرچ کا
اتنا بڑا اجر حاصل ہوگا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کا کم از کم اجر تو دس گنا ہے اور سات سو
گنا تک جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نیت اور خلوص کے مطابق اس کو لاکھوں کروڑوں گنا
تک بدلہ عطا فرمائیگا۔ زکوٰۃ میں برکت کا یہی مفہوم ہے۔

فرمایا وہی تمہیں پیدا کرتا ہے اور روزی دیتا ہے۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ
وہی تم پر موت بھی طاری کرتا ہے ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کو دی تمہیں
او بارہ زندہ کرے گا۔ یہ چاروں صفات یعنی پیدائش، روزی، موت اور زندگی اللہ تعالیٰ
کے لیے خاص میں۔ اس نے کسی دوسری ذات کو اختیار نہیں دیا کہ ان معاملات میں تصرف
کر سکے۔ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ لہذا شرک سے بچ جاؤ۔

درس توحید

فرمایا جب تمام امور کو انجام دینے والا صرف خدا تعالیٰ ہی ہے۔ هَلْ مِنْ
شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ تو کیا تمہارے شریکوں
میں سے کوئی ہے جو ان امور کو انجام دے سکے؟ تمہارے جعلی مشکل کشا اور حاجت روا
یقیناً یہ کام نہیں کر سکتے۔ جب یہ بات ہے تو پھر ان کو خدا کی صفات میں کیوں شریک
کرتے ہو؟ اور ان کو نذر و نیاز کیوں پیش کرتے ہو؟ فرمایا سُبْحٰنَهٗ اللہ تعالیٰ
کی ذات پاک ہے وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اور بلند ہے ان چیزوں سے
جن کو یہ خدا کا شریک بناتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا نہ کوئی ذات میں شریک ہے، نہ عبادت
میں اور نہ صفت میں۔ وہ بے نیاز ہے اور تمام اختیارات اسی کے پاس ہیں۔ اتنے
دلائل کے باوجود بھی خدا کا شریک ٹھہرانا کتنی حماقت کی بات ہے۔

درس نمبر ۹ — آیت ۴۱ تا ۴۵

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ
اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي
عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۱﴾ قُلْ سِيرُوا
فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّشْرِكِينَ ﴿۴۲﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ
الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ
مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُونَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ
اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: پھیل گیا ہے فساد خشکی اور تری میں اس
کی وجہ سے جو انسانوں کے ہاتھوں نے کمایا ہے ۔ تاکہ

چکھائے اللہ تعالیٰ اُن کو بعض اُن کاموں کا بدلہ جو انہوں نے کیے ہیں ، شاید کہ یہ لوگ واپس پلٹ جائیں (۴۱) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں کہ چلو زمین میں اور دیکھو کہ کیسا ہوا انجام اُن لوگوں کا جو اس سے پہلے تھے اُن میں سے اکثر شرک کرنیوالے تھے (۴۲) پس قائم کریں آپ اپنے رُخ کو دین قیمہ کے لیے قبل اس کے کہ آجائے وہ دن جس کو کوئی لوٹا نہیں سکتا اللہ کی طرف سے ، اُس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے (۴۳) جس نے کفر کیا پس اُسی پر اس کے کفر کا وبال ہوگا ۔ اور جس نے اچھا عمل کیا پس یہ لوگ اپنے نفسوں کے لیے ہی تمہید باندھتے ہیں (۴۴) تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اپنے فضل سے ، بیشک وہ نہیں پسند کرتا کفر کرنے والوں کو (۴۵)

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید اور توحید کے دلائل بیان فرمائے ، اور ساتھ ساتھ قیامت کا مسئلہ بھی سمجھایا ۔ اللہ نے واضح فرمایا کہ تمام اسباب پر اُسی کا تصرف ہے اور رزق کی تنگی اور کشادگی بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے ۔ وہی انسانوں کو زندگی بخشتا ، روزی دیتا اور موت طاری کرتا ہے ، اور پھر قیامت کو دوبارہ بھی زندہ کریگا ۔ اللہ نے شکوہ بیان کیا کہ جب یہ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے تو پھر لوگ شرک سے باز کیوں نہیں آتے اور اللہ کی دی ہوئی روزی میں بخل کیوں کرتے ہیں ؟

بحر و بر میں فسادِ کا ظہور

اب آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ بسا اوقات لوگوں کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے دنیا میں بھی سزا ملتی ہے پھر اللہ نے دنیا میں آنے والے حوادثات اور مصائب کے اسباب کا ذکر فرمایا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ انسانوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے اور اس میں اللہ کی حکمت یہ ہے لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا تاکہ ان کو ان کے بعض کاموں کا بدلہ چکھائے۔ یعنی لوگوں کی بداعمالیوں کی یا تو انہیں سزا دی جائے۔ یا کم از کم تنبیہ کی جائے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ تاکہ وہ واپس لوٹ آئیں یعنی بداعمالیوں سے باز آجائیں۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1] کہ اس فساد سے مراد قحط سالی، کثرتِ اموات اور وبائیں وغیرہ ہے۔ بعض مفسرین[2] فرماتے ہیں کہ فساد سے مراد جنگیں ہیں جو بڑی تباہی پھیلاتی ہیں۔ چنانچہ اس سورۃ کے نزول کے وقت قیصر و کسریٰ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جس کا ذکر سورۃ ہذا کی ابتدائی آیات میں ہو چکا ہے۔ اس وقت بحر و بر میں قتل کا بازار گرم تھا، فریقین ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے جس کے نتیجے میں کثرت سے اموات واقع ہو رہی تھیں، جانور ہلاک ہوتے تھے فصل تباہ ہوتے تھے اور مکانات منہدم ہوتے تھے۔ موجودہ ایٹمی دور کی جنگیں تو مزید خطرناک ہیں۔ اب تو دشمن کے شہروں پر بمباری ہوتی ہے۔ توپیں گولہ باری کرتی ہیں، ٹینک آگ برساتے ہیں۔ کیمیائی اور ایٹمی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں جن سے لاکھوں نفوس آنِ واحد میں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ شہر اور بستیاں کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتی ہیں فصلیں تباہ اور کھیت ویران ہو جاتے ہیں ایسے ہی واقعات کے متعلق فرمایا کہ خشکی و تری میں فساد برپا ہو چکا ہے۔

بدعملی مصیبت کا سبب

اللہ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ تباہی و بربادی عام طور پر انسانوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہے۔ جنگ چھڑ جائے یا کوئی دیگر حادثہ از قسم زلزلہ، طوفان یا کوئی اور آفت آجائے اس میں کسی نہ کسی طور پر انسانی ہاتھوں کا دخل ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض میں مطلق انسانی دخل نہیں ہوتا تاہم عام طور پر یہ انسان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے سورۃ الشوریٰ میں فرمایا وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا

[1] بیضاوی ص ۲۲۳/۲ و مظہری ص ۲۴۸/۷ و مدارک ص ۲۴۴/۳ [2] جمل ص ۳۹۶/۳ (فیاض)

كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (آیت-۳۰) تمہیں جو بھی مصائب پہنچتے ہیں وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ بہت سی باتوں میں درگذر بھی فرماتا ہے۔

اعمالِ بد میں سر فہرست کفر اور شرک ہے، یہی ساری برائیوں کی جڑ بنیاد اور یہی فساد فی الارض ہے۔ امام ابوالعالیہ جو تابعین میں سے ہیں فرماتے ہیں مَنْ عَصَى اللّٰهَ فِى الْاَرْضِ فَقَدْ اَفْسَدَ فِى الْاَرْضِ یعنی جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اُس نے گویا زمین میں فساد پھیلایا۔ منافقوں کے متعلق بھی سورۃ البقرہ میں موجود ہے لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ (آیت-۱۱) زمین میں نفاق کے بیج بو کر فساد نہ برپا کرو۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف-۸۵) زمین کی درستگی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ۔ وہ لوگ تجارت میں خرابی کرتے تھے، لین دین میں ڈنڈی مارتے اور لوگوں کے حقوق غصب کرتے تھے، راستوں میں ڈاکے ڈالتے تھے اور اللہ کے نبی کو تبلیغ سے روکتے تھے یہ سب فساد فی الارض کی تعریف میں آتا ہے۔

جس شخص نے زمین میں معصیت کا ارتکاب کیا، وہ بھی فساد فی الارض کا مرتکب شمار ہوگا کیونکہ صَلَاحُ الْاَرْضِ بِالطَّاعَةِ زمین کی درستگی اطاعت کے ذریعے ہوتی ہے اور نافرمانی باعثِ فساد ہوتی ہے اسی لیے بزرگانِ دین کا مقولہ ہے اَللّٰهُمَّ انْقُلْنِىْ مِنْ ذُلِّ الْمَعْصِيَةِ اِلَى عِزِّ الطَّاعَةِ اے اللہ! ہمیں معصیت کی ذلت سے نکال کر اطاعت کی عزت تک پہنچا۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اخلال بالشرائع یعنی قوانین الٰہیہ کی خلاف ورزی ہی فساد فی الارض ہے۔ اس کے برخلاف حضور علیہ السلام نے اصلاح فی الارض کے ضمن میں فرمایا لَحَدٌّ يُقَامُ فِى الْاَرْضِ خَيْرٌ لِاَهْلِهَا مِنْ اَنْ يُمْطَرُوْا اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا یعنی زمین پر

ے بیضاوی ص۲۲۳ ج۲   ے ابن کثیر ص۳۲۵ ج۲ (فیاض)

اللہ کی ایک حد جاری کر دینا اہل علاقہ کے لیے چالیس دن کی اُس مسلسل بارش سے زیادہ بہتر ہے جو فصلوں کے لیے مفید ہو۔ امام ابو حنیفہؒ بھی فرماتے ہیں اَلْحُدُوْدُ زَوَاجِرُ حدود کا اجرا باعث تنبیہ ہوتا ہے۔ کسی ایک مجرم پر حد جاری ہوتی ہے تو دوسروں کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ برائی سے باز آجاتے ہیں۔

نیک و بد کی موت

بخاری، مسلم اور موطا امام مالک میں یہ حدیثؓ موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اِنَّ الْفَاجِرَ اِذَا مَاتَ يَسْتَرِيْحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ جب کوئی فاسق فاجر آدمی مرجاتا ہے تو بندے، شہر، درخت اور جانور اُس سے راحت پاتے ہیں کیونکہ اس گنہگار آدمی کے گناہوں کا ان اشیا پر منفی اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے رزق میں کمی آتی ہے۔ جب فرعون غرق ہوا تو اللہ نے فرمایا فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (الدخان ۲۹) اُن پر نہ زمین روئی اور نہ آسمان بلکہ اُن پر یہ محاورہ صادق آیا "خس کم وجہاں پاک" دیگر ظالم قوموں کے متعلق بھی اللہ کا فرمان ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام - ۴۵) اللہ نے ظالم قوم کی جڑ ہی اکھاڑ کر رکھ دی۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین کو ان ظالموں سے پاک کر دیا۔ بہرحال جب کوئی فاسق، فاجر، نابکار آدمی مر جاتا ہے تو زمین کی چیزیں اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ اس بدبخت کی نحوست سے بچ گئیں۔

اس کے برخلاف اگر کوئی اہل ایمان نیک آدمی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو آسمان کے وہ دروازے روتے ہیں جہاں سے اُس شخص کے اعمال اوپر جایا کرتے تھے۔ اور وہ دروازے بھی روتے ہیں جہاں سے اُس کی روزی کا حکم آتا تھا۔

امام ابن کثیرؒ[1] نے ابن زیاد کی گورنری کے زمانے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو ایک تھیلی ملی جس میں کھجور کی گٹھلی جتنے موٹے موٹے[2] گندم کے دانے تھے۔ اُس تھیلی پر لکھا تھا کہ یہ اُس زمانے کی پیداوار ہے جب زمین پر عدل و انصاف کا دور دورہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۵/۲۲۷ [2] ابن کثیر ص ۲۲۵/۲۲۷

تھا۔ گویا عدل و انصاف کی اتنی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ وافر غلہ پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح صحیح حدیث[1] میں آتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے دوبارہ نزول پر کفر شرک مٹ جائے گا۔ دنیا میں نیکی اور اطاعت کا دور دورہ ہوگا۔ اس وقت زمین اپنی تمام برکات کو اگل دے گی۔ اور انار کا ایک دانہ سینکڑوں آدمیوں کی خوراک کے لیے کافی ہوگا۔ اس وقت فتنہ فساد ختم ہو جائے گا اور لوگ امن و سکون اور اتفاق و اتحاد کی زندگی بسر کریں۔

مصائب کی وجوہات

مصائب و آلام دو وجوہ سے آتے ہیں۔ یا تو اُن کے ذریعے نافرمان افراد اور قوموں کی ہلاکت مقصود ہوتی ہے اور یا پھر انہیں تنبیہ کرنا مطلوب ہوتا ہے تاکہ وہ نافرمانی سے باز آجائیں اور اطاعت کا راستہ اختیار کرلیں۔ قرآن پاک میں ان دونوں اسباب کا ذکر موجود ہے۔ دیکھئے مصائب تو انبیاء پر بھی آئے ہیں حالانکہ وہ لوگ تو بے پاک ہوتے ہیں۔ اُن کو مصائب کے ذریعے ابتلاء میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کے درجات بلند ہوں ان کو قرب حاصل ہو اور ان کے نفوس پاک ہو جائیں۔ عام انسانوں کو بھی تکالیف آتی ہیں تو ان کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ بدکار آدمیوں کو سزا دینا یا تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے مگر نیک آدمیوں کے لیے تکالیف ان کے ثواب میں اضافہ اور بلندی درجات کے لیے آتی ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ اس کی مثال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کسی بیمار آدمی کو کڑوی دوائی پلا کر کبھی دیا جاتا ہے کہ اس سے تمہیں تکلیف دینا مقصود نہیں بلکہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ یا اگر کسی شخص کے جسم کا کوئی حصہ ناکارہ ہو جائے اور اس کے اثرات جسم کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلنے کا خطرہ ہو تو ڈاکٹر اس مفلوج حصہ جسم کو کاٹ پھینکتے ہیں ہی مصلحت دیکھتے ہیں کیونکہ اس کا کٹ جانا ہی آدمی کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی حکمت میں یہ بات مسلم ہے کہ انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملنا ضروری ہے۔ بعض اوقات ہوتا ہے کہ کچھ حصہ دنیا میں بھی مل جاتا ہے مگر اس کا زیادہ حصہ آخرت میں ہی ملے گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب اس نے عمل کیا تو جزا یا سزا ضرور ملنی چاہیئے اور اس کی آپ نے جو وجوہات

[1] ابن کثیر صفحہ ۲۵/۲۶ (فیاض)

دانائی میں پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت ملکیت اور بہیمیت کی کشمکش کا نام ہے جو ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ بہیمیت مغلوب ہو کر ملکیت غالب آجائے۔ اب اگر اس کے برخلاف ہو تو وہ فطرت کے خلاف ہوگا۔ اور اس کیلئے انسان کو سزا ملنی چاہئے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کی دعائیں اور بد دعائیں بھی انسانی جزاء و سزا کا سبب بنتی ہیں اور یہ دوسری وجہ ہے۔ جب کوئی شخص اچھا عمل انجام دیتا ہے تو ملاء اعلیٰ کے فرشتوں سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ جو اس شخص پر بھی پڑتی ہیں اور اوپر بھی جاتی ہیں اور پھر ان کا انسان کے حق میں اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی برے عمل کا ارتکاب کرتا ہے تو فرشتوں سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ یہ شعاعیں بھی متعلقہ شخص پر پڑتی ہیں اور اوپر کی طرف بھی جاتی ہیں۔ اس طرح گویا فرشتوں کی دعائیں اور بد دعائیں بھی جزا یا سزا کا سبب بنتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جزاء و سزا کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ شرائع کا تقاضا ہے کہ انسان ان کی پابندی کریں۔ اب اگر وہ ان قوانین کی پابندی کرتے ہیں تو جزا ورنہ سزا کے حق دار بننا چاہئیں۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انبیاء کو مبعوث فرما کر حلال حرام اور جائز ناجائز کو واضح کر دیا ہے۔ اب جو شخص اچھا کام کریگا وہ اچھے بدلے کا حقدار ہے اور جو حرام اور ناجائز کو اختیار کریگا معصیت کا ارتکاب کریگا اُسے سزا ملنی چاہیے۔ یہ چار چیزیں جزائے عمل کا سبب ہیں۔

درسِ عبرت

ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں سِيرُوا فِي الْأَرْضِ زمین میں چل پھر کر دیکھو، ذرا سیر و سیاحت کرو اور پھر فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ دیکھو کہ تم سے پہلے لوگوں کا کیسا حشر ہوا۔ لیکن یاد رکھو كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ان کی اکثریت مشرک تھی۔ ظاہر ہے کہ تمام برائیوں میں شرک اور کفر سرفہرست ہیں۔ اللہ کا فرمان ہے إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (لقمان-۱۳) نیز وَالْكَٰفِرُونَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ

(البقرہ - ۲۵۴) جس طرح پہلے زمانے کے لوگ کافر اور مشرک تھے۔ اسی طرح آج بھی اکثریت انہی کی ہے۔ آج دنیا کی کل آبادی کا صرف پانچواں حصہ اہلِ ایمان ہیں۔ جب کہ باقی چار حصے کفر و شرک ہی میں مبتلا ہیں۔ خواہ وہ یہودی ہیں یا عیسائی، اصنامی بت پرست ہیں یا روسی بت پرست، روسی ہیں یا چینی یا دہریے سب کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ پہلے لوگوں کی اکثریت مشرکوں کی تھی اور ایسے لوگوں کا انجام آپ دنیا میں چل پھر کر دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ نے انہیں کس کس قسم کے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ آج اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات دیکھنے والوں کے لیے درسِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

دین پر پختگی

آگے ہر انسان کے لیے حکم ہو رہا ہے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ اپنے رُخ کو دینِ قیم کے لیے قائم کریں یعنی اپنی توجہ خالص دینِ اسلام کی طرف مرکوز کریں کیونکہ کفر اور شرک کا انجام آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دین وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ - ۵) پختہ دین ہے جس کے اصول و ضوابط اٹل ہیں اور جو ہر زمان و مکان اور ہر قوم و ملت کے لیے موزوں ہے۔ یہ قوانین اللہ تعالیٰ نے جو علیم و خبیر ہے اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے نازل فرمائے ہیں۔ لہٰذا ان کی پابندی ہی فلاح ہے۔

آپ اپنا رُخ اسی دین کی طرف قائم رکھیں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ پیشتر اس کے کہ وہ دن آجائے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے جسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ اس سے قیامت کا دن مراد ہے جو اپنے مقرر وقت پر آجائے گا۔ اور جسے کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اس دن محاسبے کی منزل آئے گی اور پھر ہر ایک کو اپنے کیے کا بدلہ مل کر رہے گا۔ فرمایا وہ ایسا دن ہوگا يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ جس دن سب لوگ جدا جدا ہو جائیں گے ہر سطح کے مجرم اپنے اپنے درجے کے مطابق علیحدہ علیحدہ گروہ یا قطار میں کھڑے ہو جائیں گے۔ اسی طرح اطاعت اور نیکی والے اپنے اپنے درجے کی نیکی کے مطابق الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جائیں

گے۔ اس وقت دنیا میں تو نیک و بد سب مخلوط ہیں مگر قیامت والے دن ان کی الگ الگ ٹولیاں بن جائیں گی۔ پھر اس کے بعد مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ جس شخص نے اس دنیا میں کفر کا ارتکاب کیا ہوگا، اُس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اس دن وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اور اعمال بد کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا جس نے دنیا میں نیک اعمال انجام دیے ہونگے فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ پس یہ لوگ اپنے نفسوں کے لیے تمہید اٹھا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایمان اور نیکی والے لوگ اس دنیا میں اپنے لیے ابدی آرام و راحت کا سامان کر رہے ہیں۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے اور نیک اعمال انجام دینے والوں کو بدلہ دے اپنی خاص مہربانی سے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو محض اپنے اعمال پر ہی بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ رہنا چاہیئے بلکہ اصل چیز اللہ کی مہربانی ہے۔ اس کا فضل شاملِ حال ہوگا تو کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ نہیں۔ فرمایا یاد رکھو اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس دنیا میں کامیاب امریکہ، روس، جرمنی اور فرانس جیسی بڑی بڑی سلطنتیں اللہ کے ہاں بھی محبوب ہیں۔ ایسے کافر و مشرک تو اللہ کے ہاں مبغوض ہیں دنیا میں اللہ تعالیٰ اُن کو مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب مقررہ وقت آپہنچے گا تو ان کو گرفت میں لے گا۔ سورۃ الزمر میں ہے وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (آیت - ۷) اللہ تعالیٰ کافروں سے راضی نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر تم ایمان کے ساتھ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو وہ تم سے راضی ہو جائے گا۔ اسی لیے کفر اور شرک کی تردید ہو رہی ہے اور دین قیم یعنی دین توحید کو اختیار کرنے کی تلقین ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ:۔ اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ چلاتا ہے ہواؤں کو جو خوشخبری دینے والی ہوتی ہیں۔ اور تاکہ چکھائے تمہیں اپنی رحمت سے اور تاکہ چلیں جہاز اُس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو تم اُس کے فضل سے، اور تاکہ تم شکر ادا کرو (۴۶) اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف۔ پس گئے وہ اُن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر۔ پھر انتقام لیا ہم نے اُن لوگوں سے جو گنہگار تھے اور ہم پر حق ہے مدد کرنا ایمان والوں کی (۴۷) اللہ کی ذات وہ ہے جو چلاتا ہے ہواؤں کو، پھر وہ اٹھاتی ہیں بادلوں کو۔ پھر پھیلاتا ہے اُس کو فضا میں جس طرح چاہے، اور بناتا اُس کو تہ بہ تہ۔ پس دیکھے گا تو بارش کو کہ نکلتی ہے اُس کے درمیان سے۔ پس جب پہنچاتا ہے وہ جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے تو اچانک وہ خوش ہو جاتے ہیں (۴۸) اور اگرچہ وہ تھے، قبل اس سے کہ اُن پر بارش اتاری جاتی، البتہ ناامید ہونے والے (۴۹)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دین قیمہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا، فرمایا کہ بحر و بر میں لوگوں کے کفر، شرک اور بداعمالیوں کی وجہ سے فساد برپا ہو چکا ہے۔ اللہ نے بعض انسانی اعمال بد کا بدلہ دنیا میں دیا ہے اور تنبیہ کی ہے تاکہ لوگ باز آ جائیں پھر ایمان اور اعمال صالحہ کی فضیلت کا ذکر فرمایا اور ساتھ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کفر کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کی ترغیب اور کفر و شرک کی تردید فرمائی ہے۔

بارش کی ہوائیں

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بعض نشانیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ خوشخبری لانے والی ہوائیں چلاتا ہے۔ ان ہواؤں سے مراد وہ خوشگوار ہوائیں ہیں جو بارش کی آمد سے پہلے چلتی ہیں اور جن سے بارانِ رحمت کے نزول کی امید پیدا ہوتی ہے۔ بارش کے ظاہری اسباب کے متعلق سائنسدان کہتے ہیں کہ سمندر کی فضا گرم ہوتی ہے تو اس سے بخارات اٹھتے ہیں جن میں پانی ہوتا ہے۔ پھر جہاں اللہ کی مشیت ہوتی ہے۔ ان بادلوں کو ہانک کر اُدھر لے جاتا ہے۔ اور بارش کا نزول ہوتا ہے۔ بہرحال ظاہری اسباب کے علاوہ اصل بات یہ ہے کہ جب اور جس جگہ کے لیے حکم خداوندی ہوتا ہے، اُس مقام پر اتنی ہی بارش ہو جاتی ہے۔ جتنی مشیتِ ایزدی میں مقرر ہوتی ہے تو یہ بارش والی ہواؤں کا چلنا اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کے دلائل میں سے ہے۔

قرآن پاک میں ہواؤں کے لیے چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہوائیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی علامت ہیں۔ وہ نام یہ ہیں۔

(۱) مُبَشِّرٰتٍ یعنی خوشخبری سنانے والی (۲) نَشِرٰتٍ (اٹھنے والی) (۳) مُرْسَلٰتٍ (چھوڑی ہوئی) (۴) ذٰرِیٰتٍ (گرد و غبار اڑانے والی)۔ اسی طرح ہواؤں کے چار نام ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زحمت کی علامت ہیں اور سزا کے طور پر چلائی جاتی ہیں۔

(۱) عَقِیْمٌ یعنی بانجھ یہ ہوا قومِ عاد پر چلی تھی۔

(۲) صَرْصَرٌ یعنی تند و تیز ہوا جو جنگلوں اور صحراؤں میں چلتی ہے۔

(۳) عَاصِفٌ یعنی تیز آندھی جو درختوں کو اکھاڑ دیتی ہے اور مکان گرا دیتی ہے۔

(۴) قَاصِفٌ یعنی توڑنے والی۔ جب سمندروں میں چلتی ہیں تو جہازوں کے تختے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔

ہوائیں بطور رحمت

فرمایا کہ خوشخبری دینے والی ہواؤں کا ایک مقصد اللہ کے نزدیک یہ بھی ہے

وَلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت اور مہربانی کا مزا چکھائے جب یہ ہوائیں چلتی ہیں اور باران رحمت کی خوشخبری لاتی ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی ہوتی ہے۔ سمندروں میں بادبانی کشتیوں کے چلنے کا انحصار موافق ہواؤں پر ہی ہوتا ہے۔ جب یہ چلتی ہیں تو مسافر اپنی منزل مقصود تک پہنچتے ہیں اور یہ بھی اُس کی مہربانی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے آجکل تو بڑے بڑے جہاز بھاپ یا تیل سے چلتے ہیں۔ لاکھوں ٹن وزنی جہازوں کے لیے بھی موافق ہوائیں بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں اور جہاز کی رفتار قدرے تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہوائیں ناموافق ہوں تو بڑی دقت پیش آتی ہے اور جہازوں کی رفتار بالکل سست پڑ جاتی ہے یا انہیں رُکنا پڑتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ ہواؤں کا چلنا بہرحال اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دلیل ہے۔

تلاش رزق

فرمایا ہواؤں کا یہ فائدہ بھی ہے وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهٖ تاکہ کشتیاں اللہ کے حکم سے چلیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کا دارومدار بہت حد تک ہواؤں پر ہے۔ اور پھر اس نقل وحمل کے ذریعے وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ اللہ کے فضل میں بہت سی چیزیں آتی ہیں جن میں سرفہرست رزقِ حلال ہے۔ لوگ کشتیوں کے ذریعے اور بڑے بڑے جہازوں کے ذریعے مال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے تجارت کرتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے روزی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح میں فضل ارتفاق کی طرف اشارہ ہے یعنی اچھے طریقے سے زندگی بسر کرنا۔ چنانچہ جب کوئی شخص محنت کر کے رزقِ حلال حاصل کرتا ہے تو اس کی زندگی خوشگوار طریقے سے بسر ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں ارتفاق کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الجمعۃ میں ہے وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (آیت - ۱۰) جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزقِ حلال تلاش کرو۔

اس کے علاوہ دوسری چیز اقتراب یعنی اللہ کا قرب ہے جیسے قرآن میں خوان کا نام دیا گیا ہے جیسے حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کے متعلق فرمایا یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح۔۲۹) کہ وہ اللہ کا فضل یعنی رزق حلال اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ جب تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق انجام دیئے جائیں گے تو اُس کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور اسی سے اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔

اللہ کا شکر — فرمایا ہواؤں کے چلنے سے ایک مقصود یہ بھی ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ دیکھو اس نے ہوائیں چلا کر تمہاری زیست کے کیسے کیسے سامان پیدا کیے ہیں۔ سامان کی سب سے زیادہ نقل و حمل آج بھی بحری راستوں سے ہوتی ہے اور ایک ملک کی چیزیں دوسرے ملک میں پہنچ کر لوگوں کی ضروریات پوری کرتی ہیں جس سے زندگی خوشحال ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا شکر ادا کرے۔ اور شکر یہ کا اولین اظہار اس طرح ہے کہ انسان اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرے۔ فضول خرچی اور حرام کے راستے میں اپنے رزق کو ضائع نہ کرے۔ مالک حقیقی کو پہچان کر اُس کی توحید پر ایمان لائے اور مال و دولت کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کرے۔ اگر مال کو غلط راستے پر خرچ کریگا، حرام کاموں میں لگائے گا، عیاشی اور فحاشی کا سامان کریگا، یا رسومات اور بدعات میں خرچ کریگا تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہوگی۔ اللہ نے ہواؤں کو چلا کر تمہارے لیے زیست کا سامان پیدا کیا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرو۔

مجرمین سے انتقام — ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ البتہ تحقیق ہم نے بھیجے آپ سے پہلے رسول ان کی اپنی اپنی قوم کی طرف فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ پھر وہ آئے اپنی قوم کی طرف واضح نشانیاں لے کر۔ بینات میں معجزات دلائل، احکام، مسائل اور شرائع سب شامل ہیں۔ اللہ کے نبی لوگوں کی راہنمائی کرتے

دو چیزیں پیش کرتے ہے مگر لوگوں کی اکثریت نے ان کا انکار کیا۔ اور جیسا کہ آیت میں گزرچکا ہے کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ان کی اکثریت شرک میں ہی مبتلا رہی اور ایمان نہ لائی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر زمانے میں نافرمان، باغی، مشرک اور کافر اکثریت میں رہے ہیں۔ جب کہ اطاعت گزار لوگوں کی تعداد کم رہی ہے بہرحال فرمایا کہ ہم نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا، انہوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچایا، مگر جب وہ ایمان نہ لائے بلکہ الٹا اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی، انہیں جادوگر کاہن اور جھوٹا کہا تو اللہ نے فرمایا فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ہم نے ان مجرموں سے انتقام لیا۔ انہوں نے انکار کیا تو سزا کے مستحق ٹھہرے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ انتقام کبھی تو دنیا میں ہی لیا جیسے قوم عاد، قوم ثمود، قوم نوح قوم لوط اور قوم ابراہیم کو دنیا میں ہی تباہ و برباد کر دیا۔ اور مکمل طور پر آخرت میں ہی انتقام لیا جائے گا۔ جب انہیں ان کی کارگزاری کی پوری پوری سزا ملے گی۔

نصرت الہی

فرمایا مجرموں سے تو ہم نے انتقام لیا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر حق ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں اللہ تعالیٰ نے بسا اوقات اہل ایمان کی مدد فرمائی اور ان کو کافروں اور مشرکوں پر غلبہ عطا فرمایا۔ ان کو سزا سے بچایا اور ان کے دین اور صداقت کو دنیا میں واضح کیا۔ مومنوں کی مدد کی یہ بھی ایک صورت ہے۔

فقہائے کرام نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کس طرح حق ہے؟ بعض فرماتے ہیں کہ بندوں کا اللہ پر کوئی حق نہیں، بلکہ صرف اللہ کا حق بندوں پر ہے۔ اس لیے یہ اصحاب فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنی دعا میں "بحق فلاں" نہیں کہنا چاہیے لِاَنَّهٗ لَا حَقَّ لِلْمَخْلُوْقِ عَلَى الْخَالِقِ کیونکہ مخلوق کا کوئی حق خالق پر ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ خالق کا حق بندوں پر یہ ہے کہ بندے اس پر ایمان لائیں، اس کی توحید کو تسلیم کریں، اس کے انبیاء پر ایمان لائیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ گمراہ فرقوں میں معتزلہ ایک ایسا فرقہ ہے جو ہر چیز کو عقل

کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو چیز عقل کی کسوٹی پہ پوری نہ اترے اُس کی الٹی سیدھی تاویل کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں نے عذاب قبر کا انکار کیا ہے اور معجزات میں کئی قسم کی تاویلیں کی ہیں۔ بہرحال معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیز بندوں کے حق میں اچھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ پہ واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ سو فیصدی باطل ہے۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ دعا میں حق کا لفظ استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے معتزلہ جیسے گمراہ فرقے کی تائید ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں حق کا لفظ دو مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقوق اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمے رکھے ہیں۔ ایک تو یہی ہے نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ نے ایمان والوں کی مدد اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور دوسری جگہ سورۃ یونس میں ہے۔ جہاں فرمایا حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (آیت ۱۰۳) یعنی ایمان والوں کو نجات دینا ہمارے ذمے حق ہے۔ اس سلسلہ میں محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ حق دو قسم کے ہیں۔ ایک وجوبی یعنی لازمی حق ہے جو کہ مخلوق میں سے کسی کا بھی اللہ پر نہیں ہے۔ البتہ دوسرا حق اللہ کے فضل و کرم کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے بعض چیزیں اپنے ذمے لازم قرار دے رکھی ہیں کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔ چنانچہ مذکورہ دونوں حق یعنی مومنوں کی مدد اور ان کی نجات کے حقوق اللہ نے خود اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ ورنہ فی الواقعہ مخلوق میں سے کسی کا حق اللہ پر لازم نہیں آتا۔ اس بات کا ثبوت حدیث شریف میں بھی ملتا ہے صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ حضور علیہ السلام کے پیچھے خچر پر سوار تھے۔ اس دوران میں آپ نے فرمایا اے معاذؓ! اَتَدْرِيْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں فرمایا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا اللہ کا حق بندوں پہ یہ ہے کہ

وہ اُس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ حضور علیہ السلام نے پھر فرمایا معاذؓ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ انہوں نے پھر عرض کیا، کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا یعنی بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ اگر وہ شرک کا ارتکاب نہ کریں تو اللہ انہیں عذاب سے بچائے۔ بایں ہمہ اللہ نے یہ حق اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمے لے رکھا ہے ورنہ خالق پر مخلوق کی کوئی چیز ضروری نہیں۔ آیت زیرِ درس میں نصرتِ مومنین کا جو حق اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ بھی اُس کے فضل و کرم سے ہے اور اس طرح یہ بھی مومنوں کا لازمی حق نہیں بنتا۔

الغرض! معتزلہ کے عقیدے کے مطابق دُعا میں حق کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر اس حق سے فضل و کرم والا حق مراد ہو تو پھر بحق فلاں کہنا جائز ہے جیسا کہ شیخ سعدیؒ کے کلام میں بھی موجود ہے۔

الٰہی بحق بنی فاطمہ
کہ بر قولِ ایمان کنی خاتمہ

اے اللہ! حضور علیہ السلام کے اہلِ بیت کے طفیل یعنی اُن کے حق کی وجہ سے میرا خاتمہ ایمان پر کر دے۔ دوسرا لفظ طفیل بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی وسیلہ ہے۔ اسی طرح بجاہ کا لفظ بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں بحرمت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اُن کے وسیلہ سے ہمارا خاتمہ بالایمان ہو۔ اللہ تعالیٰ ہماری پریشانیوں کو دور فرمائے اور ہماری مرادوں کو پورا کرے، ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر وسیلے سے بھی وہی وسیلہ مراد لینا چاہیئے جو مشروع ہے۔ مشرک لوگ وسیلے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ جن کے وسیلے سے دُعا کی جا رہی ہے، وہ ضرور ہی ہماری مراد پوری کرا دیں گے۔ چاہے خدا تعالیٰ راضی ہو یا ناراض۔ اس قسم کا وسیلہ باطل ہے۔ البتہ اگر یوں کہا جائے کہ مولا کریم! تیرا فلاں

بندہ نیک آدمی اور عبادت گزار تھا۔ ہمیں اُس سے محبت ہے۔ اُس نے ہمیں صحیح راستہ بتلایا۔ لہٰذا اُس کی برکت، اس کے طفیل یا اُس کے وسیلے سے ہماری دُعا قبول فرما تو ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ علمائے دیوبند اس وسیلہ کے قائل ہیں لیکن اس طریقے سے دُعا مانگنا ضروری بھی نہیں کہ اس کے بغیر قبول ہی نہیں ہوگی۔

بارش ذریعہ مسرت

ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے فَتُثِیْرُ سَحَابًا پھر وہ ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ پھر پھیلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کو فضا میں جس طرح چاہتا ہے وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا اور بنا دیتا ہے اُس کو تہ بہ تہ فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش اُس کے درمیان سے نکلتی ہے یعنی خدا کے حکم سے بارش برسنے لگتی ہے فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ پھر جب پہنچاتا ہے بارش اپنے

بندوں میں سے جس کو چاہے۔ یعنی جس علاقے میں بارش برسانا مقصود ہو، وہاں بارش ہونے لگتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ تو اچانک وہاں کے لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی باران رحمت ہو رہی ہے، زمین سرسبز ہوگی۔ پھل پھول اور اناج پیدا ہوگا جس سے انسان اور جانور مستفید ہوں گے۔ لہٰذا وہ خوش ہو جاتے ہیں وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ اگرچہ نزول باران سے پہلے وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی ہوگی اور انسان اور جانور خوراک سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی مہربانی سے بارش ہو جاتی ہے تو لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ اب اُن کی اُمید بر آنے والی ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۰) وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (۵۱) فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (۵۲) وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۵۳) ع

۵ ع ۱۲ ۸

ترجمہ:- پس دیکھو اللہ کی رحمت کی نشانیوں کی طرف کہ کس طرح وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد ۔ بیشک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے ۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (۵۰) اور اگر ہم بھیج دیں ہوا ۔ پس یہ دیکھیں اُس (کھیت) کو زرد تو البتہ ہو جائیں گے اس کے بعد ناشکر گزار (۵۱) پس بیشک آپ نہیں سنا سکتے مُردوں کو اور نہیں سنا سکتے بہروں

کو پکار جب کہ وہ پشت پھیر کر جا رہے ہوں (۵۲) اور آپ نہیں ہدایت دے سکتے اندھوں کو اُن کی گمراہی سے۔ آپ نہیں سناتے مگر اُن کو جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر۔ پس وہ فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۵۳)

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا رد فرمایا اور ساتھ اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں بیان فرمائیں جو اثباتِ توحید اور وقوعِ قیامت کی دلیل بنتی ہیں۔ ان نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہواؤں کو چلاتا ہے۔ فضا میں بادل اٹھتے ہیں اور پھر اُن سے بارش برسا کر اپنی مخلوق کو خوش کرتا ہے اگرچہ لوگ قبل از بارش مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو زمین میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔ پھل، پھول اور اناج پیدا ہوتے ہیں جو انسانوں اور جانوروں کے لیے خوراک بنتے ہیں اور اسی لیے یہ اُن کے لیے راحت کا سامان ہوتا ہے

مردہ سے زندہ

اب اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ پس دیکھو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نشانیوں کی طرف كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کہ وہ کس طرح زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے خشک ہو جانے کے بعد۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ یہی مشاہدہ اس بات کی علامت ہے کہ جو اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کرتا ہے، وہی مرنے کے بعد انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کوئی شے اُس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔

اسی سے قیاس کیا جا سکتا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ مردہ دلوں کو انبیاء مبعوث فرما کر اور اپنی کتابیں نازل فرما کر اُن کے لیے ہدایت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام ۱۲۲) جو شخص مردہ تھا یعنی جس کا دل ہدایت سے محروم تھا، کفر، شرک

میں مبتلا تھا، ہم نے اُس کو ایمان کی دولت دے کر زندہ کر دیا۔ کافروں اور مشرکوں کے دل مردہ ہوتے ہیں، جب کہ ایمان اور توحید سے دلوں میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرنے والا آدمی زندہ ہے اور جو اس سے غافل ہے وہ مردہ ہے یعنی اس کا دل مردہ ہے۔

ناشکرگزار انسان

انسان کی ناشکرگزاری کے متعلق فرمایا وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا اور اگر ہم ایسی ہوا چلا دیں جس سے کھیت زرد پڑ جائیں یعنی سوکھ جائیں لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ تو اس کے بعد انسان ناشکری کرنے لگتے ہیں۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خوشخبری لانے والی ہواؤں کو چلاتا ہے، فضا میں بادل بلند ہوتے ہیں اور پھر جہاں اللہ کو منظور ہوتا ہے، بارانِ رحمت نازل ہوتی ہے تو لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اللہ تعالیٰ خشک ہوائیں چلا دے جس سے لوگوں کے کھیت خشک اور فصل ویران ہو جائیں تو انسان ناشکری کرنے لگتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انسان کے پیش نظر اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے اگر وہ حاصل ہو گیا تو راضی ہو گیا، ورنہ ناراض۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پیش نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہونی چاہیے کہ وہ کن کاموں پر خوش ہوتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش آجائے، جو انسان کے لیے غیر مفید ہو تو بھی اُسے اللہ کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے اور کسی وقت بھی ناشکری کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

کفار کی سماعت سے محرومی

آگے ارشاد ہوتا ہے فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ بیشک آپ نہیں سنا سکتے مُردوں کو وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ اور نہ آپ بہروں کو پکار سنا سکتے ہیں جب کہ وہ پشت پھیر کر جاتے ہوں۔ وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ اور آپ اندھوں کو بھی ان کی گمراہی سے ہدایت کی طرف نہیں لا سکتے۔ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ آپ تو صرف انہی کو سنا سکتے ہیں، جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ فرمانبرداری کرنے والے ہیں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے اور انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر نورِ اسلام کی طرف لانے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ اس کے باوجود جب لوگ آپ کی بات کو سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تو آپ سخت رنجیدہ ہوتے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی ہے کہ مُردوں اور بہروں کو سنانا یا اندھوں کو راہِ ہدایت کی طرف لانا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کی بات تو وہ شخص سُنے گا جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتا ہے اور جملہ احکام کی اطاعت کرتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مشرکوں کو مُردوں، بہروں اور اندھوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح یہ لوگ نہ سُن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ دلائلِ قدرت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی آیات سورۃ نمل اور سورۃ نحل میں بھی گزر چکی ہیں اور آگے سورۃ فاطر اور زخرف میں بھی آ رہی ہیں۔ ان میں مذکور مُردوں سے مراد حقیقی مُردے نہیں بلکہ کافر اور مشرک ہیں۔ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور ان پر آیاتِ الٰہی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ گویا اس سُننے سے وہ سننا مراد ہے جو کافروں اور مشرکوں کے لیے مفید ہو۔ وگرنہ ان کے محض سُننے سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ کفار و مشرکین سنتے تھے اور دیکھتے بھی تھے مگر احکامِ الٰہی کو سُن کر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ آپ اُن کو نہیں سُنا سکتے یعنی راہِ ہدایت پر نہیں لا سکتے جیسا کہ فرمایا: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (القصص: ۵۶) جسے آپ پسند کریں اسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ ہدایت اُس کو ملتی ہے جس کو اللہ چاہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ[۱]، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ[۲] اور امام بیضاویؒ[۳] نے بھی اس آیت سے یہی اخذ کیا ہے کہ جس طرح حقیقی مُردے کسی کی بات سُن کر مستفید نہیں ہو سکتے اس طرح کافروں اور مشرکوں پر بھی اللہ کے نبی کی بات نہ سننے کے برابر ہے۔ اگر حقیقی مُردوں کو سارا قرآن بھی سُنا دیا جائے تو وہ اس سے کیا فائدہ اٹھائیں گے کیونکہ وہ دارالعمل سے دارالجزاء میں پہنچ چکے ہیں۔ اسی طرح کافروں اور مشرکوں کے تعلق

---

[۱] بیان القرآن صفحہ ۱۳/۹۲ [۲] مظہری صفحہ ۲۵۴/۷۰ [۳] بیضاوی صفحہ ۲۲۴/۲ (فیاض)

بھی فرمایا کہ آپ ان کو ایسی بات نہیں سنا سکتے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکیں۔

سماعِ موتیٰ پر اختلاف

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی مُردے جو قبروں میں دفن ہو چکے ہیں کیا وہ بھی زندوں کی بات سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کے بھی دو حصے ہیں یعنی عام مُردے اور انبیاء علیہم السلام۔ جہاں تک عام مُردوں کا تعلق ہے، یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے اختلافی چلا آ رہا ہے۔ بعض سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں اور بعض نے انکار کیا ہے تاہم نصوص دونوں جانب موجود ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سماعِ موتیٰ کا انکار کرتی ہیں جبکہ حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اس کے قائل ہیں۔ حدیث میں سے امام بخاریؒ نے سماعِ موتیٰ کا باب باندھا ہے "باب المیت یسمع قرع نعال" یعنی جب لوگ مردے کو دفن کر کے واپس لوٹتے ہیں تو مردہ ان کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ سے روایت بھی منقول ہے کہ جب کوئی شخص قبر پر جا کر سلام کرتا ہے تو اگر صاحبِ قبر اس شخص کو دنیا میں پہچانتا تھا۔ تو دعا اور سلام کے وقت بھی پہچانتا ہے نیز وہ دعا کو اور دعا اور سلام کو سنتا ہے اور اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ مگر فرمایا تم اس کی آواز کو نہیں سن سکتے۔ چنانچہ اسی اختلاف کے پیشِ نظر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ جو اختلاف صحابہ کرامؓ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے بارے میں اب کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایسے مسائل کو اپنی جگہ پر چھوڑ دو۔ کوئی شخص جس پہلو کو بھی اختیار کرے گا۔ وہ درست ہو گا۔ لہٰذا کسی شخص کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی حاشیہ قرآن میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ کسی مردہ کو زندہ کر دے مگر نبی کی قدرت حاصل نہیں کہ کسی مردہ کو بات سنوا سکے۔ اللہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے اسی طرح آپ نہ بہروں کو سنا سکتے ہیں اور نہ اندھوں کو دکھا سکتے ہیں خصوصاً جب کہ وہ سننے اور دیکھنے کا ارادہ بھی نہ رکھتے ہوں۔ لہٰذا آپ ان کافروں اور مشرکوں سے متعلق دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ تبلیغِ حق کا کام جاری رکھیں۔ آپ

ؔ روح المعانی ص۵۵ ج۲۱ ۔ ۲ؔ بخاری ص۱۷۸ ج۱ ۔ ۳ؔ ابن کثیر ص۴۳۹ ج۳ و روح المعانی ص۵۵ ج۲۱ ۔ ۴ؔ تفسیر عثمانی ص۵۸۳ (فیاض)

کی بات وہی سنے گا جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتا ہے اور اطاعت گزار ہے۔

قسم کا مدار عرف پر

سماع موتی سے فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے متعلق قسم اٹھالے کہ میں اس سے بات نہیں کروں گا اور وہ مر جاتا ہے۔ پھر اگر اس نے مرنے کے بعد اسے کسی معاملہ میں مخاطب کیا تو اس کی قسم بھی نہیں ٹوٹے گی کیونکہ قسم کا مدار عرف عام پر ہوتا ہے۔ کسی شخص کی دوسرے آدمی سے بات نہ کرنے کی قسم عرفِ عام میں اس کی زندگی تک ہی محدود سمجھی جاتی ہے اور اگر اس نے مرنے کے بعد بات کی ہے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ بعض فقہاء نے قسم نہ ٹوٹنے کی وجہ یہ لی ہے کہ مرنے کے بعد چونکہ وہ شخص سننے سے عاری ہو چکا ہے، لہذا اسے بات کرنے پر محمول نہیں کیا جائیگا اور نہ ہی قسم ٹوٹے گی۔ بہرحال صحیح بات یہی ہے کہ قسم کا مدار عرف پر ہوتا ہے نہ کہ سماع یا عدم سماع پر۔ عرف کی دوسری مثال اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ میں فرش پر نہیں لیٹوں گا، مگر وہ زمین پر لیٹ جاتا ہے تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ کیونکہ عرفِ عام میں فرش سے مراد خالی زمین نہیں بلکہ بستر ہوتا ہے جس میں دری، چادر، گدا وغیرہ شامل ہو۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی شخص گوشت نہ کھانے کی قسم اٹھائے، مچھلی کا گوشت کھائے تو بھی حانث نہیں ہوگا، کیونکہ عرف میں گوشت کا اطلاق گائے بھیڑ، بکری وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے حالانکہ خود اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو لَحْمًا طَرِيًّا (فاطر۔۱۲) یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ اس کی مثال بھی دی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ سری کا گوشت نہیں کھائے گا اور پھر چڑیا کے سر کا گوشت کھائے تو بھی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ سری کا اطلاق عرفِ عام میں جانوروں کے سر پر ہوتا ہے نہ کہ پرندوں کے سر پر۔ الغرض قسم کا معاملہ عرف پر مبنی ہوتا ہے اسے عدم سماع موتی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

انبیاء کا سماع

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ عام مردوں کے سماع کے متعلق تو صحابہ کرامؓ کے زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے لہذا ہمیں اس مسئلہ میں زیادہ کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام کے سماع کا مسئلہ متفق علیہ ہے۔

امت کے تمام فرقے اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سنتے ہیں۔ صحیح حدیث[1] کے الفاظ یہ ہیں مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ نَائِيًا أُبْلِغْتُهُ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے قریب صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے میں اُس کو خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھتا ہے تو فرشتے لے پہنچاتے ہیں۔ یہ حدیث اگرچہ غریب ہے مگر سند کے لحاظ سے صحیح ہے۔

تاہم اس زمانے میں عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی بھی نہیں سنتے۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ اگر انبیاء کے سماع کو تسلیم کر لیا جائے تو لوگ اُن سے استمداد کو جائز تصور کر کے شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ قیاس درست نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص نبی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر پکارتا ہے تو وہ شرک ہے خواہ نبی کی زندگی میں پکارا جائے یا وفات کے بعد۔ لہذا ان دو مسائل کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے جو شخص نبی کی قبر کے قریب جا کر سلام پیش کرے اُسے شفاعت کی درخواست بھی کرنی چاہیے کہ آپ اُس کے حق میں اللہ کے حضور سفارش کریں کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو اور آپ کی امت میں میرا حشر ہو۔ بہرحال انبیاء کے سماع میں عام طور پر کسی کا اختلاف نہیں حتیٰ کہ جماعت اہل حدیث کے پیشوا سید نذیر حسین دہلویؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام قریب سے صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔

آج سے تقریباً چھیاسی سال پہلے اہل بدعت کے پیشوا مولوی احمد رضا خاں نے علمائے حق کے متعلق جب کفر کا فتویٰ دیا تھا تو مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے "المہند" مرتب کیا تھا جس میں انہوں نے چھبیس ۲۶ مسائل بیان کیے تھے جو بریلویوں کے فتویٰ کا جواب تھا۔ اس پر علمائے دیوبند کے علاوہ مصر اور شام وغیرہ کے مستند علماء کے دستخط بھی موجود ہیں۔ ان مسائل میں حیات النبی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ علمائے دیوبند قائل ہیں کہ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور جو صلوٰۃ وسلام قریب سے پڑھا جائے،

---

[1] مشکوٰۃ صـ ۸۷ (فیاض)

اُس کو سنتے ہیں۔

عدم نزول کا سماع

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ دنیا کا کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ البتہ جو کام انسان خود اسبابِ عادیہ کے دائرے میں رہ کر کرتا ہے، وہ ان کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور جو عام حالات کے برخلاف غیر معمولی طریقے سے انجام پاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنا تو ولی مار کر دوسرے کو ہلاک کر دیتا ہے تو وہ قاتل کہلائیگا اور اگر ایک مٹھی کنکریاں پھینکنے سے دشمن کا سارا لشکر ہی ہلاک ہو جائے تو یہ اللہ کا فعل شمار ہوگا، کیونکہ یہ اسبابِ عادیہ کے تحت نہیں آتا۔ اس کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے کر دی اور فرمایا وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال ۔ ۱۷) کنکریوں کی مٹھی آپ نے نہیں پھینکی تھی اے پیغمبر! بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ بالکل اسی طرح فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ کہ تم خود کلام کر کے اپنی آواز مُردے کو نہیں سنا سکتے کیونکہ یہ چیز اسبابِ ظاہرہ کے خلاف ہے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے تمہاری کوئی بات مردے کو سنا دے تو اس سے کوئی مومن انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جن باتوں کا سماع غیر معمولی طریقے سے نصوص کے ذریعے ثابت ہے۔ ہم اُس سماع کے قائل ہیں۔ محض قیاس کی بناء پر دوسری چیزوں کو سماع کے تحت نہیں لا سکتے۔ مثلاً نص سے ثابت ہے کہ مردہ دفن کر کے جانے والوں کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے تو اس کو تو تسلیم کریں گے مگر اس حد سے آگے نہیں جائیں گے۔ بعض صحیح احادیث سے سلام کو سننے اور اس کا جواب دینے کا بھی ذکر آتا ہے مگر فرمایا تم اُن کی آواز کو نہیں سن سکتے۔ قبرستان میں جا کر مسنون طریقہ یہ کہا جاتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ ۔ اے قبروں والو! تم پر سلام ہو۔ اے مسلمان قوم کے گھر والو! تم پر سلام ہو۔ اور ہم بھی عنقریب تم سے ملنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب ایسا ہی

لہ ابن کثیر ص ۴۳۹ / ۳ (فیاض)

ت جیسے زندوں سے ہوتا ہے۔ اسی لیے مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ
اگر مُردوں کے سننے کا بالکل ہی انکار کر دیا جائے تو یہ تو تضحیک والی بات ہوئی کہ
پتھروں کی طرح سننے کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو جن میں اس طرح سے خطاب
کیا جائے۔ خطاب کا یہ طریقہ بتا رہا ہے کہ سماع کی کوئی صورت ضرور ہے اگرچہ
وہ ہمارے حس کی بات نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن میں ایسا شعور ضرور رکھا ہے
جس کے ذریعے وہ سنتے ہیں خواہ ایک خاص حد تک ہی ہو۔

عذابِ قبر

بعض لوگوں نے سماع کا انکار کر کے عذابِ قبر کا بھی انکار کیا ہے حالانکہ یہ
نصوص سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ عذاب روح اور جسم دونوں کے
ساتھ ہوتا ہے نہ کہ صرف روح کے ساتھ۔ اگر روح جسم سے باہر ہے، تب
بھی اس کا عکس جسم پر پڑتا ہے جس سے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کی مثال
یہ ہے کہ سورج اگرچہ ہماری زمین سے کروڑوں میل دور ہے مگر اُس کی روشنی اور
حرارت کا اثر ہم تک پہنچتا ہے۔ اگر انسان کا سارا جسم گل سڑ بھی جائے تب بھی اس
کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہتا ہے جسے عذاب یا جزا کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ حدیث شریف
میں آتا ہے کہ عام مُردوں کے اجسام گل سڑ جاتے ہیں مگر ریڑھ کی ہڈی کا کچھ نہ
کچھ حصہ ضرور باقی رہتا ہے اور اسی سے قیامت کو انسان کا ڈھانچہ دوبارہ کھڑا کیا
جائے گا۔ بہرحال جمہور محققین اور محدثین اس بات کے قائل ہیں کہ عالمِ برزخ میں
عذابِ قبر روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

حرفِ آخر

بہرحال ان آیات میں جس سماع کی نفی کی گئی ہے وہ ایسا سماع ہے جو مفید
ہو۔ مطلب یہ کہ آپ مُردوں کو ایسی بات نہیں سنا سکتے جس سے وہ فائدہ اٹھا
سکیں۔ فرمایا جس طرح بہرہ اور اندھا سماعت اور بصارت سے مستفید نہیں ہو سکتا،
خاص طور پر جب کوئی توجہ بھی نہ کرے اور پشت پھیر کر چلا جائے تو ایسے شخص
کو سماعت کا کیا فائدہ ہوگا؟ اسی طرح کفار و مشرکین کی مثال بہروں
اور اندھوں جیسی ہے، یہ لوگ بھی ہدایت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

اس سے تو وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور ہماری فرمانبرداری کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ :- اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کمزوری سے پھر اس نے بنائی کمزوری کے بعد قوت، پھر بنائی قوت کے بعد پھر کمزوری اور بڑھاپا۔ پیدا کرتا ہے جو چاہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت رکھنے والا ہے ﴿۵۴﴾

اور جس دن برپا ہوگی قیامت تو قسم کھائیں گے مجرم
کہ نہیں ٹھہرے وہ سوائے ایک گھڑی کے۔ اسی طریقے
سے وہ پھیرے جاتے تھے (۵۵) اور کہیں گے وہ لوگ
جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے البتہ تحقیق ٹھہرے ہو تم اللہ
کی کتاب میں بعث کے دن تک۔ پس یہ بعث کا دن
ہے لیکن تم نہیں جانتے تھے (۵۶) پس اس دن نہیں فائدہ
دے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ان کا عذر پیش کرنا
اور نہ اُن کو موقع دیا جائے گا کہ وہ راضی کر سکیں (۵۷)

ربط آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک کی تردید کے ساتھ اپنے رُخ کو
دین حق کی طرف پھیرنے کا حکم دیا۔ اہل ایمان اور کفار کا انجام بیان فرمایا اور پھر
قدرت کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے۔ ہواؤں کا چلنا، سمندروں میں کشتی رانی
فضا میں بادلوں کا پھیلانا اور بارش برسانا اور اس کے ذریعے خشک زمین کو سرسبز بنانا
سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ پھر منکرین اور معاند لوگوں کے
متعلق فرمایا کہ وہ ہدایت کی بات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جیسے وہ لوگ قبروں میں پڑے
ہوئے مُردوں کی مانند ہیں جنہیں کتنا بھی وعظ و نصیحت کیا جائے، وہ مستفید نہیں ہو
سکتے۔ اس کی مثال بہرے اور اندھے آدمی کی ہے کہ وہ بھی سننے اور دیکھنے کی صلاحیت
سے محروم ہونے کی وجہ سے اچھی بات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی طرح کفار
بھی ایمان اور نیکی کی بات سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہدایت ان لوگوں
کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے طلبگار ہوتے ہیں۔

انسانی زندگی کے تین دور

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اس پر ہونے والے تین مختلف ادوار
کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ
اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کمزوری سے یعنی تمہیں کمزوری کی حالت
میں پیدا فرمایا۔ انسان کی ابتدائی تخلیق تو مٹی سے ہوئی اور اس کے بعد نوع انسانی کی بقا

ہوسکتا ہے قطرہ آب ہو۔ اللہ تعالیٰ خلاق علیم ہے اور وہ قیامت تک انسانوں کو پیدا کرتا رہے گا۔ اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے أَلَمْ نَخْلُقكُّم مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ (المرسلت ۲۰) کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرہ آب سے پیدا نہیں کیا؟ سورۃ الطارق میں فرمایا فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ⑥ انسان دیکھے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے اسے اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان کی پیدائش ایک نہایت ہی حقیر چیز سے ہوتی ہے۔

اس کمزور ابتدا کے بعد فرمایا ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً پھر تم میں قوت پیدا کر دی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک انسان نسبتاً کمزور حالت میں ہوتا ہے۔ پھر جب شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں قوت آجاتی ہے۔ یہی زمانہ انسان کے لیے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ جوانی میں انسان کی ساری قوتیں ٹھیک سے کام کرتی ہیں۔ وہ بہتر سوچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھے طریقے سے کر سکتا ہے محنت مشقت کر کے اپنے لیے آسودہ حالی کا سامان پیدا کر سکتا ہے گویا اس بہترین دور میں وہ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے بہتر طور پہ کام کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہاری بچپن کی کمزوری کو ہم نے طاقت میں بدل دیا۔

فرمایا ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً پھر اللہ نے قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کو طاری کر دیا۔ جب جوانی کا زمانہ ختم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان پہ بڑھاپا طاری کر دیتا ہے۔ اس کے بال سفید اور اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں بہترین خوراک بھی انسان کے لیے مفید ثابت نہیں ہوتی بلکہ وہ تنزل کی طرف ہی گامزن رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہو جاتے ہیں جسم میں طاقت نہیں رہتی۔ آنکھوں کی بینائی اور کانوں کی سماعت جاتی رہتی ہے حتیٰ کہ انسان کا ذہن بھی ماؤف ہو جاتا ہے۔ حافظہ کمزور ہو کر یادداشت باقی نہیں رہتی۔ سورۃ المؤمن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض کو اس سے پہلے ہی موت

لے لیتا ہے یعنی بعض بچپن میں اور بعض جوانی کے عالم میں فوت ہو جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی حالت میں راہیِ ملکِ عدم ہوتے ہیں۔

بعض بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ اگر کسی انسان کی کل زندگی ساٹھ سال فرض کی جائے تو اس کی حقیقی زندگی بیس۲۰ سال ہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان نے آدھی زندگی یعنی تیس۳۰ سال تو سو کر گزار دیے۔ ابتدائی دس سال بچپن کے کھیل کود میں نکل گئے اور باقی اصل زندگی بیس۲۰ سال ہی رہ جاتی ہے جو انسانی زندگی کا بہترین عرصہ ہوتا ہے۔ اگر اس عرصہ میں انسان نے کوئی نیکی کمائی تو اس نے اخروی زندگی کے لیے راحت کا سامان پیدا کر لیا۔ اور اگر یہ مدت کھیل کود، کفر، شرک، بدعات اور سوءِ عاداتِ فاسدہ میں گزار دی تو پھر اس کی یہ زندگی بھی ضائع ہو گئی اور اگلی زندگی تو ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی اور ایسا شخص ہمیشہ کے لیے نقصان میں پڑ گیا۔

ملتِ اسلامیہ کے ادوار

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان کی انفرادی زندگی میں مختلف دور آتے ہیں، اسی طرح قومی اور ملی زندگی کے بھی ادوار ہوتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی حالت کو دیکھیے۔ مکی زندگی میں مسلمانوں کی حالت کمزور تھی اور یہ ابتدائی ضعف کا زمانہ تھا۔ پھر مدنی زندگی میں اللہ نے مسلمانوں کو قوت بخشی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال کے قلیل عرصہ میں نصف دنیا مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ چکی تھی۔ اس کے بعد پھر انحطاط کا دور شروع ہوا جو ملی زندگی میں بڑھاپے کے مشابہ ہے۔ مسلمان قوم بحیثیتِ مجموعی ہر جگہ کمزور ہے اگرچہ تعداد بہت زیادہ ہے مگر دینی قوت مفقود ہو چکی ہے۔ اس انحطاط کے اسباب میں اہلِ اسلام کا انتشار، نظامِ خلافت سے محرومی، ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ، الحادی طاقتوں یعنی عیسائیت، یہودیت اور دہریت کا دور دورہ، شرک کی بہتات، بداخلاقی، عریانی، فحاشی اور شیطان کا اغوا وغیرہ شامل ہیں۔ خواص ان حالات میں ہمیشہ متفکر رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اس پستی سے نکالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قومی و ملی شعور رکھنے

کہ نفخۂ اولیٰ اور نفخۂ ثانیہ کے درمیانی عرصہ پر محمول کرتے ہیں کہ یہ قول بھی عرصہ کے لحاظ سے درست
ہے یعنی کم و بیش چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کی دنیاوی زندگی پچاس، ساٹھ اور سو سال
تک بھی محیط ہوتی ہے اور عالم برزخ میں تو ہزاروں سال بھی بیت چکے ہیں۔ ان حالات
میں گذشتہ زندگی کا دعویٰ کرنا تو محض جھوٹ ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسان
برزخ کی زندگی میں تو بہرے اور بے زبان رہے کیونکہ جب منکر نکیر سوال کرتے
ہیں تو منکر اور کافر کہتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ ہائے افسوس میں اس کے
متعلق کچھ نہیں جانتا۔ البتہ حشر میں بعض مواقع ایسے بھی آئیں گے۔ لوگ اپنی کرتوت
سے مکر جائیں گے حتیٰ کہ رب کے سامنے جھوٹی قسم بھی اٹھائیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا
كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (الانعام - ۲۳) خدا کی قسم ہم تو شرک نہیں کیا کرتے تھے۔ مگر
ان کا یہ جھوٹ کچھ مفید نہیں ہوگا۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے
غلط بیانی کرے گا تو اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ
اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔
(یٰسٓ - ۶۵) ہم ان کے مونہوں پر مہریں لگا دیں گے اور پھر ان کے ہاتھ پاؤں
ان کے کرتوتوں کے متعلق بول کر گواہی دیں گے۔ اور بالآخر گنہگار آدمی اپنے
گناہوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بہرحال فرمایا کہ مجرمین گنہگار لوگ دنیا کی
زندگی کو گھڑی بھر پر محمول کریں گے۔ اسی طرح دنیا میں بھی یہ حقیقت سے دوسری
طرف پھیرے جاتے تھے۔ انہوں نے ایمان اور توحید کو نظر انداز کیا اور آج گرفتارِ مصیبت
ہیں۔ مجرمین کے مذکورہ بیان کے برخلاف وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَالْاِيْمَانَ صاحب علم اور صاحب ایمان لوگ کہیں گے کہ گنہگاروں کا قول غلط ہے
بلکہ حقیقت یہ ہے لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ
الْبَعْثِ تم اللہ کی کتاب کے مطابق قیامت تک ٹھہرے ہو۔ اللہ کی کتاب
سے مراد لوح محفوظ یا اللہ کا علم ہے۔ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ آج دوبارہ جی اٹھنے

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿٥٨﴾ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٩﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ﴿٦٠﴾ ع

ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہیں لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں۔ اور اگر آپ لائیں ان کے پاس کوئی نشانی تو کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہو تم مگر باطل پرست ﴿۵۸﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے ﴿۵۹﴾ پس آپ صبر کریں۔ بیشک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اور نہ خفیف بنائیں آپ کو وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے ﴿۶۰﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی کے تین ادوار کا ذکر کیا۔ انسان کی پیدائش اور بچپن کمزوری اور ناتوانی کا دور ہوتا ہے۔ پھر جب وہ جوانی کو پہنچتا ہے تو یہ اس کی قوت کا زمانہ ہوتا ہے۔ آخر میں پھر انسان کے اعضاء کمزور پڑنے

بیان کی ہیں۔ عربی زبان میں ضرب کا معنی مثال بنانا اور بیان کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس
مقام پر مراد بیان کرنا ہوتا ہے۔ اللہ نے مختلف سورتوں میں تقریب فہم کے لیے بہت
سی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ اگلی سورۃ لقمان میں مسئلہ توحید سے متعلق مثال بیان کی گئی
ہے۔ وقوع قیامت کے متعلق مثالیں سورۃ الاعراف اور سورۃ ق میں گزر چکی ہیں اور نور ہدایت
کی مثال سورۃ نور میں گزر چکی ہے۔ شرک کے بطلان کی مثال گذشتہ سورۃ العنکبوت میں
بیان ہوئی تھی۔ اسی طرح منافقین اور کفار کے طرز عمل کی مثالیں اللہ نے مختلف سورتوں
میں بیان فرمائی ہیں۔ حق و باطل کی مثال، مومن اور کافر کی مثال، ظلمات و نور کی مثال، دنیوی
زندگی کی مثال، کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال اور ریاکاری وغیرہ کی مثالیں مختلف سورتوں میں
بیان ہوئی ہیں۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن پاک میں لوگوں کو سمجھانے کے
لیے بہت سی مثالیں بیان کی ہیں۔ جس مسئلہ میں مثال کی ضرورت پیش آتی ہے
تاکہ مقصد کی وضاحت ہو جائے۔ بعض موٹے موٹے مسائل تو آسانی سے سمجھ میں آجاتے
ہیں، تاہم بعض دقیق چیزوں کو مثال کے ذریعے فہم کے قریب کر دیا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مثال سے مراد مثال بھی ہو سکتی ہے اور اس سے صفت
بھی مراد لی جا سکتی ہے جیسا کہ گذشتہ آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے وَلَهُ الْمَثَلُ
الْأَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ آسمانوں اور زمین میں اللہ کی صفت
بہت بلند ہے۔ بہرحال اللہ نے قرآن پاک میں مختلف الانواع چیزیں بیان فرمائی
ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے یا پھر دیگر بہت سی
چیزیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں

مہر قلوب

ارشاد ہوتا ہے، اے نبی علیہ السلام! وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ اگر آپ
ان کفار و مشرکین کے پاس کوئی نشانی لے کر آئیں، کوئی معجزہ یا دلیل پیش کریں
لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝
تو کافر لوگ کہیں گے کہ نہیں ہو تم مگر باطل راستے پر۔ یہ بدبخت حق کو باطل کہہ کر ٹال
کر دیں گے۔ مطلب یہ کہ ہٹ دھرم اور بدعقیدہ لوگوں کے سامنے کوئی مثال یا کوئی

فرماتے ہیں کہ غین حجاب تو توبہ استغفار سے دور ہو جاتا ہے مگر رین تو عذاب
کا مقدمہ ہے اور یہ شے سے تعبیر کیا ہے تو پختہ ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے اثر لینے کے
مادہ موافق ختم ہو جاتے ہیں سورۃ النساء میں ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا
بِكُفْرِهِمْ (آیت ۱۵۵) اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں
پر ٹھپے لگا دیئے ہیں جس سے ان کی قبولیت حق کے لیے صلاحیت ہی ختم ہو چکی
ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ہے۔ یہاں بھی فرمایا کہ اسی
طرح ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپے مار دیتے ہیں۔

جہل مرکب

جو لوگ سمجھ اور عقل سے کام نہیں لیتے، وہ جہل مرکب کا شکار ہوتے ہیں۔ جہالت
دو قسم کی ہے یعنی جہل بسیط اور جہل مرکب۔ جہل بسیط سادہ اور محض لاعلمی ہوتا ہے۔ جو
حصول علم سے دور ہو جاتا ہے اور اس جہل میں مبتلا شخص کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔ البتہ
جہل مرکب یہ ہے کہ انسان کسی غلط چیز پر پختہ ہو جائے اور اسے اچھا سمجھ کر اس پر کاربند
ہو جائے۔ ایسے جاہل کی اصلاح ممکن نہیں رہتی کیونکہ ایسا شخص غلط کو بھی صحیح سمجھتا ہے
لہٰذا وہ کبھی بھی اس سے باز نہیں آتا۔ صاحب تفسیر روح المعانی ایک لطیفے کی
بات لکھتے ہیں۔

قَالَ حِمَارُ الْحَكِيمِ يَوْمًا لَوْ تُنْصِفُونِي لَكُنْتُ أَرْكَبُ
لِأَنَّنِي جَاهِلٌ بَسِيطٌ وَصَاحِبِي جَاهِلٌ مُرَكَّبُ

ایک روز ایک دانشور کے گدھے نے کہا کہ اگر لوگ انصاف سے کام لیں تو مجھے
میرے آقا پر سوار ہونے کا زیادہ حق ہے کیونکہ میں تو صرف جہل بسیط میں مبتلا ہوں۔
جب کہ میرا یہ مالک جہل مرکب کا شکار ہے۔ بہرحال جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں
لیتے بلکہ غلط چیز پر ہی اڑے رہتے ہیں، وہ جہل مرکب کا شکار ہو کر قابل اصلاح نہیں
رہ جاتے ہیں۔

صبر کی تلقین

آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا ہے فَاصْبِرْ
إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ آپ صبر سے کام لیں کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

ے روح المعانی ص ۶۲ ج ۲۱ (فیاض)

کو اخلاص سے، حمد کو توبہ سے، کذب کو صداقت سے اور غفلت کو تفکر سے تبدیل کرتا ہے۔

نقص وضو کا اثر امام پر

امام ابن کثیر[1] نے سورۃ روم کی تفسیر کے آخر میں امام احمد بن حنبل کے حوالے سے روایت بیان کی ہے کہ حضور علیہ السلام کے بعض صحابہؓ نے بیان کیا کہ آپ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۃ روم تلاوت فرمائی۔ آپ کو نماز میں کچھ وہم اور بھول ہو گئی۔ جب حضور علیہ السلام نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ ہم پر قرآن کو مبہم کیا جاتا ہے یعنی تلاوت قرآن میں گڑبڑ ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے۔ فرمایا جو شخص ہمارے ساتھ نماز میں شامل ہوتا ہے اس کو اچھے طریقے سے وضو بنانا چاہیئے۔ ورنہ اس کا اثر ہم پر پڑتا ہے اور قرآن کی تلاوت میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اور متن حسن ہیں۔ امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ دوسری حدیث[2] میں صراحتاً موجود ہے اَلْإِمَامُ ضَامِنٌ یعنی امام مقتدیوں کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر اس کی نماز صحیح ہو گی تو مقتدیوں کی نماز بھی درست ہوگی اور اگر امام کی نماز فاسد ہے تو مقتدیوں کی بھی فاسد ہوگی۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اسی بنا پر امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرأت کے قائل نہیں ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۴۳۲ ج ۳ (فیاض)

معالم العرفان فی دروس القرآن مکمل ۲۰ جلدوں میں

افادات

مفسر قرآن مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین ایم۔اے علوم اسلامیہ لاہور

زیر انتظام انجمن محبان اشاعت القرآن

صدر انجمن شیخ محمد یعقوب عاجز صاحب

جنرل سیکرٹری بابو غلام حیدر صاحب

الحاج محمود انور بٹ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ خزانچی مکتبہ دروس القرآن

ناظم مکتبہ دروس القرآن محمد منیر صاحب فون: 4221943